۱۶ر سے ۳۱ر جنوری ۱۹۸۷ء
۲۶ر پوش سے ۱۱ر ماگھ ۱۹۰۸ شاکا

آواز

اشاعت کا ۵۲ واں سال
قیمت ایک روپیہ

آل انڈیا ریڈیو و دوردرشن کے پروگرام، معلوماتی مضامین، دلچسپ افسانے و منظومات

ساغر جیلانی

کوئی ناصح ہوں، نہ مشفق ہوں نہ رہبر ہوں میں
میرا پیغام محبت ہے، سخن ور ہوں میں

جس کے سائے میں گذرتے ہیں مرے لیل و نہار
ہاں اُسی زلف کی خوشبو سے معطر ہوں میں

کوئی احسان گھٹاؤں کا نہیں ہے مجھ پر
جس کو شبنم نے نکھارا وہ گلِ تر ہوں میں

ہے مرے پاس محبت کے خزانوں کی کلید
خسروِ وقت ہوں قسمت کا سکندر ہوں میں

تو کہ پتھر تھا خدا میں نے بنایا تجھ کو
جس نے پیکر تجھے بخشا ہے وہ آذر ہوں میں

ہے رگِ گل سے بھی نازک مرا احساس مگر
جانے کیوں لوگ سمجھتے ہیں کہ پتھر ہوں میں

مجھ میں ڈوبے ہیں کئی دَرد کے دریا ساغر
پھر بھی اک ساکت و خاموش سمندر ہوں میں

سلمان صہبا بدایونی

رخ پہ افشاں لگا رہی ہے رات
ناز نیں بنتی جا رہی ہے رات

ہائے وہ غم کدہ جہاں پیہم
رات کے بعد آ رہی ہے رات

روشنی سے سنور رہا ہے دن
تیرگی میں نہا رہی ہے رات

شمعِ امید بجھنے والی ہے
آ بھی جاؤ کہ جا رہی ہے رات

کس ادا سے جبینِ فطرت پر
ماہ و انجم سجا رہی ہے رات

صبحِ نو کے حسین ہاتھوں سے
اپنی بانہیں چھڑا رہی ہے رات

ایک مجبورِ غم کے اشکوں سے
پیاس اپنی بجھا رہی ہے رات

ڈوبتا جا رہا ہے دل صہبا
کانپتا ہو کہ آ رہی ہے رات

اشہر مرادآبادی

اس نے کچھ مجھ سے کہا ہو جیسے
آئینہ بول اٹھا ہو جیسے

زندگانی کی حقیقت کیا ہے
آپ کا عہدِ وفا ہو جیسے

میرے آنگن میں چمکتا سورج
راستہ بھول گیا ہو جیسے

ناخدا کے کوئی تیور دیکھے
اہلِ کشتی کا خدا ہو جیسے

کچھ تو بولو کہ ذرا جی بہلے
تم تو یوں چپ ہو خفا ہو جیسے

ریگزاروں پہ برستا بادل
خشک ہونٹوں کی دعا ہو جیسے

یوں سُنا اس نے حالِ دل اشہر
ہم نے کچھ بھی نہ کہا ہو جیسے

راہی ٹانڈوی

"آدمی" سے لفظ کے اتنے مطالب دیکھ کر
روح شرمائی ہوئی ہے اپنا قالب دیکھ کر

نقش ہیں کاغذ پہ کتنی رفعتیں افکار کی
آج اندازہ ہوا "دیوانِ غالب" دیکھ کر

چاند نے بھیجی ہیں کرنیں پیشوائی کے لیے
بے بضاعت خاکداں کو اپنا طالب دیکھ کر

دُور مٹی کے مکانوں میں دیئے جلنے لگے
اک تھکی ہاری سحر پر شب کو غالب دیکھ کر

شعر تو راہی ہیں کیا کہنا مگر دل خوش ہوا
رات اک اردو لغت میں لفظِ جالب دیکھ کر

انور کیفی

نذر لیلائے سیاست بزمِ ہستی ہو گئی
زندگی مہنگی ہوئی اور موت سستی ہو گئی

آج معیارِ شرافت صرف سیم و زر ہوا
باعثِ تذلیلِ انساں تنگدستی ہو گئی

کالے دھن کے سائے میں کب یاد آتا ہے خدا
باعثِ رحمت ہماری فاقہ مستی ہو گئی

ہم بھی تو سقراط ہیں زہرِ ہلاہل دو ہمیں
ہم سے بھی سرزد جہاں میں حق پرستی ہو گئی

ماہ و انجم، سبزہ گل سب مری ٹھوکر پہ ہیں
دوشنا میں عظمتِ غم میری ہستی ہو گئی

عالمِ بالا سے آتی ہے صدائے روحِ کیف
وجہِ تزئینِ غزل انور کی ہستی ہو گئی

اس بار رامپور سے غزلیں

آواز
آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام
جلد ۵۲ | شمارہ ۱
۱۶ر جنوری ۱۹۸۷ء بمطابق ۲۶ر پوش ۱۹۰۸ اشاکا
چیف ایڈیٹر ایس کے سندر ٹیلی فون ۳۸۲۲۴۹
ادارت
سراج احمد ۳۸۲۲۵۴
ہرمہندر سنگھ وج

اس شمارے میں

جمہوری ہندوستان ـــــ مسرور ہاشمی ـــــ ۳
شیشے کا گھر ـــــ جوگندر پال ـــــ ۵
جمہوری فکر کی بنیادیں ٹیگور کی شاعری میں ـــــ ڈاکٹر انیس الرحمن ـــــ ۶
گاندھی جی نے کہا ـــــ محمود ہاشمی ـــــ ۷
فرقہ وارانہ فساد کے ذمہ دار قوم دشمن عناصر ـــــ محمد مجیب اللہ ـــــ ۸
سائنس کی دنیا ـــــ خلیل اکمل ـــــ ۹
آکاش وانی اور ہم ـــــ یوسف ناظم ـــــ ۱۰
چکبست کی وطنیت ـــــ حامد علی خاں ـــــ ۱۲
آبادی اور اس کے مسائل ـــــ سید تقی الدین ـــــ ۱۳
جدوجہد آزادی میں اردو کا حصہ ـــــ شاہد کبیر ـــــ ۱۴
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے ـــــ شکیل شاہجہاں کاشٹوی ـــــ ۱۶
جدید اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات ـــــ عشرت بیتاب ـــــ ۱۷
ایک آسیبی کہانی ـــــ احسان تابش ـــــ ۱۹
بیتے لمحوں کی کسک ـــــ افتخار عظیم چاند ـــــ ۲۰
لہولہان انگلیاں اور پیپل ـــــ خورشید حیات ـــــ ۲۱
خوشی ـــــ عبدالصمد ـــــ ۲۲
زمانے کی ہوا ـــــ ذاکرہ خاتون ـــــ ۲۴

غزلیات

شفق شاہ چشتی ـــــ ۴
تسنیم صدیقی ـــــ ۶
خواجہ ضمیر ـــــ ۱۲
جوہر وارثی ـــــ ۱۸
عبداللہ کمال ـــــ ۲۳

اسسٹنٹ بزنس منیجر: جگدیش پرساد

قیمت
فی کاپی ـــــ ایک روپیہ
سالانہ ـــــ ۲۲ روپے
دو سال ـــــ ۴۲ روپے

ادائیگی بذریعہ چیک / پوسٹل آرڈر / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، بنام / چیف ایڈیٹر آکاشوانی گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو، فلور پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Telegram: 'LISTENER' New Delhi

(ایک سال سے کم کا چندہ قابل قبول نہیں ہوگا)
اندرون ملک ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

جمہوری ہندوستان

مسرور ہاشمی

ہندوستان بہت بڑا اور بہت پرانا ملک ہے۔ یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ برصغیر کہلاتا ہے اور اتنا پرانا ہے کہ دنیا کی سب سے پرانی تہذیبوں میں سے ایک تہذیب، جسے وادیٔ سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے، یہیں پھلی پھولی تھی۔ اس کے شمال میں دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہمالیہ ہیں جن کا سلسلہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ جنوبی ہند تین طرف پانی سے گھرا ہوا ہے۔ مشرق میں خلیج بنگال، مغرب میں بحر عرب اور جنوب میں بحر ہند ہے۔ ہندوستان کی تین چوتھائی سرحدیں انہی سمندروں کے ساحل ہیں۔

تقریباً ستر کروڑ انسانوں کا یہ ملک اپنی تاریخ کے اولین دور سے جمہوری قدروں کا حامل رہا ہے۔ پنچایت اور مشترکہ کنبہ زمانہ قدیم سے ہمارے سماج کی بنیاد رہے ہیں۔ یہ دونوں ایسے سماجی ادارے ہیں جن کے ڈانڈے جمہوریت سے جاملتے ہیں۔ اب تو خیر گاؤں کی پنچایت کو قانونی حیثیت دیدی گئی ہے۔ لیکن سینکڑوں سال پہلے بھی گاؤں کی پنچایت ہی جھگڑے نمٹایا کرتی تھی۔ پنچ اور سرپنچ اتفاقِ رائے سے چنے جاتے تھے۔ ان کے فیصلے قانونی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر ان کے فیصلے سے کوئی سرتابی کرتا تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جاتا تھا۔

پنچایت کے علاوہ ایک اور پرانی روایت مشترکہ کنبے کی روایت ہے۔ خاندان کے سارے افراد جیسے دادا، باپ، بیٹے، دادی، ماں، بہوئیں عموماً ایک جگہ رہتے۔ کوئی اور بے سہارا اور لاوارث رشتے دار اگر ساتھ رہنے آجاتا تو کنبے کے افراد کی ہمت نہ ہوتی کہ اس کے ساتھ رہنے پر اعتراض کریں۔ چنانچہ دور کے رشتوں کی بڑی بوڑھیاں اکثر مشترکہ کنبے کے ممبر کی حیثیت سے بڑے باعزت طریقے سے ساتھ رہتیں۔ کنبے کی ساری آمدنی گھر کے کسی بڑے کے پاس رہتی، اور وہی ضرورت کے مطابق مختلف افراد کو خرچ دیتا۔

اگر پنچایت کی بنیاد حق، انصاف اور مساوات پر تھی تو مشترکہ کنبہ تحفظ ذات اور انسانی ہمدردی پر مبنی تھا۔ یہ دونوں ادارے بڑے پائدار تھے۔ نہ حملہ آور انھیں لوٹ سکے نہ خود ملک والے انھیں بدل سکے۔ نئی نئی قومیں جیسے ہن، کشان، ترک، منگول، وغیرہ تھوڑے سے ثقافتی لین دین کے بعد انہی اداروں کے ذریعے ہمارے ہندوستانی سماج کا جز بن گئیں۔ صرف یورپی قومیں اس ہندوستانی سماج میں رچ بس نہ سکیں۔

یوروپ کی جمہوریت جن اصولوں پر قائم ہوئی تھیں وہ ہماری جمہوری قدروں سے بہت مختلف نہ تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یوروپ والوں نے اپنی تنظیمی صلاحیتوں کی مدد سے جمہوریت کو ایک سیاسی ادارے کی شکل دیدی اور ہمارے ہاں جمہوریت ایک طریقہ زندگی رہی۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے یوروپ کے جمہوری اداروں کو اس طرح اپنا لیا جیسے مچھلی پانی کو اپنا لیتی ہے۔ جمہوریت ہمارے خون میں تھی اس لیے جمہوریت کو بہ حیثیت سیاسی ادارے کے ہم نے بہت آسانی سے اپنا لیا۔ تقریباً تیس کروڑ بالغ مرد اور عورت آٹھ مرتبہ عام انتخابات میں حصہ لے کر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے فرد کہلانے کے جائز طور پر حقدار ہیں۔

آیئے آج یہ دیکھیں کہ ہماری جمہوری حکومت کس طرح بنتی ہے۔ لنکن نے کہا ہے کہ جمہوریت عوام کی حکومت ہوتی ہے جسے عوام بناتے اور عوام ہی چلاتے ہیں۔ ہماری حکومت بھی عوام بناتے اور چلاتے ہیں۔ حکومت بنانے کا سارا عمل الیکشن کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہر وہ باہوش ہندوستانی شہری جو ۲۱ سال یا اس سے زیادہ عمر کا ہو الیکشن میں ووٹ دے سکتا ہے۔ ایسا شہری ریاستی اور مرکزی انتخابات میں حصہ لے کر حکومت سازی کے کام میں شریک ہو جاتا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ پورا ملک ریاستوں اور مرکزی علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ علاقے جو براہ راست مرکزی حکومت کے تحت ہیں وہ یونین ٹیریٹری کہلاتے ہیں۔

ہر ریاست میں ایک قانون ساز اسمبلی ہوتی ہے جس کے ہر پانچ سال بعد الیکشن ہوتے ہیں اور اس طرح ریاست کی اپنی حکومت بنتی ہے۔ لیکن ہم جس الیکشن کی بات کریں گے وہ پارلیمنٹ یا مرکزی قانون ساز اسمبلی کے الیکشن ہیں۔ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہیں، ایک جسے دارالعوام یا لوک سبھا کہا جاتا ہے اور دوسرا جسے کاؤنسل آف اسٹیٹس یا راجیہ سبھا کہا جاتا ہے۔

راجیہ سبھا یا کاؤنسل آف اسٹیٹس کے ممبروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ ہو سکتی ہے جس میں سے ۱۲ ممبران کو صدر جمہوریہ نامزد کرتا ہے۔ نامزد ممبران وہ لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے قومی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیا ہو۔ اس کے نامزد ممبروں میں ڈاکٹر تارا چند مشہور مورخ، ڈاکٹر واڈیہ مشہور سائنسداں، اور نرگس مشہور ایکٹرس رہ چکے ہیں۔ راجیہ سبھا کے باقی ممبران کا انتخاب ریاستوں کے منتخب ممبر کرتے ہیں۔ یہ الیکشن ہر دو سال کے بعد ہوتے ہیں، کیونکہ ہر دو سال کے بعد راجیہ سبھا کے ایک تہائی ممبروں کی مدت ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح پارلیمنٹ کا یہ ایوان جسے ایوان بالا کہنا جائز ہوگا، بالکل منتشر کبھی نہیں ہوتا۔

پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں، جسے دارالعوام یا لوک سبھا کہا جاتا ہے، وہ ایوان ہے جہاں عوام براہ راست ووٹنگ کے ذریعے اپنے نمائندے بھیجتے ہیں۔ اس کے الیکشن ہر پانچ سال کے بعد ہوتے ہیں۔ الیکشن کے لیے سارے ہندوستان کو انتخابی حلقوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ ہر انتخابی حلقے میں ووٹروں کی فہرست بن جاتی ہے۔ جو شخص ووٹر ہو سکتا ہے وہی الیکشن میں امیدوار بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازم نہ ہو، اور پچھلے پانچ سال میں اسے کسی جرم کی پاداش میں دو سال تک کی سزا نہ ہوئی ہو۔ الیکشن کی امیدواری کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ووٹر فارم بھر کر امیدوار کا نام تجویز کرے۔ یہ فارم رٹرننگ آفیسر کے پاس جاتا ہے جو اس کی چھان بین کرتا ہے۔ اگر فارم میں کوئی غلطی نہ ہو تو وہ شخص الیکشن میں امیدوار ہو جاتا ہے۔

الیکشن میں سیاسی پارٹیاں بڑا اہم رول ادا کرتی ہیں یہ اس طرح بنتی ہیں کہ جو لوگ ملک کے اہم مسائل اور ان کے حل کے بارے میں ہم خیال ہوتے ہیں وہ ایک سیاسی پارٹی کے رکن بن جاتے ہیں۔ الیکشن کے وقت یہ سیاسی پارٹیاں اپنے امیدوار جگہ جگہ کھڑے کرتی ہیں۔ اکثر انتخابی حلقوں سے ایسے امیدوار بھی کھڑے ہوتے ہیں جو کسی پارٹی کے ممبر نہیں ہوتے ایسے امیدوار آزاد امیدوار کہلاتے ہیں۔ ہر پارٹی کا ایک انتخابی نشان ہوتا ہے۔ ہر انتخابی حلقے کے آزاد امیدواروں کو بھی علیحدہ علیحدہ نشان دیدیے جاتے ہیں، تاکہ ایسے ووٹروں کو جو لکھ پڑھ نہ سکتے ہوں اپنی پسند کے امیدوار کو پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔

الیکشن سے پہلے پارٹیاں اور امیدوار جلسے کرواتے اور جلوس نکلواتے ہیں۔ خوب نعرے لگاتے ہیں۔ بچوں کے غول کے غول اس طرح نعرے لگاتے پھرتے ہیں جیسے کسی بہت بڑے تہوار میں حصہ لے رہے ہوں۔ سارے ملک کے لوگ، خواہ وہ ووٹر ہوں یا نہ ہوں جیسے یک لخت ہوشیار ہو جاتے ہیں۔ دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں۔ وعدے کیے جاتے ہیں۔ دوسروں کی وعدہ شکنی یاد دلائی جاتی ہے۔ غرضیکہ پروپیگنڈہ کا یہ زمانہ بڑی دلچسپیوں میں گزرتا ہے۔ پھر پروپیگنڈہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسکولوں، کالجوں، چوپالوں اور پبلک اداروں میں پولنگ بوتھ بن جاتے ہیں۔ الیکشن کے دن صبح ہی سے قطاریں لگ جاتی ہیں۔ شام کو ووٹنگ کے خاتمے پر امیدواروں کے نمائندوں کی موجودگی میں ووٹوں کی گنتی شروع ہو جاتی ہے۔ جس امیدوار کو سب سے زیادہ ووٹ ملتے ہیں اس کی کامیابی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

جس پارٹی کے امیدوار لوک سبھا کی آدھی سے زیادہ نشستیں حاصل کر لیتے ہیں اسے لوک سبھا کی اکثریتی پارٹی کہا جاتا ہے۔ صدر اس کے لیڈر کو بلا کر حکومت بنانے کے لیے کہتا ہے۔ یہ لیڈر وزیر اعظم بنتا ہے اور اپنے وزراء کے نام صدر کے سامنے پیش کرتا ہے۔ صدر کی طرف سے ان وزراء کی تقرری کا اعلان ہوتا ہے۔ وزیر اعظم اور وزراء اپنے عہدے کے حلف اٹھاتے ہیں۔ زیادہ اہم وزراء کابینہ میں شمار ہوتے ہیں۔ وزیر اعظم حکومت کا سربراہ کہلاتا ہے یا کہلاتی ہے اور کابینہ اس حکومت کی حکمتِ عملی وضع کرتی ہے۔ اس طرح مرکز میں حکومت بن جاتی ہے۔

حکومت کے کارکنان اور وزراء ہمیشہ کے لیے تو منتخب ہوتے نہیں۔ اس لیے وہ اپنی پانچ سالہ مدت میں کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے عوام ان سے ناراض ہو جائیں۔ انکی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ حکومت عوام کی فلاح اور بہبود کے کام کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کی پوری حکمت عملی کا رُخ عوام ہی کی طرف رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ حکومت واقعی بالکل ویسا ہی کرنے کی کوشش کر رہی ہے جیسا ہمارے دستور کی تمہید میں لکھا ہوا ہے۔

"ہم ہند کے لوگ سنجیدگی کے ساتھ یہ فیصلہ کرکے کہ ہند کو ایک کل اقتدار جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے:۔

سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف، خیال، بیان، عقیدے، مذہب اور عبادت کی آزادی، حیثیت اور موقعوں میں مساوات کا تحفظ کریں۔

اور اس کے سب شہریوں میں، بھائی چارہ کو اس طرح ترقی دیں کہ وہ فرد کے وقار اور قوم کی ایکتا قائم رکھنے کی ضمانت ہو۔

اپنی دستور ساز اسمبلی میں آج نومبر ۱۹۴۹ء کے ۲۶ ویں دن اس کارروائی سے اس دستور کو منظور کرتے، شکل دیتے اور اپنا دستور بناتے ہیں۔"

دستور کے یہ الفاظ کتنے صاف اور واضح ہیں، اس دستور کے الفاظ جو ہماری قدروں کا آئینہ دار اور ہماری جمہوریت کا ضامن ہے، اور ہم جس کے محافظ اور نگہبان ہیں۔

(اُردو سروس سے نشر)

شفق شاہ چشتی

یوں شب ہجر میں پلکوں پہ درخشاں آنسو
جیسے برسات کی نمناک فضا میں جگنو

بے خیالی میں کبھی چھو گئے ہوں گے گیسو
دامنِ ہوش سے آتی ہے ابھی تک خوشبو

یوں ہوا چاک فسوں کاریٔ فطرت کا لباس
کہ نہ ہونا تھی نہ آخر ہوئی تو فیسق رفو

یہ بھی اک منزلِ ادراکِ جنوں ہے شاید
ایک اک غنچۂ ذی ہوش میں ہے جوشِ نمو

روحِ احساس ہے اس مست نگاہی کا شعور
دل کی رگ رگ میں سمائی ہے وہ چشمِ آہو

ذوقِ سجدہ تو دیا ہے مرے مالک لیکن
راس آجائے کبھی اشکِ ندامت سے وضو

بے خودی میں بھی کوئی شے ہے بنامِ جلوہ
سخت حیراں ہو کہ اس آئینے میں، میں ہوں کہ تو

جتنی دیر اس نے سُنا ہے مرا افسانۂ غم
نرگسی آنکھوں سے ٹپکائے ٹپ ٹپ آنسو

ابھی اٹھے تھے پئے راہ نوردی کہ شفقؔ
بن گئے پاؤں کی زنجیر کسی کے گیسو

(رامپور سے نشر)

تصور کے صنم خانے کبھو اُجڑتے ہیں؟ اغراتفری کے یُگ میں بھی گیان کی شمع جلتی رہتی ہے۔ انسانی تہذیب کی بقا اور اس کے ارتقا میں مدبروں، مفکروں، فنکاروں اور سائنس دانوں نے اہم کردار ادا کیا اور اپنی کاوشوں سے انسانی شعور، جذبات اور اقدار کے کینوس پر گہرے نقوش چھوڑے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بنیادی طور پر انفرادی حیثیت رکھنے والے تخلیقی اور جمالیاتی تجربے ترسیل کے بعد "اکثر اوقات آفاقی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

فن کے میدان میں تخلیقات کو سراہا گیا لیکن امکان یہ بھی ہے کہ نقد و نظر کے نام پر کبھی کبھی تخلیقات پر ایسے تبصرے بھی کیے گئے ہوں جو تخلیق کار کے نزدیک بے جا تنقید کے زمرے میں آتے ہیں۔ بہر حال تحریروں کے ہمارے اس سلسلے "شیشے کا گھر" کا مقصد یہ ہے کہ خالق بذات خود اپنی تخلیقات کا مخلصانہ جائزہ لیں اور فن کے میدان میں اپنے کارناموں کے ساتھ ساتھ اگر کہیں کسی کوشش ناتمام کا کرب پوشیدہ ہے تو اس کو بھی سامنے لائیں۔ عنوان "شیشے کا گھر" یقیناً تخلیق کار کو محرک کرے گا۔ وہ اپنے فنی سفر میں پیش آنے والے دکھ سکھ، سیرابی یا احساس تشنگی میں پڑھنے والوں کو شامل کریں کہ یہ تقاضا پڑھنے اور سراہنے والوں کا حق بھی ہے اور شدید خواہش بھی۔

(اردو سروس)

شیشے کا گھر

جوگندر پال

میری باشندگی ساری عمر بے مقام رہی ہے — نہیں، کمسنی کے ایام تو ماں کی گود میں ہی بیتے، مگر اس کے بعد کبھی کہیں قیام نصیب نہ ہوا۔ اِن حالات میں میں اپنا کوئی گھر — شیشے کا یا مٹی کا — کہاں کہاں اٹھائے پھرتا؟ ہاں، جب میں زندگی کے سفر پر نکلا تھا تو دل و دماغ پر چند مقامات کے مبہم سے نقوش ضرور اُبھر آئے ہوں گے، ورنہ کہاں پہنچنے کے لیے نکلتا؟ اِنہی نقوش کی ٹوہ میں میرے روانگی کے قصد کو تقویت پہنچی ہوگی اور میں بڑی معصوم مسرت سے آگے ہی آگے چلتا گیا ہوں گا، خواب میں بھی ویسے ہی، جیسے ہوش میں، بلکہ خواب میں زیادہ تیز چلتا ہوں گا، اور پھر چند ہی سال میں زندگی کے گرم و سرد سے گزرنے کے بعد وہ دھندلے نقوش میرے دل و دماغ سے اُڑ گئے ہوں گے اور میں راستوں میں کھو کر رہ گیا ہوں گا۔

میں پوری زندگی اسی طرح کھویا کھویا چلتا رہا ہوں، اپنا راستہ بھول جائے تو ہر راستہ اپنا ہی معلوم ہوتا ہے اور اُس راستے کی ہر واردات بھی اپنی ہی۔ میری کہانیاں لکھنے کی خواہش میں میرا یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ میری ساری خوشیوں اور ندامتوں کا انحصار اوروں کے کئے دھرے پر ہے۔ اپنے کسی کردار کی اچھائی پر مجھے اپنا آپ ہی اچھا معلوم ہونے لگتا ہے، یا میں اسی کی برائی کا اعتراف کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا ہوتا ہوں، میرے کرداروں کے دُکھ سُکھ ہی میرے دُکھ سُکھ ہوتے ہیں۔ میری اپنی کوئی زندگی نہیں، میں اُن ہی کی زندگی کرتا ہوں۔ اپنا ناول "نادیدہ" رقم کرتے ہوئے میں گزشتہ چند سال اپنے قلم سے ٹپک ٹپک کر ناول میں جذب ہوتا رہا اور اس سارے دوران میرے اندھے کرداروں کے مانند اندھیرا ہی میری بینائی کا وسیلہ بنا رہا، اور میں یونہی زندگی کرتا رہا اور پھر ناول کے خاتمے پر جب میں اندھوں کی اس بستی سے وداع ہو کر خارج کی روشنی میں لوٹا تو کئی ہفتے اُس وقت تک مجھے اپنے 'ہونے' کا احساس نہ ہوا جب تک میں کسی نئی کہانی میں منتقل نہ ہو گیا۔ سالہا سال اسی نوعیت کے تجربوں کے باعث میں لاشخصی سا ہو کر رہ گیا ہوں اور جس نے واقعی مجھ سے ملنا ہو وہ میری کہانیوں میں ہی مجھ سے مل پاتا ہے۔ میرے وجود میں مجھ سے مل کر شاید میرے دوستوں کو میری نیک نیتوں کے باوجود مایوسی ہوتی ہے، اور انھیں مایوس کر کے مجھے خجالت — مدتوں کی ریاضت کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ میرے نام یا شکل سے محض ایک سماجی سہولت مہیا ہو جاتی ہے اور بس۔ میں کوئی اور ہوں، کچھ بھی، کوئی بھی — نہیں، جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو مجھے اپنے نام سے بڑا عشق تھا۔ اس وقت پکی سیاہی میں اپنا نام دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی اور میرا سارا تخلیقی تناؤ میری اسٹارڈم کی خواہش سے وابستہ تھا لیکن جب میری فنی شرکتیں خوب گھنی ہو گئیں اُس دوران مجھے پتہ چلا کہ میرا نام، میری نجی شناخت کی علامتیں ڈھے رہی ہیں اور اس عمل کی بدولت میرے چہرے کا تناؤ اُدھڑنے لگا ہے اور میری پہچان ہر ذی جان سے وابستہ ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے بے نام پن کا عرفان ہوا تو سارے نام مجھے اپنے ہی محسوس ہونے لگے۔ جہاں جو کچھ جسے بھی پیش آتا ہے وہ مجھے ہی پیش آتا ہے میں صرف میں نہیں، میں ایک پوری کائنات ہوں اور میرے نہ رہ پانے پر بھی اس کائنات کی آبادکاری کے اسباب ہوتے رہیں گے۔

میں بے خبر نہیں کہ فن بھی زندگی کے مانند لامحدود امکانات کا حامل ہوتا ہے اور کہ کسی بھی فنکار کو اپنے اٹوٹ تخلیقی انہماک کے باوصف بالآخر اپنے ناکافی پن کے احساس کے بغیر چارہ نہیں۔ تاہم اس کے ناکافی پن کے باعث نوواردان کی تخلیقی مہم جوئی کا باب ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ حسن اور ضمیر کو اسی لیے دوام حاصل ہے کہ لکھنے والے اپنی ناکامیوں کے خوف سے جراُتوں سے تامل نہیں برتتے اور اپنے ویژن کو سہولتاً محدود نہیں کر لیتے۔ میرے بعض نقاد اپنے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں میری کسی ناکامی کا ذکر کر کے کچھ اس طرح خوش ہوتے ہیں گویا میں کامیاب ہوتا تو وہ بہت مایوس ہوتے۔ میں بھی انھیں پڑھ کر بہت خوش ہوتا ہوں، کیونکہ کامیاب ادیب یہ تو بخوبی جانتے ہیں کہ لکھے ہوئے کی زیادہ سے زیادہ اُجرت کیونکر وصول کی جاتی ہے مگر لکھ پانا انھیں غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔

نقادوں کی ججمنٹ کی بے صبر خواہش کے تعلق سے مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے: ایک دفعہ میں کہیں اپنا افسانہ "باشندے" پڑھ رہا تھا اور اپنے سننے والوں سے میرا بڑا گہرا ربط پیدا ہو رہا تھا۔ کہانی کے خاتمے پر بڑی پیاری، گھور خاموشی طاری ہو گئی، گویا سامعین اُسے ابھی تک اپنے ذہنوں میں سنتے جا رہے ہوں، یا اپنے تلازموں کی روشنی میں اسے ازسرِ نو دریافت کر رہے ہوں۔ کہانی میں ان کی اسقدر بھرپور شمولیت میرے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔ اسی اثنا میں صدر کی دعوت پر ایک نقاد نے گویا سامعین کو کچا چبلانے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ "کہانی بڑی اچھی ہے مگر —" اس کے طویل محاسبے میں ڈانٹ ڈپٹ محسوس کر کے سامعین گویا کہانی کے طلسم سے باہر آ گرے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اسے اپنی شرمندہ، متشکر نظروں سے دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ کتنا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ ہم جاہلوں کو تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ کہانی میں آنی منہمک شرکت سے ججمنٹ کورپٹ ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کہانی اولاً ججمنٹ کے لیے نہیں پڑھی جاتی، بلکہ زندہ کہانی میں پڑھنے والا اس طرح شریک ہوتا چلا جاتا ہے، گویا وہی اسے لکھ رہا ہو۔ ادب میں جس طبع زاد کام کو ہم کلاسیک سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کام بذاتِ خود کلاسیک نہیں ہوتا بلکہ اسے کلاسیک بنانے میں قارئین کی صدیوں کی تخلیقی شرکتیں بھی کارفرما ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے پڑھنے والے بھی گویا کہانی کو ازسرِ نو تخلیقتے ہیں جس سے کہانی کے تاثر میں ان کی وارداتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

یہ امر ہماری بدبختی کا موجب ہے کہ ہمارے ادبی نقاد اب تک عام طور پر دو گروہوں میں بٹے رہے۔ ایک گروہ کا اصرار تھا کہ ادب سے اصلاحی نقارے کا کام لیا جائے اور دوسرا ادب کو بے سیاق و سباق خیالی حسن کا آلۂ کار بنانے پر مصر رہا۔ مجھے اِن دونوں گروہوں نے اپنی اپنی سہولت کے مطابق رد کیا ہے یا قبولا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ یہ گروہ اب اپنے اپنے پرکھ کے معیاروں میں خوشگوار تبدیلیاں لانے کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ چیخوف نے بجا طور پر نوجوان ادبا کو ہدایت کی ہے کہ پڑھنے والوں پر یہ مت وا ہونے دو کہ تم انھیں دانستہ کسی نتیجے پر کھینچ کر لیے جا رہے ہو۔ کہانی خودرو نہ ہو اور اس میں ہر واقعہ ناگزیر نہ لگے تو اسے جمالیاتی سطح پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اس کے بے سیاق خیالی تار و پود سے اس میں تاکید اور اصرار کے عناصر نمایاں نہیں ہو پاتے۔ فن کے جمالیاتی تقاضے خلائی سوچوں سے پورے نہیں ہو جاتے بلکہ کسی مخصوص سیاق و سباق سے پیدا شدہ تناؤ ہی کسی فن پارے میں جمالیاتی آنچ لا پاتا ہے۔ کہانی کار کا کمال یہ ہے کہ کہانی میں وہ اپنے آپ کو پیش کرنے کی بجائے صرف کہانی پیش کر سکے۔ ہمارے خالق کی عظمت کا دار و مدار بھی اسی پر ہے کہ اس کے یہاں ندیوں میں

صرف ندیاں، کھیتوں میں صرف کھیت اور پہاڑوں میں صرف پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اور وہ خود آپ اپنی کُل کائنات سے یکسر غائب ہے۔ ہماری زندگی میں ہر صورتِ حال ایک الگ نوعیت رکھتی ہے اور ہماری ہر واردات عین مقامی تقاضوں سے جنم لے کر پہلی اور آخری بار ناگزیر حالات میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ میرے نزدیک کسی کہانی میں بھی آباد کاری کا یہی معیار اسے فنونِ لطیفہ کے زمرے میں لا پاتا ہے۔

مجھے اپنے افسانچے لکھنا بھی بڑا خوش آفریں معلوم ہوتا ہے، مانو میرے ذہن کی شاخوں پر رنگ برنگے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جھول رہے ہوں ——— ہاں، مجھے معلوم ہے کہ بعض نقادوں کو ابھی افسانچے کی صنف قبول کرنے میں تامل ہے مگر اس صنف کا پُرگو اختصار ——— مجھے یقین ہے ——— دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی اپنا لوہا منوا کر رہے گا۔ ہماری زندگی بھی اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں بٹ کر ہماری سمجھ میں زیادہ آنے لگتی ہے، اس لحاظ سے ممکن ہے کہ کوئی بالکل مختصر اور متناسب کہانی شروع ہونے سے پہلے ہی کہیں سے شروع ہو رہی ہو اور اِسے پڑھنے والا اس کے خاتمے کے بعد بھی آپ ہی آپ اسے بڑھاتا چلا جائے۔ افسانچے کا تناسب چُست اور صحیح ہو تو قاری کو اس سے آزادانہ ایک طویل کہانی بُننے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے، جس سے اس کی تخلیقی شرکت کا ایک پورا باب کُھل جاتا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔

میرا جسم کھنڈر ہونے میں آ رہا ہے مگر میرے ذہن میں کتھاؤں کا ایک پورا نگر بسا ہوا ہے میری بڑی خواہش ہے کہ میں یہ پورے کا پورا نگر اپنے ذہن سے خارج میں آباد کر جاؤں اور مستقبل کے لوگوں کو روشنیوں کا یہ شہر بڑا مانوس لگے اور وہ یہاں بے جھجک بستے رہیں اور بس بس کر اس کی وسعتوں کی تدبیر کرتے رہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میری کتھا یاترا سدا جاری رہے گی۔ اور نت نئی کہانیوں کی بدولت انسان کی بقا کا سامان بنا رہے گا۔

(اردو سروس سے)

تسنیم صدیقی

آج پھر دل اُداس ہے آجا
تیرا غم میرے پاس ہے آجا
دیکھ لے آ کے مری آنکھوں میں
کیسی شدت کی پیاس ہے آجا
دھندلی دھندلی پڑی ہیں تصویریں
آئینہ بدحواس ہے آجا
تو جسے ڈھونڈتا ہے دیوانہ
تیرا دل میرے پاس ہے آجا
کیسے بھلائے گی عنبر کی خوشبو
ذہن میں تیری باس ہے آجا
کاش تسنیم سے وہ کہتا
زندگی اب اداس ہے آجا

(الٰہ آباد سے نشر)

جمہوری فکر کی بنیادیں ٹیگور کی شاعری میں

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

جہاں دل خوف سے خالی ہے، جہاں سر اونچا ہے
گیان جہاں آزاد ہے، جہاں گھر کی چہار دیواری نے
دن رات اپنے آنگن میں دھرتی کو چھوٹا بنا کے نہیں رکھا ہے
جہاں تقریر سرچشمۂ دل سے
اُبل پڑتی ہے، جہاں بے روک بہنے والے چشمے کی طرح
دیس دیس میں، سمت سمت میں عمل کا دھارا دوڑتا ہے
اے مرے پتا، اپنے ہاتھ سے بے دردوار کر کے
بھارت کو اسی جنت میں بیدار کر دو۔

اپنے زمان و مکان کی خوشحالی کے لیے یہ دعا مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے کی تھی۔ ٹیگور کا شمار صوفیوں اور سنتوں میں کرنے والے اپنے دعوے کی کئی ضمانتیں اور شہادتیں ڈھونڈ لاتے ہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ شعری اظہار اور صوفیوں سنتوں کی دعاؤں کی حدیں کئی بار آپس میں آملتی ہیں۔ ایک مشہور مفکر کا قول ہے کہ "شعر کا حلقۂ عمل صوفیانہ عقائد کے حلقۂ عمل ہی کی ایک مسخ شدہ شکل و صورت ہے۔" اس خیال کی تائید ایک مذہبی رہنما نے یوں کی کہ شاعری "پرستش کا ایک الہامی تجربہ ہے۔ اس دعا میں دل کی اتھاہ گہرائیوں کی اس طاقت کا استعمال کیا جاتا ہے جو اس کا بہترین جوہر ہے۔" ٹیگور کی شاعری پر نگاہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان کا فلسفۂ حیات ایقان و عمل کے پیغام سے مملو ہے۔ ان کے افکار کی بنیادیں ایک طرف مختلف زبانوں کے کلاسیکی ادب پاروں تک پہنچتی ہے تو دوسری جانب فلسفے اور مذہب سے جا ملتی ہیں۔ شاعر کا مذہب انسانیت، اس کا کلام انسانی اور اس کا پیغام آفاقی ہوتا ہے۔ وہ حیات کو لمحوں کی یکجائی کا روپ نہیں مانتا، کائنات اس کے پیش نظر دائروں اور مربعوں میں بٹی ہوئی اکائیوں کا نام نہیں ہے۔ اس کے تخیل میں نسلوں اور قوموں، خطوں اور سرحدوں کی تمام تر تعریفیں یکسر معدوم ہو جاتی ہیں۔ حیات اور کائنات کے رشتے اور اس کی مختلف جہتیں اس کی فکر کا مرکز ہوتی ہیں۔ ٹیگور کی شاعری کے احاطے میں یہ تمام باتیں بروئے کار آتی ہیں۔ وہ اپنی زمین کے شاعر تھے اور اس خیال کے حامی تھے کہ انسانوں کا رشتہ اپنی زمین سے ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسا پیڑوں اور پودوں کا رشتہ اپنی زمین سے ہوتا ہے۔ ابتدائی زمانوں سے ہی وہ بھانت بھانت کے حالات سے دوچار ہونے میں لطف لینے لگے۔ پدما ندی کے ایک بجرے میں انھوں نے مہینوں قیام کیا۔ شہروں اور دیہاتوں کے مختلف روپ دیکھے۔ فطرت سے قربت حاصل ہوئی اور رفتہ رفتہ ان سے ترسیل کی ایک سطح قائم ہو گئی۔ ایک جانب فطرت کا لافانی حسن تھا اور دوسری جانب زمانے کے نت نئے بدلتے ہوئے حالات تھے۔ ان کے شعری تجربات و محرکات کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ تاریخ کے جلو میں واقعات کے سلسلے تھے جو ان کے تجربات و محرکات کے سلسلے بنتے گئے ——— غدر کا اندوہناک واقعہ، کانگریس کا قیام، بنگال کی تقسیم، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، خلافت کی تحریک، سوراج کا نعرہ، گاندھی جی کی پُرامن تحریکِ آزادی اور ملک کی تقسیم ——— یہ ساری اکائیاں زمانے کے مزاج کی تشکیل کر رہی تھیں۔ بنگال کے نشاۃ ثانیہ نے مشرق کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ادب اور حسن کارانہ تحریکات کا فروغ ہوا۔ راجہ رام موہن رائے اور رابندر ناتھ ٹیگور کے والد نے اہم فرائض انجام دیئے تورو دت نے انگریزی میں ایسی نظمیں لکھیں جن کی روح قدیم ہندوستانی تھی۔ ادب زندگی کا آئینہ دار اور قوم کا قیمتی سرمایہ بننے لگا۔ جمہوریہ کے جذبات کی ترجمانی ہونے لگی۔ اس روایت سے متاثر ہو کر ٹیگور نے اپنی زمین کی نیرنگی کے گیت گائے زمین سے اپنا رشتہ اور بھی مضبوط کر لیا اور زمانے کی مسیحائی کرنے لگے۔ انھوں نے ایک بار کہا کہ "میری مکتی دنیا کو ترک کر دینے میں نہیں ہوگی۔ میں انسانوں کے درمیان رہنا چاہتا ہوں۔" انسان اور زمین سے ٹیگور کا یہ رشتہ دن بہ دن مضبوط ہوتا گیا۔ وہ قوم کی داخلی زندگی کی تابناکی کے خواب دیکھنے لگے۔ ان کا قومی شعور دن بہ دن بیدار ہونے لگا۔ ان کی نگاہ ظاہر پر بھی تھی اور اس سے پرے بھی۔ حقائق کے روپ ایک مابعد الطبیعاتی سطح پر بھی ان کے سامنے ابھرنے لگے۔ گو شاعری فلسفہ طرازی

نہیں لیکن ہر سنجیدہ شاعر ایک غیر شعوری طور اپنے فلسفۂ حیات کا اظہار کرتا ہے۔ ٹیگور نے بھی اپنی شاعری و نثری تحریروں میں اپنے موقف کا اظہار بار بار کیا ہے۔ ایک بار انھوں نے کہا "ہماری جنگ روحانی جنگ ہے۔ یہ انسان کے لیے ہے۔ ہمیں انسان کو ان بندشوں سے آزاد کرنا ہے جو اس نے اپنے اطراف بُن لیے ہیں۔" زندگی کی مادی ضروریات کا پورا کرنا ہی انسان کا مقصد نہیں۔ مادی ترقی سے انسانی ترقی کا رشتہ جوڑنا ان کے لیے لایعنی تھا۔ ان کے لیے ترقی کا تصور روحانی بالیدگی کا تصور تھا۔ وہ اپنی زمین کی تہذیبی زندگی کو تابناک دیکھنا چاہتے تھے۔ "دعائے ہند" میں انھوں نے اپنے ایقان کا اظہار صاف لفظوں میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا:

تو نے ہمیں زندہ رہنے کے لیے پیدا کیا
ہم اس عزت کو پوری قوت سے برقرار رکھیں گے
کیونکہ ہماری خوشنودی اور شان اسی میں ہے کہ ہم زندہ رہیں
اس لیے تیرے نام پر ہم اس قوت کا مقابلہ کریں گے
جو ہماری روح پر قبضہ کرے۔

ٹیگور کے فلسفۂ حیات میں زندگی کی اہمیت کا اظہار بار بار ہوتا ہے۔ زندگی اعلیٰ مقاصد کے لیے ہے صرف زندہ رہنے اور مرجانے کے لیے نہیں ہے۔ موت کو انسانی دائرۂ عمل سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ "گیتا نجلی" میں انھوں نے اپنے مقصد کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"زندگی سزا نہیں بلکہ ایک برکت اور عطیہ ہے۔ زندگی میں دیکھنے اور سننے کی قابل قدر اور مسرت بخش صلاحیتیں موجود ہیں۔ زندگی کے معنی ہیں کہ ہم اپنے وجود کی طاقتوں کے استعمال سے سچائی، نیکی اور خوبصورتی کو ہر طرف پھیلائیں۔ ہمارا جینا حقیقت کے اظہار کے لیے ہو۔ کسی شخصی مقصد کے لیے نہیں۔"

ٹیگور کے نزدیک زندگی ایک جاودانی قوت کا نام ہے۔ وہ بار بار اپنی اس فکر کا اظہار کرتے ہیں اور انسانوں کو عمل کا پیغام دیتے ہیں۔ "زندگی نہ صرف غیر فانی ہے بلکہ سدا نئی نئی صورتوں اور مسرتوں میں ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اس کی کوئی حد کبھی اور کہیں متعین نہیں کی جاسکتی کیونکہ اس کا سرچشمہ غیر محدود ہے۔" اس خیال کی جڑیں فلسفہ اور مذہب تک جا پہنچتی ہیں۔ لیکن ٹیگور کا اصل کمال یہ تھا کہ وہ حقیقت کو فلسفیانہ تہہ داریوں سے پاک کرکے ایک صاف شفاف اور عام تجربے کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ ان کا خدا آسمانوں میں نہیں ہے بلکہ ہمارے آس پاس ہے۔ وہ کہتے ہیں:

خدا وہاں ہے جہاں کسان سنگلاخ پتھریلی زمین کھود رہا ہے
اور جہاں سڑک بنانے والا پتھروں کو توڑ رہا ہے
وہ دھوپ اور بارش میں تیرے ساتھ ہے اور اس کے کپڑے
گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہیں

ٹیگور کے ہاں ترک دنیا سے مقصد حیات پورا نہیں ہوتا۔ وہ زندگی میں ڈوب جانا چاہتے ہیں۔ سارے مظاہر ہمہ وقت ان کے سامنے ہیں۔ انہیں میں سب دکھ درد چھپے ہیں اور انہیں میں ان کے حل بھی موجود ہیں۔ زندگی کے گوناگوں مظاہر میں جینے کا سامان کرنا انسان کا فرض ہے۔ خدا اس کے سامنے موجود ہے۔ منزل تک پہنچنے کا ان کا راستہ بہت سیدھا ہے:

یہ رام نام جپنا اور تسبیح پھیرنا چھوڑ
خانقاہ کے تاریک اور سنسان گوشے میں تو کس کی پرستش کر رہا ہے؟
آنکھیں کھول اور دیکھ — تیرا خدا تیرے سامنے موجود ہے

ٹیگور اپنے گرد و پیش کے تجربات اور ان سے ماورا مابعد الطبیعاتی حقائق کے درمیان مستقل سفر کرتے ہیں۔ ان کی نگاہیں وقت کے تینوں کناروں پر ہیں۔ لمحۂ حاضر ماضی اور مستقبل سے منسلک ہے۔ زمانوں سے آگے وہ سارے مناظر ایک ساتھ منسلک دیکھتے ہیں — پنجاب، سندھ، گجرات، مراٹھا — دراوڑ، اتکل، ونگا۔ وہ بھارت بھاگیہ ودھاتا کے روپ میں سارے جن گن من کا استقبال کرتے ہیں۔ ٹیگور اپنی زمین کے موسموں کے قدردان تھے اور اس موسم کے خواب دیکھتے تھے جہاں دھرتی کی سوندھی خوشبو اور مدھر سنگیت انسانی دلوں کو مسرت سے بھر دیتا ہے۔ "آزاد ملک" میں انھوں نے جو سپنا دیکھا تھا وہ ہر شہری کا سپنا تھا۔ انکی زمین میں وہ زمین تھی:

جہاں دل کو خوف نہیں ہے اور سر اُونچا ہے
جہاں علم مفت دیا جاتا ہے
جہاں دنیا کو تنگ خانگی دیواروں کے ذریعے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا گیا
جہاں سچائی کی گہرائی سے الفاظ نکلتے ہیں
جہاں انتھک کوششیں کمال کی طرف اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں
جہاں عقل کی صاف ندی اپنی مردہ عادت کی ریت سے بھیانک صحرا میں
اپنا راستہ نہیں کھو بیٹھتی
جہاں تو ذہن کو دائمی وسعت پذیر خیال و عمل کے لیے لیے جا رہا ہے!
اے پیدا کرنے والے — آزادی کی اس جنت میں میرا ملک جاگ اٹھے!

(اُردو سروس سے نشر)

گاندھی جی نے کہا

تحریر: محمود ہاشمی

اعتقاد اور اقدار کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا:

"میں یہ نہیں کہتا کہ میرے اندر کوئی خاص خدائی طاقت ہے۔ نہ ہی میں پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ میں تو سچائی کا ایک ادنیٰ کھوجی ہوں۔ اور اسی کی تلاش میں جی جان سے لگا ہوں۔ میرے نزدیک خدا کو روبرو دیکھنے کے لیے کوئی بھی قربانی زیادہ نہیں ہے۔ میرے تمام کام، خواہ وہ سیاسی ہوں یا سماجی، اخلاقی ہوں یا خدمتِ انسانی سے متعلق۔ ان کا مقصد یہی ہے — اور چونکہ میں جانتا ہوں کہ خدا اونچے اور طاقتور طبقے کے افراد کی بجائے زیادہ تر اپنی کمترین مخلوقات میں ملتا ہے۔ اس لیے میں ان ہی لوگوں کے درجے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ کام میں ان لوگوں کی خدمت کے ذریعہ ہی سرانجام دے سکتا ہوں۔ اسی لیے میں دبے ہوئے طبقے کے افراد کی خدمت کرنے کی زبردست خواہش رکھتا ہوں۔ لیکن یہ خدمت چونکہ میں سیاست میں قدم رکھے بغیر انجام نہیں دے سکتا، اس لیے میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں۔ اس طرح میں کوئی آقا نہیں ہوں، بلکہ ہندوستان اور اس کے توسط سے بنی نوع انسان کا ایک ناچیز خادم ہوں۔"

اپنی زندگی کے مقصد اور اپنی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا تھا:

"میری زندگی ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے، اور میری تمام سرگرمیاں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اور ان تمام سرگرمیوں کا منبع بنی نوع انسان کے لیے میری ناقابل تسکین محبت ہے۔

میری تعلیمات، جذبات پر مبنی نہیں، اور نہ ہی یہ ناقابل عمل ہیں۔ جن باتوں کی میں تعلیم دے رہا ہوں وہ بہت پرانی ہیں۔ میں جن باتوں کا پرچار کر رہا ہوں، اس پر خود بھی عمل کرنے کی سوچتا ہوں۔ میرا محض اتنا دعویٰ ہے کہ جس بات پر میں عمل کر سکتا ہوں۔ اس پر دوسرے لوگ بھی عمل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح ایک عام فانی انسان ہوں۔ اور مجھ میں بھی عام لوگوں کی طرح کمزوریاں موجود ہیں۔ میرا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو چیز میرے لیے ممکن ہے، وہ ایک سچے انسان کے لیے بہر حال ممکن ہے۔ یہ بات کہنے کے لیے میرے پاس معقول دلائل موجود ہیں۔ سچائی کی تلاش کے لیے استعمال کیے جانے والے اوزار جتنے مختلف ہیں اتنے ہی سادہ بھی ہیں۔ ایک متکبر شخص کی نظروں میں، ان اوزاروں سے کام لینا ناممکن ہے کیوں کہ ایک معصوم بچے کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے۔ سچائی کی تلاش کرنے والے شخص کو، اپنے آپ کو، خاک سے بھی زیادہ حقیر سمجھنا چاہیے۔ دنیا خاک کو پاؤں تلے روندتی ہے، لیکن سچائی کے متلاشی کو اپنے آپ کو خاک سے کمتر سمجھنا چاہیے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم سچائی کی جھلک نہیں دیکھ سکتے۔"

یہ ہے گاندھی جی کی شخصیت کا وہ نظریاتی اور عملی پہلو جس کی بنیاد پر انھوں نے نوع انسانی کو پُرامن مستقبل کے خوابوں سے ہم آہنگ کیا! (اُردو سروس سے نشر)

فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار

قوم دشمن عناصر

محمد مجیب اللہ

فسادات کے ذمہ دار قوم دشمن عناصر ہوتے ہیں، اس پر غور کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ قوم کسے کہتے ہیں۔ دنیا مختلف خطوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کچھ خطے ایسے ہیں کہ وہاں کی آب و ہوا ایک ہی جیسی ہے۔ موسمی حالات کے اعتبار سے اگر سردی ہو تو اس پورے خطے میں سردی ہوتی ہے۔ گرمی ہو تو پورا خطہ گرم رہتا ہے، بارش ہو تو تقریباً پورے علاقہ میں بارش کا موسم رہتا ہے۔ اگر قحط پڑے تو اس خطے کے رہنے والے سب کے سب متاثر ہوتے ہیں۔ اگر طوفان یا سیلاب آئے تو اس خطۂ ارض میں رہنے بسنے والے سبھی لوگوں کی جان و مال تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ وبا پھیلے تو اس وسیع و عریض خطے کے رہنے والے تمام لوگوں کو اپنی زد میں لے لیتی ہے کسی کو نہیں چھوڑتی۔ اُس سرزمین میں موسم تقریباً یکساں ہوتا ہے اس لیے قدرتی طور پر پیداوار بھی ایک جیسی ہوتی ہے۔ جب قدرتی پیداوار یکساں ہیں تو غذائیں بھی وہی ہوں گی۔ پیشوں کے اختیار کرنے کا تعلق اس خطے کے نباتاتی اور معدنی وسائل نیز صنعتی ترقی سے ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کے پیشے بھی مشترک ہوتے ہیں۔ تہذیب و رہن سہن کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح جغرافیائی بنیادوں پر مشترک قدروں کی وجہ سے ایک قوم وجود میں آتی ہے۔ اسی جغرافیائی وحدت کی بنا پر عرب کے رہنے والے عربی، یونان کے رہنے والے یونانی، ایران کے لوگ ایرانی، اور ماضی کے ہندوستان کے باشندے ہندوستانی قوم ہیں۔

لیکن جیسے جیسے دنیا ترقی کرتی گئی، ویسے ویسے قوم کے تصور میں بھی تبدیلی آگئی۔ اب قوم ان باشندوں پر مشتمل ہوتی ہے جو جغرافیائی اشتراک کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص سیاسی حدود میں رہتی بستی ہو۔ قوم کے اس جدید تصور کی رو سے اب دنیا کے نقشے پر ہر ملک ایک قوم کی صورت رکھتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی، پاکستانی، افغانی اور ایرانی سب ایک الگ الگ قوم ہیں۔

دنیا کی ہر قوم چاہے وہ جغرافیائی بنیادوں پر تشکیل پائے یا سیاسی بنیادوں پر، وہ دراصل ایک جسم ہوتی ہے۔ اور جس طرح جسم کا وجود مختلف اعضاء کے درمیان اتحاد سے قائم ہے اسی طرح کسی قوم کا وجود بھی اتحاد ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ اگر جسم کے اعضاء میں سے ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے یا ایک پیر، دوسرے پیر کے مخالف ہو جائے دل، دماغ کو یا دماغ دل کو تباہ کرنے پر تل جائے تو جسم کا وجود بیکار ہی کر رہ جائے گا۔ کسی جسم اور اس کے اعضاء کی بہترین کارکردگی کے لیے دل اہم ترین رول ادا کرتا ہے کیونکہ دل کے ہی ذریعہ صاف ستھرا خون دیگر اعضاء میں حرکت کرتا ہے۔ اور ہر مذہب کسی قوم میں دل کا کردار ہی ادا کرتا ہے۔ مذہب ہی ہے جو کسی قوم کو متحد اور صحت مند رکھتا ہے۔

کرۂ ارض پر جتنے مذاہب ہیں وہ انسان کے اندر سے عقیدے اور اخلاق کے بگاڑ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہی آئے ہیں اور اسی کی تعلیم دیتے ہیں۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

عیسیٰ علیہ السلام آئے، انجیل مقدس کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تو بگڑی ہوئی انسانیت کو یہی تعلیم دی کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو تم دوسرا رخسار پیش کر دو۔ انسانیت کی خدمت اور ترقی کو ہی اپنا شعار بنا لو، ظلم و زیادتی سے باز آؤ اور اسی فتنہ و فساد کے خاتمے کے لیے انھوں نے سولی پر چڑھنا گوارہ کر لیا لیکن محبت کے پیغام کو عام کیا۔

مہاتما گوتم بدھ، بادشاہی دور کے عیش و عشرت، خود غرضی اور ظلم و زیادتی سے بھرپور ماحول ہی سے تنگ آکر شاہی ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر سچائی کی تلاش میں نکل گئے، نروان حاصل کیا اور لوگوں کو "اشٹ مارگ" یعنی انسانیت کی نجات کے لیے آٹھ اصولوں پر مبنی تعلیمات دیں اور بتلایا کہ جانوروں پر دیا کرو، ہنسا مت کرو، سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو، ذات پات کی تفریق مت کرو، کسی کی بے عزتی مت کرو، بغض و کینہ نہ رکھو۔ ہمیشہ سچ بولو۔ شراب مت پیو۔ نیک سلوک کرو۔ انھوں نے بتلایا کہ انسان کی زندگی میں دکھ و پریشانیاں حرص و ہوس کی وجہ سے ہیں، اسے چھوڑ دو اور صداقت پر چلو۔

جب دنیا کشت و خون اور غارت گری کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، مہاویر جی، جین مت کا عَلم لے کر اٹھے۔ غصہ، حسد، لالچ اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی تعلیم دی۔ اہنسا کو لوگوں کی رگ رگ میں پیوست کر دیا اور اہنسا کے تصور کو اتنا بلند کیا کہ انسان تو انسان کیڑے مکوڑوں کی ہتیا کو بھی سب سے بڑا پاپ قرار دیا۔

ہندو دھرم کی تعلیمات انسانیت سے پکار پکار کر کہتی ہے کہ ستیم شیوم سندرم کو اپنائے بغیر انسان کی نجات نہیں۔ رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید سب کے سب دنیا کو ڈر و خوف اور رنج و غم سے چھٹکارا دلانے کا ہی راستہ بتلاتے ہیں۔ گیتا اور رامائن، مذہب، پیشے اور علاقائی حدود سے بالاتر منوُ یعنی انسان کے آدرش کا پرچم لہراتے ہیں۔

سکھ مذہب تو ظلم، لالچ، بغض و حسد کی دلدل میں پھنسے ہوئے دکھی انسانوں کو سکھی بنانے کے لیے ہی وجود میں آیا۔ "خالصہ" کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی کو بغض و حسد، کینہ و کدورت، حرص و ہوس سے پاک کر کے اللہ کی محبت اور سچائی کے جذبے سے سرشار کر دے۔ "ست سری اکال" کا سلوگن ہی یہ ہے کہ حق و صداقت کو زوال نہیں۔

مذہب اسلام نے ساری کائنات کو کھول کھول کر بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ زمین پر فساد کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ لعنت بھیجتا ہے اور سخت عذاب سے ڈراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر اسلام کو اخلاق کا بلند ترین نمونہ فرماتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں کہ دشمن سے محبت کی جائے۔ گالیاں دینے والوں پر پھول برسائے جائیں۔ بددعا کرنے والے کے لیے دعا کی جائے۔ لوٹنے اور برباد کرنے والے، ظلم و زیادتی کرنے والے کے ساتھ حُسن سلوک کیا جائے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مومن وہ ہے جس کے ہاتھ و زبان سے کسی کو ایذا نہ پہنچے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ بہادری یہ نہیں ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت نہ ہو اور معاف کر دیا جائے۔ بلکہ بہادری یہ ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت ہو لیکن اس کے باوجود معاف کر دیا جائے اور بدلہ لینے کی بجائے اس پر احسان کیا جائے۔

یہ ہیں وہ مذہبی تعلیمات جو کسی قوم کو صاف و شفاف خون عطا کرتی ہیں اور اسے صحت مند، تندرست اور طاقتور بناتی ہیں۔ اسی لیے حقیقت میں جو شخص جتنا کٹر مذہبی ہوگا وہ اتنا ہی بہترین قوم پرست بھی بن جائے گا۔

مذہب کے ساتھ ساتھ مختلف پیشے ہیں، کئی صنعتیں ہیں، الگ الگ زبانیں ہیں۔ علیحدہ علیحدہ علاقے ہیں۔ اگر ان پر غور کیا جائے تو حقیقت میں یہ سب کے سب کسی قوم کے اعضاء ہیں۔ اور اگر جسم کا کوئی ایک عضو جیسے ایک انگلی زخمی ہو تو دوسری انگلی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر ایک معمولی ناخن بھی کٹ جائے یا ٹوٹ جائے تو سارا جسم بخار آلود ہو جاتا ہے۔ اگر کسی عضو کو جسم سے کاٹ دیا جائے تو صرف وہ عضو ہی معذور نہیں ہوتا بلکہ سارے کے سارے انسانی وجود ہی کو اپاہج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی قوم کے کسی فرقے کو تباہ و برباد کر دیا جائے خاک و خون میں لپیٹ دیا جائے تو صرف وہ فرقہ ہی کمزور ہوگا۔ ہرگز نہیں بلکہ ساری کی ساری قوم لنگڑی لولی ہو جائے گی۔

غور کیجیے کہ اگر سیلاب آتا ہے، وبا پھیلتی ہے، قحط پڑتا ہے، آتش فشاں پھٹتا ہے، طوفان بپا ہوتا ہے، آگ پھیلتی ہے۔ جنگ چھڑتی ہے، تو کیا وہ کسی خاص پیشے، فرقے یا مذہب والوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ نہیں نہیں! وہ تو ساری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

تو پھر آخر یہ فرقہ وارانہ فسادات کیوں پھوٹ پڑتے ہیں!
کیا آج تک زبان کے نام پر فساد نے کسی زبان کو، علاقے کے نام پر فساد نے کسی علاقے کو، پیشے کے نام پر فساد نے کسی پیشے کو یا مذہب کے نام پر فساد نے کسی مذہب کو فائدہ پہنچایا ہے؟ نہیں پہنچایا۔ بلکہ الٹا اس زبان، پیشے، علاقے اور مذہب کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ان کے درمیان نفرت اور دشمنی میں شدت ہی پیدا ہوئی ہے۔ ملک و قوم کے بہترین افراد ضائع ہوئے، معیشت برباد ہوگئی، ترقی کی راہیں رُک گئیں۔ اور ملک و قوم پھر گئے۔ تو پھر ذرا سوچیے کہ کیا مختلف پیشے، فرقے، علاقے اور مذاہب کے ماننے والے فسادات کروا کے اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار سکتے ہیں۔ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار تو دراصل وہ لوگ ہیں جو چور، ڈاکو، ٹھگ اور غنڈے ہیں۔ جنھیں صرف اپنا ذاتی مفاد عزیز ہے۔ فسادات کے ذمہ دار کچھ ایسے خود غرض، دولت کے پجاری سرمایہ دار بھی ہیں جو اپنی تجوریاں بھرنے کی خاطر چھوٹے موٹے بیوپاریوں کی جان و مال سے کھیلتے ہیں۔ ان میں ایسے افراد، جماعتیں اور تنظیمیں بھی ہیں جو کئی مقامات پر اپنے سیاسی مفادات کے حصول کے لیے ان پڑھ اور سیدھے سادے لوگوں کے جذبات کو مذہب، علاقے، زبان و پیشے کے نام پر ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور ان سیدھے سادے معصوموں کی چتا پر اپنا سیاسی محل تعمیر کرتے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو حکومتِ وقت سے بغض و عناد رکھتے ہیں۔ اس کو ہٹانے کے لیے، پریشان کرنے کے لیے یا صرف اپنی زندگی کو عیش و عشرت سے گزارنے کی خاطر بے حساب دولت جمع کرنے کی ہوس میں دوسرے ملکوں اور قوموں کے آلہ کار بن کر اپنے ملک و قوم کے وجود کو تختۂ دار پر چڑھا دینے کا سودا کرتے ہیں۔

یہ مٹھی بھر وحشی درندے، کسی مذہب کے ماننے والے ہیں نہ انھیں کسی زبان سے لگاؤ ہے، نہ ان کو کسی علاقے سے جذباتی تعلق ہے نہ تو کسی پیشے سے محبت۔ یہ تو وہ عناصر ہیں جو نہ صرف کسی پیشے، علاقے، اور زبان و مذہب کے دشمن ہیں بلکہ ساری قوم کے دشمن ہیں صرف اور صرف یہی لوگ فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار ہیں۔

ہر مذہب ظلم و زیادتی سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ظالم کا ساتھ دینے اور اس کے ظلم کو چھپانے کو بھی اتنا ہی گناہ قرار دیتا ہے جتنا کہ ظلم و زیادتی کرنا۔ ہر مذہب ظالم کا مقابلہ کرنے اور اسے کیفر کردار تک پہنچانے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اسی لیے تمام مذاہب کے درمیان اتحاد، محبت و آشتی کی فضا پیدا کر کے ان قوم دشمن وحشیوں کا صفایا کر دینا ہی ہمارے سچے مذہبی ہونے کا ثبوت ہوگا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ؎

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(اورنگ آباد سے نشر)

۱۶ر جنوری ۱۹۸۷ء

سائنس کی دنیا

خلیل اکمل

سائنس ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکی ہے۔ اس کے ذریعہ کائنات کو سمجھنے سمجھنے اور انسان کو اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سائنس نہ صرف کسی چیز کو بنانے یا ترقی دینے میں مدد کرتی ہے بلکہ یہ نت نئے تعمیری خیالات سے آراستہ کرتی ہے سائنس نے ہمارے لیے معلومات کے نئے اُفق پیدا کیے۔ اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی راہیں ہموار کیں۔ وہ سائنس ہی ہے جس سے انسان کے مشاہدہ میں وسعت اور استدلال میں معقولیت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے ہم کسی بھی مسئلہ کے خوشگوار نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ ہماری روزمرہ کی مصروفیات اسی سے کنٹرول ہوتی ہیں اور تکمیل پاتی ہیں۔ سائنس ہمارے قدیم روایتی رسومات توہمات اور عقیدوں کی نفی کرتے ہوئے جدیدیت کے اصولوں کو اپنانے کی تعلیم دیتی ہے تاکہ ہم کو زندگی میں سکون اور چین میسر ہو۔ سائنس قوموں کی تہذیب و تمدن کو سنوارتی ہے۔ اسی لیے سائنس کو دنیا کے تمام علوم میں ایک کلیدی مقام حاصل ہے۔ سائنس کی ترقی کے کوئی حدود مقرر نہیں کیے جاسکتے۔ کیونکہ آئے دن سائنس کی دنیا میں نئے نئے ایجادات اور دریافتوں کا اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ جن کی مثالیں ہم طب، انجنیئرنگ، زراعت اور صنعت سے دے سکتے ہیں۔

طبی میدان میں میگنیٹو سرجری یعنی مقناطیسی جراحی کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ روس کی اکیڈمی برائے سائنس کے ڈاکٹروں، انجنیئروں اور ماہرین علم کیمیات و طبعیات کا کارنامہ ہے۔ اس جراحی میں آپریشن کے بعد جلد کو ٹانکے نہیں دیئے جاتے بلکہ آپریشن کی نوعیت کے لحاظ سے مناسب شکل کے دو مقناطیس مریض کے جسم سے پیوست کیے جاتے ہیں جو اپنی قوت کشش ایک دوسرے پر ایک مطلوبہ وقت کے لیے برقرار رکھتے ہیں۔ یہ جراحی ایسے بچوں کے لیے مفید ہے جن کے سینہ کی ہڈیاں دبی ہوئی ہوں۔ عموماً ایسے مریض کو مسلسل چند آپریشن کے بعد نارمل حالت میں آنے کے لیے کئی ہفتہ بستر پر لیٹے رہنا ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک ۵ سالہ روسی بچے کا آپریشن کیا گیا جس کو صرف چند دنوں میں چلنے پھرنے کے قابل بنا دیا گیا۔ روس میں اب تک اس قسم کے کوئی ۳ سو آپریشن کیے جاچکے ہیں۔ امید ہے کہ اس جراحی کو آنتوں کے آپریشن کے بعد بغیر ٹانکوں کے جوڑنے کے لیے استعمال کیا جا سکے گا۔

لندن کے ایک سرکردہ سرجن ڈاکٹر جان نے اپنی تحقیق سے گردے کی پتھری نکالنے کا ایسا آلہ تیار کیا ہے جس سے پتھری صرف ۲۰ تا ۴۰ منٹ میں نکالی جا سکتی ہے۔ نہ تو کسی چیر پھاڑ کی ضرورت اور نہ ہی خون کے ضائع ہونے سے ہلاکت کا اندیشہ۔ اس طریقۂ علاج میں مریض کو ایک آرام دہ کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے جو کہ پانی میں رکھی جاتی ہے جس کا درجۂ حرارت انسانی خون کی تپش کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے بعد مریض کو بے ہوش کیا جاتا ہے۔ پھر پانی میں سے برقیاتی مقناطیسی لہروں کو گزارتے ہیں جس سے پتھری ان لہروں کے زیر اثر ٹوٹ کر پیشاب کے ذریعے نکل آتی ہے۔ اس طرح اب تک کوئی ۴ ہزار مریضوں کا علاج کیا جا چکا ہے۔ جو صرف دو دن میں معمول کے مطابق کام کرنے کے قابل ہوگئے۔ ڈاکٹر جان کا کہنا ہے کہ اگر وہ ایک اور تجربہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کا علاج بھی بغیر آپریشن کے کر سکیں گے۔

گردے کی پتھری نکالنے کا ایک اور آلہ مغربی جرمنی میں ایجاد کیا گیا ہے جس کا نام 'لیتھو اسٹار' ہے۔ جو ڈاکٹر جان کے اصول پر کام کرتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ گردے میں پتھری کا مقام اور حالت معلوم کرنے کے لیے کمپیوٹر کی مدد سے چلنے والی ایکسرے مشین سے کام لیا جاتا ہے۔ اور اس آلہ کے استعمال کے وقت مریض کو نہ تو بے ہوش کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کو پانی میں بٹھانے کی ضرورت ہے۔ صرف متاثرہ حصہ

کو بے حس کر کے اس پر آلہ کا گول لوڈا اسپیکر نما حصہ رکھ دیا جاتا ہے جس سے برقیاتی لہریں نکل کر پتھری کو توڑ دیتی ہیں۔ یہ ڈاکٹر جان کے بنائے ہوئے آلہ کے مقابلہ میں سستا ہے جس کو چھوٹے سے چھوٹے دواخانہ میں مہیا کیا جا سکتا ہے۔

پٹرول کی آئے دن بڑھتی ہوئی قیمتوں کے پیش نظر ہر ملک میں اس کا موزوں متبادل دریافت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یوں تو یہ کام امریکہ میں بیسویں صدی کے اوائل اور پھر دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی میں ہوا، لیکن پٹرول کی افراط کی وجہ سے اس میں پیش رفت نہ ہو سکی۔ ۱۹۱۱ء میں "رڈولف ڈیزل" نامی امریکی محقق نے اپنے تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نباتی اور خوردنی تیلوں کو بطور ڈیزل موٹر گاڑیوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سرسوں کے تیل اور سورج مکھی کے بیجوں کے تیل پر امریکہ اور جنوبی افریقہ میں کام ہوا اور پھر سویڈن اور مغربی جرمنی میں کھجور کے بیجوں کے تیل اور سویابین کے تیل پر تحقیق مکمل ہو چکی ہے۔ تحقیقاتی ٹیم نے اس بات کی سفارش کی ہے کہ سرسوں کے تیل اور ڈیزل آئل کا اہم وزن آمیزہ بطور ایندھن استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ اس آمیزہ سے انجن کی قوت میں خاصا اضافہ ہوتا ہے اور فضائی آلودگی کا بھی کوئی خدشہ نہیں رہتا۔ لیکن آسٹریلیا کے سائنسدانوں نے اپنی تحقیق سے اس امر کا انکشاف کیا ہے کہ صرف سرسوں کے تیل کو ہی ڈیزل آئل کے بجائے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے انجن کی کارکردگی میں ۳ فیصد کی کمی اور اس کی قوت میں ۱۲ فیصد کا انحطاط واقع ہوتا ہے۔

تحقیقات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قدرتی گیس کو پٹرول کے بجائے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس کو گوبر سے بھی تیار کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس گیس سے آج کوئی ۴ لاکھ موٹر کاریں تمام دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ جن میں سے صرف اٹلی میں ۲½ لاکھ موٹر کاریں موجود ہیں۔ اس گیس کے استعمال سے بہت ہی امید افزا نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ایک تو انجن کی کارکردگی میں اضافہ۔ دوسرا روزمرہ کے صرفہ میں آدھی بچت اور پھر فضائی آلودگی کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ اور صرف ۵ ہزار روپیہ میں موجودہ پٹرول انجن کو اس گیس سے چلنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے لیکن اس گیس کے استعمال کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس کو دھاتی وزنی سلنڈروں میں بھاری دباؤ سے بھر کر موٹر گاڑیوں میں رکھنا نہایت خطرناک ہے۔ اس لیے اس گیس کو ذخیرہ کرنے کی متبادل کوشش کی جا رہی ہے۔

سائنسدانوں نے توانائی کے بحران سے نبٹنے کیلئے گھریلو کوڑا کرکٹ کو بھی نہیں چھوڑا۔ ایک اندازہ کے مطابق تمام دنیا میں سالانہ کوئی ایک سو کروڑ ٹن کوڑا کرکٹ نکلتا ہے جس کا بیشتر حصہ نامیاتی اشیا جیسے بیکار کاغذ، کپڑے کے ٹکڑے گھاس پھوس اور پلاسٹک وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کا ۵۰ فیصد حصہ گیس اور سیال ایندھن میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں اس کام کے لیے عصری تکنالوجی دریافت کر لی گئی ہے اور بڑے بڑے پلانٹ کوڑا کرکٹ سے صنعتی بھٹیوں میں جلانے کا تیل یعنی فرنیس آئیل اور یکوان گیس کے مماثل ایندھن تیار کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں سالانہ کوئی ۱½ کروڑ ٹن کوڑا کرکٹ جمع ہوتا ہے۔ جس کو نشیبی علاقوں کو پاٹنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ایک عرصہ کے بعد بطور کھاد کام میں لایا جاتا ہے۔ لیکن آج کل کوڑا کرکٹ کو جلا کر حاصلہ حرارتی توانائی سے بھاپ کے ٹربائن چلا کر بجلی پیدا کرنے کی تکنالوجی کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کچرے کو سڑا کر میتھین گیس پیدا کرنے کے کامیاب تجربات ہو چکے ہیں۔ اس گیس کو جلا کر گیس ٹربائن کی مدد سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ایک پلانٹ ہندوستان میں پہلی مرتبہ نئی دہلی میں گزشتہ ماہ سے کام کر رہا ہے جس سے یومیہ ۳۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔ اس بجلی کی قیمت صرف ۱۲ پیسے فی یونٹ ہے جو روایتی طریقوں سے پیدا کردہ بجلی کے مقابلہ میں آدھا سستی ہے۔ اس کے علاوہ اس پلانٹ کی لاگت صرف ۵ لاکھ روپیہ ہے جبکہ دوسرے پلانٹ کے لیے کروڑہا روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۰ ایکڑ رقبہ پر پھیلے ہوئے کوڑا کرکٹ سے ۱۰ میگاواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے۔

سائنس کی لاثانی تخلیق کمپیوٹر ہے جس سے بے شمار سماجی اور معاشی فائدے ہو رہے ہیں۔ کمپیوٹر کو آجکل تعلیمی تجارتی، تفریحی اور مواصلاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کمپیوٹر کے اطلاق کی ترقی یافتہ شکل "روبوٹ" یعنی مشینی انسان ہے جس کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۸ء میں بنایا گیا۔ یہ ایک دراصل ایسی مشین ہے۔ جو ایک خاص پروگرام کے تحت کام کرتی ہے۔ جس کی بہت ہی کارآمد اور ذہین شکل ۱۹۷۲ء میں ایجاد کی گئی۔ اب اس مشینی انسان کی کئی قسمیں ہمارے روزمرہ کے حساب و کتاب صنعت اور تحقیقی سرگرمیوں میں برسرخدمت ہیں۔ چنانچہ اس کو جرمنی، جاپان، امریکہ اور سویڈن میں صنعتی پیداوار میں اضافہ کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں مشینی انسان کے وجود میں آنے سے مزدوروں اور فنی لوگوں کی ضرورت کم محسوس کی جا رہی ہے لیکن چین اور ہندوستان میں جہاں فنی ماہروں کی کمی نہیں ہے اس روبوٹ سے فولاد سازی جیسی صنعتوں کے علاوہ ایسے امور میں استفادہ کیا جا سکتا ہے جہاں انسان بے بس ہو جاتا ہے مثلاً زیرسمندر پٹرول کی کھوج۔ خلائی تحقیق۔ دریاؤں میں سیلاب کی روک تھام اور ریگستانی علاقہ کی ترقی وغیرہ۔ کیونکہ انسان ایسے سخت ماحول اور کٹھن حالات میں اپنے آپ کو خطرات سے محفوظ رکھتے ہوئے موثر کام انجام نہیں دے سکتا۔

اس برق رفتار سائنسی ارتقار کے باوجود اگر ہم انسانی اقدار کو نہ پہچانیں۔ بلکہ صرف عیش پرستی اور دوسروں پر تسلط کے طریقوں کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ تو وہ دن دور نہیں جبکہ یہ تمام ایجادات خود ہماری فنا کے درپے ہو جائیں گے۔

(حیدرآباد سے نشر)

خلیل اکمل
۱/۶۹۲-۱-۲۲، نورخاں بازار حیدرآباد ۲۴

آکاش وانی اور ہم

دھرتی سے آکاش کی طرف جانے کے لیے خلابازوں کو بڑی سہولتیں حاصل ہیں اور انہیں بڑے اہتمام بلکہ تزک و احتشام کے ساتھ آسمان پر لے جایا اور دھرتی پر واپس لایا جاتا ہے۔ مشہور تو یہی ہے کہ زمین پر وہی خلاباز اتارے جاتے ہیں جنھیں اوپر بھیجا گیا تھا۔ اس معاملے میں اب تک کسی فراڈ کی اطلاع نہیں ملی ہے۔ لیکن جو لوگ خلابازی کا کام نہیں کر سکتے اور صرف ادب یا موسیقی جیسے مضرت رساں مشاغل میں حصہ لیتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ آکاش وانی جا سکتے ہیں۔ آکاش وانی جاتے وقت ان لوگوں کو آکاش کو نظر بھر کر دیکھ لینا منع نہیں ہے ——— آکاش وانی کے سفر کو خلابازی نہ سہی قلابازی تو کہا ہی جا سکتا ہے۔

آکاش وانی کے سفر میں آدمی کو زمین سے اوپر نہیں اٹھنا پڑتا اور یہ سفر ایک مدت تک یعنی حال حال تک بڑا خوشگوار اور مسرت بخش رہا۔ جو شخص بھی آکاش وانی کے احاطے میں داخل ہوتا اپنے بارے میں یہ محسوس کرتا کہ وہ کوئی معمولی شاعر یا کوئی ادنیٰ فنکار نہیں ہے بلکہ شیرافگن ہے۔ شیرافگن سے ہماری مراد وہ شیرافگن ہیں جو جہانگیر کے ہم عصر اور ان کے عہد میں چند دنوں تک بقید حیات تھے۔ ان کا نام ہمارے ذہن میں یوں آیا کہ تخت و تاج کی جو اہمیت ہے وہ تو اپنی جگہ ہے لیکن اگر تخت شاہی کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے صرف تھوڑی دیر کے لیے تو جہانگیر کے مقابلے میں شیرافگن زیادہ خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں۔ نورجہاں کی شہرت اور عدل جہانگیری کے خوف سے اگر آپ کو یہ مثال پسند نہیں آتی ہے تو ہم اسے واپس لیتے ہیں۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ یا اپنا دیا ہوا بیان واپس لینا آج کے سماج میں بے حد ضروری چیز ہے بلکہ ایک لحاظ سے لازمی مضمون ہے اور اس طرح کی حرکتیں کرتے اور کرتے رہنے سے لوگوں کو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ یہ شخص کھلے دماغ کا ہے۔ کھلے دماغ کو ایک اچھی صفت مانا

یوسف ناظم

گیا ہے اسی لیے اکثر لوگ اپنا دماغ ایک ہی طرف سے نہیں دونوں طرف سے کھلا رکھتے ہیں۔ عدل جہانگیری کے خوف کی بات بھی اس لیے ہماری زبان پر آگئی کہ اُس انصاف میں قصوروار اور خطاکار شخص کی بجائے اس کے کسی قریبی رشتہ دار کو سزا کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ اب تو یہ بھی نہیں ہوتا۔ بہر حال ہم یہ دونوں مثالیں فی الحال واپس لیتے ہیں اور صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ آکاش وانی کے احاطے میں قدم رکھ کر لوگ ایسا محسوس کرتے تھے کہ ان کے قدموں کے نیچے سُرخ بانات بچھی ہوئی ہے۔ وہ دراصل میں نیچے دیکھتے ہی نہیں تھے حالانکہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان میں لوگ پان بہت کھاتے ہیں اور خاص طور پر آکاش وانی کی عمارت کے گرد تو صرف پان ہی کھائے جاتے ہیں۔ بہر حال سرخ بانات کا خیال ان کے دماغ سے نکل نہیں پاتا تھا اس لیے وہ عمداً سر اٹھا کر اور وقتاً فوقتاً سینہ پھلا کر چلتے تھے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب ہوائیں موافق چلتی تھیں۔ اب اس ہوا محل کے حالات بدل گئے ہیں اور اس لیے بدل گئے ہیں کہ ان دنوں سوائے غریبوں کے کس کے حالات نہیں بدلے ہیں۔ آدمی تو خیر آدمی ہیں اور بحیثیت آدمی ابھی اور کچھ دنوں تک برقرار رہیں گے لیکن اب تو معمولی ترکاریوں تک کے حالات بدل گئے ہیں اور ان کے دام بھی خلا بازوں اور آریہ بھٹ کی طرح آسمان پر ہیں۔ آکاش وانی کی عمارت جس میں ہم پہلے اس طرح داخل ہوتے تھے جیسے یہ ہماری سسرال ہو اب ہم سے باآوازِ بلند کہتی ہے :

مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

تفصیل اس بیان کی یہ ہے کہ آکاش وانی کے صدر دروازے پر پہلے بھی ایک یا دو دربان رہا کرتے تھے لیکن ان کا تسلط وہاں نہیں تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ خیر سگالی کے سلسلے میں کھڑے ہوئے ہیں۔ گو وہ ایئر انڈیا کے مہاراجا کی طرح جھک کر کسی کا استقبال نہیں کرتے تھے لیکن آنے والوں کو دیکھ کر ناراض بھی نہیں ہوتے تھے۔ (گدا سمجھ کر چپ رہتے تھے) لیکن اب ان کے چہروں پر یکایک خشونت آگئی ہے ان کی بندوقیں تو خیر بھری رہتی ہی ہیں لیکن یہ خود بھی کچھ کم بھرے نہیں رہتے۔ ان کی مونچھوں میں سختی کی علامات نمودار ہوگئی ہیں۔ آکاش وانی کے حالیہ سخت انتظامات کا سب سے زیادہ اثر انہی مونچھوں پر ہوا ہے۔ ایک اور تبدیلی یہ عمل میں آئی ہے کہ اب صدر دروازے پر ایک میز اور دو کرسیاں بھی نظر آنے لگی ہیں۔ میز پر ایک رجسٹر اور اس کے ساتھ ایک بال پین بھی رکھ دیا گیا ہے۔ یہ بال پین چونکہ بہت قیمتی ہے اور یہ دو دربان اس کی حفاظت کے لیے کافی نہیں ہیں اس لیے اسے ایک ڈوری کی مدد سے مذکورہ میز کے پائے سے باندھ دیا گیا ہے بالکل اس طرح جیسے بکری کو کھونٹے سے باندھا جاتا ہے۔

آکاش وانی میں جہاں آنے اور بلائے جانے والے لوگوں کو پہلے محبت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اب شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن یہ شکایت نہیں ہے کیوں کہ ان دنوں رواج ہی کچھ یہ چل پڑا ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کو دیکھے تو شبہ کی نظر سے دیکھے۔ بہر حال اس رجسٹر کی وجہ سے ہر شخص کو اندازہ ہو گیا بلکہ یہ بات عام ہو گئی ہے کہ آکاش وانی میں اب صرف مشتبہ لوگ ہی آنے جانے لگے ہیں۔ آکاش وانی نہ ہوئی بمبئی کی سب اربن ریلوے ہو گئی جس میں سفر کرنے والوں کو سیزن ٹکٹ کے ساتھ اپنی تصویر بھی دکھانی پڑتی ہے۔ کچھ دنوں بعد مسافروں کی انگلیوں کے نشانات بھی طلب کیے جانے لگیں گے۔

اس رجسٹر میں جسے نومولود رجسٹر کہنا چاہیے کافی تفصیلات درج کرنی پڑتی ہیں اور ان لوگوں کو بھی جنہیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ وہ کہاں ہیں اس رجسٹر میں اپنا پتہ لکھنا پڑتا ہے۔ اس دوران کرسی پر بیٹھا ہوا شخص آپ کو برابر گھورتا رہتا ہے۔ آپ کی سیکس کیا ہے اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر آنے والا شخص خالی ہاتھ آیا ہے تو سمجھیے سستا چھوٹ گیا ورنہ اُس کے تھیلے کی تلاشی بھی برحق ہے۔ اس تھیلے کے اندر سے اگر کوئی قابل گرفت چیز برآمد نہیں ہوتی ہے اور چند تصویرِ بُتاں کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے تو مفتشوں کو بڑی کوفت ہوتی ہے کہ اُن کی ساری محنت اکارت گئی۔ ملاقاتی اس مرحلے سے گذرنے کے بعد جب اس جگہ پہنچتا ہے تو جہاں اُسے جانا ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جن کے لیے اس نے اتنے ستم سہے وہ تو موجود ہی نہیں ہیں۔ ملاقاتی کو بیٹھنے کے لیے کرسی بھی نہیں ملتی کیونکہ دو کرسیاں تو صدر دروازے پر بھیج دی گئیں ——— مزید کرسیاں اب نئے بجٹ کے بعد ہی آئیں گی۔

آکاشوانی کا تین چوتھائی سے زیادہ کاروبار ٹیپ پر منحصر ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ ٹیپ ریڈ ٹیپ نہیں ہے لیکن آکاش وانی کے ٹیپ میں دقت یہ ہے کہ یہ وقت پر ملتا نہیں ہے جب کہ ریڈ ٹیپ کی کہیں بھی کوئی کمی نہیں۔ یہ تو اس افراط سے ملتا ہے کہ آپ کو تنگیٔ داماں کی شکایت ہو جائے، ہمارے یہاں سب سے زیادہ مقبول اور مستقل چیز یہی ریڈ ٹیپ ہے۔ ہم خود بناتے ہیں کہیں سے امپورٹ نہیں کرتے۔ کہا جاتا ہے کہ ریڈ ٹیپ کی وجہ سے آدمی کا خون سُرخ رہتا ہے ورنہ کاغذ کی سفیدی خون میں سرایت کر جاتی ہے۔

آکاش وانی کے علاقے میں جس ٹیپ پر فن کار کی آواز کو پُرانی مشینوں کی مدد سے منتقل کیا جاتا ہے اگر وہ اتفاق سے وقت پر ہاتھ لگ جائے تو فوراً اسٹوڈیو کی تلاش شروع ہو جاتی ہے اور اس تلاش میں افسر متعلقہ اپنی بغل میں ٹیپ کا ڈبا دبائے اور فن کار کو اپنے جلَو میں لیے ہوئے ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو اور ایک فلور سے دوسرے فلور پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جیسے وہ اسٹوڈیو نہ ڈھونڈ رہا ہو بلکہ اس شہر میں اپنے لیے ایک مکان ڈھونڈ رہا ہو جو اس کے اگلے تبادلے تک نہیں ملتا ہے ——— آکاشوانی کے لوگوں کو دھرتی پر مکان تلاش بھی نہیں کرنا چاہیے۔

اسٹوڈیو اُس مربع یا مستطیل کمرے کو کہتے ہیں جس میں فن کار کو دنیا کی محفلوں سے الگ کر کے کچھ دیر کے لیے نظر بند کر دیا جاتا ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ سامنے کی گھڑی پر نظر رکھے، ساتھ ہی ساتھ کاغذ پر بھی نظر رکھے اور جب افسر متعلقہ شیشے کی دوسری طرف مشین روم میں پہنچے تو مقرر اس کے ہاتھ پر بھی نظر رکھے۔ اب بے چارا مقرر یہ تیسری نظر کہاں سے لائے لیکن ہدایت یہی دی جاتی ہے کہ جونہی یہ ہاتھ ریلوے گارڈ کی جھنڈی کی طرح ہلے مقرر تقریر پڑھنا شروع کر دے۔ اس صدا بندی سے پہلے فن کار کی آواز کے زیر و بم کا امتحان بھی لیا جاتا ہے اور اس بات کی جانچ کی جاتی ہے کہ آکاش وانی کی مشین فن کار کی آواز سے اور زیادہ تو نہیں بگڑ جائیں گی۔ یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اور مقرر کی علمی قابلیت اناؤنسر کی فنی قابلیت کے مقابلے میں صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔ مقرر جب اٹک اٹک کر اپنی تقریر وقت مقررہ سے ایک منٹ زیادہ یا دو منٹ کم میں ختم کر لیتا ہے تو اُسے مشین روم میں پہنچا کر اس کی آواز بھی سنائی جاتی ہے کہ دیکھو اپنا کارنامہ ——— ہمیں کہنا تو نہیں چاہیے لیکن مقرر اگر اپنی آواز نہ سُنے تو یہ اس کے حق میں اچھا ہے۔ اس کی آواز میں سبھی آوازیں ہوتی ہیں۔ کاغذ کے مائیکروفون سے ٹکرانے کی آواز، مقرر کی سانس کے تیز تیز چلنے کی آواز، کہیں کہیں اس کے کھنکھارنے کی دبی دبی اور گھٹی گھٹی آواز جیسے کوئی تیر نیم کش ہو جو خلش بن کر دل میں رہ گیا ہو۔ مقرر کو چونکہ سامنے کی گھڑی پر نظر رکھنے کے لیے کہا گیا تھا اس لیے اگر اس نے صفحہ ۳ کے فوراً بعد صفحہ ۵ پڑھ دیا ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ آکاش وانی میں خوش قسمتی سے اس بات کی اجازت ہے کہ صفحہ نمبر ۵ کے بعد مقرر کا جی چاہے تو وہ صفحہ ۴ بھی پڑھ لے۔ یہ کوئی معمولی رعایت نہیں اور غالباً اسی رعایت کی وجہ سے آکاش وانی میں مقرروں کے معاوضے کی رقم پر نظر ثانی نہیں کی جاتی ——— نظر ثانی کا جہاں تک تعلق ہے یہ صرف اس وقت کی جاتی ہے جب یہ شبہ ہو کہ ہم نے غلطی سے کوئی صحیح بات تو نہیں لکھ دی۔

اب آخری منزل آتی ہے لیکن یہ وہ منزل نہیں ہے جس کے بارے میں جگر نے کہا تھا کہ :

میں دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

اب فن کار کو اس جگہ پیش کیا جاتا ہے جہاں اسے ایک رسیدی ٹکٹ یا اس کی قیمت داخل کرنی ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بڑا دردناک منظر ہوتا ہے۔ دونوں فریق اپنی اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ آکاش وانی نے اب تک اپنے کوپن جاری نہیں کیے ہیں اور نہ یہاں ہماری بی ای ایس ٹی کے کوپن

قبول کیے جاتے ہیں، حالانکہ اب شہر میں ریزرو بینک کی کرنسی اتنی نظر نہیں آتی جتنے کہ یہ کوپن دکھائی دیتے ہیں۔ مائیں بھی اپنے بچوں کو اب روزانہ کے جیب خرچ کے لیے یہی کوپن دیتی ہیں۔ یہ ہوتے بھی بہت سُبک ہیں۔ چھوؤ تو معلوم ہوتا ہے کوئی تتلی ہاتھ آگئی ہے لیکن ایسی تتلی جس کے رنگ اڑ گئے ہیں اور آج کل کون ہے جس کا رنگ اڑا ہوا نہیں ہے۔

آکاش وانی کا قاعدہ یہ بھی ہے کہ ایک علاقے کا فن کار دوسرے علاقے میں پہنچ کر اپنے جوہر اس وقت تک نہیں دکھا سکتا کہ جب تک کہ اُس کے اپنے علاقے کی آکاش وانی سے یہ اطلاع نہیں مل جاتی کہ شخص مذکور کا ریکارڈ اچھا اور چال چلن اطمینان بخش ہے۔

فن کاروں کو ایک بڑی سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ جب وہ آکاش وانی کی عمارت سے باہر آنا چاہتے ہیں تو واپسی پر صدر دروازے پر اُن سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی حالانکہ اگر یہ دربان غور سے دیکھیں تو فن کار کا حلیہ بدل چکا ہوتا ہے۔

لیکن ایک بات ماننی پڑے گی کہ آکاش وانی کی طرف سے جب بھی کوئی سکھلا پروگرام آکاش وانی کے آڈی ٹوریم میں ترتیب دیا جاتا ہے تو اُس وقت اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہال ہے کوئی ادارہ جو شہر کی گرمی کو ادبی اور تہذیبی سرگرمی میں بدل سکتا ہے۔ مانا کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے لیکن ہم جیسے قناعت پسندوں کے لیے یہ داغ داغ اُجالا بھی بہت ہے۔

(بمبئی سے نشر)

خواجہ ضمیر

نہ مجھ کو ڈوبنے کا غم نہ مجھ کو خوفِ طوفاں ہے
مری کشتی وہ کشتی ہے خدا جس کا نگہباں ہے

یہ آخر کون سی منزل میں عکسِ حُسنِ جاناں ہے
کہ جس کو دیکھ کر خود آئینہ تصویرِ حیراں ہے

نہ دیکھی ہے گریباں میں، نہ باقی تارِ داماں ہے
مرا ذوقِ جنوں کیا حاصلِ جشنِ بہاراں ہے

نہ ہو مایوس اے دل حادثاتِ زندگانی سے
اگر ہے عزم کامل تو سمجھ لے مشکل آساں ہے

نگاہیں جس طرف اٹھیں اُدھر جلوے نظر آئے
کچھ ایسی صورت سے شمعِ آگہی دل میں فروزاں ہے

ڈرا سکتے نہیں اس مرحلے پر حادثے مجھ کو
مرے اشکِ غم دل کے ہر اک قطرہ میں طوفاں ہے

رضا جوئی وفا کیشی مروت پیار ہمدردی
انھیں دو چار لفظوں میں ہماری زیست پنہاں ہے

شعورِ عام کیا سمجھے یہ حُسن و عشق کے جذبے
کسی کی ذات افسانہ کسی کی ذات عنواں ہے

یہ سچ ہے ایک مدت ہوگئی ترکِ تعلق کو
مگر اک نشترِ غم اب بھی نزدیک رگِ جاں ہے

ضمیرؔ ایسے تو جینے کو جہاں میں سب ہی جیتے ہیں
مقامِ زندگی کو جو سمجھ جائے وہ انساں ہے

(حیدرآباد سے نشر)

چکبست کی وطنیت

حامد علی خاں

اُردو شاعری میں پنڈت برج نرائن چکبست ان معدودے چند شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے محض وطنی شاعری کے باعث ایک مخصوص اہمیت و شہرت ہی حاصل نہیں کی بلکہ جدید اردو شاعری کے معمار بھی کہلائے۔ گو کہ چکبست کی شاعری کا آغاز روایت کے مطابق غزل گوئی سے ہی ہوا تھا لیکن ملکی و قومی حالات کے تحت چکبست کے دل میں وطنی جذبہ شدت اختیار کرتا گیا، چنانچہ قومی و وطنی جذبے کی شدت کے زیرِ اثر چکبست نے جدید نظم نگاری کی طرف توجہ کی۔

جدید شاعری جس کے اولین معمار آزاد تھے رفتہ رفتہ جدید ذہنوں کی آرائش و زیبائش میں بہت کچھ سود مند ثابت ہوتی جارہی تھی جس کی وجہ محض یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی میں ناکامی کے باعث عوام کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا وہ نہایت نامساعد اور اذیت رساں تھے جس کے سبب قوم میں حوصلہ و ہمت ہی مفقود نہیں ہوا تھا بلکہ ایک اضمحلالی کیفیت کا پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ اِن حالات میں ہمارے شعراء اور قومی رہنماؤں کے حساس ذہنوں میں عوامی کیفیات کے احساسات کا پیدا ہونا بھی لازم امر تھا۔ چنانچہ بعض اردو شعراء نے اپنے شعری ذوقِ سلیم کو ملکی قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہی وقف کر دینا مقتضائے وقت سمجھا اس طرح جہاں ایک طرف اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا وہاں دوسری طرف ہندوستانی عوام کے حوصلہ و ہمت کو بحال کرنے میں بھی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

اس حقیقت سے قطعاً انحراف نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے اردو شعراء نے غلامی کی بیجا پابندیوں اور جبر و تشدد کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی اس سے ہندوستانی عوام میں ایک نیا جوش و خروش پروان چڑھتا رہا۔ آزاد، حالی، اقبال، جوش، اور چکبست جیسے محبانِ وطن نے ہندوستانی عوام کو ان کے خوابوں کی تعبیر سے روشناس کرانے میں جو اہم خدمات انجام دیں اسی کے صلے میں ۱۹۴۷ء میں بالآخر ہندوستان کو آزادی مل سکی۔

"صبحِ وطن" چکبست کی شاعری کا واحد مجموعہ ہے جس میں سیاسی، وطنی اور قومی احساسات و جذبات کی ترجمانی نہایت موزونیت کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن حب الوطنی کے احساسات و جذبات کو چکبست نے جس آفاقیت اور انفرادیت کے ساتھ اپنے کلام میں داخل کیا ہے۔ اس سے اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی وطنیت کے محرکات سب سے زیادہ قومی ہیں۔ جس کا خاص مقصد وطن کو بیدار کرنا ہی ہے۔ ویسے تو یہ احساس آزاد اور حالی کے زمانے میں ہی پیدا ہو چکا تھا لیکن اکبر، اقبال، جوش اور چکبست کے زمانے تک اس میں مزید نکھار پیدا ہونا شروع ہوا تھا۔

چکبست کے دل میں حب الوطنی کی شمع جب روشن ہوئی تو ان کی ہستی وطن و قوم کی محبت میں سرشار ہو کر رہ گئی۔ خاکِ ہند، وطن کا راگ، ہمارا وطن، نالۂ درد، سیرِ دہر، دون وغیرہ نظموں کو پڑھنے سے ان کی خداداد ذہانت اور ان کے وسیع مطمحِ نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور قومی و وطنی جوش و خروش کا بھی پتہ چلتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا چکبست کی رگ رگ میں وطنیت کا جذبہ موجزن ہے۔

درحقیقت حب الوطنی کے جذبے نے ہی چکبست کو جدید اردو شاعری میں دیگر شعراء سے منفرد کر دیا ہے کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کو محض وطن و قوم کے لیے وقف کر دیا تھا اس دور میں جبکہ قوم میں احساسِ زندگی کی لہر پیدا ہونے لگی تھی مگر قوم کی زبان پابندیوں کے باعث اپنے احساسات و جذبات کو ادا کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن ان حالات میں چکبست نے عوامی جذبات کو بے خوف و خطر ادا کر دینا بھی باعث فخر سمجھا اور ساتھ ہی زبانوں پر لگائی ہوئی پابندیوں کا تمسخر بھی اڑایا۔

شعر ملاحظہ ہو ؎

زباں کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے
سمجھ لیا ہے ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو سہنا ہے

چکبست اپنی وطنیت میں وطن کی خاک، اس کے پہاڑوں، اس کے دریاؤں، اس کی فضاؤں، قدرتی مناظر، شان و شوکت، اور وطنی رہنماؤں کا بیان جس موثر انداز اور ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں اس سے ان کی وطن سے والہانہ

محبت کی بخوبی وضاحت ہوجاتی ہے جو یقیناً قابل ستائش ہے۔
چکبست کا دور درحقیقت ملک و قوم کے لیے ایک انقلابی دور سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے لیے قومی رہنماؤں کی مسلسل جدوجہد جاری تھی اور حالات کے دھارے تیزی سے بدل رہے تھے ان حالات میں چکبست قومی رہنماؤں کی حوصلہ افزائی میں دل و جان سے کوشاں نظر آتے ہیں اور نہایت پُروقار انداز میں فرماتے ہیں ؎

وطن پرست شہیدوں کی خاک لائیں گے
ہم اپنی آنکھ کا سرمہ اسے بنائیں گے
غریب ماں کے لیے درد دکھ اٹھائیں گے
یہی پیام وفا قوم کو سنائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

پہنانے والے اگر بیڑیاں پہنائیں گے
خوشی سے قید کے گوشے کو ہم بسائیں گے
جو سنتری درِ زنداں کے سو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انھیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

۱۹۱۴ء میں جب مہاتما گاندھی ہندوستانی باشندوں کی حالت پر غور کرنے جنوبی افریقہ گئے تو چکبست نے ایک پُرتاثیر نظم "فریادِ قوم" لکھی۔ جس میں گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ؎

وطن سے دور ہیں ہم پر نگاہ رکھنا
اِدھر بھی آگ لگی ہے ذرا خبر لینا

چکبست کی بعض نظموں کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے گویا ان کے دل و دماغ میں حب الوطنی کا سیلاب سا اُمڈا چلا آرہا ہے جو سرزمین وطن کو سیراب کرتا جارہا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے :-

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لیے رواں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس خاک سے دکھا دے

چکبست نے اپنی نظموں میں اتحاد و مساوات، اصلاحِ رسم و رواج، تعلیم و تربیت، اور ملکی و قومی آزادی جیسے اہم مضامین پر خصوصی توجہ دی ہے۔ بہرکیف جہاں ایک طرف چکبست بحیثیت ایک وطنی شاعر کے پہچانے جاتے رہیں گے تو دوسری طرف اردو شاعری اپنے اس عظیم محسن کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکے گی کہ جس نے جدید اردو شاعری کے چمن کی آبیاری کرکے اردو شاعری کے دامن کو مزید وسعت بخشی ہے۔

(رام پور سے نشر)

حامد علی خاں
ذخیرہ کا بازار۔ بریلی

۱۶ جنوری ۱۹۸۷ء

آبادی اور اس کے مسائل

سید تقی الدین

آبادی کا مسئلہ فلاسفروں، سائنسدانوں اور سیاستدانوں کے لیے قدیم زمانے سے ہی کافی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ مگر حال میں اس کو کافی اہمیت حاصل ہونے کی وجہ اس میں مسلسل اضافہ ہی نہیں بلکہ اس میں مختلف طرح کی تبدیلیوں کی وجوہات جیسے شرح پیدائش و شرح اموات میں زیادتی و کمی کے اثرات اور خاندانی منصوبہ بندی پر عمل جس کا مقصد انسانی زندگی میں خوشحالی لانے کی کوشش کرنا ہے۔

افلاطون اور ارسطو بھی اپنے زمانے میں آبادی کے اعداد و شمار میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ افلاطون کے خیال میں مناسب ترین آبادی وہی ہوسکتی ہے جس میں ہر آدمی کو اپنی قابلیت کو بڑھانے اور اس کے اپنے ملک کی ترقی میں حصہ لینے اور اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کرنے کے موقعے ملے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ عوام معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہو اور آبادی اتنی ہو کہ وہ اپنے تحفظ و دفاع کے قابل ہو اور اتنی زیادہ نہ ہو کہ معاشی مسائل پیدا ہوں۔

اس کے باوجود اٹھارویں صدی کے آخری حصہ تک دنیا کی آبادی میں اضافہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ اس زمانے تک عام طور پر لوگوں کا رجحان آبادی کے اضافہ کے موافقت میں ہی تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے دو ہزار سال پہلے دنیا کی آبادی جو کہ صرف دو سو پچاس ملین تھی ۱۷۵۰ عیسوی تک یہی آبادی سات سو اکیانوے ملین ہوگئی۔ اس طرح تقریباً پانچ سو ملین اضافہ کے لیے ایک ہزار سات سو پچاس سال لگے۔ مگر یہی آبادی اٹھارویں صدی کے ختم پر ۹۷۸ ملین ہوگئی۔ یعنی پچاس ہی سال میں اس میں دو سو ملین کا اضافہ ہوگیا۔ مگر اسی آبادی میں مزید ایک بلین یعنی ایک ہزار ملین کا اضافہ صرف ایک سو تیس سال میں ہوا جبکہ آبادی کے تیسرے بلین تک پہنچنے کے لیے صرف تیس سال ہی لگے اور یہی آبادی تقریباً پندرہ سال میں یعنی ۱۹۸۰ء کے درمیان میں ۴۴۲۴ ملین کو پہنچ گئی۔ ہر سال دنیا کی آبادی میں تقریباً آٹھ ملین اضافہ ہو رہا ہے اس کی وجہ حالیہ تین دہائیوں یعنی تقریباً تیس سال سے آبادی میں اضافہ کی رفتار دو فیصد سالانہ ہے آبادی میں اضافہ کی رفتار کا اگر یہی حال رہا تو اندازاً اس صدی کے ختم تک یہ چھ بلین ہوجائے گی اور ۲۰۱۰ عیسوی تک سات بلین کو بھی عبور کرلے گی۔ اور اب سے تقریباً ایک سو سال کے بعد شاید پندرہ بلین ہوجائے گی۔ آبادی میں اس طرح کا دھماکہ خیز بڑھنے کا اندازہ بالواسطہ اور دوررس اثرات چھوڑے گا کیونکہ اسوقت ہی دنیا میں پانچ ملین آدمیوں کو مشکل ہی سے ایک وقت کا کھانا نصیب ہوتا ہے اور تقریباً پندرہ سو ملین آدمی غذا کی کمی۔ ناقص غذا اور نیم فاقہ کشی کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اگر آبادی کے اس طرح سے بڑھنے کو نہ روکا گیا تو کوئی شک نہیں کہ آئندہ پندرہ سو سال میں دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ آدمی کو صرف کھڑے رہنے کے لیے جگہ مل سکے گی اور اندازہ کے مطابق ۲۰۴۰ء میں دنیا کی آبادی کا وزن زمین پر زمین کے اپنے وزن کے برابر ہوجائے گا۔ دنیا کی آبادی کے ۵۰ فیصد لوگ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ جیسے ترقی پذیر ممالک میں بستے ہیں جبکہ دنیا کا پچاس فیصد حصہ چار ہی ممالک چین، ہندوستان، روس اور امریکہ میں ہی رہتا ہے۔ ویسے آپ کو جان کر تعجب ہوگا صرف ہندوستان اور چین کی آبادی ملا کر پوری دنیا کی آبادی کے ۱/۴ حصہ سے زیادہ ہے۔ اور جبکہ صرف ہندوستان ہی میں دنیا کے تقریباً سولہ فی صد لوگ بستے ہیں۔ جو کہ آبادی کے لحاظ سے دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے جبکہ چین آبادی کے لحاظ سے سب سے پہلے نمبر پر آتا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے مطالعہ سے پتہ چلے گا کہ اس کی آبادی اس صدی کے شروع میں تقریباً ۲۳۸ ملین ہی تھی جو کہ بڑھ کر ۱۹۷۱ء میں ۵۴۸ ملین ہوگئی ہے۔ یعنی صرف ستر سال میں ہی اس میں تقریباً ایک سو تیس فیصد کا اضافہ ہوگیا ہے سوائے ۱۹۲۱ء کے ہندوستان کی آبادی میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے اس کی وجہ سواری کی اچھی سہولتیں، صحت مند غذا، قحط پر کنٹرول حفظ ماتقدم اور طبی سہولتیں وبائی بیماریاں جیسے ہیضہ، پلیگ اور چیچک وغیرہ پر

مکمل کنٹرول، عزبت، کم عمری میں شادی، تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی، اولاد پیدا کرنے کے قابل افراد میں اضافہ وغیرہ ہیں۔ اب اندازہ کے مطابق ہندوستان کی آبادی ۱۰۰ ملین کو عبور کر چکی ہے کیونکہ ہر ڈیڑھ سکنڈ میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور ہر سال ہندوستان کی آبادی میں آسٹریلیا کی آبادی کے برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے ہی ہندوستان میں دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلہ میں سب سے زیادہ غریب بستے ہیں اور ہندوستان کی آبادی میں ہر سال اضافہ سے غربت میں بھی مزید اضافہ ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ ملک کی ترقی پر بھی اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ پہلے ہی یہاں کفالت کرنے والوں یعنی کمانے والے کی کمی ہے کیونکہ ۵ سال سے کم عمر اور ۶۰ سال سے بڑے عمر کے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو کہ عموماً بے روزگار رہتے ہیں۔ آبادی میں اضافہ کی اصل وجہ شرح پیدائش۔ شرح اموات اور آبادکاری یا آبادی کے ترک مقام یعنی مائیگریشن پر منحصر ہے اگر مائیگریشن کو نظر انداز کر دیا جائے تو آبادی کے بڑھنے کی شرح کا دارومدار شرح پیدائش و شرح اموات کی کمی و بیشی پر ہی رہ جاتا ہے۔ اور ان دونوں میں زیادہ فرق ہو تو آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے خصوصیت سے تیس سال سے شرح پیدائش اور شرح اموات پر کنٹرول کرنے کے لیے خاص توجہ دی جا رہی ہے تاکہ اس شرح پر کنٹرول رکھا جائے۔

آبادی کے اضافہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مالتھوس کا نظریہ اس سلسلہ میں کافی اہمیت کا حامل ہے اس بارے میں اس کے علاوہ بھی کئی اور سائنسداں، فلاسفروں اور دانشمندوں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں جنھیں زمانے کے لحاظ سے تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :-

(۱) مالتھوس سے پہلے کے زمانے کے نظریات۔
(۲) مالتھوس کے نظریات۔
(۳) مالتھوس کے بعد کے زمانے کے نظریات۔

اٹھارویں صدی سے پہلے کے فلاسفروں نے آبادی میں اضافہ کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی صرف فوجی نقطۂ نظر، سیاسی پہلو اور معاشی اعتبار سے کی تھی۔ چین، یونان، اسپارٹا اور رایتھنز کے فلاسفر آبادی کے کنٹرول کے موافقت میں تھے جس کی خاص وجہ صحت مند آبادی تھی جس کے لیے وہ اسقاط حمل کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔ ارسطو کے نظریہ میں آبادی میں اضافہ غربت اور اجتماعی خرابیاں لاتا ہے اس کے خیال میں اب زمین میں مزید اضافہ ممکن نہیں اس لیے آبادی کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے اس نے اسقاط کے ذریعہ بچوں کی تعداد میں کمی کی بھی سفارش کی تھی۔ میکاولی کا خیال تھا کہ زیادہ آبادی اس کی اپنی ضروریات اور بیماریوں سے اپنے آپ کو ختم کر دیتی ہے۔ فیسیاغوث کے مطابق آبادی میں اضافہ اگر انسان کی معیارِ زندگی پر اثر انداز ہو تو اس کو قطعی برداشت نہیں کرنا چاہیے۔

اٹھارویں صدی کے درمیان میں آبادی اور اس کے ضروریات زندگی کے سلسلے میں کافی تحقیق ہوئی جس میں مالتھوس کا نظریہ قابل ذکر ہے اس نے اپنی کتاب - Essays of Malthus میں جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ آبادی میں تیز رفتاری سے اضافہ کا رجحان کا گہرا تعلق اس کے وجود سے بھی ہے جس کا دارومدار زیادہ تر غذا اور دوسری ضروریات زندگی پر ہے۔ جو انسان کو غربت جیسی لعنت اور اس کی اپنی ترقی کی راہ میں کئی رکاوٹیں پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کے اضافہ پر خاص نظر رکھی جانی چاہیے کیونکہ اصل غربت کی وجہ آبادی کا وبا اور پیداوار کے وسائل ہیں۔ اگر پیداوار میں بھی اضافہ ہوتا رہے تو آبادی میں اضافہ سے کوئی نقصان نہیں اگر ان دونوں کے اضافوں میں یکسانیت نہ ہو جیسے مالتھوس کے اپنے اندازے کے مطابق انسانی آبادی کے بڑھنے کا تناسب جیومیٹری تناسب میں ہے یعنی اس کا تناسب ۱ : ۲ : ۴ : ۸ : ۱۶ : ۳۲ : ۶۴ : ۱۲۸ : ۲۵۶ : ہو تو پیداوار کا تناسب ریاضی تناسب میں ہے یعنی اس کا تناسب ۱ : ۲ : ۳ : ۴ : ۵ : ۶ : ۷ : ۸ : ۹ ہے اس طرح صرف دو صدیوں میں آدمیوں اور پیداوار کا تناسب ۲۵۶ نسبت ۹ ہو جائے گا۔ لازماً اس سے غذا کا مسئلہ بڑھ جائے گا۔

مالتھوس کے بعد کے نظریات میں زیادہ اہم نظریہ تھامسن نوٹسٹائین اور بلیکر نے اس صدی کے تیسرے دہے میں پیش کیا جس کو Demographic Transition Theory کہتے ہیں۔ ان کے مطابق آبادی میں اضافے کا دارومدار شرح پیدائش و شرح اموات پر ہے۔ انھوں نے اس نظریہ کو پانچ درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے خیال میں پہلا درجہ وہ جبکہ یہ دونوں شرح زیادہ ہو اور تقریباً یکساں ہوں تو آبادی میں اضافہ نہیں ہوتا۔ دوسرے درجہ میں اگر شرح پیدائش وہی قائم رہی اور شرح اموات میں کمی واقع ہو تو ان دونوں شرح میں فرق کافی بڑھ جائے گا جس سے آبادی میں بہت ہی تیز رفتاری سے اضافہ ہوگا۔ اس درجہ کو کافی اہمیت حاصل ہے کیونکہ آج کئی ممالک اس مرحلہ سے گزر رہے ہیں۔ تیسرا درجہ شرح پیدائش میں کمی جس کی وجہ فیملی پلاننگ وغیرہ ہے۔ اور شرح اموات میں مزید کمی کا ہے جس سے آبادی میں اضافہ تو ہوگا مگر کم اور چوتھا درجہ دونوں کی شرح میں کمی اور یکسانیت کا ہے اس لیے اس درجہ میں آبادی کے بڑھنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ پانچویں درجہ میں شرح پیدائش میں شرح اموات سے بھی کمی ہو تو آبادی میں کمی ہوگی۔

ہندوستان ۱۹۲۰ء تک پہلے درجہ میں تھا، اب دوسرے درجہ میں ہے اور تیسرے درجہ میں داخل ہو رہا ہے اور چوتھے درجہ میں داخل ہونے پر آبادی پر کنٹرول ہو جائیگا تب موجودہ مسائل جیسے گھروں کی قلت، پانی کی قلت، سواری کا مسئلہ، بچوں کے اسکولوں کا مسئلہ، ٹرافک مسائل، اچھی طبی سہولتیں وغیرہ حل ہو جائیں گے اور ہر ہندوستانی کی زندگی خوشیوں سے بھرپور ہوگی۔

(حیدرآباد سے نشر)

جدوجہد آزادی

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

غالب کے اس نظریے کے مطابق جب زمین کے متعدد علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کی مختلف زبانیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئیں تو ایک نئی اور مکمل زبان کا جنم ہوا۔ اس زبان کا نام ہے اردو۔

اردو کا وجود مختلف لشکروں کے سپاہیوں اور ہندوستانی عوام کے باہمی میل جول اور بات چیت کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس زبان میں رنگا رنگ لب و لہجے کے ساتھ کئی علاقوں کی تہذیبیں بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زبان کا نام اردو (یعنی لشکر) قرار پایا۔ اس لیے اس زبان میں نہ صرف ایک دوسرے کے لیے پیار، محبت اور انسانی رشتوں کے نازک جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں بلکہ اس کے لب و لہجے میں بلا کی مٹھاس ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا سینہ انسانیت کے درد سے لبریز بھی ہے۔ ہر شے اپنے ماحول کا اثر قبول کرتی ہے۔ اور چونکہ اردو لشکری سپاہیوں کے درمیان پروان چڑھی ہے۔ اس لیے ساری نرمی اور نزاکت کے باوجود اپنے اندر تلوار کی کاٹ بھی رکھتی ہے۔ چنانچہ ملک کی وسیع فضا میں پرورش پانے والی یہ زبان مادرِ وطن کے کسی گوشے پر بھی آنچ آئے تو "خنجر لگے کسی کو تڑپتے ہیں ہم امیر" کے مصداق تڑپ اٹھتی ہے اور ہر ظلم و ستم کے خلاف تلوار کی طرح کھنچ جاتی ہے۔

ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ میں جو نیا موڑ آیا اور لوگوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا، اسے پھیلانے میں اردو پیش پیش رہی۔ مغلیہ دور کے خاتمے تک اردو کے تقریباً پینتالیس اخبارات وجود میں آچکے تھے۔ تاریخ صحافت اردو کے مصنف نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات ہی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بیباکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کیا جا سکتا تھا

میں اردو کا حصہ

شاھد کبیر

انھوں نے کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کے خلاف جو بغاوت کی تھی انگریزوں نے اس کی زیادہ تر ذمہ داری انھیں اردو اخبارات پر عائد کی تھی چنانچہ ہفتہ وار "صادق الاخبار" کے مہتمم کو اس جرم میں تین سال قید کی سزا دی گئی۔

اسی طرح 'دہلی اردو اخبار' بھی انگریزی حکومت کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کے ذہن میں امیر غریب یا ہندو مسلم اور سکھ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ اس میں شائع ہونے والی یکم نومبر ۱۸۴۴ء کے شمارے کی ایک خبر اس طرح ہے:

"لاہور اخبار سے واضح ہوتا ہے کہ کنور نہال سنگھ نے والیٔ افغانستان دوست محمد خان کو لکھا ہے کہ تمہارے ساتھ ہو کر میں مقابلہ سپاہ انگریزی کا کروں گا۔ نیز کنور صاحب نے فرزند خان مذکور کو طلب کیا ہے کہ اسے سکھ فوج کا سپہ سالار بنایا جائے توقع ہے کہ نیپالی لوگ بھی اس فوج میں شامل ہوں گے۔"

اس اخبار کے ایڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ چنانچہ جب دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو آزاد کو گھر کی خواتین کو ساتھ لے کر راتوں رات فرار ہونا پڑا اور ان کے والد محمد باقر کو گرفتار کر کے سرعام گولی سے اڑا دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی آزادی کی ساری لڑائی قریب قریب اردو ہی میں لڑی گئی۔ چونکہ اس زمانے میں نہ صرف کورٹ کچہری اور عدلیہ کی ساری کارروائی اردو میں ہوا کرتی تھی بلکہ اس سلسلے میں انگریز افسران سے بھی ساری خط و کتابت اردو ہی میں ہوئی۔ اردو ہی نے مجاہدینِ آزادی کو "انقلاب زندہ باد" جیسا ولولہ انگیز نعرہ دیا جو رگ و پے میں سرایت ہو کر جوش و جنون کو زندہ کر دیتا ہے۔ اور آج بھی ہر تحریک کا پہلا نعرہ "انقلاب زندہ باد" ہی ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب اور بربادی کے بعد آنے والے حالات سے باخبر کرنے والا پہلا شخص اردو کا مشہور شاعر حالی تھا ؎

کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

مولانا آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" کے ذریعے آزادی کا علم بلند کیا تو محمد علی جوہر نے اپنے اخبار "ہمدرد" کے ذریعے آواز اٹھائی۔ مولانا کی آواز میں بلندی سے گرتے ہوئے آبشار کا جلال اور ہلچل تھی جو حصولِ آزادی کی رَو کو تیز تر کر رہی تھی، تو محمد علی جوہر کی آواز آزادی کے لیے زمین کے سینے میں بیج بو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سرور صاحب نے مولانا کی آواز کو دماغ کی آواز اور محمد علی کی آواز کو دل کی آواز قرار دیا ہے۔ مگر یہ دونوں ہی آوازیں جدوجہد آزادی کی مہم پر سرگرم عمل رہیں اور پھر ان آوازوں میں ظفر علی خاں، حسرت موہانی، اقبال اور پنڈت رام پرشاد بسمل نے بھی اپنی آوازیں ملائیں۔ رام پرشاد بسمل کا یہ شعر آج بھی عوام کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے ؎

سرفروشی کی تمنا پھر ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس دور میں اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ انقلابی نظموں ہی پر مشتمل رہا۔ انھوں نے اپنے مخصوص حکیمانہ لہجے میں لوگوں کو بیداری کا پیغام دیا ؎

وطن کی فکر کر ناداں، مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے جنگِ آزادی کے مورچے پر جس جوش و خروش اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کا اپنا ہی حصہ ہے ؎

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں کو چراغاں کر کے چھوڑوں گا

غرضیکہ ہر شاعر نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں آزادی کی لڑائی کی آگ کو بھڑکایا۔ یہاں تک کہ مجاز جیسا لاابالی شاعر بھی اس آگ سے اپنا دامن نہ بچا سکا۔ اور صنفِ نازک کو بھی میدانِ عمل میں قدم رکھنے کے لیے اکسایا ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جوش نے گھن گرج کے ساتھ للکارا تو مخدوم نے پیار بھرے گیتوں سے۔ دانش نے اپنی سنجیدہ نظموں کو نعرہ بنایا تو احمق پھپھوندوی نے اپنے مزاحیہ اشعار سے کام لیا۔ آنند نرائن ملا نے اپنی متانت بھری آواز اٹھائی تو سردار جعفری نے اپنی انقلابی نظموں سے للکارا۔ یہاں تک کہ فیض نے بھی اپنے نرم و نازک لہجے کو انقلاب کی آنچ میں تپا لیا ؎

نثار میں تری گلیوں کے، اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر جھکا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

اور پھر فیض نے تو زبان اور قلم پر لگائی ہوئی پابندی کو بھی اس طرح توڑ دیا ؎

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے
متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اس محاذ پر اردو شاعروں کے ساتھ اردو کے ادیب بھی شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ کرشن چندر سے لے کر اوپندر ناتھ اشک تک سبھی نے اپنے قلم میں انقلاب کی آگ بھر لی تھی۔ پریم چند کا آشیانہ برباد، منٹو کا شرابی، اور خواجہ احمد عباس کا "ایک پائلی چاول" اس انقلابی تحریک کی دین ہیں۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
جسم پر قید ہے جذبات پہ تعزیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار میں زنجیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز ـــــ (فیض)

جنگِ آزادی کے آخری مرحلے پر جب اردو شاعری نے آزادی کی محبوبہ کو اس طرح دلاسہ دیا تو اس کے پیروں کی زنجیریں کٹنے کے بعد اتنی ہی تڑپ اور جوش و خروش کے ساتھ اس کا استقبال بھی کیا ؎

بصد غرور و بصد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہر و نجوم ہیں نغمہ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
ہے پاک ابرِ غلامی سے آسمانِ وطن
یہ کام کر گئے آخر بلا کشانِ وطن
ابھی تو خیر سے دو چند ہوگی شانِ وطن
ابھی تو اور بھی مہکے گا بوستانِ وطن

ـــــ مجاز

صہبا شہیدوں کو ہر سو پکار آئی ہے
لہو سے جن کے یہ فصلِ بہار آئی ہے

ـــــ (ش۔ک)

(آکاشوانی ناگپور سے نشر)

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

شکیل شاہجہاں کامٹوی

کبھی کبھی وہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہئے اور کبھی وہ ہو جاتا ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔ ہونی اور انہونی کے بیچ انسان یہ کہہ کر صبر کر لیتا ہے کہ" جب جب جو ہونا ہے تب تب سو سو ہوتا ہے۔" زندگی تماشے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے یا تماشہ زندگی کے ساتھ۔ بقولِ غالبؔ ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

ہر لمحہ ہر پل کوئی نہ کوئی حادثہ تماشے کی شکل اختیار کر کے ہمارے سامنے سے گزر جاتا ہے اور ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل پڑتا ہے "یہ کیا ہو رہا ہے"۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا فرق اتنا ہے کہ نغمۂ شادی کے بعد نوحۂ غم کا سلسلہ شروع ہوا جس دن سے ہم رشتۂ ازدواج میں بندھے اس دن سے مسلسل فرمائش کا سلسلہ جاری ہے یعنی جس دن سے ہم نے مانگ بھری اس دن سے لگاتار مانگ پوری کرنے کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے ہماری بیگم کا بھی یہی حال ہے جس دن سے ہمارے پڑوس میں ٹی وی آیا ہے اس دن سے بیوی نے مسلسل ٹی وی کی فرمائش کر کے ہم کو ٹی بی کے مرض میں مبتلا کر دیا ہے۔ کب تک چھپے گی کیری پتوں کی آڑ میں۔ آخر ہم بھی بیگم کی فرمائش کو کب تک ٹالتے رہیں۔ دل کو مضبوط کر کے ایک عدد ٹی وی سیٹ ہم بھی لے آئے۔ ٹی وی سیٹ دیکھتے ہی بیگم نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا سواگت کیا۔ ہم کو یوں لگا جیسے وہ ہمارا نہیں ہماری کم ظرفی کا سواگت کر رہی ہیں۔ برسوں پہلے اسی مسکراہٹ نے ہمیں رشتۂ ازدواج میں بندھ جانے پر مجبور کیا تھا۔ کالج کا زمانہ تھا۔ عمر کا تقاضہ تھا۔ وہ ہم کو دیکھ کر مسکراتیں ہم ان کو۔ مسکراہٹ کا یہ کھیل شادی ہونے کے بعد ختم ہوا اب لوگ ہم دونوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ بیگم کی فرمائشوں کو ہم اس لئے بھی نہیں ٹھکرا سکتے کہ ان کا تعلق پہلوانوں کی فیملی سے ہے، ان کے بھائی سے لے کر ماموں جان تک سب پہلوانی کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ جہیز زیادہ لینے کے چکر میں ہم نے بیگم کے خاندان کا جغرافیہ معلوم کیے بغیر شادی کر لی۔ اور اب صبر جمیل کا پیالہ یہ کہہ کر پی رہے ہیں کہ

"اب پچھتائے کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں سارا کھیت"

گھر میں ایک عدد ٹی وی کیا آیا کہ دوست، پڑوسی، رشتہ دار سب کے تیور ہی بدل گئے۔ جو پڑوسی خفا خفا سے رہے، ہماری تعریف کرنے لگے۔ جو دوست ہم کو نظر انداز کرتے اب بار بار ہم کو پوچھتے۔ جو دور کے رشتہ دار ہیں وہ رشتے کے فاصلے کو کم کر کے قریب کے رشتہ دار بنا چاہتے ہیں۔ جو قریب کے رشتہ دار ہیں وہ اپنی قرابت کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ خیر دنیا میں تغیر نہ ہو تو شاید یہ خوبصورتی بھی نہ رہے — اتوار کا دن تھا۔ ٹی وی پر فلم آ رہی تھی۔ ہم اور بیگم مہمان نوازی میں مصروف تھے۔ کچھ نہ کچھ تو سزا ملنی چاہئے۔ پھر بھی ہم اس سزا سے خوش تھے کہ ہمارے دوست پڑوسی اور رشتہ دار ہمارے جذبات سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہماری تعریف بھی کر رہے ہیں۔ آج ہمیں یہ احساس ہے کہ رشتے بھی بدلتے ہیں، صرف رشتے ہی کیا پیار، جذبات، احساسات، نظریات سب بدل جاتے ہیں۔ اس بدلتی ہوئی دنیا کا کس سے شکوہ کریں۔ ہم خود بھی تو بدل گئے ہیں۔

سماج میں رہنا ہے تو لوگوں سے خوشگوار تعلقات بھی قائم رکھنا ضروری ہے۔ تعلقات سے فائدہ اٹھانا تو ہماری تہذیب بن چکا ہے۔ ہم تعلقات سے اس درجہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ پھر بگڑے ہوئے تعلقات کو بنانے کے لیے تعلقات کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ جہاں ہم دوسروں سے تعلقات قائم کر کے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہیں کچھ لوگ ہم سے تعلقات پیدا کر کے فائدہ اٹھانے کے لیے جٹے ہوئے ہیں — ہمارے ایک دوست ہیں جن کو پرانی چیزیں خریدنے کا بہت شوق ہے۔ بدقسمتی سے اب تک ان کی نظر ہماری بیگم پر نہیں پڑی۔ ایک دن ہمارے گھر تشریف لائے اور کمرے کے ایک گوشے میں پڑی ہماری زندگی کی طرح دھول اور گرد میں لپٹی، بے رونق، اپاہج اور کھٹارہ سائیکل کا بغور معائنہ کرنے لگے۔ وہ سائیکل کو اس طرح دیکھ رہے تھے۔ جیسے کوئی بہت خوبصورت منظر ہو جسے وہ اپنی آنکھوں میں قید کرنا چاہتے ہوں۔ ہم نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"حضور! یا تو آپ ہماری زندگی کو دیکھ لیجئے یا اس سائیکل کو۔"

تو وہ چونک کر بولے "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہ سائیکل ہماری زندگی کا ماڈل ہے۔"

تو انھوں نے دریافت کیا "کیا قیمت ہے۔"

"ہماری" ہمارے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

انھوں نے سائیکل کی طرف گھورتے ہوئے کہا "آپ تو مفت میں مہنگے ہیں۔ میں تو اس سائیکل کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا آپ خریدیں گے؟" ہمارا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ تو انھوں نے سائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا گویا سائیکل نہیں ان کی محبوبہ ہو گئی۔

ضرورت صرف ایجاد کی ہی نہیں تعریف کی بھی ماں ہے۔ ہم کو بھی روپے کی ضرورت تھی اس لیے سائیکل کی مضبوطی اور پائیداری کی تعریف کے ساتھ ساتھ ایک شرط یہ بھی رکھ دی کہ سائیکل خریدنے سے چھ مہینے تک جو بھی ٹوٹ پھوٹ ہو گی اس کو درست کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہو گی۔ ہماری تعریف اور شرط کی بنیاد پر انھوں نے سائیکل خرید لی۔ چند ہی دنوں میں وہ سائیکل سڑک پر دوڑنے لگی۔ کل تک جو سائیکل ہماری زندگی سے مشابہ تھی آج وہی سائیکل ہم سے بہت اوپر اُٹھ گئی۔ گھوڑے کے دن بھی پھرتے ہیں، سائیکل کے دن بھی پھر گئے۔ اور ہم تکتے رہ گئے۔ ٹھیک دو مہینہ، دو دن، دو گھنٹہ، دو منٹ، اور دو سکنڈ بعد وہ صاحب پھر ہمارے گھر تشریف لائے۔ اور پچھلی شرط کو دوہراتے ہوئے بولے کہ" آپ نے کہا تھا کہ چھ مہینے کے اندر جو بھی ٹوٹ پھوٹ ہو گی اس کو آپ درست کروا دیں گے۔" ہم نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے بتایا کہ" سائیکل چلانے کے دوران میری بائیں ٹانگ اور دو دانت ٹوٹ گئے ہیں۔" ان کے اس سوال پر ہم چونک پڑے اور سوچنے لگے کہ اسے کہتے ہیں تعلقات سے بھرپور فائدہ اٹھانا۔

کسی سمجھدار شخص نے کیا خوب کہا ہے کہ "کچھ لوگ عظیم پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی محنت اور لگن سے عظیم بنتے ہیں۔ اور کچھ لوگ زبردستی عظیم بنا دیے جاتے ہیں۔" یہی فارمولا شاعروں پر بھی لاگو ہوتا ہے کہ کچھ شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی محنت اور لگن سے بنتے ہیں اور کچھ زبردستی شاعر بنا دیے جاتے ہیں۔ زبردستی بنانے میں دوستوں اور کرم فرماؤں کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ جو محض ناشتہ اور چائے کی خاطر بے وزن اور بے معنی اشعار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست "علامہ درشن" بھی دوستوں کی ایسی ہی سیاست کے شکار ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہندوستان

کا عظیم ترین شاعر تصور کرتے ہیں۔ غالبؔ و اقبالؔ کے اشعار کو اپنا بناکر محفلوں میں پیش کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ اتنا حوصلہ آج تک ہم نے کسی شاعر میں نہیں دیکھا۔ ایک دن ہمارے پاس آئے اور بولے "کل رات جب میں نے سنا کہ آپ کے پڑوسی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے تو مجھے بڑا افسوس ہوا اور اسی افسوس کے موڈ میں میں نے ان کے نام ایک تعزیتی نظم لکھ ڈالی۔" ہم حیرت سے ان کو دیکھنے لگے انھوں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میری یہ خواہش ہے کہ جلد از جلد یہ نظم کسی اخبار میں چھپ جائے۔" ہم نے کہا "بہت خوب آپ چاہتے ہیں کہ وہ صاحب جلد از جلد دنیا سے رخصت ہوجائیں اور آپ کی یہ تعزیتی نظم اخبار کی زینت بن جائے۔" یہ سنتے ہی وہ صاحب فوراً اٹھے اور تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

کہتے ہیں دکھ درد سنانے سے کم ہوتے ہیں۔ بیشک سنانے والے کے کم ہوتے ہیں لیکن سننے والے کے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نما پڑوسی ہیں جو آفس کی ساری باتیں سب سے پہلے ہم کو سناکر ہمارا دکھ بڑھا جاتے ہیں۔ ایک دن ہم آفس سے لوٹے تو وہ صاحب جن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں بیسویں صدی کی طرح گم صم، مایوس، اداس، غور و فکر میں غرق کمرے میں بیٹھے ہمارا انتظار کر رہے تھے ان کی اس حالت کو دیکھ کر ہم نے بھی اپنے چہرے پر سنجیدہ رنجیدہ اور مصیبت زدگی کا پاوڈر مل لیا۔ ان کا دکھڑا سننے کی غرض سے از راہ ہمدردی اپنا ہاتھ ان کے شانوں پر رکھتے ہوئے بولے "کیا بات ہے یونس بھائی؟" انھوں نے نہایت گمبھیر لہجے میں کہا "میرے آفس کے ایک ساتھی نے مجھے گدھا کہا۔"

"کب کی بات ہے؟" ہم نے دریافت کیا۔

"ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔" انھوں نے اسی گمبھیرتا سے کہا۔

ہم نے تمسخر آمیز لہجے میں کہا "تو اب آپ یہ فیصلہ کر پائے ہیں کہ آپ گدھے نہیں ہیں۔" وہ صاحب اسی گمبھیر لہجے میں بولے "مذاق چھوڑو یار مجھے کچھ سوچنے دو" اور ہم ان کو مزید سوچنے کا وقت دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

(ناگپور سے نشر)

شکیل شاہجہاں کامٹوی
وارث پورہ۔ کامٹی ضلع ناگپور ۴۴۱۰۰۱

آواز کی قیمت
فی کاپی ——— ایک روپیہ
سالانہ ——— ۲۲ روپے
دو سال ——— ۴۲ روپے
ترسیل زر کا پتہ
چیف ایڈیٹر
آکاشوانی گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو
۲ فلور، پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱

جدید اردو افسانے پر مغربی ادب کے اثرات

عشرت بیتاب

سب سے پہلے تو اس بات کا اعتراف کرلینا ضروری ہے کہ جدید افسانے کے آغاز کی قطعی تاریخ کا تعین کرنا ناممکن ہے اور پھر اس پہ اس بات کی قطعی تحقیق کہ ان پر مغربی ادب کے اثرات کب سے ہونا شروع ہوئے۔ جہاں تک اردو افسانے میں جدید رجحان یا نئے فن کے مظاہرے کا تعلق ہے اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کہ اردو افسانے کا نیا موڑ اور روایت میں توسیع "انگارے" کی اشاعت ہے۔ ا میں شامل تمام افسانے فرائڈ کے ساتھ فرانسیسی فطرت نگاروں اور مارکس ازم کے اثرات کے تحت لکھے گئے تھے۔ انگارے کے افسانے تدبیر کاری کے اعتبار سے جمیز جوائزہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس، اور فلابیئر، موضوعاتی سطح پر فرائیڈ اور نظریاتی اعتبار سے مارکس سے متاثر تھے۔

فرائیڈ کے لاشعور کی دریافت نے مغربی ادب پر ہمہ گیر اثر کیا۔ جمیز جوائس کی یولیسز شعور کی رو کی تکنیک میں لکھی گئی اور اس کے ساتھ ہی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ منٹو کی "پھندنے" بھی شعور کی رو کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس میں تحت الشعور کی منتشر خوابیدہ کیفیات کا اظہار ہے۔ اس طرح اردو میں جدید کہانی کا آغاز منٹو کے "پھندنے" سے ہی ہوتا ہے۔ یوں تو پریم چند اور کرشن چندر بھی مغربی ادب کے اثرات سے خود کو بچا نہ سکے۔ کرشن چندر کا افسانہ "حسن و حیوان" چیخوف The Sleppe سے متاثر معلوم پڑتا ہے۔ کرشن چندر نے کسی ایک مغربی ادیب یا کسی خاص تحریک کا اثر یوں قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی روح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہو بلکہ انھوں نے وقتی طور پر مختلف طرز تحریر اور مختلف مغربی رجحانات سے دلچسپی لی۔ انھوں نے "غالیچہ" میں ایک پراسرار معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں کچھ تو ایڈگر ایلن پو کے پراسرار افسانے مثلاً Pet and the Pe-ndolum کی ہی ذہنی اذیت کی پیش کش تھی اور کچھ کافکا کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی۔ کافکا کے اثرات اس سے پہلے احمد علی کے افسانوں میں ملتے ہیں چاہے وہ "قید خانہ" ہو یا "تیرا کمرہ" یا "موت سے پہلے"۔ ان سبھی افسانوں میں The Castle اور 'The Trial' کا عکس نمایاں ہیں۔

اس کے علاوہ عزیز احمد نے بھی ایملی زولا کی حقیقت نگاری میں پناہ ڈھونڈی۔ اس کے ساتھ ہی ترقی پسندوں نے عام طور پر ٹالسٹائی، ترگنیف، دوستوویسکی، وغیرہ کو خاص کر اپنایا۔ اس زمانے میں جنسی حقیقت نگاری کا بھی ایک گروہ ابھرا جو لارنس کے پیرو کار کہلاتے۔ اس ضمن میں منٹو، احمد علی، اور عصمت چغتائی کے علاوہ ممتاز مفتی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس اسکول کی تھوڑی بہت پیروی حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی کی۔

بیدی کے افسانوں میں بھی چیخوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے یوں تو حیات اللہ انصاری، محمد حسن عسکری اور غلام عباس کے یہاں بھی چیخوف کے رنگ ملتے ہیں۔ لیکن چیخوف کے افسانوں کی فضا، رنگ اور لہجہ بیدی کے یہاں نمایاں ہیں۔ چیخوف کی کی کہانیاں کہرے کی مانند ہیں جو روح کے اندر ہی اندر رلتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے ایک لطیف جسم میں ڈھل جاتی ہیں۔ اردو افسانے میں یہ رویہ راجندر سنگھ بیدی (جوگیا، صرف ایک سگریٹ) اور غلام عباس (اوورکوٹ، سایہ) کے یہاں شعری سی فضا پیدا کرنے والے اور نئے آہنگ کا باعث بنا۔ اس تدبیر کاری کی اہم خصوصیت نیم علامتی انداز ہے۔ بیدی کے "لاجونتی" میں بھی یہی چیخوفی کیفیت پائی جاتی ہے۔

منٹو نے جہاں فرائیڈ کی نمائندگی کی ہے وہاں بعض افسانوں میں موپاساں کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ موپاساں کو پڑھنے کے بعد جو تصور سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، غلاظت اور حیوانیت ہے لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔ منٹو کے ہاں، دوسرے دور کے افسانوں میں خصوصیت سے انسان کی یہی تصویر نظر آتی ہے۔ منٹو کے موضوعات بھی موپاساں کے انسان کے وحشیانہ، ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں، جنس، شہوانیت، ظلم، قتل و خون، تیز ہیجانی جذبات، غیر معمولی واقعات اور غیر معمولی انوکھے کرداروں کے ساتھ منٹو نے چونکا دینے والے افسانے تخلیق کئے۔ منٹو کے ایک آدھ افسانے میں گورکی کا اثر بھی ملتا ہے۔

محمد حسن عسکری کے افسانوں میں بھی مغربی ادب کی جھلک نمایاں ہے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے مجموعہ "جزیرے" کے دیباچے میں کیا ہے کہ ان کا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے "اسکول مسٹرس" اور "چائے کی پیالی"، "ایلیٹ" سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ورجینا وولف کو اپنا آئیڈل بنایا۔ قرۃ العین حیدر اردو کی ایک ایسی خاتون افسانہ نگار ہے جس نے مغربی ادب سے بھرپور اثر قبول کیا۔ ان کے افسانوں میں کردار مختلف رنگوں میں، مختلف تاریخوں اور تہذیبوں سے گزر کر اپنی شناخت کراتا ہے ان کے افسانوں میں "فوٹو گرافر" "آوارہ گرد" اور "تار پر چلنے والی" میں مٹی ہوئی تہذیب کے گمشدہ نقوش کی تلاش کو موضوع بنایا گیا ہے۔

وجودیت ـــــ جنگ کے بعد کی سب سے عظیم تحریک بنی ـــ ادب میں یہ تحریک سارتر کے ذریعہ آئی۔ اس کے بعد البرٹ کامیو نے کہیں زیادہ بہتر طور سے اس کو پیش کیا۔ اردو میں انتظار حسین کو اس اسکول کا نمائندہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کا افسانہ "چاند گہن" اسی کیفیت سے دوچار ہے۔

رومانیت کی تحریک مغربی ادب کی دین ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ اس فکری تناظر میں ترتیب پاتی رہی ہے۔ اختر اورینوی کے بیشتر افسانے اس کی نمائندہ مثالیں ہیں "بال جبرئیل" اور "کچلیاں" میں اس مغربی طریقہ اظہار کا بھرپور عکس ملتا ہے۔

گو مغرب کے کئی ادبی رجحان اور تحریکیں ہمارے نئے ادب اور خصوصیت سے افسانہ پر اثر انداز ہوئیں لیکن ہمارے ادب میں یہ مختلف رجحان الگ الگ مجموعی تحریکوں کے طور پر نہیں ابھرے بلکہ ہمارے چند منفرد شعوری فنکاروں نے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ یا کم از کم ان رجحانوں کے زیر اثر چند تجربے کئے۔

کیتھرائن نے شاعرانہ نثر میں نفسیاتی کش مکش کو خوبصورتی سے رکھا۔ غیاث احمد گدی کے ہاں بھی یہی شہری زندگی کی عکاس ابنارمل نفسیات کے افسانے ہیں۔ جن کی مثالیں "تج دو، تج دو" اور "بندے خاں" جیسے افسانوں میں موجود ہیں۔ یہی نفسیاتی کش مکش رتن سنگھ کے یہاں "دکھ کی عمر" اور "آخری اداس آدمی" میں بھی عیاں ہے۔

انور عظیم، اقبال متین کے افسانے زیادہ تر ترگنیف کے افسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں انسان بے چہرگی کا شکار ہو گیا ہو۔ یا انسان کے ٹوٹاؤ کا ذکر ہو۔

اقبال مجید کی افسانوی تدبر کاری روایت اور جدت کا توازن سامنے لاتی ہے تہذیبی اقدار کی شکست و ریخت کا سنجیدہ مطالعہ اقبال مجید کا موضوع خاص رہا ہے جس کی مثال "دو بھیگے ہوئے لوگ" اور "پیٹ کا کیچوا" ہیں۔ غرضیکہ اقبال مجید کے یہاں واقعات اہم نہیں، کردار اہم ہیں، اور ترگنیف کی کردار نگاری کی طرف توجہ دلاتی ہے۔

سریندر پرکاش کا بنیادی موضوع انسانی باطن کا اندرونی اجاڑپن اور ویرانی کا شدید احساس ہے جسے ہم کافکا کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے لیے "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" کے افسانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں اندرونی اجاڑپن اور ویرانی کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔ علامتوں کا ایک پورا نظام کارفرما نظر آتا ہے۔ افسانہ میں فرد اپنے ایک سفر میں پا پیادہ ہے اور یہ سفر فرد کی اپنائیت سے صنعتی عہد کے بنجرپن تک کا سفر ہے۔

ظفر اوگانوی، روسی ادیب الکزینڈر سولی زلیٹن سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ "بیچ کا ورق" کے بیشتر افسانے اس جلا وطن ادیب کے احساس اور جذبات و خیالات کے پرتو میں تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

جدید افسانے میں ایک نام بلراج مین را کا ہے۔ مین را نے مغربی ادب سے بڑا گہرا اثر قبول کیا ہے۔ مین را کے افسانوں میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعری کا گمان گزرتا ہے۔ اور موضوعات میں مارکس کو اپنا رہنما بنائے ہوئے نظر آتا ہے۔ کمپوزیشن سیریز کی کہانیاں شعور کی رو کی تکنیک کی عمدہ مثال ہیں

بلراج مین را کے ہمقدم جو افسانہ نگار ملتے ہیں، ان میں شفق، شوکت حیات، اور انور خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شفق نے "بنجا ہوا گلاب" میں۔ انور خاں نے "چھپر" میں، اور حسین الحق نے "آتم کتھا" میں جن مکاتیب فکر کو اپنایا ہے وہ فرانسیسی علامت نگاروں کی دین ہے۔ شوکت حیات کی کمپوزیشن سیریز کی کہانیاں بھی اسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں۔

برٹرنڈرسل بنیادی طور پر ایک فلسفی تھا اور اس کے فلسفیانہ افکار نے اردو افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ ان کے وہ افسانے جو ان کے فلسفیانہ طرز نگارش کا اظہار بن کر تخلیق ہوئے۔ مغربی ادب میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ اردو کے جن افسانہ نگاروں کے یہاں فلسفیانہ ورتار ملتا ہے ان میں انور عظیم، اقبال مجید، عوض سعید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں موضوعات کی فلسفیانہ گیرائی انھیں نمایاں کرتی ہیں۔

وجودیت کی تحریک کے بانی ژاں پال سارتر کے افسانوں نے اردو افسانہ نگاروں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ احمد یوسف اور حمید سہروردی کی کہانیوں میں وجودیت کے اثرات اس طرح ملتے ہیں جو اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں عنقا ہیں۔ بھیڑ میں اپنی تلاش، اپنے گم ہو جانے کا احساس، اپنے وجود کا اقرار، اپنی گمشدہ شخصیت اور اپنے نہ ہونے کا گمان ایسے موضوعات ہیں جو اردو کے ان افسانہ نگاروں کے یہاں ملتے ہیں۔

لینن کے اس قول نے کہ انقلابی قوتوں کو جب پوری طرح ابھرنے کا موقع نہیں ملتا ہے تو زندگی زیر آب ہو جاتی ہے۔ ہمارے اردو کے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ کلام حیدری، سلام بن رزاق، اور جوگندر پال کے افسانوں کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ جوگندر پال کا "پاتال" کلام حیدری کا "لا" اور سلام بن رزاق کا افسانہ "کالے ناگ کے پجاری" میں سماجی حقیقتیں نفسیاتی الجھنیں، اور معاشرتی ناہمواریوں کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

قمر احسن اور انیس رفیع اردو کے دو ایسے فنکار ہیں جنھوں نے البرٹ موراویا، مارکس، جیمس جوائس سے زیادہ اثر قبول کیا۔ قمر احسن کے افسانوں کی تکنیک، موضوعات کا انتخاب، کرداروں کی نمائندگی۔ یہ سب البرٹ موراویا کے انداز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انیس رفیع کے افسانوں میں مارکس ازم کے نظریات کی عکاسی ملتی ہے "اب وہ اترنے والا ہے" میں شامل بیشتر افسانے اس مکتبۂ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مغربی ادب نے جو رجحان اور تحریک دی ہے اس کے اثرات اردو افسانوں پر ملتے ہیں۔ مغربی افسانہ نگاروں کی تکنیک، موضوعات، کردار نگاری اور طرز اظہار اردو افسانہ نگاروں کے یہاں ملتے ہیں اس طرح مغربی ادب کے مفکرین، فلسفیوں، دانشوروں کے افکار و خیالات بھی کسی نہ کسی طرح سے اردو افسانہ نگاروں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں قطعی عار نہیں کہ اردو افسانہ نگاروں نے مغربی ادب کا بھرپور اثر قبول کیا ہے۔

(کلکتہ سے نشر)

عشرت بیتاب
ماسدی محلہ، ریلوے کراسنگ
آسنسول ۷۱۳۳۰۲

جوہر وارثی

رنگین فضاؤں میں الجھانے چلے آئے
کچھ شوخ پرندے پھر بہکانے چلے آئے

جھونکے ہیں حوادث کے آہوں کے بگولے ہیں
اس عرصۂ ہستی میں ویرانے چلے آئے

الفاظ کے گل بوٹوں سے بہلیں بھی کہاں تک ہم
اپنے جو ہوئے رخصت بیگانے چلے آئے

پھر دل کی فصیلوں پہ زخموں سے چراغاں ہے
پھر جھومتے یادوں کے پروانے چلے آئے

تنہائی معطر ہے پھر لمس کی خوشبو سے
قربت کے حسیں لمحے تڑپانے چلے آئے

اس جرم پہ سر اپنا ہے وقت کے نیزے پر
ماضی کے فسانے ہم دہرانے چلے آئے

تھا ان کا مقدر بھی پل بھر میں بکھر جانا
شیشے کے مکانوں میں انجانے چلے آئے

گلشن میں چمکتے تھے جو حسن کے آئینے
کیوں آج بیاباں میں مرجھانے چلے آئے

زخموں سے لہو میرے پھر رسنے لگا جوہر
وہ پھول تبسم کے برسانے چلے آئے

(گورکھپور سے نشر)

ایک آسیبی کہانی

احسان تابش

رات کے آدھے پہر سنسناتی ہواؤں اور اپنے سایہ سے بچتا ہوا میں ماضی کے گہرے سمندروں میں غوطے لگا رہا ہوں۔ غوطہ لگانا ہی میری زندگی ہے۔ سمندر کی آغوش میں ویران کھنڈر، ان کھنڈروں سے نکلتی آواز۔ اور پھر کھنڈر اور سمندر کے درمیان جھولتا میرا وجود ـــــ

یہ کھنڈر کبھی راجاؤں کا محل تھا۔ جہاں شہنائی بجتی، رقص ہوتا، جام پر جام چلتا اور پھر رات کے آدھے پہر، نیم برہنہ پرشباب جسم، جلتے بدن، یا..... یا..... یا..... اور پلاؤ ـــ اور ..... لڑکھڑاتی آواز..... آپس میں مدغم سرگوشیاں ـــ "

اور پھر ایک تڑپتا انسان شبِ تاریکی کو الوداع کہتا۔

بولتے کھنڈرات ساکت ہو گئے۔ رات کے آدھے پہر چیختے گھنٹے کی آواز۔ اور ان گھنٹے کی آواز دبی، سسکتی، دم توڑتی ایک نسوانی چیخ ـــــ میں پاگلوں کی طرح ہانپتا کانپتا بے تحاشہ کھنڈرات کی جانب دوڑتا چلا جا رہا ہوں۔ لیکن مجھے پتہ نہیں کہ میں بوسیدہ سے کھنڈر کی طرف جا رہا ہوں یا بوسیدہ کھنڈر میری جانب چلا آ رہا ہے۔

ماضی

سمندر

کھنڈرات

نسوانی چیخ

اور پھر اس نسوانی چیخ کو دبانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی گھنٹے کی آواز..... اب میرا سایہ مجھ سے بے وفائی کر رہا ہے نہیں یہ نہیں ہو سکتا ـــ میرا سایہ ـــ اس کا سایہ ... اور دونوں سایوں کے درمیان بوسیدہ کھنڈرات سے نکلتی ہوئی نسوانی چیخ ـــ میرا سایہ ـــ بڑھا، لمبا ہوا، چھوٹا ہوا اور پھر نقطہ نما بن کر میری آنکھوں سے اوجھل ہی ہونا چاہتا ہے کہ میں اس نقطہ نما سائے کو اپنے گریباں میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا نقطہ نما سایہ کے پیچھے بھاگتا رہا....

وہ سایہ....

ہاں وہ سایہ میرے ہاتھوں کی گرفت میں آتے ہی چند منٹوں میں مکمل سایہ بن گیا۔ اور میں اب اپنے سایہ پر سوار اور کھنڈرات کی بوسیدہ دیواریں میری گرفت میں ـــــ میں کھنڈروں کی بوسیدہ دیواروں کا سہارا لیے آگے بڑھتا رہا کہ آگے بڑھنا ہی زندگی ہے۔

۱۶ر جنوری ۱۹۸۷ء

اندھکار بڑھتا رہا۔ کائنات کی ہر شئے ساکت... اور میں آگے بڑھتا رہا، پھر کسی شئے سے ٹکرایا، چکرایا، اور گر پڑا ـــ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا، اور پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شئے کو دیکھنے لگا۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ـــ یہ نہیں ہو سکتا ـــ ویران کھنڈروں میں ایک بھرپور شباب، آنکھوں کو خیرہ کرتا حسن..... اس کا یہاں کیا کام؟

اور پھر دھندلکوں کی چادر تار تار ہو گئی اور میں حیران رہ گیا۔ وہ قلوپطرہ کا مجسمہ نہیں، سایہ تھا۔ پھر سایہ مٹ گیا، سایہ کی جگہ انسانی شکل نے اختیار کر لی۔ اور وہی پرشباب جسم کی مالک ایک خوبصورت عورت بت بنی طنز بھری مسکراہٹ بکھیرتی میری راہ میں دیوار بنی کھڑی تھی۔

آسمان پر کالے اور بھیانک بادل گویا کائنات کو نگلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رات تاریک، دور دور تک سناٹے کی بھیانک موجیں ہہ ہہ کرتی گزر رہی تھیں اور ویران بوسیدہ کھنڈرات کے سایہ تلے ایک نوجوان تنہا لڑکی کھڑی تھی اور دوسری جانب اُگی جھاڑیوں میں جھینگروں کی سائیں سائیں اس ویرانی میں اور اضافہ کر رہی تھی۔ میں گھبرایا ہوا جیوں ہی آگے بڑھنا چاہتا ہوں ویسے ہی بھوت بول اٹھا۔

"چلو ڈھلتی راتوں میں محل کی رنگینیاں صدیوں سے تمہاری منتظر ہیں" اور پھر اس کی نرم گداز سی باہیں آگے بڑھیں اور میری بانہوں میں جذب ہو گئیں۔ اور اب میں اس کی نرم بانہوں کا سہارا لیے آگے بڑھ رہا ہوں۔

اب بوسیدہ سے محل کے سامنے میں اور وہ کھڑے تھے۔ جہاں قندیلیں جل رہی تھیں، شہنائیاں بج رہی تھیں، جام کا دور چل رہا تھا۔ رقص اپنے شباب پر تھا اور آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر کا سماں تھا۔ جب میں اس کی نرم باہوں میں باہیں ڈالے محل کے اندر پہنچا تو سب کے سب ساکت ہو گئے۔ اور اسی درمیانی لمحے میں اس کی نرم باہوں میں جنبش ہوئی اور میں اس کے ہمراہ تاریک راہوں سے گزرتا ہوا راجاؤں کی خلوت میں جا کھڑا ہوا۔ ارے یہ کیا ـــــ میری باہیں ٹیڑھی میڑھی شکل اختیار کرنے لگیں۔

میری بانہوں میں کوئی بانہہ نہیں تھی۔

میں اکیلا تن تنہا بادشاہوں کی شبستانوں میں ان کی خلوتوں میں کھڑا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ دیکھنے کے علاوہ چارہ کیا تھا۔

ویران کھنڈر کا سناٹا میرا منہ چڑا رہا ہے۔ قالین بچھی ہے، صوفے لگے ہیں۔ دیواروں پہ عریاں تصویریں چسپاں ہیں۔ ایک سمت مسہری پھولوں سے لدی ہے۔ رنگ برنگ کے جھلملاتے پردے حرکت کر رہے ہیں۔ دوسری سمت ہری، لال، گلابی، بلو، پیلی روشنیاں جلتی اور بجھتی اپنا سفر طے کر رہی ہیں۔ لال اور ہری بتی کا ملاپ ہوتے ہی ہلکی ہلکی موسیقی چھڑ جاتی ہے۔ رسیلے نغموں کا سہارا لیے اب میں کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا ہوں کھڑکی کے ٹھیک بائیں جانب پہاڑی جھرنوں سے بہتا ہوا پانی نشیب میں آ کر چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں تبدیل ہو کر دوسری جانب نکل جاتا۔ ان جھیلوں میں تیرتے ہوئے سفید اور گلابی کنول اور جھیلوں کے کنارے لگے ہوئے نیلوفر ایک عجیب فرحت انگیز سرور بخش رہے تھے۔ اور پھر دائیں جانب پُل کے محرابوں سے گزرتا ہوا پانی کسی چنچل شوخ نوخیز حسینہ کی طرح اچھلتا کودتا نشیب میں گرتا ہوا بہتا رہا۔ دور دور تک پھیلے ہوئے چنار کے درخت ـــ نیچے کھلے میدان میں کھڑا ویران بوسیدہ سا کھنڈر ـــ اور کھنڈر کے خلوت میں کھڑا میں ـــــ اور صورت حال کو سمجھنے کی ناکام کوشش کرتا ہوا میرا وجود ماضی کے گہرے سمندروں میں غوطے لگاتا رہا۔

اسی درمیان خلوت کا دروازہ ایک شور کے ساتھ بند ہوا۔ میرے خیالوں کا طلسم ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اور اب میں جیسے ہی مڑنا چاہتا ہوں پھر وہ کافر شباب ـــــ نیم برہنہ کھڑی باہیں پھیلائے۔ قریب اور قریب ـــ یہاں تک کہ بالکل قریب آ گئی۔ اور پھر اچانک میں بھی نیم برہنہ ہو گیا۔ پھر کیا تھا دونوں کی باہیں ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ جسم دھند کے جانے انجانے دائروں میں جکڑتا رہا۔ پھسلتے قدم، سرخ سبز جلتی بجھی بتیاں۔ اور ہلکی بھینی بھینی خوشبوؤں کے گھیرے میں وہ مجھے ہر زاویے سے قید کرتی رہی۔

اچانک گرم گرم سانسوں میں ابلتے الفاظ ـــ ان ویران کھنڈروں میں ہر رات میں اپنے بادشاہ کو ڈھونڈتی رہی۔ آخر میں نے اپنے بادشاہ کو پا ہی لیا۔ میں نے اپنے بادشاہ کو حاصل کر ہی لیا۔ وہ بڑبڑاتی رہی، پھر اس کے گرم گرم دہکتے ہوئے سرخ لب میرے لب پر جھک گئے۔

اور میں ان ویران محلوں میں ایک دن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ پھر قندیلیں گل ہو گئیں۔ تاریکیوں کا سایہ بڑھتا رہا۔ نیم برہنہ جسم تڑپتے پھڑپھڑاتے انسان میں اترتا رہا۔ وہ ہر زاویے سے مجھے قید کرتی رہی۔ اور میں گہرے سمندر میں غوطے لگاتا رہا کہ غوطہ لگانا ہی زندگی ہے۔

رعایا ان راجاؤں سے بدظن ہوتی گئی۔ اور ایک دن رعایا نے محلوں پر چڑھائی کر دی۔ محل کھنڈر میں تبدیل ہو گئے۔ اب صرف میں ہوں اور میری آغوش میں راجاؤں اور کنیزوں کی تڑپتی ہوئی روحیں ـــ رات کے آدھے پہر چیختے ہوئے گھنٹے کی آواز ـــ بولتے کھنڈرات سات ہو گئے، اور پھر نسوانی چیخ فضا میں ابھری۔

نسوانی چیخ سنتے ہی میری خمار آلودہ آنکھیں کھلیں، میری بانہیں پھڑ پھڑاتے ہوئے نرم بانہوں کو تلاش کرنے لگیں۔ میری

آنکھیں توبہ شکن جوانیاں تلاش کرنے لگیں۔ میرے سارے اجزا اس کے لچیلے جسم کو تلاش کرنے لگے۔ اور میں ایک رات کا بادشاہ بوسیدہ کھنڈرات کے باہر پڑا کراہ رہا ہوں۔ تڑپ رہا ہوں۔ گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔ جہاں چند گھنٹوں پہلے شہنائیاں بج رہی تھیں۔ وہاں اب سارے در و دیوار اداس اداس سر جھکائے میری آنکھوں کے سامنے کھڑے ہیں۔ دوسری جانب محکمۂ جنگلات کے کرمچاری اور جنگلوں میں بسے ہوئے گاؤں والوں کا ہجوم حیرت ناک چہرہ لیے ایک ٹک مجھے دیکھے چلا جا رہا ہے۔ اچانک چند گاڑیاں آ کر رکیں۔ جس میں سے میرے ساتھی باہر نکل آئے اور ہمارے سامنے آتے ہی بول پڑے۔

سر! آپ اور یہاں ——؟

ہم لوگوں نے سر! آپ کو کہاں نہیں تلاش کیا۔ لیکن مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ رات کے آدھے پہر آپ اِدھر کیسے نکل آئے سر؟

وہ سب کے سب پریشان تھے اور میں عریاں جسم کو جھاڑیوں میں چھپائے ان سب لوگوں کو دیکھ رہا ہوں — آوازیں سن رہا ہوں۔ مگر بول نہیں پا رہا ہوں۔ میں ابھی ایسے ہی کش مکش سے دوچار تھا کہ اسی درمیان ساتھیوں کے ہاتھ جیسے ہی مجھے اٹھانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، میں بول پڑتا ہوں۔

نہیں نہیں — رکو — کہیں سے کپڑوں کا انتظام کرو — یہ سنتے ہی سبھوں نے نگاہیں جھکا لیں۔ اور پھر کسی نے اپنے بیگ سے چادر نکال کر میری طرف بڑھائی۔

چادر سے بدن ڈھانپ کر میں جیپ پر آ بیٹھا۔

اور جیپ چل پڑی۔

راستے میں میرے ایک کلیگ نے کہا۔

"دیکھ لیا نا، بات نہ ماننے کا نتیجہ۔ ہم لوگ منع کر رہے تھے، مگر تم اپنی ضد میں کسی کی سنتے کہاں ہو؟ — ہم سب کو تو اسی پر حیرت ہے کہ تم بولتے کھنڈرات سے زندہ کیسے نکل آئے؟"

میرا ایک ماتحت بولا۔ "سر! وہاں آپ کے ساتھ کیا گزری؟"

دوسرے ماتحت نے کہا۔ "سر! آپ بہت خوش قسمت ہیں، ورنہ آج تک وہاں جانے والا کوئی زندہ واپس نہیں لوٹا۔"

میرا افیسر دوست شاید بہت غصّہ میں تھا۔ وہ پھر جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تم کو تو اقدام خودکشی کے جرم میں قید کر لینے کو جی چاہتا ہے۔"

میرا جی چاہا کہ اس سے کہوں "پہلے وہاں جو قید ہے اس کو رہائی تو دلا دو۔" مگر میں کچھ نہ بول سکا۔

باہر چاروں طرف جنگل کی بھیانک رات بکھری پڑی تھی۔ اور جیپ جنگل کا سینہ چیرتی اپنے ٹھکانے کی طرف بھاگ رہی تھی!!!

(پٹنہ سے نشر)

احسان تابش
نیو کریم گنج۔ گیا ۸۲۳۰۰۱

بیتے لمحوں کی کسک

افتخار عظیم 'چاند'

جس مکان میں میرا دفتر تھا، وہاں دو بچے رہتے تھے وہ دونوں بھائی بہن تھے۔ ایک بچے کا نام نیّر اور دوسری جو بچی تھی اس کا نام فرح تھا۔ دونوں بہت ہی معصوم اور نیک تھے۔ اور مجھ سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ دونوں مجھ کو انکل کہہ کر مخاطب کیا کرتے۔ میں بھی ان دونوں کو بیحد پیار کرتا اور ان کے ساتھ شفقت سے پیش آتا تھا۔ میں ان کے گھر کے ایک فرد جیسا ہی لگتا تھا۔ اور وہ دونوں بچے —— نہیں لگتے تھے کہ غیر ہیں۔ بالکل اپنوں جیسے لگتے تھے۔ میرے آفس کا ایک شخص جو بہت مغرور اور کینہ پرور تھا ہم لوگوں کی میل جول اور قربت کو دیکھ کر دل ہی دل میں حسد کرتا تھا اور بچوں کے والدین سے میری جھوٹی شکایت کر کے ان کو میری طرف سے بدگمان کرتا تھا اور اپنا الّو سیدھا کیا کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچے میرے پاس آیا کریں اور بچوں سے میری قربت و محبت بڑھے۔ پھر بھی بچے میری شرافت اور شفقت سے اتنا زیادہ متاثر تھے کہ مجھ سے ہمیشہ قریب رہتے۔ ان بھائی بہن کے علاوہ بھی آس پاس کے تمام بچے مجھ سے بیحد مانوس تھے۔ اور مجھ کو ماموں ماموں کہا کرتے تھے۔ پاس پڑوس کے بچوں اور بچیوں سے اپنائیت اور بچوں کو میرے پاس آتے جاتے دیکھ کر ایک دن نیّر کے پاپا اور ممّی نے ہنستے ہوئے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا بات ہے مختار صاحب —— تمام بچے آپ کے بہت قریب ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا تھا کہ بچوں سے شفقت و محبت سے پیش آنا سنّتِ رسولؐ ہے اور ہمارے رسولؐ عربی بھی بچوں سے کافی شفقت رکھتے تھے۔

اچھی تعلیم دلانے کے لیے نیّر کے والدین نے اس کا داخلہ دوسرے شہر کے ایک بڑے اور نامی اسکول میں کرا دیا تھا۔ اور وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اپنے گھر، والدین اور مجھ سے دور چلا گیا تھا۔ لیکن وہ مجھ کو بھولا نہیں تھا بلکہ اس نے ایک بغیر ٹکٹ لگا خط لکھ کر مجھ کو یاد کیا۔ میں بھی اس کو برابر خط سے یاد کرتا اور اپنے خط کے ساتھ جوابی لفافہ بھیج دیتا۔ گرمشتہ گرمی کی تعطیل میں وہ اپنے گھر آیا تھا۔ گرمی کی چھٹی کافی طویل تھی۔ اسی ایام میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا تھا اور ہم لوگ روزہ رکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی نیّر بھی روزہ رکھتا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ افطار کرتا اور نماز پڑھتا میں اسے وضو بنانے کا طریقہ اور نماز ادا کرنے کی ترکیب سکھاتا۔

ایک دن گرمی بہت سخت تھی۔ شدید لُو چل رہی تھی۔ گرمی نے سبھوں کو پریشان اور نڈھال کر دیا تھا۔ میں بھی کافی مضمحل اور پیاس سے نڈھال ہو کر رہ گیا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ اور میں بیحد نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ پیاس برداشت سے باہر ہو گئی تھی اور جب قوت برداشت جواب دینے لگتی تو میں روزہ توڑ دینے کا قصد کرتا۔ لیکن پھر خود کو سنبھالتا۔ میں نے کئی دفعہ اپنا ارادہ نیّر پہ ظاہر کیا۔ وہ بیچارہ خود بھی روزہ رکھے ہوئے تھا لیکن مجھ کو یہ کہہ کر سمجھاتا کہ اب روزہ کھولنے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ پھر میں وقت کاٹنے کے لیے اس کو بزرگانِ دین کی کہانیاں سنانے لگا۔ اس دوران میں نے کئی بار روزہ توڑنا چاہا لیکن اس نے بار بار مجھ کو سمجھا کر ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں اس کے صبر و استقلال اور عزم کو دیکھ کر پانی پانی ہو رہا تھا۔ جب افطار میں صرف آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا تو وہ افطار کا اہتمام کرنے چلا گیا۔ میں بھی اِدھر مُنہ ہاتھ دھو کر اور وضو بنا کر فارغ ہو چکا تھا اس نے بازار جا کر برف لایا اور خود اپنے ہاتھوں سے برف ڈال کر شربت کا ایک جگ تیار کیا۔ دسترخوان بچھا کر افطار کا سامان مع شربت کے جگ کے رکھا اور خود بھی وضو بنا کر اور ٹوپی سر پر رکھ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ میری تو حالت دیگر گوں اور بالکل بُری تھی۔ میں بار بار چاہ رہا تھا کہ پانی پی لوں۔ لیکن نیّر مجھ کو سمجھاتا رہا کہ اب وقت ہو چلا ہے۔ خدا خدا کر کے وقت ہوا اور ہم لوگوں نے روزہ کھول کر افطار کیا۔ میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ لہٰذا دوسرے روز سے میں نے روزہ رکھنا چھوڑ دیا لیکن وہ روزہ رکھ رہا تھا اور مجھ کو بھی رکھنے کی تلقین کرتا۔ میں اس کی ہمت و عزم اور صبر و استقلال دیکھ کر کافی شرمندہ تھا۔

ان دنوں میں موروثی جائیداد کے بٹوارے کو لے کر دو مقدموں میں بُری طرح الجھا ہوا تھا اور اپنے سگے چچازاد بھائیوں سے مقدمہ لڑ رہا تھا۔ نیّر نے مجھ سے کہا تھا کہ گھبرائیے نہیں مختار انکل —— آپ ضرور دونوں مقدمے جیت جائیں گے۔ میں نے نیّر کے والدین سے وعدہ کیا تھا کہ اگر مجھ کو دونوں مقدمے میں کامیابی ملی تو میں نیّر کو سیر کرانے کے لیے کشمیر لے جاؤں گا۔ اور دونوں چچا بھتیجہ کشمیر جنت بے نظیر کی سیر کریں گے۔ نیّر کی دعاؤں سے مجھ کو ایک مقدمہ میں فتح حاصل ہوئی۔ لیکن اپنی بدقسمتی سے

لہولہان انگلیاں اور پیپل

خورشید حیات

میں کرسی پر بیٹھا تھا اور میری انگلیاں ٹیبل پر رکھے سرخ کاغذ پر رقص کر رہی تھیں۔

میرے کمرے میں میرے علاوہ دو آنکھیں اور تھیں جو میری انگلیوں کے رقص کا محاسبہ کر رہی تھیں۔ میری انگلیوں کا رقص جاری تھا اور میرا ذہن بس ایک نقطہ پر مرکوز تھا۔ اچانک کسی نے دروازہ پر دستک دی اور پھر انگلیوں کا رقص تھم گیا۔ میرے قدم دروازہ کی طرف بڑھے، دروازہ کھولا تو سامنے دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

کیا چاہتی ہیں یہ آنکھیں ——— ؟

شاید میری آنکھ کے Retina پر کچھ تصویروں کی کھوج میں تھیں۔

اچانک کمرے کا سبز بلب جلنے اور بجھنے لگا۔ سبز بلب کے جلنے بجھنے کا سلسلہ جاری تھا اور دروازہ کے پاس دو آنکھوں کا .....

میں کمرے کی چہار دیواری سے باہر کھنچتا چلا گیا۔

نامعلوم کونسی کشش تھی ان دو آنکھوں میں کہ میں کھنچتا چلا جا رہا تھا۔ میں کھنچتا چلا گیا۔

اب میں پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہوں اور میری انگلیوں کا رقص سبز گھانسوں پر ہو رہا ہے کہ پھر وہی دو آنکھیں سبز گھانسوں کے درمیان سے جھانکنے لگتی ہیں۔ پیپل کے درخت سے کچھ ہی فاصلے پر میرے کمرے میں سبز بلب اب بھی جل بجھ رہا تھا۔ اور ادھر گھانسوں کے درمیان سے دو آنکھیں مجھے بدستور گھورے جا رہی تھیں۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔

گھانسوں کے درمیان آنکھیں .....؟

بچپن میں بھوت پریت کے قصے بہت سنے تھے وہ سب اب سچ نظر آ رہے تھے۔

اچانک آواز آئی ———

تم مجھے پہچانو .....!

ہا--- ہا--- ہا... ہا... نہیں پہچان سکے نا!

میں گھبرا گیا اور دو آنکھوں کو اپنی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنا چاہا مگر کہیں کچھ نظر نہیں آیا۔ البتہ پیپل کے درخت کے پتے جو جھوم رہے تھے اب ساکت ہو گئے اور کمرے کا سبز بلب ——— ؟

پھر آواز آئی ———

تم مجھے نہیں جانتے مگر میں تم کو جانتی ہوں۔ آج میں تم سے باتیں کر کے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ تو میرا ہی کلیجہ ہے کہ میرے کھیت کی فصل مولی گاجر کی طرح کٹتی رہی، سُرخ ندی بہتی رہی، معصوم پرندوں پر ظلم ہوتے رہے، تاریخی مینار سے پرندوں کی لاشیں گرتی رہیں، بستی دھواں میں تبدیل ہوتی رہی۔

لیکن میں گھوم گھوم کر تماشائی بنی دیکھتی رہی۔

میں کبھی سوچتی ہوں کہ گھومنا بند کر دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔ چکر لگانا میری فطرت میں داخل ہے، گھومنا میری قسمت ہے اور آئے دن ہونے والے تماشے دیکھنا میرا مقدر بن چکا ہے۔

نہ جانے کتنی اولادیں ہیں میری۔ مگر ان میں سے صرف تین ہی کام کی ہیں دو تو اس دنیا کے سب سے بڑے طاقتور کہلاتے ہیں۔

مگر میری بڑی اولاد کی بدنصیبی ہے کہ اس کے پاس دولت کا انبار ہوتے ہوئے بھی وہ اس کا استعمال کرنا نہیں جانتا۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ وہ ان دونوں سے بھی زیادہ باصلاحیت ہے۔ مگر ——— کاش کہ ——— کوئی اسے احساس دلاتا۔

میری دوسری اور تیسری اولاد کے درمیان ختم نہ ہونے والی جنگ دائرے کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ تم اس کے خلاف آواز بلند کر سکتے ہو میرے بھائی! کیونکہ تم نے اپنے دادا، پردادا کی چیخیں سنی ہیں۔ تم نے ماضی میں آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتوں کو قبرستان میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے .....

تم شتر مرغ کی طرح خاموش کیوں ہو؟

امن قائم کرنے کے لیے تمہیں آگے آنا ہوگا۔

یہ میری ہی ہمت تھی کہ میرے نواسوں کے جسم دو ٹکڑے کر دیے گئے اور میں خاموش بیٹھی رہی۔ مگر کبھی کبھی مجھے غصہ بھی آ جاتا ہے۔ اور وہ طوفان اٹھتا ہے کہ معاذ اللہ۔ میرا غصہ بہت خراب ہے۔ ویسے مجھے غصہ تو کبھی کبھی آتا ہے۔

یہ آنکھوں کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس کے Retina پر دنیا کی بے شمار تصاویر بنتی ہیں مگر خود اس کی .....

میرا مطلب تم سمجھ گئے ہوگے۔

کاش کوئی آئینہ رکھ دیتا تو وہ اپنی تصویر بھی دیکھ سکتیں ——— کیا تم ایسا کرو گے؟

لیکن تم ایسا کیوں کرنے لگے؟

تم تو افسانہ نگار ہو۔ روٹی کے چکر اور حصارِ ذات سے تمہیں فرصت ملے تب تو!

لیکن نہیں، تمہیں یہ کرنا ہوگا۔

تم جادوگر ہو نا۔ جادو کے زور پر تم باطن کی تصویر بھی اتار سکتے ہو۔ وہ تصویر بھی بالکل صاف کر سکتے ہو، جو دھندلی اور پانی سے مٹ گئی ہیں۔

ہاں تمہیں کو یہ کرنا ہوگا!

بولو کرو گے نا!!

تمہاری خاموشی میرے تخیل کا امتحان لے رہی ہے۔

جلدی سے ہاں یا نہیں کہو ———

مگر نہیں! حتمی فیصلہ تم کیسے کر سکتے ہو اس کے لیے جگر چاہیے، دل چاہیے، اور وہ تم کھو چکے ہو۔ صرف تمہارا دماغ کام کر رہا ہے۔

دماغ ——— جلتا بجھتا بلب ———

دھواں سا تخیل ——— آنکھوں کو کچھ سوجھتا ہی نہیں ———

پیپل جھومتا ہے اور میری انگلیاں لہولہان ہیں۔

(پٹنہ سے نشر)

خورشید حیات
"الحیات" نیو کریم گنج۔ گیا ۸۲۳۰۰۱

میں دوسرا مقدمہ ہار گیا۔ کاش! میں دونوں مقدمہ جیت جاتا اور اپنا وعدہ پورا کرتا؟

آفس کے مالک کے غیر منصفانہ رویے اور جھوٹے وعدے سے میں کافی بدظن اور دل برداشتہ ہو گیا تھا۔ اوپر سے میں نے پورا ارادہ کر لیا تھا کہ آفس کو خیرباد کہہ دوں گا۔ میں نے اپنا ارادہ نیر پر بھی ظاہر کیا تھا۔ اس نے مجھ کو بہت سمجھایا کہ مختار انکل، آپ آفس مت چھوڑیئے اسی طرح چلاتے رہیے۔ لیکن جب میری کافی دل آزاری ہونے لگی اور میں بے حد دل برداشتہ ہو گیا تو آخر کار میں نے نیر کی موجودگی ہی میں آفس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ نیر دسہرہ کی چھٹی میں اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ مجھ کو آفس چھوڑنے کا جتنا غم نہیں ہوا اس سے کہیں ہزار گنا زیادہ غم نیر بیچارے کو میرے آفس سے چلے جانے کا ہوا۔ اور وہ بیچارہ کئی روز تک غم و ملال میں مبتلا رہا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ "دل سے دل کو راحت ہوتی ہے ....." نیر کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے یاد ہے اور تا زندگی یاد رہے گا۔

میں اس کے خلوص، ایثار اور اس کی خدمت و محبت کو کیسے بھلا پاؤں گا؟ (پٹنہ سے نشر)

افتخار عظیم 'چاند'
عظیم آباد ایکسپریس
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵ بانکی پور پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

۱۶ جنوری ۱۹۸۷ء

خوشی

عبدالصمد

اس روز راکیش سے رنجنا کی زوردار بحث ہوگئی راکیش ٹھہرا ہر وقت مست مست سا رہنے والا شاعر، محبت کی دنیا کا پجاری، حقیقت کی دنیا سے بہت دور وہ خواب اور محبت کو بہت اہمیت دیتا۔ محبت کو وہ عبادت سمجھتا اور خواب کو شخصیت کی تکمیل کی سب سے بڑی شرط۔ رنجنا کو خوابوں اور محبت کی دنیا سے بہت وحشت ہوتی، وہ حقیقت سے آنکھیں ملانے ہی کو زندگی سمجھتی۔

رنجنا کالج کی رومان پرور اور ہیجان انگیز دنیا سے نکل کر یونیورسٹی کی بالغ زندگی میں آگئی تھی جہاں محبت اکثر ایک نظریے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس پر ساری زندگی گزارنے کا ارادہ باندھ لیا جاتا ہے۔ راکیش بھی اس کے ساتھ ہی انگریزی ادب میں ایم اے کر رہا تھا۔ رومانی دور کے شاعروں کے مطالعہ کے وقت وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ وہ اس موضوع پر جس قدر بے تکان بول سکتا تھا اتنا تو پروفیسر اوجھا بھی نہیں بول سکتے تھے جو نہ صرف یونیورسٹی، بلکہ صوبہ بھر کے انگریزی کے زبردست ٹیچر مانے جاتے۔ قائل تو وہ اس طرح کر دیتا کہ سامنے والے کو اور کچھ نہ سوجھتا، لیکن اس کی ساری قابلیت اور دلائل اسوقت دھرے رہ جاتے جب وہ رنجنا کو اپنا ہم خیال بنانے کی ہر کوشش میں ہار جاتا، اس وقت اس کی بوکھلاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی۔

اس روز یونیورسٹی کینٹین میں وہ دوستوں میں گھرا ساحر کی نظمیں سنا رہا تھا کہ رنجنا اندر داخل ہوئی اور قریب ہی کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک نظم ختم ہوئی تو راکیش کے دوست نے واہ واہ کرنے لگے۔ اس وقت رنجنا نے ہونٹ سکوڑ کر بس اتنا ہی کہا۔

"نان سنس!"

اس کی آواز تو دھیمی ہی تھی لیکن راکیش نے سن لیا اور غصہ میں تلملا کر اس کے پاس آیا۔

"آپ اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہیں؟"

"بھارت کی ایک ذمہ دار شہری۔"

"لیکن آپ کو میرے جذبات کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"میں نے مذاق تو نہیں اڑایا۔ مجھے آپ کا نکتہ نگاہ پسند نہیں اور اپنی رائے کے اظہار کا مجھے پورا حق حاصل ہے۔"

"دیکھئے رنجنا جی، بات یہ ہے کہ خدا نے آپ کو دل دیا ہی نہیں ہے اس کی جگہ پر ایک پتھر رکھ دیا ہے جو نہ دھڑکتا ہے نہ مچلتا ہے نہ پھولوں کی خوشبو سونگھتا ہے، نہ چڑیوں کی چہچہاہٹ....."

"بس کیجئے۔ آپ کی اس قسم کی باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ آپ سیدھے سادے زمین پر کھڑے ہو کر بات کیوں نہیں کرتے، آسمانوں کی سیر کیوں کرنے لگتے ہیں۔"

"آپ نے زندگی کو بس یہی سمجھ رکھا ہے کہ کھاؤ پیو تھوڑا بہت کام کرو اور مر جاؤ۔ زندگی اتنی چھوٹی نہیں ہوتی رنجنا جی اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، لیکن آپ کی سمجھ میں یہ سب کچھ نہیں آئے گا۔ یہ زندگی اور موت کے فلسفے سے بہت آگے کی چیز ہے۔"

دونوں کو الجھتے دیکھ کر راکیش کا دوست سنیل بیچ بچاؤ کراتے آگے بڑھا۔

"ارے بھائی، جب تم لوگوں نے ایک دوسرے سے متفق نہیں ہونے کی قسم ہی کھالی ہے تو پھر بحث کیوں کرتے ہو۔ تم دونوں کے الگ الگ راستے ہیں۔"

رنجنا اٹھ کر چلی گئی۔ راکیش کا موڈ بھی خراب ہو گیا اور ساحر کی نظمیں ادھوری رہ گئیں۔

رنجنا ایک خوبصورت لڑکی تھی، بہت سے لڑکے اس کی قربت کی آرزو میں مرتے لیکن وہ کسی کو منہ نہ لگاتی، اس کے سلوک کی وجہ سے کوئی بھی اس سے قریب آنے کی کوشش نہ کرتا۔ رنجنا کا ایک بھائی اشوک بنارس ہندو یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اگرچہ وہ رنجنا سے بڑا تھا لیکن دونوں کے خیالات اور نکتہ نگاہ میں بہت یکسانیت تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے قربت کے سبب دوست معلوم ہوتے۔ اشوک جب چھٹیوں میں گھر آتا تو پھر رنجنا کو ایک طاقت سی مل جاتی۔ دراصل خیالات بالکل جدا ہونے کے سبب وہ سب سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ گھر اور گھر کے باہر سبھی لوگوں سے اس کے تعلقات کام چلاؤ جیسے تھے۔ ایک اشوک ہی اس کا ہم خیال تھا۔ اس لیے جب وہ آجاتا تو پھر رنجنا اس کی غیر موجودگی میں بھرے ہوئے غبار کو ایک ہی سانس میں نکال دیتی اور اشوک سے ہمایت مل جانے کے بعد وہ پھر اندر سے مضبوط اور توانا ہو کر دنیا کے مقابلے پر آجاتی۔

دونوں بھائی بہن محبت اور عشق کو دنیا کی سب سے فضول اور بیکار شے سمجھتے۔ انھیں حیرت ہوتی کہ زندگی کے لمبے چوڑے اور بکھرے ہوئے جھمیلوں سے لوگوں کو فضول چیزوں میں دل اور دماغ کھپانے کا موقع کیسے مل جاتا ہے رنجنا کو تو ان لڑکوں سے گھن آتی جو ہر خوبصورت اور جوان لڑکی کو دیکھ کر آہیں بھرنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر جہاں کسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی، عشق وشق ختم اور آٹے دال کا بھاؤ شروع اشوک کا کہنا تھا کہ محبت ــــ سچی محبت صرف خدا ہی سے ہو سکتی ہے ورنہ لوگوں نے تو ہوس کو محبت کا نام دے کر محبت جیسی چیز کی توہین کی ہے۔ آخر آج کے عشق کے مریضوں میں لیلیٰ مجنوں کیوں نہیں پیدا ہوتے، ہیر رانجھا کیوں جنم نہیں لیتے، رومیو اور جولیٹ کیوں سامنے نہیں آتے۔ آخر عشق کا بخار آٹے دال کے بھاؤ میں الجھ کر اتر کیوں جاتا ہے ــــــ

دونوں بھائی بہن جب یکجا ہوتے تو پھر کیا مجال کہ کوئی ان کے سامنے ٹھہر جائے۔ وہ عشق کرنے والوں کا اس طرح مذاق اڑاتے کہ اگر ان میں غیرت ہوتی تو پھر یا تو وہ عشق سے توبہ کر لیں یا پھر جان دیدیں۔ لیکن رنجنا اور اشوک کو افسوس تھا تو بس یہی کہ سمجھداری کی بات کسی کے دماغ میں گھستی ہی نہ تھی۔

ان کے گھر میں ناول اور کہانیوں وغیرہ کی کتابوں کا آنا بالکل بند تھا۔ چھوٹے بھائی بہن کے ہاتھوں میں اگر وہ اس قسم کی کتابیں دیکھ لیتے تو چھین کر جلا دیتے۔ البتہ سیاسیات، معاشیات، فلسفہ اور ادب کی اعلیٰ کتابیں پڑھنا انھیں اچھا لگتا اور پھر ان پر دھواں دھار گفتگو سے تو انھیں نئی زندگی ملتی ان کے دوست ان سے دور بھاگنے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بڑے بڑے جبر اور مشکلوں سے مارے باندھے تو انھوں نے کلاسوں میں ان چیزوں کو پڑھا ہی ہے۔ اب ہر جگہ یہی سنتے اور پڑھتے رہیں گے تو پھر زندگی کس کام کی۔

جہاں رنجنا کو پتہ چلتا کہ اس کی کوئی دوست، محبت وغیرہ کے مرض میں مبتلا ہو گئی ہے وہ فوراً اسے سمجھانے بجھانے پہنچ جاتی اور اس بیماری کے ایسے ایسے نقشے کھینچتی کہ کسی سے کوئی جواب ہی نہ بن پاتا۔ لیکن ہوتا یہ کہ رنجنا کی کوشش کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا ہی جاتا۔ یہاں تک کہ رنجنا کو تھک ہار کر اپنی کوششیں چھوڑ دینی پڑتیں۔

اچانک گھر میں یہ خبر پھٹی کہ اشوک نے بنارس میں اپنے ساتھ پڑھنے والی کسی لڑکی سے پریم وواہ کر لیا ہے۔ ماں باپ اور گھر کے دوسرے افراد پر اس کا جو بھی اثر ہوا ہو رنجنا اس بات کو تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوئی۔ اس کا ایمان تھا کہ اشوک ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی انسان کسی جانور کی شکل میں بدل جائے۔ ممکن ہے

کہ اشوک نے شادی کرلی ہو لیکن محبت کی شادی ہرگز نہیں کی ہوگی ـــــــ اس کی یہ ایک عجیب منطق تھی لیکن ماں باپ کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ اشوک نے پریم دواہ کیا ہے یا صرف دواہ کیا ہے، پریم نہیں کیا۔ اشوک کی شادی ایک بڑے گھرانے میں طے ہو چکی تھی۔ وہ خود ایک کھاتے پیتے گھر کا لڑکا تھا اور وکالت کا امتحان دے کر جوڈیشیل سروس میں جانے والا تھا۔ تلک میں اتنے روپیوں کی بات طے ہوئی تھی کہ اس گھر میں اب تک کوئی لڑکا اتنا تلک لے کر نہیں آیا تھا، جہیز اور سامان الگ۔ اشوک نے سب خوابوں پر پانی پھیر دیا۔ ماں باپ کو اس کی اس حرکت پر اتنا دکھ ہوا کہ انھوں نے اس کی شکل دیکھنے سے قسم کھالی۔ لیکن ماں باپ پھر ماں باپ ہی تھے۔ چند مہینوں کے بعد اشوک جب اپنی دلہن کو لے کر اچانک آ پہنچا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اشوک کو گلے لگا لیا بلکہ اس کی دلہن کو بھی سویکار کر لیا۔ رنجنا تو دوڑ کر بھائی اور بھابی سے لپٹ گئی۔

"دیکھا، میں نہ کہتی تھی، بھیا کبھی پریم وریم کے چکر میں نہیں پڑنے والے۔ کوئی بہت اچھی سی، سندر سی لڑکی مل گئی ہوگی بیوی بننے کے لائق۔ تو انھوں نے اسے سویکار کر لیا ہوگا ورنہ ـــــــ"

اشوک کی دلہن منجو نے شریر نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور اشوک کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ رنجنا کو لگا جیسے اس پر دونوں ہنس رہے ہیں۔

"تو کیا بھیا........"

اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا کہ اشوک نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہاں بہن، تیرا بھائی تجھ سے ہار گیا، بلکہ ہم دونوں ہی محبت سے ہار گئے، یہ سچ ہے رنجنا کہ ہم لوگوں کا یہ پریم دواہ ہے ـــ"

رنجنا کو محسوس ہوا جیسے اشوک نے بھرے بازار میں اس کے چانٹا مار دیا ہو۔ وہ جس زمین پر کھڑی تھی، وہ زمین اپنی جگہ سے کھسک گئی ہو ـــــــ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اشوک دو ہفتہ وہاں رہا لیکن وہ اس سے کھنچی کھنچی رہی۔ کئی بار اشوک اسے کھینچ کر باہر لایا اور اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ زیادہ تر چپ رہی۔ دراصل اسے یہ ہرگز امید نہیں تھی کہ اشوک جو اس کا آدرش تھا۔ اتنا کمزور ثابت ہوگا۔ اشوک کی حرکت سے اس کے اندر بیٹھا ہوا آدرش کا وہ بت ٹوٹ گیا جس کی وہ اب تک پوجا کرتی آئی تھی۔ اشوک جانے لگا تو اس نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

"میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی بھیا۔ تم تو بڑے بدھو اور کمزور نکلے۔"

اشوک نے ہنسی میں اس کی بات اڑا دی۔

رنجنا نے پڑھائی ختم کی تو ماں باپ کو اس کے بر کی فکر سوار ہوئی۔ یوں تو رنجنا ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی تھی لیکن وہ تھوڑا کریک مشہور ہو گئی تھی جس کے سبب باقاعدہ اس کے رشتے نہیں آتے تھے۔ اس کے باپ ایک اونچی سرکاری نوکری سے حال ہی میں ریٹائر ہوئے تھے اور ایک سماجی حیثیت کے مالک تھے۔ وہ رنجنا کے لیے اچھے سے اچھے رشتے کے انتظار میں رہے۔ لیکن ایم اے پاس کر جانے تک جب کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تب پھر ان کا فکر مند ہونا لازمی تھا۔ آدمی پڑھے لکھے تھے۔ انھوں نے براہ راست رنجنا سے گفتگو کی۔

"بیٹی، اب تم بھگوان کی دیا سے جوان ہو گئی ہو۔ پڑھائی بھی ختم کر چکی ہو۔ ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں، تمہاری کیا رائے ہے ـــ؟"

"پتاجی، آپ میرے لیے بھگوان کا روپ ہیں، آپ میرے لیے جو فیصلہ کریں گے، میں آنکھیں موند کر مان لونگی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی پسند بتادو تاکہ ہم اس کے مطابق لڑکا ڈھونڈ سکیں۔"

"وہ سب آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرا آدرش نہ ٹوٹنے پائے۔ لڑکا کیسا بھی ہو، لیکن عام ڈھنگ کا ہرگز نہ ہو۔"

اتفاق سے روی میں یہ سب باتیں موجود تھیں۔ وہ رنجنا کے پتاجی کے ایک دوست کا لڑکا تھا جو دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ وہ سائنس کا لکچرر تھا اور اپنے میدان میں نام کما چکا تھا۔ شادی کے سلسلے میں اس کی بس ایک ہی شرط تھی ـــ لڑکی خوبصورت ہو، سو رنجنا کے ہاں سے رشتہ آیا تو ان لوگوں نے فوراً قبول کر لیا۔ لڑکی ان کی دیکھی بھالی تھی، گھرانہ ان کا جانا بوجھا تھا۔

شادی کے بعد روی، رنجنا کو بہت پسند آیا۔ اس کے خیالات جاننے کا تو اسے فوراً کوئی موقع نہیں ملا لیکن اس کے انداز اور سلوک سے رنجنا کو یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ کوئی سطحی آدمی نہیں، باوقار اور ہر معاملے پر ایک اپنا مستقل نظریہ رکھنے والا فرد ہے۔ وہ اپنی قسمت پر ناچ اٹھی۔

شادی کے دو ہفتہ کے بعد روی نے ہنی مون پر کشمیر جانے کا پروگرام بنایا۔ رنجنا کو یہ سن کر بڑا عجیب لگا۔

"ہنی مون پر جانا تو بہت عام سی بات ہے۔ شادی کے بعد تو سبھی جاتے ہیں، یہ کون سی نئی بات ہوگی۔" اس نے روی سے کہا۔

"ڈارلنگ، مجھے ہنی مون پر جانا اچھا نہیں لگتا۔ سبھی تو جاتے ہیں ہنی مون پر۔ ہم لوگ کوئی ایسی بات کیوں نہ سوچیں جو نئی بھی ہو اور ......"

"رنجنا، بیشک ہنی مون پر سبھی جاتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کا ہنی مون سب سے مختلف ہوگا، تم دیکھنا تو۔"

رنجنا خوش ہو گئی۔ روی کے جواب نے اس کے سارے شبہات دور کر دیے، وہ اپنی قسمت پر ایک بار پھر مسکرا اٹھی کہ خدا نے اسے روی جیسے معیاری اور اعلیٰ انسان کی ساتھی بنایا۔

دونوں سرینگر پہنچے۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں ٹھہرے ٹورزم کارپوریشن سے ایک ٹیکسی کرایہ پر لی اور بیلگام، گل مرگ، کھلن مرگ، شنکر اچاریہ کا مندر اور مغل باغات میں گھومتے رہے۔ چاندنی رات میں جھیل ڈل میں شکارے پر سیر کی۔ باغوں کے تازہ پھل کھائے۔ پہلگام میں گھوڑے کی سواری کی۔ دن بھر کی محنت کے بعد بھی دونوں تازہ دم رہتے۔ راتوں میں روی، رنجنا پر محبت کی بارش کر دیتا اور رنجنا پیاسی زمین کی طرح سیراب ہو جاتی۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔ رنجنا کسی انوکھے پن کا انتظار کرتی رہی۔ اسے تو کہیں بھی کوئی نیا پن دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ سب تو وہ بہت پہلے ہی سے سنتی آرہی تھی۔ جو بھی کشمیر آتا وہ یہی سب کچھ تو کرتا۔

دو ہفتوں کے بعد روی نے واپسی کا پروگرام بنایا تو رنجنا سے نہ رہا گیا۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

"ڈارلنگ، ہم لوگوں نے تو عام ڈھنگ سے اپنا وقت بتا دیا، میں تو کسی انوکھی اور نئی بات کی منتظر ہی رہی۔"

روی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"رنجنا ڈارلنگ! زندگی میں یوں تو کوئی انوکھا پن نہیں ہوتا، لیکن ہم چاہیں تو اسے انوکھا بنا سکتے ہیں۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکی۔"

"یہ خوشی جو ہے نا، وہ سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ اسے زندگی کے پھل سے نچوڑ کر نکالنا پڑتا ہے۔ یہ ایک آرٹ ہے جو سب کو نہیں آتا۔ ہم لوگ اتنے روز یہاں رہے۔ چلو حساب لگائیں کہ ہم لوگوں نے اس آرٹ میں کتنی کامیابی حاصل کی۔"

روی بول رہا تھا اور رنجنا منہ پھاڑے اس کا منہ تک رہی تھی۔ روی کی بات کا جواب دینے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ شاید زندگی سے نچوڑی ہوئی خوشیوں نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔

(پٹنہ سے نشر)

عبداللہ کمال

طلسم لوح، نہ تیغ و تفنگ ہے بابا
وہ شاہزادہ مگر محوِ جنگ ہے بابا
سراغ اپنا کبھی کا میں کھو چکا لیکن
وہ کون ہے جو مرے سنگ سنگ ہے بابا
خود اپنی راہ خموشی سے کاٹ جاتا ہوں
کہ آپ اپنے سے اک سرد جنگ ہے بابا
تری رگوں میں اُتر جائے آگ موسم کی
مرے لہو پہ تو صدیوں کا زنگ ہے بابا
مرا وجود طلسم ہزار رنگ سہی
مری شناخت مگر سبز رنگ ہے بابا
سنا نایا ہو، کی پہچان آج مشکل ہے
دھوئیں کے بیچ تو پتھر ملنگ ہے بابا

(بمبئی سے نشر)

زمانے کی ہوا

ذاکرہ خاتون

قاریہ بڑی سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ بس گھریلو تعلیم تھی۔ والدین کے علاوہ اس کے کئی بھائی ایک بہن تھے۔ بڑے بھائی کسی کالج میں لیکچرر تھے۔ اور والد آرٹسٹ تھے۔ اچھا خاصہ گھرانہ تھا۔ قاریہ جوان ہوئی تو اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور اس کی منسوب کی تلاش شروع ہوگئی۔

ایک صاحب کے یہاں رشتہ ملا۔ لڑکا بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ اس کا سوال تھا کہ آپ بی اے کرا دیجیے میں شادی کرنے کو تیار ہوں۔ اور اس کے لیے آپ کو سات ہزار نقد دینا پڑیگا لڑکا پسندیدہ اور قاریہ کے باپ کے خیال میں خاندانی تھا۔ اس لیے شرط منظور کرلی اور رشتہ طے پا گیا۔ اور پھر شادی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ یہاں سے جہیز میں کافی سامان کے علاوہ لڑکے کو بھی گھڑی، ریڈیو، سائیکل اور ٹیبل فین دیا گیا۔ زیور بھی دس بھر سونا سے کم نہیں تھا۔ مگر سسرال میں اس کو عجیب ماحول سے واسطہ پڑا۔ وہاں اس کو ساس سسر کے علاوہ اس کے دو دیور بھی تھے۔ دو چار ہی روز میں اس کو اندازہ ہوگیا کہ وہاں خوشگوار زندگی کے آثار نہیں تھے۔

جب وہ سسرال سے پہلی ہی بار میکے آئی تو اس کے سارے سامان کے علاوہ زیور کپڑے سبھی چیزیں اس کی ساس نے روک رکھے۔ محض دو چار جوڑے کپڑے دیکر روانہ کر دیا۔ بہلاوا یہ دیا کہ تمہیں تو پھر آنا ہی ہے تو کیا کروگی اتنے سارے سامان لے جاکر۔ نادان قاریہ کچھ ٹھیک ٹھیک سمجھ نہ پائی۔ کچھ روز تو اس کا شوہر آتا جاتا رہا۔ پھر اس نے آنا جانا بند کر دیا اور نہ ہی سسرال سے قاریہ کا بلاوا آیا۔ سسرال کے اس رویے سے اس کو طرح طرح کی تشویش ستانے لگی۔ لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو اس کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پہننے اوڑھنے کے، گھومنے پھرنے اور آنے جانے کے۔ مگر اس کے سارے ارمان خاک میں مل رہے تھے۔ اور وہ طرح طرح کے احساسات کی شکار ہوکر ملول رہنے لگی۔ اسے اس طرح دیکھ کر والدین بھی رنجیدہ رہنے لگے۔

ایک دوبار وہ اپنے آپ سسرال والوں کی مزاج پرسی کے بہانے گئی بھی تو اس کو یہ نوٹس ملی کہ جب تک بی۔ اے نہ کرلوں اور سروس نہ ہو جائے تم اپنے میکے ہی میں رہو۔ اور اس ارادے سے اس کے والدین کو بھی آگاہ کر دیا گیا۔ اور ستم یہ کہ دو چار جوڑے کپڑوں کے علاوہ سب کچھ سسرال والوں نے ضبطی میں رکھ لیا اب بیچاری قاریہ میکے ہی میں پڑی اپنی خیر منانے لگی۔ غمزدہ والدین اس کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ مگر اس کے دل کے اندر رہ رہ کر اٹھنے والی ہوک کو کون روک سکتا تھا۔

خدا خدا کرکے اس نے شوہر نے بی۔ اے پاس کیا سب لوگ خوش تھے۔ خاص کر قاریہ بیحد مسرور تھی کیونکہ اب اسے اپنے گھر جانے کی امید تھی۔ دل کے ارمان پورے ہونے کے دن آگئے تھے۔ لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ کامیابی کے چند ہی روز بعد اس کا شوہر سخت علیل ہوگیا۔ ٹھنڈک لگ گئی تھی۔ اور اس کے علاج کے لیے بھی سسرال والوں سے ہی روپیہ طلب کیا گیا۔ وہ بھی چار و ناچار قاریہ کے بڑے بھائی نے دیا۔ بے چاری قاریہ نے جب اپنے شوہر کی بیماری کی خبر سنی تو اس کی عیادت اور تیمارداری کے لیے دوڑ پڑی۔ مگر وہاں کا نقشہ ہی عجیب سا لگا۔ سبھی لوگ اُسے اکھڑے اکھڑے سے لگے۔ ساس غرانے لگی کہ تم کو یہاں کس نے بُلایا ہے؟ تم کیوں آئی ہو؟ تجھ منحوس نے تو میرے بچے کو بھی بیمار ڈال دیا۔ تم ابھی فوراً چلی جاؤ۔ اور خود شوہر نے بھی اس کو دیکھ کر منہ میلا کرلیا۔ اور اس کے سینے میں ایک تازہ تیر مارا کہ جب تک تمہارے والدین نوکری نہ دلائیں گے تم کو اس گھر میں قدم نہیں رکھنا ہے۔ جاؤ، انتظار کرو جلدی جاؤ ورنہ میرا مرض اور بڑھ جائے گا۔

قاریہ کے والدین شریف لوگ تھے۔ اپنی عزت اور خیریت اسی میں سمجھی کہ زہر کا یہ گھونٹ بھی پی لیں اور قہر درویش برجان درویش، داماد کی نوکری کی جستجو میں سرگرداں ہوگئے اور لڑکی کو تسلیاں دے دے کر ڈھارس بندھاتے رہے۔ ماں نے کہا کہ جس چیز کے لیے تمہارا دل چاہے ہم سے کہو۔ ہر ضرورت ہم پوری کریں گے۔ کوئی فکر نہ کرو۔ لیکن ہر شادی شدہ لڑکی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اب میں شادی شدہ ہوں میرا میکہ اب پرایا ہے اور والدین سے کسی بھی چیز کی فرمائش کرنے پر جھجکتی ہے۔ تسلیوں اور دلجوئیوں کے باوجود قاریہ غمگین ہی رہی۔

پھر کچھ ہی عرصہ میں وہ بیمار پڑ گئی۔ اکثر بخار رہنے لگا۔ علاج چلتا رہا لیکن بیماری بڑھتی ہی گئی۔ والدین کی پریشانی بڑھتی گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ شاید لڑکی کے دل میں کوئی گہرا صدمہ گزرا ہے۔ بالآخر دق کے موذی مرض کی تشخیص نے پورے گھر کو ہراساں کر دیا۔ پڑوس لوگ افسردہ ہوگئے۔ مگر سسرال سے کوئی دیکھنے تک نہ آیا، شوہر بھی نہیں۔

ایک روز قاریہ نے مایوس لہجے میں کہا کہ امی اب تو میں اس دنیا سے جا رہی ہوں کم از کم ایک بار وہ آجاتے تو ملاقات ہو جاتی۔ یہی چھوٹی سی تمنا ہے۔ خدا جانے میرے لیے ان کے دل میں جگہ کیوں نہیں۔ اور قاریہ رو پڑی۔

دوسرے ہی دن والدین نے داماد کو بلوا بھیجا مگر داماد نے کہلوایا کہ تاوقتیکہ وہ مجھے نوکری نہ دلائیں گے میں نہیں آسکتا۔

اور اس زمانے کے دور میں نوکری مل جانا آسان کام نہیں، ایک طرف لڑکی کی بیماری، دوسری طرف داماد کی نوکری کی دوڑ دھوپ، کافی جد و جہد کے بعد ایک نوکری ٹھیک ہوسکی جس روز جوائن کرنے کا لیٹر اس کے شوہر کے پاس گیا۔ اُس روز قاریہ کی حالت غیر تھی۔ اس کو اب غشی رہنے لگی تھی۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر ماں سے رہا نہ گیا پھر اپنے لڑکے کو وہاں دوڑایا کہ جاکر کہو کہ اب بھی آکر اس کو دیکھ جائیں۔ اور جب قاریہ کا بھائی اس کی سسرال پہنچتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ جوائننگ لیٹر نوکری کا آگیا ہے اور وہ نوکری جوائن کرنے جاچکے ہیں۔ معقول ملازمت تھی، فوراً آجانا تھا۔ مگر اس خوشخبری کے ساتھ اس کا بھائی گھر آتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ قاریہ کو لوگ ہاسپیٹل لے جا رہے ہیں۔ جہاں پہنچتے ہی اس کی روح پرواز کر گئی۔

(پٹنہ سے نشر)

ذاکرہ خاتون
معرفت ڈاکٹر سید اظہر الحق
محلہ پٹھان ٹولی۔ عالم گنج۔ پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

آپ کی رائے

محترمی!

"آواز" ہی میرے مطالعہ میں ایسا حسین دلکش اور مہذب رسالہ ہے جو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ قبل از وقت جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ میں رسالہ کی ترقی اور درازیٔ عمر کے ساتھ آپ کی بھی سایۂ عاطفت کی طوالت کے لیے دعاگو ہوں۔

مستری فاران سہیل الرحمٰن راؤ
راجپوت نگر۔ سہارنپور

آواز کا دسمبر کا پہلا شمارہ دیکھا۔ حالانکہ ہاپوڑ میں آواز کا ملنا ناممکن سا ہی ہے لیکن کل جب دہلی گئی تو کچھ رسائل خریدے جن میں آواز بھی تھا۔ پرچے کا پہلا صفحہ پڑھ کر ہی دل و دماغ روشن ہو گئے۔ کافی عرصے کے بعد اتنا اچھا کلام پڑھنے کو ملا۔ اعجاز الدین پاپولر کے مزاحیہ اشعار جہاں قہقہوں کی دنیا میں لے گئے وہیں احمد علوی اور انور حسین انور صاحب کے دل سوز شعروں نے اپنی انفرادیت کا احساس بھی دلایا۔ جی ڈی چندن صاحب کا لکھا ہوا مضمون بچوں کے مسائل اور صحافت بھی اپنی نوعیت کا واحد مضمون لگا۔ آپ میری جانب سے پاپولر، انور حسین انور، جی ڈی چندن اور احمد علوی صاحب کو مبارکباد پہنچا دیں۔

ساجدہ منظور احمد
گلی پرانا بازار۔ ہاپوڑ

آواز یکم دسمبر ۱۹۸۶ء کا شمارہ بروقت موصول ہوا۔ سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ تجریدی آرٹ کا یہ ایک عمدہ نقش ہے اور معنویت سے پُر ہے۔ چندن صاحب کا مضمون "بچوں کے مسائل اور صحافت" عمدہ صاف ستھرا معلوماتی مضمون ہے۔ "فضول خرچی سے کیسے بچیں" بہترین سماجی اصلاحی مضمون ہے۔ ہر گھر میں اس مضمون کو پڑھ کر اس کی اہمیت بتانے کی ضرورت ہے۔ دونوں مزاحیہ مضامین "ہستی اپنی نواب کی سی ہے" اور "شوہر کی جاسوسی کا نسخہ" معیار اور تفریح کے لحاظ سے اچھے مضامین ہیں۔ احمد یوسف، شکیلہ اختر اور عشرت ظہیر کے افسانوں نے متاثر کیا۔

اردو سروس کی غزلوں میں پاپولر کی غزل پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

انوار انصاری
اولڈ ہزاری باغ روڈ۔ رانچی ۱۰ (بہار)

یکم دسمبر کا شمارہ دیکھتے ہی نگاہوں میں رنگین بہاریں رقص کرنے لگیں۔ آپ قارئین کی دلچسپی کا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ

شکریہ کا لفظ ناکافی ہے۔ رنگین تصاویر سے معمور صفحہ آخر دیدہ زیب ہے۔ اندرونی صفحات بھی ہمیشہ کی طرح معلومات کا خزینہ ہے۔ "بچوں کے مسائل اور صحافت" پسند آیا۔ واقعی بچوں پر جتنا مواد شائع ہونا چاہیے اتنا نہیں ہو پاتا ہے جبکہ بچے معاشرے کی عمارت کی بنیاد ہیں۔ جتنی توجہ بنیاد پر دی جاتی ہے اتنی ہی مضبوط عمارت تعمیر ہو سکے گی۔ اخبارات کو مستقل گوشہ بچوں کے لیے رکھنا چاہیے جس میں ان کے متعلق خبریں اور ان کی تحریر کردہ چیزوں کو شائع کیا جائے۔

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی کا مضمون "احتشام صاحب" اچھا تھا۔ "فضول خرچی سے کیسے بچیں" بہت اہم ہے مگر آج کے معاشرے میں انسان فضول خرچی کو ضروریات کا نام دے رہا ہے اور اپنا مقام اسی کے ذریعہ سے بلند بنانے میں سرگرداں ہے۔ "تصوف اور سائنسی عہد" بہت پسند آیا۔

افسانہ "راحتیں اور بھی ہیں" کا ایک جملہ بہت حسین تھا: "اس کے ہونٹ زہریلی مسکراہٹ سے بھیگ رہے تھے"۔ افسانہ "پتھر کا آدمی" پسند نہیں آیا۔ پلاٹ کمزور، کردار نگاری میں پھیکا پن ہے۔ افسانہ "یہاں زینے ہی زینے ہیں" بہت خوبصورت ہے۔ اس بار غزلیات زیادہ پسند نہیں آئیں، بہت ہلکے پھلکے اشعار تھے صرف صادق نوید صاحب کی غزل اچھی تھی۔

شاہانہ نسرین۔ روز تقی
رامپور (یوپی)

میں آواز کا ایک دیرینہ قاری ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ آپ آواز کو خوب سے خوب تر بنانے میں شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔ ہندوستان کے بیشتر ریڈیو اسٹیشنوں سے موصول شدہ مضامین نظم و نثر بڑی خوبصورت ترتیب و تزئین کے ساتھ عوام تک پہنچاتے ہیں جس کے لیے آپ بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اخلاق سہسوانی
سہسوان ضلع بدایوں (یو۔پی)

دسمبر کا آواز ملا۔ آواز کی میں بہت پرانی مداح ہوں۔ لیکن آج پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اس بار اردو سروس سے غزلیں آپ کے حسن انتخاب کی بہترین اور خوبصورت مثال ہیں۔ ان غزلوں کو پڑھ کر لگتا ہے جیسے اردو میں صرف نئی نسل ہی شاعری کر رہی ہے۔ باقی تو پٹی ہوئی لکیر ہی پیٹ رہے ہیں۔ آپ سے میری گزارش ہے آپ نئی نسل کے اور شاعروں کو شائع کریں۔

ڈاکٹر حیدر علی خاں کا مضمون "فضول خرچی سے کیسے بچیں" بے حد پسند آیا۔ عابد کرہانی کا حرف غزل بھی خوب رہا۔ نئی نسل کے یہ تمام قلمکار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کی اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ ایسی نصیحت آمیز تخلیقات شائع کرتے رہیں گے۔

حمیرہ تسنیم
اسماعیل نگر۔ میرٹھ

یکم دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ آپ جس کاوش سے ادبی و معلوماتی مضامین کو آواز میں شامل کر کے عوام تک پہنچا رہے ہیں وہ قابل تعریف ہی نہیں بلکہ اردو کے لیے بیش بہا سرمایہ بھی ہے۔ تزئین و طباعت بھی قابل ستائش ہے۔ منظومات کے لیے ایک خاص اہتمام جو آپ برت رہے ہیں وہ اس رسالہ کی اہمیت و بلندی کا ضامن ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عام قاری ہی نہیں بلکہ طلبا کا ایک خاص گروپ جو تحقیق سے جڑے ہیں، اس رسالہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اس شمارہ میں جناب ڈاکٹر ایس۔ او۔ رحمٰن صاحب کا مضمون بعنوان "ایڈس ایک مہلک مرض" کافی اہم ہے اور معلوماتی بھی۔

محمد سہیل احمد۔ ایم۔ ایس۔ سی (زولوجی)
موضع تیموہاں پوسٹ فاتحہ (پھلواڑہ)
ضلع بیگوسرائے (بہار)

اردو پروگرام کے تحت کچھ دنوں پہلے آکاش وانی گورکھپور سے ایک طرحی نشست نشر ہوئی تھی جس کا مصرع اس طرح تھا "خودی تو ٹوٹ چکی خوئے بتاں بھی ٹوٹی ہے"۔ 'آواز' ۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۸۶ء کے شمارے میں محترم اقبال احمد وصفی (رامپور) کا ایک مراسلہ اس نشست کے سلسلے میں شائع ہوا تھا جس میں ڈاکٹر اختر بستوی کو چھوڑ کر بقیہ شرکار نشست کی غزلیات پر اعتراض کئے گئے تھے اور وہ سارے کے سارے اعتراض درست بھی تھے۔ مراسلے کی اشاعت ہوتے ہی بقیہ شرکار نشست کو یہ خیال گزرا کہ شاید اختر بستوی نے خود یا اپنے کسی واقف کار کے ذریعہ یہ مراسلہ بھیج دیا ہے۔

یہ تو ہوا زیر نظر مراسلے کا پس منظر۔

اب میں "آواز" کے ۱۶ تا ۳۰ نومبر ۸۶ء میں اشاعت پذیر تحریر انجم صاحب کے مراسلے کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ تحریر انجم صاحب کی ساری وکالت صرف ایک شخص واحد کی محافظت میں صرف ہو گئی ہے۔ گویا نشست کے بقیہ شرکار کے سلسلے میں اقبال احمد وصفی صاحب کے

اعتراضات کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اقبال احمد صاحب نے اپنی ہر بات کے لئے مثالیں اور دلیلیں دی ہیں لیکن تحریر انجم صاحب نے عمداً اس سے گریز کیا ہے کیونکہ اس سلسلے میں ان کے پاس دراصل کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ وہ صرف بحث کو معروف غیر معروف کی گلیوں میں بھٹکا کر مراسلے کی روح سے لوگوں کی توجہ ہٹانا چاہتے ہیں اور پھر ستم ظریفی یہ کہ اپنے آخری جملوں سے اپنی ہی دلیلوں کا خود ہی قلع قمع بھی کر دیتے ہیں یعنی معروف ہونا لازماً معیاری ہونے کا مترادف نہیں ہے۔

اب ذرا انجم صاحب کے دلائل کا پوسٹ مارٹم بھی کر لیجئے۔ انہوں نے واحد دلیل اپنے محسن کی تصنیفات و انعامات کی تعداد گنا کر دی ہے۔ اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر کسی شخص کا اپنے سارے خس و خاشاک کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دینا اور اس طرح تصنیفات کی تعداد بڑھا لینا اسکو معیاری / معروف ادیب کے زمرے میں لا کھڑا کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہے۔ انجم صاحب تو اردو کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ وہ اردو ادب کے ان بزرگوں سے یقیناً واقف ہوں گے جن کا ادبی اثاثہ تعداد میں قلیل ہونے کے باوجود ان کو آج بھی نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہے بلکہ بعض بسیار نویسوں میں ان کو ممتاز بھی کئے ہوئے ہے غالب کا مختصر دیوان اسکی ایک نمائندہ مثال کے طور پر کافی ہے رہ گئی بات اکاڈمیوں کے انعامات کی تو "اردو ادب کی سمت و رفتار سے کماحقہٗ واقفیت رکھنے والے تحریر انجم صاحب اس سے یقیناً واقف ہونگے کہ ان انعامات کا اصل حقداروں کے مقابلے غیر حقداروں کی جیب میں پہونچنے کا کیا تناسب ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تصنیفات کثیر تعداد میں اشاعت پذیر ہونے کے باوجود اردو ادب میں اضافے کا موجب ہیں اور نہ ہی اردو اکاڈمیوں کے لئے بقول غالبؔ "ذریعہ عزت" ہیں

انجم صاحب اگر اقبال احمد وصفی کے مراسلے میں مذکور باتوں سے متفق نہیں تھے تو ان کو ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اس پر فنی بحث کر کے دلائل سے انکی تردید کرنی چاہیئے تھی لیکن اس کی چونکہ کوئی گنجائش نہیں تھی اس لئے انھوں نے بحث کے بجائے کج بحثی کا سہارا لیا۔

دراصل مصرع طرح میں "خوئے بتاں" کے ٹوٹنے کے جواز سے فائدہ اٹھا کر شعراء حضرات نے ہر چیز پر ٹوٹنے کا اطلاق جائز سمجھ لیا۔ اس لئے یہ خامی شعراء حضرات سے زیادہ اس مصرع طرح کی ہے۔ آکاشوانی کو ایسے مصرع ہائے طرح دے کر اپنی نشریات کے معیار کو پست کرنے اور ساتھ ہی ہزاروں سامعین کے وقت کو برباد کرنے اور طبیعت کو مکدر کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔

میرا ارادہ اس مراسلے سے کسی کی دل آزاری نہیں ہے بلکہ اس بحث کو صحیح سمت و رخ دینے کا ہے اور شہر کی ادبی فضا میں ایک شخص کی پست معیاری کوششوں سے جو تعفن کا احساس ہے اسکو زائل کرنے کا ہے اس لئے مجھے امید ہے کہ متعلقہ حضرات میری اس حقیقت بیانی کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔

وسیم اصلاحی
۶/۳۰ ترکمان پور گورکھپور

محترم آداب!

تکلفات کو تج کر جرأت سے کام لیتے ہوئے میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے یہاں خاص طور سے شعری تخلیقات میں بیشمار غلطیاں ہوتی ہیں جسکی بنا پر شائق تنقید کی امیدیں بر آئی ہیں اور آپکی رائے کا کالم فالتو خطوط کا نذر ہو جاتا ہے۔ جبکہ ان شائق تنقید کو یہ علم ہونا چاہیئے کہ ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروگرام آفیسر مکمل شاعر یا ادیب ہوتے ہیں جو کہ ہر تخلیق کو بغور پڑھ کر ہی پاس کرتے ہیں۔

۱۵ نومبر ۸۶ء کے شمارہ میں رمیصا صاحبہ کا جو خط شائع ہوا ہے۔ وہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جناب نثار اللہ نثار مرحوم فیض احمد فیضؔ کی نقالی کرتے ہیں۔ ۔ ! میں ان کے حضور میں صرف اتنا ہی عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ وہ نثار اللہ نثار صاحب کے ساتھ ہی ساتھ فیض صاحب سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر واقف ہیں تو دونوں حضرات سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !!

شمیم شہزاد
الٰہی باغ گورکھپور

بہت دنوں کے بعد رسالہ آواز دیکھا۔ اور پڑھا۔ کچھ شکایات ہیں۔

وودھ بھارتی پروگرام شائع ہوا ہے۔ لیکن کس کس میٹر پر ہوتا ہے وہ لکھا ہوا نہیں ہے۔

پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام کے بارے میں لکھا ہوا ہے ۴۰-۸ سے ۴۵-۹ تک اردو پروگرام نشر ہوگا۔ لیکن پروگرام کی تفصیل نہیں ہے۔

اردو سروس کے بارے میں جو دہلی سے نشر ہوتا ہے۔ رسالہ آواز میں دوپہر کے نشریات کی تفصیل کسی کسی دن گول ہے۔

میرا مشورہ ہے کہ ہر شمارہ میں ایک اچھا سا ڈرامہ ضرور شائع کریں۔

ڈاکٹر ایس رحمان
مدنپورہ پورنیہ ۔ بہار

آواز کا شمارہ ۱۶ تا ۳۰ نومبر ۸۶ء پٹنے سے دستیاب ہوا۔ دگیا میں نہیں آتا، جب میں پٹنہ جاتا ہوں "آواز" وہیں سے حاصل کرتا ہوں۔ آواز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آکاشوانی سے نشر شدہ پروگرام سے منتخب تخلیق آپ شائع کرتے ہیں۔ جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ کس ریڈیو اسٹیشن پر اردو کا پروگرام ہوتا ہے۔ ہاں اس وقت خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ۱۶ تا ۳۰ نومبر کے شمارے میں آپ کے کاتب نے ہوا محل کے پروگرام میں (۲۴ نومبر اور ۳۰ نومبر) میرے نام کو تمنا مظفر علی لکھ دیا ہے جبکہ تمنا مظفر پوری ہونا چاہیئے تھا۔

ریڈیو پر اناؤنسر نے تمنا مظفر پوری ہی اعلان کیا تھا۔ لہذا یہ کتابت کی غلطی ہے اطلاعاً عرض ہے۔

تمنا مظفر پوری
گردرا بلز، گیا ۸۲۴۱۱۸

ماہ نومبر کے دونوں رسالے باصرہ نواز ہوئے بھوپال اور گورکھپور سے جو غزلیات شائع ہوئی ہیں وہ نہایت لاجواب ہیں مجھے یہ صفحہ بہت عزیز اور محبوب ہے بھوپال سے جو غزلیں شائع ہوئی ہیں تمام غزلیات اچھی ہیں لیکن گورکھپور کی غزلیں بہت پسند آئی۔

جناب آغا غیاث الرحمان کا ایک عظیم شخصیت پسند آیا مولانا آزاد مرحوم پر جو انھوں نے خامہ فرسائیاں کیں ہیں نہایت جامع اور جاندار ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور صحافت لاجواب ہے۔ ایسے تو بہت سے مولانا ہوئے مگر جو خوبیاں ان میں تھی وہ انہیں نصیب کہاں آزادی کے لئے انھوں نے جو صعوبتیں جھیلیں وہ اظہر من الشمس ہیں وہ تقسیم ہند کے سخت مخالف تھے اگر آج لوگ ان کی باتوں پر عمل پیرا ہوتے تو آج ہندوستان کی جو حالت ہے وہ نہ ہوتی۔ ہر جگہ دنگا فساد اور آپس میں نفرت اس سے ان کا دل بہت مایوس رہتا تھا۔ صحافت کے میدان میں اوّل اوّل رہے خدا انکے قبر کو نور سے بھر دے۔

حضرت رسولِ اکرم کے اخلاق حسنہ پر مولانا علی بسمل عزیزی صاحب نے جو مضمون لکھا ہے وہ لوگوں کے لئے عبرت اور نصیحت ہے کفار مکہ اور دشمنانِ اسلام بھی آپ کے اخلاق کا دم بھرتے تھے۔ اسلام کو جو فروغ حاصل ہوا یہ سب آپ کے اخلاق کا نتیجہ ہے۔

طوطی ہند حضرت امیر خسرو دہلوی کو مولانا ہادی نقشبندی نے اتنا اونچا مقام دیدیا کہ نعوذ باللہ

افسوس اس کا ہے کہ وہ بت پرستی کو برا نہیں سمجھتے تھے اور ان کا یہ کہنا کہ مرا اسلمانی درکار نیست بھی ان کے آگے جائز ہے جیسا کہ مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔ خدا ہر مسلمان کو قبر پرستی سے محفوظ رکھے حضور کا ارشاد ہے جسکو مولانا الطاف حسین حالی نے یوں مسدس حالی میں لکھا ہے

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم

خدا ہر ایماندار مسلمان کو عقل سلیم عطا کرے اور راہ راست پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین

محمد یوسف النصاری مفتاحی
متعلم مدرسہ مفتاح العلوم مئو ناتھ بھنجن
ضلع اعظم گڑھ۔ یو۔ پی

3137

نیشنل پروگرام

تیاگ راج ارادھنا فیسٹیول

ہفتہ ۱۷ر جنوری رات ساڑھے نو بجے

تثلیثِ موسیقی کے نمایاں موسیقار سنت رچنا کار تیاگ راج کی یاد میں ہر برس تامل ناڈو میں تنجور و یارو کے مقام پر پشیا بہولا پنچمی کے موقع پر تیاگ راج ارادھنا فیسٹیول منایا جاتا ہے۔ اسی دن موجد لغمات سنت تیاگ راج نے سمادھی پائی تھی۔ اس موقع پر ہر برس ملک کے دور دراز علاقوں سے آئے موسیقاران کی سمادھی پر اکٹھے ہوتے ہیں اور اس مہان سنگیت کار کی لافانی تخلیقات گا کر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

۱۷ر جنوری کو شب ساڑھے نو بجے نشر ہونے والے موسیقی کے نیشنل پروگرام میں ہمارے سامعین تنجور و یارو سے سنت تیاگ راج کی سمادھی پر منعقد موسیقی کی کنسرٹ کا براہ راست نشریہ سنیں گے۔

اروند پاریکھ کا ستار وادن

ہفتہ ۲۴ر جنوری رات ساڑھے نو بجے

ملک کے نمایاں ستار نواز اروند پاریکھ نہایت کم عمر میں ہی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی بعد میں انھوں نے ستار کے مشہور فنکار استاد ولایت خاں

کی شاگردی اختیار کی۔ ان کے ستار وادن میں انکے اپنے انفرادی انداز کے ساتھ ساتھ ان کے استاد کے انداز کی بھی چھاپ ملتی ہے۔ اروند پاریکھ اپنے فن کا مظاہرہ ملک اور ملک سے باہر کر چکے ہیں۔ جہاں شائقین اور ناقدین موسیقی دونوں سے داد تحسین ملی ہے۔

امرناتھ کا گائن

ہفتہ ۳۱ر جنوری رات ساڑھے نو بجے

اندور گھرانہ کے فنکار امرناتھ نے حصول علم موسیقی کا آغاز پروفیسر بی۔ آر۔ دیوتھلے سے لاہور میں کیا۔ بعد میں انھوں نے استاد امیر خاں سے تعلیم پائی جن سے ان کا ساتھ بیس سال تک رہا۔ راگوں کی گہرائی تک پہونچ۔ الاپ سرگم اور تان کی پیچیدگیوں کا بخوبی استعمال ان کے گائن کی انفرادی خصوصیت ہے۔ ملک کی اہم اور مشہور محفلوں میں شرکت کے علاوہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ غیر ممالک میں بھی کر چکے ہیں۔

منگل شب کی محفل موسیقی

سندر لال گندھرو کا بانسری وادن

۲۰ر جنوری رات دس بجے

سندر لال گندھرو نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے پتا رام داس گندھرو سے حاصل کی اور بعد میں گرو ڈاکٹر بی۔ ڈی۔ کالا سے تعلیم پائی۔ بانسری وادن کی تعلیم انھوں

نے مشہور بانسری دشہنائی نواز گرو مہاراج وشنو پرسنّا سے پائی۔ آجکل آپ آکاشوانی نجیب آباد سے منسلک ہیں۔

بلدیو راج ورما کا گائن

۲۷ر جنوری

بلدیو راج ورما کو کم عمری میں ہی موسیقی سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے اس شوق میں ان کے پتا نے حوصلہ افزائی کی۔ ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے امرتسر کے پرتاپ چند اروڑہ سے کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی

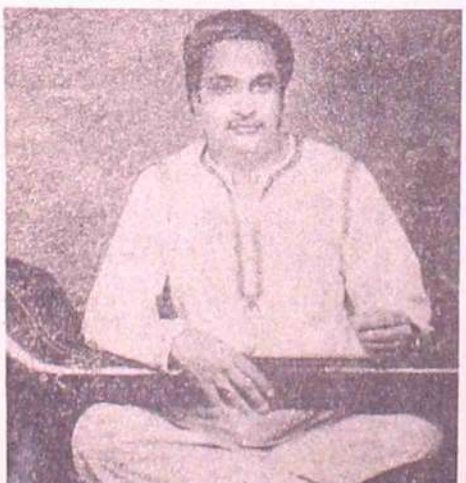

انکی صلاحیتوں اور شوق کے سبب انکو وزارت تعلیم کی جانب سے اعلیٰ تربیت کے لئے نیشنل اسکالرشپ دیا گیا اور انھوں نے اندور گھرانہ کے نامور فنکار امرناتھ جی کی شاگردی اختیار کی۔

دور درشن

دہلی

چینل ۴ تصویر 62.25 MHz
بینڈ ۱ آواز 67.75 MHz

مسوری

چینل ۱۰ تصویر 210.25 MHz
بینڈ ۳ آواز 215.75 MHz

روزانہ ٹیلی کاسٹ ہونیوالے پروگرام

شام

۶-۰۰ افتتاحی اعلانات (سوائے اتوار)
۶-۵۵ پروگراموں کا خلاصہ اور گمشدہ افراد سے متعلق اعلانات (سوائے ہفتہ)
۷-۰۰ کرشی درشن (پیر، منگل، بدھ اور جمعہ)

نیشنل پروگرام

رات

۸-۴۰ سماچار (ہندی خبریں)
۹-۳۰ دی نیوز (انگریزی خبریں)
۱۱-۴۵ نیوز ہیڈلائن (ہفتہ کو ۱۲-۲۰ پر)

اسکول ٹیلی کاسٹ

پیر
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ سائنس (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۱۰-۱۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

منگل
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ کیمسٹری (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

بدھ
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ حساب (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ بایلوجی (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور شام ۴-۴۵ سائنس (ساتویں جماعت)

جمعرات
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ جغرافیہ (دسویں جماعت)
۱۰-۵۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ سائنس (چھٹی جماعت)

جمعہ
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ فزکس (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ انگریزی کا سبق (چھٹی جماعت)

یو جی سی پروگرام

دوپہر ۱۲-۴۵ اور شام ۴-۴۰
اعلیٰ تعلیمی پروگرام (روزانہ سوائے اتوار و تعطیل)

•••••

دہلی I

اتوار

صبح
۹-۳۰ سرب سانجھی گوربانی / سنگیت
۹-۴۵ یوگ اور سواستھ
۱۰-۰۰ اِتو اور پِتو (ہندی سیریل)
۱۰-۳۰ بھجن مالا / سگم سنگیت
۱۱-۰۰ اپنے آپ
۱۱-۱۵ انگریزی سیریل

دوپہر
۱۲-۰۵ کھیل کھیل میں (ہندی سیریل)
۱۲-۳۵ تصویر کا دوسرا رخ (ہندی سیریل)
۱-۲۰ علاقائی زبان کی انعام یافتہ فیچر فلم (I اتوار)
علاقائی زبان کی فیچر فلم II، III اور V
۳-۴۵ ورلڈ آف اسپورٹ

شام
۵-۴۵ اور ۷-۴۵ ہندی فیچر فلم
۷-۳۰ اندھی گلیاں / سنرکشن اپھوگتا کا

۹-۰۰ **کوئز ٹائم** (انگریزی)
۹-۵۰ **فوکس: حالات حاضرہ پر انگریزی پروگرام**

پیر

شام
۶-۰۰ مہیلاؤں کے لیے
۶-۱۵ بچوں کے لیے انگریزی فلم
۶-۳۵ جان ہے جہان ہے (صحت سے متعلق)
۷-۳۰ سنسد سماچار / سنگیت
۷-۴۰ ہندی ناٹک

۹-۰۰ **کبھی دور کبھی پاس** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **سچ کی پرچھائیں** I اور III
چترمالا II اور IV
شام غزل V

۱۰-۲۰ **کرم چند** (ہندی سیریل)
۱۰-۴۵ **رقص کا نیشنل پروگرام / بیلے**

منگل

شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ کھیل کھلاڑی
۶-۳۵ ہمارے کامگار، ہمارے ادیوگ (II اور IV)
ہمارے ادھیکار اور کرتویہ (I، III، V)
۷-۴۰ یوتھ فورم I، III اور V
یووا منچ II اور IV
۸-۱۰ بزم (اردو ادبی میگزین)

۹-۰۰ **بنیاد** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **جن وانی** I، III اور V
بیانڈ لوٹ مارو II اور IV
۱۰-۵۰ **ایکسپیڈیشن ٹو دی اینیمل کنگڈم** (انگریزی سیریل)
۱۰-۰۰ **ٹو وردس پروگریس / پریورتن**

بدھ

شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۲۵ آنگن واڑی
۶-۳۵ وکاس کی اور
۷-۴۰ آپ اور ہم (ناظرین کے خطوں کے جواب)
۸-۰۰ چترہار (ہندی فلموں سے رقص و گیت)

۹-۰۰ **مالگڈی ڈیز** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **رونگ آئی** I، III
حالات حاضرہ پر پروگرام / متفرقات II، IV اور V
۱۰-۲۰ ہندی سیریل
۱۰-۴۵ پریمیر انسٹی ٹیوشنز آف انڈیا (I، III اور V)
گریٹ ماسٹرز (II اور IV)

جمعرات

شام
۶-۰۰ دیہی بچوں / دیہی نوجوانوں کے لیے
۶-۱۵ گھریلو نسخے
۶-۳۵ قانونی صلاح

۷-۰۰ رقص
۷-۲۵ وشو درشن
۷-۴۰ پتریکا (ہندی ادبی میگزین)

۸-۰۰ باتوں باتوں میں
سنگیت / ترتیبہ
۸-۲۵ اکنامکس میڈ ایزی: انگریزی سیریل
۹-۰۰ **اسپونسرڈ پروگرام** (ہندی سیریل)

۹-۵۰ **پرشن منچ** I
کیوسٹ II
اسپورٹس کیوز III
واٹ از دی گڈ ورڈ IV
ہیلتھ کوئیز V

۱۰-۲۰ **انگریزی پروگرام**

۱۰-۴۵ **موسیقی کا نیشنل پروگرام**

جمعہ

شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (انگریزی)
۶-۱۵ آپ کا پریوار
سگم سنگیت
۶-۳۵ گیان دیپ
۷-۴۰ چترہار
۸-۰۰
۹-۰۰ **یاترہ** (ہندی سیریل)
۱۰-۲۰ **ان دس آور لینڈ**

ہفتہ

دوپہر
۱-۴۵ گھر باہر
۲-۱۵ یوتھ ٹائم / یوتھ فورم
۲-۴۵ ہندی سیریل

آکاشوانی پانڈیچری
سے نشر ایک تامل ناٹک کے شرکار فنکار
اوپر بائیں)
نئی صبح کا سورج، آکاشوانی سورت گڈھ
ے نشر ہندی ناٹک کی صدا بندی میں
مصروف فنکار
کاشوانی سلی گوڑی سے نشر
گالی ناٹک کے فنکار

آکاشوانی ناگپور سے
نشر مراٹھی ناٹک کے فنکار

آکاشوانی بمبئی، احمدآباد بڑودہ
اور بھج سے نشر
گجراتی ناٹک کے شرکار فنکار

Regd. No. D-(C)39
R.N. No. 14253/57
PRICE : RUPEE 1.00
Awaz
16th JANUARY 1987
Licensed (U-23) to post without
prepayment at PSO, New Delhi.

بالامدی سرلا ——— آل انڈیا ریڈیو کے مقابلہ موسیقی میں
کلاسیکی گائن کا پہلا انعام والی فنکارہ آکاشوانی وجے واڑہ کی
ایک محفل موسیقی میں ۔

سینل شمبھو ۔ رقص کے ایک ابھرتے
ہوئے فنکار آپکے ساتھ انٹرویو
آکاشوانی بنگلور سے نشر ہوا ۔

آکاشوانی جلگاؤں سے
نشر ———
مراٹھی کوی سمیلن کے شرکاء

شری شرن بساشیشو ور ریذیڈنشل اسکول
کے طلباء ———
جنکی پیش کردہ جھلکی آکاشوانی گلبرگہ
سے نشر ہوئی ۔

ublished by the Director General, All India Radio, at the Office of the Chief Editor, Akashvani Group of Journals, PTI Building, II floor, Sansad Marg, New Delhi-110001.
rinted by the Manager, Govt. of India Photo Litho Press, Faridabad.

۱۲ سے ۲۶ ماگھ ۱۹۰۸ شاکا

اشاعت کا ۵۲ واں سال
قیمت ایک روپیہ

آکاش

آل انڈیا ریڈیو و دوردرشن کے پروگرام، معلوماتی مضامین، دلچسپ افسانے و منظومات

اس بار لکھنؤ سے غزلیں

زیب غوری

رنگِ غزل میں دل کا لہو بھی شامل ہو
خنجر جیسا بھی ہو لیکن قاتل ہو
اِس تصویر کا آب و رنگ نہیں بدلا
جانے کب یہ دل کا نقش بھی باطل ہو
شورِ فغاں پر اتنی بے چینی کیسی
تم سے کیا تم کون کسی کے قائل ہو
دیکھ کبھی آ کر یہ لامحدود فضا
تو بھی میری تنہائی میں شامل ہو
میں ہوں ایک تھکا ہارا درماندہ شخص
میری انا کہتی ہے میرے مقابل ہو
زیبؔ سوال اب یہ ہے تجھے پہچانے کون
کس کی نظر اس گہرائی کی حامل ہو

انیس اشفاق

موجِ خوں صرفِ قلم کرتا ہوں
شہر کا نوحہ رقم کرتا ہوں میں
شمع روشن ہے مگر اب اس کی لَو
تیز ہوتی ہے تو کم کرتا ہوں میں
غم نہیں ہے تیرے جانے کا مجھے
آنکھ نم کرنا ہے نم کرتا ہوں میں
دور تک صحرا میں روشن ہے غبار
دشت کی ظلمت میں دم کرتا ہوں میں
جس کی ہر آیت ثمر آثار ہے
وہ دعا شاخوں پہ دم کرتا ہوں میں

اثر انصاری

نکل کے کوچۂ قاتل سے اب کدھر جاؤں
کسی کے سامنے کیسے بُریدہ سر جاؤں
میں عکس عکس ہوں وہ آئینہ در آئینہ
وہ ٹوٹ جائے تو میں بھی بکھر بکھر جاؤں
بنی ہے پاؤں کی زنجیر یہ زمین وطن
لگی رہے گی یہ مجھ سے جدھر جدھر جاؤں
سفر سفر ہے مری زندگی ہر لمحہ
نہ جانے منزلِ ہستی سے کب گذر جاؤں
مجھے ان آنکھوں کی گہرائیوں کا علم نہیں
اتھاہ پانی میں کس طرح میں اتر جاؤں
ابھی تو چھان رہا ہوں میں شہر شہر کی خاک
ذرا نپٹ لوں ادھر سے تو اپنے گھر جاؤں
قدم قدم ہے مرے ساتھ گردشِ دوراں
نفس نفس لیے غم ہائے معتبر جاؤں
نہ آ قریب کہ مردم گزیدہ ہوں میں اثرؔ
کسی کے پاؤں کی آہٹ سنوں تو ڈر جاؤں

نامی انصاری

ہر شے وہی نہیں ہے جو پرچھائیوں میں ہے
اس کے سوا کچھ اور بھی گہرائیوں میں ہے
آئینہ جس سے ٹوٹ کے بے آب ہو گیا
وہ عکسِ بے نوا بھی تماشائیوں میں ہے
فرصت ملے تو میں بھی کوئی مرثیہ لکھوں
اک دشتِ کربلا مری تنہائیوں میں ہے
کس شہر میں تلاش کریں رشتۂ وفا
سنتے تو ہیں پرانی شناسائیوں میں ہے
دریا کے زور و شور پہ باتیں ہزار ہوں
پانی مگر وہی ہے جو گہرائیوں میں ہے
گھل جائے شعر میں تو زمین آسمان بنے
وہ حُسنِ لازوال جو سچائیوں میں ہے
بے کار اس کو اہلِ وفا میں گنا گیا
نامیؔ کہاں سے آپ کے شیدائیوں میں ہے

عرفان صدیقی

سکوتِ خوف یہاں کو بہ کو پکارتا ہے
نہ اس کی تیغ، نہ میرا لہو پکارتا ہے
میں اپنی کھوئی ہوئی لوح کی تلاش میں ہوں
کوئی طلسم مجھے چار سُو پکارتا ہے
ندائے کوہ بہت کھینچتی ہے اپنی طرف
مرے ہی لہجے میں وہ حیلہ جو پکارتا ہے
وہ مجھ میں بولنے والا تو چپ ہے صدیوں سے
یہ کون ہے جو ترے روبرو پکارتا ہے
ہمارا عہد ہے بے برگ و بار شاخوں سے
اگرچہ قافلۂ رنگ و بو پکارتا ہے
کہ جیسے میں سرِ دریا گھرا ہوں تیروں میں
کہ جیسے خیمۂ صحرا سے تو پکارتا ہے

راجندر بہادر روج

نہ ہم بدلے نہ دل بدلا نہ یہ شام و سحر بدلے
تعجب ہے مجھے اس کا تمہیں کیوں اِسقدر بدلے
وفا و مہر کی اپنی روش ہم تو نہ بدلیں گے
زمانے کو بدلنا ہے اگر وہ بے خطر بدلے
مرے جذبات میری چاہ کا عالم نہیں بدلا
نظر آتے ہیں پھر بھی آپ کے تیور مگر بدلے
کہاں ان کا تغافل اور کہاں میری وفاداری
ذرا حالات کی صورت ادھر بدلے ادھر بدلے
کرم پر ان کو مائل دیکھ کر یہ فکر ہوتی ہے
وہ کب بدلیں نہ جانے اور کب ان کی نظر بدلے
بہت رنگینیاں ہوتی ہیں آغازِ محبت میں
دکھائی دیتے ہیں دو ہی دنوں میں بام و در بدلے
نہ آئیں موج طوفاں کیوں نہ اکثر آبجوؤں میں
ذرا سی پا کے ثروت لوگ اکثر بیشتر بدلے

انجم عرفانی

جو بھر سکے کبھی نہ وہ گہرائی دے گیا
یہ ایک زخم کیسا مرا بھائی دے گیا
سرسبز ہو اُٹھے ہیں شجر درد کے تمام
وہ شہرِ جاں میں یادوں کی پُروائی دے گیا
ایک عمر ساتھ ساتھ رہا اجنبی کی طرح
اور جاتے جاتے زخمِ شناسائی دے گیا
کیا کیا کیا نہ گوشہ نشینی پہ پہلے طنز
محفل میں آتے آتے ہی سوائی دے گیا
گرد آندھیوں کو فطرتِ دشت آفرینی دی
بادِ صبا کو ذوقِ گل آرائی دے گیا
اُن کو تو نظمِ مقتل و زنداں کیا عطا
ہم کو فرازِ دار کی زیبائی دے گیا
ہر داستاں میں زینتِ عنوان بنا رہا
دُنیا کو مشقِ حاشیہ آرائی دے گیا
اک بار رکھ کے روبرو آئینۂ وقت کا
انجمؔ وہ سادہ لوحوں کو دانائی دے گیا

حسن زندگی

محمد اختر عالم

انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں۔ ایک طبعی اور دوسرا روحانی۔ انسان جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے۔ اور دونوں ہی زندگی کا مقصد متعین کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ انسانی فطرت مختلف قوتوں، جبلتوں اور خواہشوں کا ایک غیر مربوط مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مربوط نظام ہے۔

اس نظام کے بنیادی خطوط متعین ہیں۔ زندگی کا خارجی نظام جب داخلی فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے تو زندگی سنور جاتی ہے۔ اور انسان کو ذہنی سکون اور قلبی مسرت اور جسمانی آسودگی نصیب ہوتی ہے اور خارجی نظام پائیدار اور مستحکم ہوتا ہے۔ لیکن جب ہم آہنگی کے بجائے تصادم ہوتا ہے تو زندگی ذہنی خلفشار و قلبی بے چینی سے بھر جاتی ہے۔ اور خارجی زندگی کے خلاف بے اطمینانی اور کشمکش شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمارے سامنے زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا ایک واضح تصور ہونا چاہیئے اور ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ بگاڑ کیا ہے تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں اور بناؤ کیا ہے تاکہ اس کو عمل میں لانے پر سارا زور لگا دیا جائے۔ سیرت و کردار کو سنوارنے کے لئے ایک واضح ضابطہ و معیار کا علم ہونا ضروری ہے۔ ہر دور، ہر خطہ اور ہر قسم کے حالات میں افراد کے اندر بہتر زندگی حاصل کرنے، برائیوں اور خرابیوں سے بچنے اور تعمیر و ترقی کے راستے پر بڑھنے کی خواہش فطری طور پر موجود رہی ہے لیکن بہترین زندگی حاصل کرنے کا راستہ جب کبھی غیر واضح رہا ہے تو وہ دھندلے قیاسات کے پیچھے گھومتا رہا ہے اور زندگی اسی وقت سنور سکی ہے جب اسے صلاح و فلاح کا ضابطہ ہاتھ آیا ہے۔ انسان پر پاک نفوس کا احسان عظیم یہی ہے کہ انھوں نے صلاح و فلاح کے ضابطے وضاحت کے ساتھ انسانیت کے سامنے رکھے۔ انسانی زندگی میں بگاڑ دراصل خدا سے بے خوفی اور اسکی ہدایت سے بے نیازی کا نتیجہ ہے۔ جس نے انسان کے لئے کسی معاملہ میں بھی مستقل اخلاقی اصول باقی رہنے نہ دیئے جن کی پابندی کی جائے، اسی چیز کی بدولت اشخاص کا سارا طرز عمل مفاد پرستی، لذت پرستی اور خواہشات کی غلامی پر قائم ہو گیا ہے۔ خود غرضی جو صرف افراد ہی کو ایک دوسرے کی حق تلفی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ طبقاتی امتیازات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے فساد کی بیشمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

انسان کے اندر ایک فطری حس ہے جو بعض باتوں کو پسند اور بعض باتوں کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ حس انفرادی طور پر اشخاص میں چاہے کم و بیش ہو مگر مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی زندگی میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ اور کبھی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے۔ اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا ___ صبر، تحمل، استقلال، بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے۔

آواز

آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام

جلد ۵۲ | شمارہ ۳

یکم فروری ۱۹۸۷ء مطابق ۱۲ ماگھ ۱۹۰۸ شاکا

چیف ایڈیٹر ایس کے سندر — ٹیلی فون ۳۸۲۲۴۹

ادارت

سراج احمد — ۳۸۲۲۵۴

ہرمہندر سنگھ وج

اسسٹنٹ بزنس منیجر : جگدیش پرساد — ۳۸۲۳۵۱

اس شمارے میں

حسن زندگی ___ محمد اختر عالم ___ ۳

ذاکر ___ ابوالکلام قاسمی ___ ۴

جگر مراد آبادی ___ غلام رضوی گردش ___ ۶

اردو ادب میں خاکہ نگاری ___ سید شریف الحسن نقوی ۷

دیہات کے موجودہ مسائل اور ان کا حل ___ سید فرید حیدر رضوی تھوری ۸

پٹرول کی قیمت اوپیک کی نئی پالیسی ___ آر این گنیش ___ ۱۰

یونانی طب کے میدان میں ترقی ___ ۱۱

سیاحت ___ نریندر لوتھر ___ ۱۳

قصہ تنخواہ بڑھنے کا ___ محمد اکرام الحق ___ ۱۴

سچ بولنا ___ فکر تونسوی ___ ۱۶

ستو اور اس کی دلہن ___ عطیہ پروین ___ ۱۷

دل کی دنیا کا اجالا ___ اکرم فاروقی ___ ۲۰

وہ آدمی ___ خورشید عالم ___ ۲۲

بوڑھی پلکھن ___ ظہیر کیفی امروہوی ___ ۲۳

غزلیات

ہوش عظیم آبادی ___ ۸

نور عالمی ___ ۱۵

خورشید سحر ___ ۱۷

عبدالاحد ساز ___ ۱۹

قیمت

فی کاپی ___ ایک روپیہ

سالانہ ___ ۲۲ روپے

دو سال ___ ۴۲ روپے

ادائیگی بذریعہ چیک / پوسٹل آرڈر / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، بنام چیف ایڈیٹر [illegible] آل انڈیا ریڈیو [illegible] نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Telegram: 'LISTENER' New Delhi

(ایک سال سے کم کا چندہ قابل قبول نہیں ہوگا)

اندرون ملک ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

بے صبری، چھچھورپن، تلوّن مزاجی، پست حوصلگی۔ اور بزدلی پر کبھی تحسین وآفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔ خود داری، شائستگی اور ملنساری کا شمار ہمیشہ سے خوبیوں میں ہوتا رہا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کم ظرفی کج خلقی، بدتمیزی نے محاسن کی فہرست میں جگہ پائی ہو۔ ایسا ہی معاملہ انسان کے زندگی کے سنوارنے میں بدی اور نیکی کا بھی ہے۔ چوری۔ ڈاکہ۔ قتل۔ جعل سازی، رشوت خوری۔ کبھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے۔ بدزبانی، مردم آزاری، غیبت، چغلخوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی کو کبھی نیکی نہیں سمجھا گیا۔ مکار، ریاکار منافق، ہٹ دھرم، حریص لوگ کبھی بھی بھلے آدمیوں میں شمار نہیں کئے گئے۔ اس کے برعکس والدین کی خدمت، رشتہ داروں کی مدد، ہمسایوں سے سلوک دوستوں سے رفاقت، کمزوروں کی حمایت، یتیموں اور بے کسوں کی خبرگیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدوں کی اعانت ہمیشہ نیکی سمجھی گئی۔ پاک دامن خوش گفتار، نرم مزاج اور خیراندیش لوگ ہمیشہ سے عزت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہیں لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو راست باز اور خیراندیش ہوں، جن پر ہر معاملے میں اعتماد کیا جا سکے۔ جو اپنے حق پر قانع اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں فراخدل ہوں۔ جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن دیں۔ جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی امید ہو اور کسی کو برائی کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ باتیں دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے ہیں اور جانتے چلے آرہے ہیں۔ نیکی سے زندگی کا بناؤ اور بدی سے زندگی کا بگاڑ انسانیت کی جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ نیکی کو "معروف" اور بدی کو "منکر" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے۔ جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ ہے جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اگر زندگی معروف پر قائم ہو تو وہ منکر سے پاک ہو تو زندگی سنور جاتی ہے۔ جن بھلائیوں کو انسانیت کی ضمیر نے بھلا جانا ہے ان کی پیروی کی جائے اور پروان چڑھایا جائے۔ اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی رہی ہے اس سے بچا جائے تو زندگی سنور جاتی ہے۔

وہ باتیں جن سے زندگی سنورتی ہیں وہ ہے خدا کا خوف اور خدائی ہدایت کی پیروی۔ ہر دور ہر ملک اور ہر قوم میں ایسے نفوس قدسیہ کا ظہور ہوتا رہا ہے جنہوں نے انسانوں کو اپنے عمل اور زبان سے ان ہدایت کو برت کر دکھایا اور آج بھی ان کی باتیں زندگی کو سنوارنے کے لئے قابلِ اعتماد ضمانت ہیں، اور وہ تمام خوبیاں جن پر ایک پرامن اور ترقی پذیر زندگی کی پیدائش کا انحصار ہے اسی ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ گرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعہ سے بھی کسی نہ کسی حد تک انہیں پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کی نشوونما بس ایک حد پر جاکر رک جاتی ہے اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل رہتی ہے۔ خدا ترسی کی باتیں ہی وہ پائیدار بنیاد ہے۔ جس پر انسان اپنی زندگی کو سنوار سکتا ہے۔

زندگی کو سنوارنے کے لئے یہ بھی اشد ضروری ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کا شعور حاصل کرے بار بار کے تجربات سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہماری زندگی کا کمزور پہلو کیا ہے۔ کسی کے اندر کبر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کسی میں غصہ کی تلخی زیادہ ہوتی ہے۔ کسی میں خود آرائی کا مرض ہوتا ہے، کسی میں اسراف یا بخل کے آثار ہوتے ہیں۔ کسی میں اور کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اسے زندگی کی اسی کمزوریوں کا جان لینا اور اس کے خلاف ایک جدوجہد جاری رکھنا زندگی کو سنوارنے کے لئے انتہائی ضروری ہے، اگر ہم اپنی کمزوریوں کو ڈھیلا چھوڑ دیں تو آخرکار پورے کردار پر چھا جائیں گی۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ اپنے نفس پر نگاہ رکھنا، اپنی کمزوریوں کو جاننا اور ان کے خلاف معرکہ آرا ہونا اور اپنے مرکز روح کی پاسبانی کرنا ہر فرد کی اپنی ہی ذمہ داری ہے، اس دائرے میں باہر سے کوئی دوسرا اس کے حصے کا فرض انجام نہیں دے سکتا لیکن احساس ذمہ داری کے سن ہونے کی صورت میں دوسرے سمت آدمی تعمیر زندگی کا مطالبہ تمام تر دوسروں سے کرتا ہے۔ وہ بظاہر اس بات کا حریص بنتا ہے کہ اس کی زندگی اعلیٰ معیار پر پہنچنا چاہیئے مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ معمار بن کر اسکی شخصیت کی عمارت کو اٹھائیں اور اسکی زندگی کا حسین و جمیل قصر تیار کریں۔ پھر جب اس کے مطالبات پورے نہیں ہوتے تو پریشان ہو ہو کر اپنی کوتاہیوں کا الزام تمام تر دوسروں پر ڈالتا ہے اور ہر جگہ خرابی تلاش کرتا ہے اور پالیتا ہے مگر اسے اپنے اندر کی خرابی کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے جس شخص کے اندر یہ حس کام کرنے لگے کہ میں اپنے بھلے اور برے کا خود ذمہ دار ہوں، خود مجھے اپنے دماغ کو اچھے خیالات کا گہوارہ بنانا ہے خود اپنے کردار کو بنانا اور زندگی کو سنوارنا ہے تو اس کی زندگی یک لخت سنورنے لگتی ہے۔

(پٹنہ سے نشر)

بھلائے نہ بنے
مشرق ومغرب کی شہرۂ آفاق تصنیفات کے ان اہم کرداروں پر اردو سروس کی نشریاتی تقاریر کا سلسلہ جو قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔

ذاکر

افسانوی ادب — خواہ داستان کی شکل میں ہو یا ناول افسانے کی صورت میں، اپنے کرداروں کی پیش کش اور انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اترنے کی نوعیت کے اعتبار سے اپنی قدر وقیمت کا تعین کرتا ہے۔ افسانوی ادب میں پلاٹ، تکنیک اور اندازِ بیان کے پیرائے بدلتے رہتے ہیں لیکن کردار کے مطالعے کی اہمیت ہر شیوہ اور ہر انداز کے ساتھ باقی رہتی ہے۔ ناول اور افسانے درحقیقت مختلف اور متنوع انداز میں انسان کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ اس لیے کردار نگاری کا معاملہ کبھی ثانوی حیثیت اختیار نہیں کرتا۔ کرداروں ہی کے گرد پورے فکشن کا تانا بانا بُنا جاتا ہے اور کرداروں ہی کے سہارے صورت حال کی تبدیلی اور تبدیل شدہ صورت حال کی معنویت واضح اور نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ فکشن کے پلاٹ، اسالیب بیان اور ہیئت واظہار کے تجربے بسا اوقات ہمارے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں مگر بعض کردار مدتوں ہمارے ذہن ہی نہیں، بلکہ ہمارے پورے وجود کا حصہ بنے رہتے ہیں۔ ایسے کردار، ناول یا افسانے کے کاغذی پیرہن سے باہر آکر ہم سے ہمارے مادی اور جسمانی وجود کی سطح پر متعارف معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کردار نگاری کے طلسم کے سبب اس قسم کے کردار ہمارے ذہن وشعور کے لیے کچھ ایسا التباس تخلیق کرتے ہیں کہ ہم ان سے صرف کتاب کے صفحات پر نہیں ملتے بلکہ اس حد تک مانوس اور واقف ہو جاتے ہیں گویا ہم نے انھیں حقیقی زندگی میں دیکھا، محسوس کیا اور برتا ہو — چونکہ ایسے کردار آسانی سے فراموش نہیں کیے جا سکتے اس لیے بہت سے تخلیق کار اپنی ادبی تخلیقات سے کہیں زیادہ اپنے تخلیق کردہ اسی نوع کے کرداروں سے پہچانے جاتے ہیں۔

انتظار حسین کے ناول "بستی" کا مرکزی کردار اسی نوع کے کرداروں میں سے ایک ہے۔ 'بستی' حقیقی معنوں میں ذاکر کی کہانی ہے۔ اس ذاکر کی کہانی جو کالج میں پڑھاتے، ایک گاؤں سے دوسرے قصبے یا شہر میں منتقل ہونے اور ہجرت کے تجربے سے گزرنے کے باوجود روپ نگر نام کی بستی سے ہر جگہ اپنا حقیقی، وجدانی اور جذباتی تعلق باقی رکھتا ہے۔ روپ نگر اس کی یادوں کی دنیا ہے

ابو الکلام قاسمی

صاف وشفاف، مقدس اور بے داغ ـــــ ناول کا آغاز روپ نگر کے اس منظر نامے سے ہوتا ہے جہاں ذاکر ایک نوعمر، حساس اور مضطرب ذہن رکھنے والے لڑکے کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے ـــــ وہ ایک طرف اپنے گاؤں کے بھگت جی کے علم پر بہت اعتبار کرتا ہے جو گلے میں جنیو باندھے، ماتھے پر تلک لگائے رامائن اور مہابھارت میں لکھی حکمتیں سنا سنا کر لوگوں کے علم میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ـــــ تو دوسری طرف اپنے عالم باپ کی مذہبی باتوں سے غیر معمولی طور پر متاثر نظر آتا ہے، جن کے پاس مشکل سے مشکل سوالوں کے جواب قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کی شکل میں ہمہ وقت موجود ہیں ـــــ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر کی تربیت اور ذہنی نشو ونما میں اسلامی تاریخ، روایات اور مذہبی قصوں کے ساتھ ہندو تہذیب اور دیومالا کا بڑا گہرا اثر ہے ـــ ناول کے ابتدائی صفحات میں ذاکر کے ذہنی پس منظر کے طور پر ہند اسلامی تہذیب و روایت کا اثر دکھلا کر ذاکر کے کردار کی تشکیل اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات اور صورت حالات میں ایک خاص طرح کی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ذاکر اس ناول میں اپنی زندگی کے تین ادوار کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے مگر یہ تینوں دور اپنے آخری نتیجے کے طور پر ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جاتے ہیں اور پہلے دور میں رونما ہونے والے حیرت خیز، شدت احساس سے لبریز اور دل و دماغ کی گہرائیوں تک چھا جانے والے ابتدائی تجربات کے بعد کے زمانے میں جگہ جگہ اپنی پرچھائیاں ڈالتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذاکر کی زندگی کا ابتدائی دور لڑکپن کا وہ زمانہ ہے جب اس کی خالہ زاد بہن صابرہ سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ لڑکپن کے کھیل کود کے درمیان دو مخالف جنس کے مابین کشش اور کھینچاؤ کا انوکھا اور غیر واضح، مگر حواس کی ساری جہات کا احاطہ کر لینے والا عجیب و غریب تجربہ ـــــ یہ تجربہ صابرہ سے بہت دور جا کر بھی ذاکر کے ذہن میں تازہ رہتا ہے اور اسے صابرہ سے ملنے کی طرف راغب کرتا رہتا ہے ـــــ صابرہ سے دوسری ملاقات کا منظر عنفوان شباب کی جذباتیت اور جنس مخالف کی طرف کشش کے شعور و احساس کی تفصیلات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اس دور میں ذاکر کا دوست سریندر اس کا ہم راز ہے، جس سے وہ صابرہ کی جسمانی قربت اور ملاقات کی ساری جزئیات پر کھل کر بات کرتا ہے۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد ملک کی تقسیم بروئے عمل آتی ہے اور ذاکر اپنے والدین کے ساتھ مملکت خداداد چلا جاتا ہے۔ پاکستان پہنچ کر اس کی مصروفیات، اس کی دلچسپیاں اور اس کے مسائل خاصے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کہ اس زمانے میں اسے اطلاع ملتی ہے کہ صابرہ کے گھر کے لوگ مشرقی پاکستان چلے گئے تھے مگر صابرہ نے ایسلی ہندوستان میں رہنا پسند کیا ـــــ پاکستان میں ذاکر کی بدلی ہوئی دلچسپیاں اور مصروفیات اس کے ذہن سے صابرہ کی یاد کے محو ہونے کا گمان پیدا کرتے ہیں مگر بعد کے واقعات میں صابرہ کے بارے میں تجسس اس گمان کی نفی کرتا ہے ـــــ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقعات کے مقابلے میں صابرہ کے رویے اس کو ذاکر سے کہیں زیادہ پراسرار ہے اور ذاکر کی یاد سے وابستہ سرزمین سے اس کی وفاداری ذاکر کے مقابلے میں زیادہ واضح و غیر مشکوک ہے۔

ذاکر کی زندگی کا تیسرا اور اہم دور پاکستان میں سیاسی ہنگاموں اور سماجی افراتفری کے پس منظر میں ابھارا گیا ہے۔ یہ دور ذاکر کی زندگی کا ہی نہیں بلکہ اس ناول کی کہانی کا وہ ابتدائی مرحلہ ہے جس کی پیش کش کے لیے ماقبل کے واقعات اور تفصیلات سے سیاق و سباق تیار کیا گیا ہے۔ اس زمانے میں ذاکر کبھی اپنے احباب، افضال اور عرفان کے ساتھ نظر آتا ہے اور کبھی اپنے گھر یا شیراز ہوٹل میں پاکستان کے حال میں مستقبل کی طرف سے فکر مند دکھائی دیتا ہے ـــ اسی زمانے میں وہ یکے بعد دیگرے دو لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ـــ صابرہ کچھ عرصے تک اس کے خواب و خیال تک سے غائب نظر آتی ہے، ظاہر ہے کہ ناول میں اس کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ اس لیے کہ ناول کے نصف اول میں صابرہ کی یاد جس انداز میں ذاکر کا سب سے بڑا ذہنی سرمایہ بنی رہتی ہے، اچانک اس یاد سے غافل ہو جانا واقعات کی منطق سے مطابقت نہیں رکھتا ـــــ

کچھ عرصے کے بعد ذاکر ہمہ وقت پاکستان کی صورت حال پر غور و فکر میں غلطاں و پیچاں دکھائی دیتا ہے۔ اسی دوران ہندوستان اور پاکستان کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ جنگ کے آغاز کے ساتھ افراتفری اور اجتماعی الجھن اور بے اطمینانی کی فضا ہر طرف نظر آنے لگتی ہے۔ باہر کے ہنگامے اسے مزید غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں وہ ایک جگہ عجیب و غریب ذہنی کیفیت سے دوچار ہے ـــــ "وہ اپنے آپ پر حیران ہونے لگا۔ باہر جتنا ہنگامہ بڑھتا جاتا ہے۔ میں اندر سمٹتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آ رہی ہیں۔ میری یادیں میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل کہاں سے شروع ہوتا ہے، نہیں ـــ میں کہاں سے شروع ہوتا ہوں۔ اور پھر ـــــ وہ جنگل میں تھا ـــــ" ذاکر کے کردار میں اس کے دوستوں کے برخلاف بالکل مختلف اور منفرد رویوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کا ایک دوست پاکستان کو سوشلزم کی راہ پر لے جانا چاہتا ہے، دوسرا اسلامی مملکت کے خواب کو شرمندہ تعبیر دیکھنا چاہتا ہے۔ تیسرا سول سروسز کو اپنا کیریر بناتا ہے مگر ذاکر معلمی کے پیشے سے پیشے کی حد تک وابستہ تو ضرور دکھائی دیتا ہے مگر اس کی زندگی کا اصلی روپ یادوں کے گھنے جنگل میں بسیرے سے عبارت ہے۔ ایسا لگتا ہے گویا وہ رفتہ رفتہ اپنی ذات کے حصار میں محصور ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے ذہن کو پراگندہ خیالی سے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ کے دنوں میں ڈائری لکھنا شروع کرتا ہے۔ جنگ کے متعلق افواہوں، سچی خبروں اور خوش گمانیوں پر مبنی تحریروں میں وہ اپنی اور اپنے ملک کی صورت حال کو غدر کی صورت حال کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ ڈائری کے صفحات پر روزانہ کے واقعات کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والی ہلاکت خیزیوں کی داستان بھی درج ہوتی چلی جاتی ہے مگر بقول شخصے غدر کے زمانے کی دلی اور ۱۹۷۱ء کے لاہور میں مماثلت کی اقدار نہ ہونے کے برابر دکھائی دیتی ہیں ـــ ذاکر کی ڈائری اس کی شخصیت کے اس پہلو کو خاصا نمایاں کرتی ہے کہ وہ ٹھوس حقائق سے آنکھیں چار نہ کرنے کے سبب اپنی صورت حال کو اپنے اسلاف کی صورت میں رکھ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش بجائے خود ذاکر کی انفرادیت کی شہادت دیتی ہے۔ ذاکر اسی پر بس نہیں کرتا وہ جا بجا کتھاؤں اور اساطیری واقعات میں بھی پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے مگر ٹھوس حقائق ہر جگہ اس کا تعاقب کرتے ہیں ـــــ اور اسے کوئی راہ فرار نہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ان حالات میں وہ ایک بار پھر صابرہ کی یاد کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہے اور سریندر کے خط سے معلوم ہونے والی تفصیلات کے حوصلے سے صابرہ کی جستجو کا جذبہ اس کے دل میں بیدار ہوتا ہے مگر اس مقام پر اس کی اپنی شخصیت کی انفعالیت سدِ راہ بن جاتی ہے۔ ناول کے اختتام سے پہلے ذاکر اپنے ملک کی شکست کو قبول کر لیتا ہے اور اس طرح وہ بھی اس جم غفیر کا حصہ بن جاتا ہے جس نے شکست کو اپنا مقدر جان کر خوش آئند مستقبل کے لیے نئے سرے سے جد و جہد کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے ـــــ

ذاکر کے کردار میں امتیاز کے کچھ اور پہلو بھی ملتے ہیں مگر جو چیز اس کردار کو ایک ناقابل فراموش کردار بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کردار کی پیش کش میں انتظار حسین نے واقعات و حالات کے خارجی اور ظاہری عمل اور ردعمل کے بجائے اس کردار کے شعور و احساس کی داخلی کشمکش اور تناؤ کو نہایت فنکاری اور چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ناول ختم کرنے کے ساتھ ہم خارجی واقعات سے کہیں زیادہ ذاکر کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا عرفان حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ ذاکر کی کردار نگاری کی بہترین مثال ہے۔

(اردو سروس سے)

یکم فروری ۱۹۸۷ء

جگر مراد آبادی

غلام رضوی گردش

یادش بخیر آل انڈیا مشاعرے میں شرکت کرنے جگر صاحب بھوپال تشریف لائے۔ ایک نوآموز شاعر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت مودبانہ اپنی غزل سنانے کی خواہش ظاہر کی۔ جگر صاحب نے ان کے سراپے پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور خاموش رہے جاں نثار اختر نے اشارتاً اجازت دے دی تھی۔ غزل شروع ہوئی اور ختم بھی۔ جگر صاحب بت بنے بیٹھے رہے! دوسری غزل کی باری آئی — جگر صاحب نے اُف نہ کی! پھر تیسری کے بھی چند شعر ہو گئے۔ جگر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے! بیچارے شاعر نے دست بستہ عرض کیا۔ "حضور! کچھ ارشاد نہیں ہوا؟ اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔"

جگر صاحب ٹکٹکی باندھے کچھ دیر ان کے چہرے کا جائزہ لیتے رہے پھر جھٹ بول پڑے — "ایسا ہے میاں۔ آپ کوئی دوسرا دھندا کر لیجئے"! کھرے آدمی تھے، لگی لپٹی نہیں رکھتے، جو دل میں وہی زبان پر، ظاہر و باطن یکساں!—

ایک بار مشاعرے گاہ سے اسٹیشن یکہ پر بیٹھ کر آئے چند عقیدت مند اور منتظم اسی یکہ پر لدے پھندے اسٹیشن تک پہونچانے آئے تھے۔ جگر صاحب نے ٹکٹ کے لئے جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو بٹوا غائب — بہت سٹپٹائے اور گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ایک عقیدت مند نے بھانپ لیا اور انہیں کنارے لے جا کر بڑی رازداری سے کہا — "حضور! یکہ پر فلاں نے آپ کا بٹوا نکالا . . . میں نے خود دیکھا" — "دیکھا تو میں نے بھی . . . .!" جگر صاحب آہستہ سے جواب دیا — دردمند انسان تھے۔ کسی کو سرِ عام ذلیل و رسوا نہیں کرتے۔ بعض اوقات چشم پوشی کرنے میں ہی عافیت سمجھتے!

صابو صدیق پالی ٹکنک بمبئی کے مشاعرے میں شرکت کرنے تشریف لائے۔ تین سو پر معاملہ طے ہوا تھا۔ ابھی گیٹ تک ہی پہنچے تھے کہ کسی نے کان بھر دیا "جوش کو پانچ سو پر بلایا گیا ہے"! بس قدم جہاں تھے وہیں جم گئے، سکتہ چھا گیا! اب منتیں ہو رہی ہیں سماجتیں ہو رہی ہیں — "حضور! اندر تشریف لے چلیے!" مگر کان پر جوں نہیں رینگتی — ! خلقت جمع ہو گئی۔ مجمع سے بار بار آواز آ رہی تھی۔ "آیئے حضور آیئے . . . تشریف لے چلئے!" مگر سنی کی ان سنی کرتے گئے۔

سڑک بن رہی تھی، کنکر پتھر کا ڈھیر لگا تھا، آؤ دیکھا نہ تاؤ اسی پر چڑھ کر غزل چھیڑ دی۔ لحن داؤدی کا طلسم جاگ اٹھا، جمِ غفیر بڑھتا گیا، مرحبا آفریں کی صدائیں آنے لگیں ناٹک در ناٹک کا منظر تھا! منتظمین گھبرا گئے — ایک شخص ہمت کر کے آگے بڑھا اور ہاتھ جوڑ دیئے جگر صاحب کچھ کھلے! "اگر جوش کو پانچ سو ملیں گے تو آپ کو پانچ سو ملیں گے!" انہیں یقین دلایا۔ پھر بچاؤ کے سارے ہتھیار پھینک دیئے، بالکل رام ہو گئے اور خاموشی سے مشاعرہ گاہ کی طرف چل دیئے۔

جگر صاحب میں انانیت نہیں تھی جذبۂ خودی سے سرشار تھے، اگر خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتے، تو کسی سے کمتر بھی نہیں سمجھتے!

لکھنؤ میں مشاعرہ کا پنڈال کھچا کھچ بھرا تھا تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی محفل رنگ پر آ چکی تھی اور جگر صاحب مائک پر تھے! "شعر میں الطار ہے . . . .!" پیچھے سے کسی استاد نے اعتراض جڑ دیا "ایطا نیتا کچھ نہیں جانتا!" جگر صاحب نے مڑتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ اہل علم و ادب کی محفل ہے جہلا کا مجمع!" کسی گستاخ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ جگر صاحب کا ادھر ڈائس سے نیچے اترنا تھا کہ مشاعرہ میں بھگدڑ مچ گئی، ہنگامہ، شور و غل واویلا۔ اور یہ ہنگامہ اس وقت فرد ہوا جب بڑی خوشامد کر کے جگر صاحب کو پھر ڈائس پر لایا گیا اور غزل سرائی کی دعوت دی گئی! یہ تھی ہر دلعزیزی اور مقبولیت زندگی میں ہی انہیں افسانوی حیثیت حاصل ہو چکی تھی!

یگانہ نے عزیز، صفی، ثاقب، فانی، جوش، فراق، بیخود، ماہر القادری اور عبد المجید سالک کے بعد جگر کو بھی نمبر پر لے لیا تھا ؎

شعر کہنے لگا ہے کالا بھوت
رنگ لایا ہے کیا نرالا بھوت
انھیں لاتوں کی ہے یہ بلہاری
پھاند سکتا تھا کیا ہمالا بھوت

اور یہ بھی ؎

جو میں نے کہا وہ بھی وہی کہنے لگا
دو باتیں سن کے تیسری کہنے لگا
میں نے کہا فارسی تو دیکھا دیکھی
کالا کوا بھی فارسی کہنے لگا

رنگ گہرا سیاہ ضرور تھا، لیکن دل شمع ایمانی سے روشن تھا، یگانہ کو جواب دے سکتے تھے، لیکن شاعری کو کبھی انھوں نے کشف جذبات سے آلودہ نہیں کیا۔ شاعری، جگر کے لئے ہمیشہ نعرۂ مستانہ رہی۔

"جوش کوئی شاعر ہیں۔ وہ تو بینڈ ماسٹر ہیں!" جوش کے ایک دیرینہ پرستار کے سامنے بے خیالی میں منہ سے نکل گیا۔

"آپ جوش کو بینڈ ماسٹر کہتے ہیں . . . لیکن ہم تو آپ کو قوال سمجھتے ہیں!" بات پی گئے، شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا ہو — نام ہی سکندر تھا اگر عالم پر حکمرانی کا حوصلہ تھا تو پورس کی گستاخیوں کو بخشنے کا ظرف بھی، فتح نہیں کر سکے، لیکن دنیائے شاعری کو تسخیر کر چکے تھے!

اردو شاعری کا یہ بے تاج بادشاہ جسے دنیا جگر مراد آبادی کے نام سے جانتی ہے۔ ۱۸۹۰ء میں مراد آباد میں پیدا ہوا، والد علی نظر نظرؔ اپنے عہد کے ممتاز صاحب دیوان شاعر تھے، مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہ جہاں کے اتالیق تھے دلی میں چین سے بسر کرتے، لیکن حالات کی ستم ظریفی، بادشاہ کے عتاب کی زد میں آ گئے اور دلی کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ کر، مراد آباد میں سکونت اختیار کر لی۔

جگر صاحب زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، لیکن فارسی شعر و ادب میں اچھا خاصہ دخل تھا، تھوڑی بہت انگریزی سے بھی واقفیت تھی۔ شاعری کا چسکا بارہ سال کی ہی عمر سے لگ گیا۔ ابتدا میں اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے پھر فصیح الملک داغ دہلوی اور ان کے بعد منشی امیر اللہ تسلیم کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔

مشاعروں میں قبول عام کی سند اچانک نہیں مل گئی، بڑا ریاض کرنا پڑا، بڑے پاپڑ بیلنے پڑے۔ ابتدا میں مسلہ آزوقہ کا بھی تھا کسبِ معاش کے لئے کچھ چشمے کے کاروبار میں مصروف رہے۔ ایک بکس میں مختلف سائز، مختلف رنگ کے چشمے بھر کر شہروں شہروں بھٹکتے اسی دوران گونڈہ پہنچے، اصغر گونڈوی سے ملاقات ہوئی اور پھر اصغر کی ذات سے ایسی انسیت ہوئی کہ ان کے انتقال کے بعد ہمیشہ کے لئے گونڈہ میں ہی بس گئے! جوانی میں شراب کے رسیا تھے۔ نگری نگری، ڈگری ڈگری گھومنا، چشمے بیچنا، شراب پینا اور شعر سنانا۔ یہ تھی زندگی۔ ابتدا میں جگر مراد آبادی کی! بنیادی طور سے آدمی نیک تھے۔ ان کے مزاج میں شرافت متانت دردمندی اور دل سوزی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ احباب سے بہت محبت کرتے اور ٹوٹ کر ملتے۔ عوام اور خواص انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ قدردانی ایسی ہوتی جس پر کوئی بھی شاعر رشک کر سکتا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی نے "آتش گل" کو انعام سے نوازا، سرکار نے پنشن مقرر کر دی!

پہلا مجموعہ "داغ جگر" کے نام سے شائع ہوا۔ اس زمانے کی غزلوں میں داغ کا رنگ بہت نمایاں ہے ؎

اے چارہ ساز حالت درد نہاں نہ پوچھ
اک راز ہے جو کہہ نہیں سکتے زباں سے ہم

مگر شاعری کا اصل جوہر "شعلۂ طور" میں کھلتا ہے۔ ان غزلوں میں مستی والہانہ پن، وارفتگی، بے خودی اور سرشاری ہے۔ زبان میں سادگی اور روانی ہے۔ وہ ثقیل الفاظ اور فارسی تراکیب سے پرہیز کرتے ہیں ؎

کبھی شاخ سبزہ و برگ پر کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں میرا حق ہے فصل بہار پر

پیتا بغیر اذن یہ کب تھی میری مجال
در پردہ چشم یار کی شہ پا کے پی گیا

آخری مجموعہ کلام "آتش گل" میں حکیمانہ رنگ غالب ہے بعض غزلوں میں معاشرے کے انتشار اور سیاسی اتھل پتھل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

سلامت تو تیرا میخانہ تیری انجمن ساقی
مجھے کرتی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فساد سے متاثر ہو کر انہوں نے کہا تھا ؎

فکر جمیل خواب پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

آخری مجموعہ میں حسن و عشق کے موضوعات پر بھی نہایت دلنشیں اشعار ملتے ہیں ؎

جز ذوق طلب جز شوق سفر کچھ اور مجھے منظور نہیں
اے عشق بتا اب کیا ہوگا کہتے ہیں کہ منزل دور نہیں

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں
کیجئے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

مجھے یہ وہم رہا مدتوں کہ جرأت شوق
کہیں نہ خاطر معصوم پر گراں گزرے
اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

جگر کی شاعری خمریات کے لئے خاص طور سے ممتاز ہے۔ جس جوش و خروش سے وہ بادہ و ساغر کا ذکر کرتے ہیں وہ ان کی اپنی زندگی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی ان کی شاعری ہے اور ان کی شاعری ان کی زندگی ؏

شیشہ مست و بادہ مست و عشق مست و حسن مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

پھر ایک دور وہ آیا جب جگر صاحب خود محتسب بن گئے۔ توبہ کر لی اور شراب اٹھا کر پھینک دی حج کر آئے اور شائستہ زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۹۵۶ء میں تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ ریڈیو کے مشاعرے میں آخری بار جو غزل پڑھی اس کا مطلع ان کی موت کے بعد مدتوں فضاؤں میں گونجتا رہا ؏

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

ایک دور میں کسی شاعر کی بے پناہ مقبولیت آنے والے دور میں اس کی گمنامی کا باعث ہوتی ہے۔ جگر صاحب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا!

(گورکھپور سے)

یکم فروری ۱۹۸۷ء

اردو ادب میں خاکہ نگاری

سید شریف الحسن نقوی

اردو ادب میں افسانہ اور ناول کی طرح خاکہ نگاری بھی ایک خود رو صنف ہے۔ یوں تو اس کی ابتدا کے بیج ثبوت انیسویں صدی میں بھی اردو زبان میں ملنے لگتے ہیں لیکن ایک مستقل اور منفرد صنف کی صورت میں خاکہ نگاری بیسویں صدی میں ہمارے سامنے آتی ہے اولاً تو چند اردو ادیبوں نے اس کو اظہار تاثر کے لئے استعمال کیا لیکن رفتہ رفتہ انگریزی ادب کا اثر قبول کر کے اس کے خدوخال کو سنوارا گیا اور اب خاکہ نگاری بہ حیثیت صنف اردو ادب میں اپنا مقام پیدا کر چکی ہے۔ حالانکہ یہ کہنا آج بھی درست نہیں ہے کہ خاکہ نگاری کے جملہ فنی اصول اور ضوابط متعین ہو چکے ہیں اور ہم ان اصولوں پر خاکوں کو پرکھ سکتے ہیں۔ لیکن اب خاکہ نگاری انشائیوں اور مضامین سے بالکل الگ صنف کی صورت میں ابھر کر سامنے آ چکی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری نے انگریزی کے Sketch یا Pen Portrait سے کافی اثر قبول کیا ہے۔ دراصل اس کی حد بیں انگریزی کے اسکیچ کے فنی اصولوں اور ضوابط کے مطالعے کے بعد ہی متعین کی گئی ہیں۔ خاکہ نگاری کو اگر اشاروں کا آرٹ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ خاکہ نگار اپنی ہلکی پھلکی موشگافیوں سے کسی شخصیت کی مرقع کشی اس طرح کرتا ہے کہ قاری کے سامنے اس کا ہو بہو نقشہ کھنچ جائے۔ تحریر میں شوخی، ظرافت، طنز اور مزاح کے امتزاج سے ایک حسن پیدا کیا جاتا ہے جو پھکڑ پن اور ہجو سے بالکل تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں کسی کا تمسخر اڑانا یا یہ الفاظ دیگر خاکہ اڑانا خاکہ نگار کا مقصود نہیں ہوتا بلکہ شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے قاری کے سامنے یوں پیش کرنا ہوتا ہے کہ اس کا کردار اس کے انداز، اس کے مشاغل، غرض زندگی کے ہر پہلو پر قاری کو محض اشاروں اشاروں میں تھوڑی بہت واقفیت پیدا کرا دے اور کسی بھی ایک بات کی جزئیات میں جائے بغیر اس شخص کو قاری کے سامنے اپنے قلمی خاکے کے ذریعہ روشناس کرا دے۔

خاکہ نگار کا کام بہت مشکل اور انتہائی ذمہ داری کا ہوتا ہے۔ اگر حسب قد و قامت، رنگ و روپ افکار و مشاغل جوں کے توں بیان کر دئے جائیں تو مضمون خاکہ نگاری کے صنف میں شمار نہیں ہوتا لیکن اگر اشاروں اور لطیف مزاج کے ساتھ ان باتوں پر روشنی ڈالی جائے تو خاکہ نگاری کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ دراصل خاکہ نگار الفاظ کے ذریعہ متعلقہ شخص کو حیات نو بخشتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ تو وہ شخصیت ایک مثالی صورت اختیار کر سکے اور نہ شیطانی بلکہ اپنے جذبات اور ذاتی تاثرات کی مدد سے ایک ایسا تاثر چھوڑے کہ قاری یہ محسوس کرے کہ متعلقہ شخص سے اس کا بھرپور تعارف ہو گیا ہے۔ خاکے کو مقبول بنانے میں اختصار اور سچے تاثرات کا اہم رول ہے۔ کسی قسم کی پیچیدگی خواہ وہ جزوی تفصیلات کی ہو یا زبان و بیان کی، خاکہ نگاری کو بوجھل اور بے کیف بنا دیتی ہے۔ ادبی لطافت، لطیف مزاح اور جاندار اشارے خاکے کو مقبول بناتے ہیں اور تربیت اصلاح یا مقصد کے تحت لکھنا اس کو بوجھل اور غیر مقبول۔

خاکہ نگار جس قدر عظیم شخصیت کا حامل ہوگا، جتنا نفسیات کی گہرائیوں سے واقف ہوگا، جس قدر ادبی اقدار کا حامل ہوگا اور جتنا ذکی الحس ہوگا، اس کی تحریر اتنی ہی زیادہ جاندار ہوگی۔ کیونکہ خاکہ نگاری میں شخصی مرقع کشی ہی اصل مقصد ہے اور یہ تبھی ہی پس منظر اور عوامل کی تہہ در تہہ ردعمل کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ خاکہ نگار محض ذاتی معلومات پر اعتبار نہیں کرتا۔ وہ متعلقہ شخص کے خطوط، اس کی شاعری یا تصنیفات اور محاضرات کا بھی پورا فائدہ اٹھا کر اس کی صورت اور سیرت اس کے عادات و اطوار اور شخصیت کے دیگر پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خاکہ نگار ہمیشہ اپنے تاثرات کو پیش کرتا

ہے لیکن اس کے تاثرات اسکی اپنی لیاقتوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ وہ کسی بڑے سیاسی مدبر، عالم یا شاعر کا خاکہ پیش کرتا ہے کیونکہ وہ ان کے افکار یا کردار سے اثر قبول کرتا ہے لیکن وہ ذاتی دوست اور غیر معروف اور معمول اشخاص کا خاکہ بھی پیش کر سکتا ہے۔ خاکہ خواہ غیر معروف شخص کا ہو جیسے اشرف صبوحی کا تحریر کردہ خاکہ "پنکھے والے حافظ جی" یا رئیس احمد صدیقی کا "شیخ پیرو" یا کسی بڑے عالم یا سیاست داں کا، اس کا حسن یہ ہے کہ زبان و بیان کا انداز ایسا ہو کہ قاری کے سامنے ایسی تصویر پیش ہو جائے کہ اسے یہ احساس ہو سکے کہ گویا اس کی ملاقات متعلقہ شخص سے ہو گئی ہے

خاکے کی مختلف اقسام ہیں۔ کچھ خاکے محض تعارفی ہوتے ہیں جب کہ کچھ توصیفی کچھ سرسری ہوتے ہیں تو کچھ تاثراتی، کچھ سوانحی ہو سکتے ہیں۔ تو کچھ محض معلوماتی کچھ خاکے مزاحیہ ہوتے ہیں اور کچھ طنزیہ، دراصل خاکہ نگار اگر اپنے انداز میں طنز یا مزاح پیدا کرتا ہے یا وہ معلوماتی اور سوانحی خاکہ پیش کرتا ہے تو اس کے مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں۔ تعارفی خاکوں میں شوکت تھانوی کا "شیش محل" یا رئیس احمد جعفری کا "دید و شنید" آ سکتے ہیں۔ لیکن شاہد احمد دہلوی اور رشید احمد صدیقی کے زیادہ خاکے تاثراتی ہیں۔ حالانکہ رشید احمد صدیقی کا مشہور خاکہ "ذاکر صاحب" توصیفی خاکوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح عبدالماجد دریا آبادی کا "محمد علی" سوانحی خاکہ شمار کیا جا سکتا ہے جبکہ قاضی عبدالغفار کا خاکہ "حکیم اجمل خاں" معلوماتی خاکوں میں شمار کیا جانا چاہیئے۔

یوں تو میر کے "نکات الشعراء" انشاء کے "دریائے لطافت" اور محمد حسین آزاد کے "آب حیات" "نیرنگ خیال" اور "دربار اکبری" میں خاکہ نگاری کے اولین نقش تلاش کئے جا سکتے ہیں لیکن محمد حسین آزاد کے یہاں زیادہ واضح نقش ملتے ہیں۔ انھوں نے افراد کا حلیہ انکے عادات و اطوار اور انکی خوبیوں اور کمزوریوں کو بیان کرنے میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ آزاد کی مرقع کشی ان حدود میں آتی ہے جن کو ہم خاکہ نگاری کا ایک وصف مانتے ہیں۔ اسی روایت کو رسوا اور شرر سے مزید تقویت ملتی ہے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی نے اس فن کو 'قلمی چہروں' کا نام دے کر خاصی قابل قدر کوشش کی ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں خاکہ نگاری کو ایک مستقل صنف کی شکل میں پیش کیا۔ انکے بعد مولوی عبدالحق، خواجہ محمد شفیع دہلوی خواجہ غلام السیدین، عبدالماجد دریا آبادی اور رشید احمد صدیقی نے اس صنف میں ایک نئی جان ڈالی اور اس کو مزید جلا بخشی۔ ان حضرات کی کوشش سے خاکہ نگاری ایک مستقل صنف کی شکل میں ابھر کر اردو ادب میں ایک اضافے کی شکل میں نظر آئی۔ عصمت چغتائی، سعادت حسین منٹو، اشرف صبوحی، دیوان سنگھ مفتون، شوکت تھانوی، مالک رام، فرحت کاکوروی رئیس احمد جعفری، شاہد احمد دہلوی، علی جواد زیدی اور نریش کمار شاد نے اپنے ہنر کے جلوئے دکھائے آج فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسین اس صنف کی آبیاری بڑی چابکدستی سے کر رہے ہیں۔ لیکن اس ترقی کے باوجود ہمیں اس بات کا اقرار کرنا پڑے گا کہ اب بھی صنف خاکہ نگاری اپنے ابتدائی دور سے گذر رہی ہے لیکن جس انداز سے اردو کے ادیب اس میں نئی جہات پیدا کر رہے ہیں اس سے یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بہت جلد خاکہ نگاری ایک مستقل صنف کی صورت اختیار کر کے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ثابت ہوگی۔

(اردو مجلس سے نشر)

ہوش عظیم آبادی

اب تک تو اعتراف شکست نظر نہیں
کل کیا کریں گے آپ کے جلوے خبر نہیں

کہہ دو کہ ہم نے درد کو درماں بنا لیا
اب فکر چارہ جوئی قلب و جگر نہیں

پا کر کسی کو چھوڑ دیا ہائے کیا کیا
کمبخت جستجو بھی مری معتبر نہیں

صیاد کے خلوص نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں وہی مگر وہ غم بال و پر نہیں

ترے غرور چارہ گری کا جواب ہے
نالہ، یہ تنگ ظرف قلب و جگر نہیں

رونا ہے تا بہ عمر تو اشکوں کی قید کیا
اس پر نہ جائیو کہ مری چشم تر نہیں

بے ساختہ کسی سے تصادم نگاہ کا
ہے مختصر سی بات مگر مختصر نہیں

مدت ہوئی کہ ہوش طبیعت بدل گئی
اب درخور نگاہ یہ جنس ہنر نہیں

پٹنہ سے نشر

دیہات کے موجودہ

صدیوں

سے ہندوستان کے اقتصادی اور سماجی پس منظر میں دیہاتوں کی نمایاں اور اہم نمائندگی رہی ہے۔ برٹش حکومت کے پہلے اور اس کے شروع کے برسوں تک یہاں کے دیہات خود کفیل تھے معاشی ترقی کے خلاف حکومت کی عدم دلچسپی اور روکھے رویے کے باعث ہندوستانی اقتصادیات میں تنزلی آنے لگی۔ زراعت کے علاوہ دیگر پیشوں پر ضرب کاری کے لئے انگریزوں نے آزاد تجارت کو فروغ دیا جس میں ملک کے تیار مال کو بیرونی ممالک بھیجے جانے کی پالیسی خاص طور سے شامل تھی۔ یہاں کے صنعت گروں اور دست کاروں کو اپنی کاریگری اور پوشیدہ فنون کو بتانے پر مجبور کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی صنعتیں سمٹ کر عجائب گھروں تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ حکومت برطانیہ کے خاتمے تک دیہاتوں پر مشتمل ملک کا ایک بڑا حصہ افلاس و ناداری کی بھنور میں پھنس چکا تھا۔

آج جبکہ ہندوستان میں کل ۵،۵۷،۱۲۹ مکمل طور پر آباد گاؤں ہیں جن میں تقریباً ۴۴ فیصد کاشتکار، ۲۶ فیصد زرعی مزدور اور ۳ فیصد مویشیوں، جنگلات، ماہی گیری، پھلوں کے باغ اور گھریلو دستکاری جیسے پیشوں سے متعلق لوگ ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف شعبہ جات حیات میں منہمک کل آبادی کا تقریباً ۷۰ فیصد سے زائد حصہ دیہاتوں سے تعلق رکھ رہا ہے۔ اس لیے کہنا غلط نہ ہوگا کہ قومی ترقی کا سب سے اہم پہلو دیہاتوں کے سامنے درپیش مسائل کو حل کر کے ان کو متواتر ترقی کی راہ پر گامزن کرنا ہی ہے۔ دیہی ترقی کے بنا ملک کی معاشی ترقی کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا موجودہ دور میں دیہات جن مسائل سے دوچار ہے وہ گزشتہ برسوں کے مسائل سے مختلف ہیں؟ اور اگر ہیں تو کس حد تک؟ اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے کیے گئے کام یقیناً قابل تحسین ہیں۔ آج غلے کی پیداوار میں ملک کی خود کفالت، چھوٹی صنعتوں کی دور دراز گاؤں میں رسائی، سڑکوں کا گاؤں سے جوڑا جانا اور دیہاتوں میں بھی بجلی کا پہنچنا وغیرہ جیسے

مسائل اور ان کا حل

سید فرید حیدر رضوی ھلوری

پروگرام اس بات کی صاف غمازی کرتے ہیں کہ پس آزادی ملک کے دیہاتوں کے جو مسائل تھے وہ موجودہ مسائل کے مقابل کچھ مختلف ہیں ہی۔ اگرچہ ملک کو آزاد ہوئے تقریباً چار دہائیاں ہونے کو ہیں اور متعدد ترقیاتی منصوبے جاری ہیں پھر بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دیہاتوں کے موجودہ اور گزشتہ مسائل میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں آسکا ہے۔ یہ ایک المیہ جسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ بڑھتی ہوئی سیلابی آبادی ہمارے سامنے ترقیاتی منصوبوں کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہی ہے۔

موٹے طور پر آج دیہات جن مسائل کی زد میں ہے انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اوّل اقتصادی اور دوم سماجی۔

بے روزگاری جو کہ براہ راست غریبی کا بنیادی سبب ہے۔ اقتصادی مسائل کا سب سے بڑا حصہ ہے جسکی کوکھ سے دوسرے بہت سے مسائل خود بخود جنم لیتے ہیں۔ ایک بے روزگار شخص سماج پر بوجھ بن جاتا ہے، اس کی اہلیت خریداری کم ہونے کے باعث وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ غذا کے معیار و مقدار میں کمی کی وجہ سے وہ مختلف بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ ایسے لوگ اکثر مایوس ہو کر غیر سماجی اور مجرمانہ حرکات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ دیہاتوں میں دیرپا بے روزگاری کے بجائے موسمی بے روزگاری زیادہ ہے۔

دیہاتوں میں غربا کے دو طبقے ہیں۔ اوّل چھوٹے و محدود کاشت کے کسان، دوم زرعی مزدور۔ بے زمین محنت کش، درج فہرست عوام، خدمت گار اور قبائلی لوگ۔ محدود کاشت والے خاص طور سے اور چھوٹے کسان عام طور سے اپنی زمین پر اتنا بھی نہیں پیدا کر پاتے کہ جس سے کم سے کم اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ لہٰذا وہ بڑے کاشتکاروں یا محض زمیندار وں کی زمین بٹائی پر لے کر اپنا کام چلاتے ہیں۔ مزید چھوٹے کسانوں کو مناسب وسائل کی کمی کی وجہ سے نئی سائنسی تکنیک میسر نہیں ہو پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی کوششوں کے باوجود خط غریبی سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد میں سست رفتار کمی ہو رہی ہے۔

بے شمار غربا کو درپیش مسائل میں رہنے کے لیے گھر کا نہ ہونا اہم ہے۔ بہت سے نچلے طبقے کے غربا کے پاس تو مال دنیا کے نام پر ان کی اپنی جسمانی محنت اور سر چھپانے کے لیے مشکل سے پھوس کی جھونپڑی ہی ہے یہ لوگ گرمیوں میں تمازت آفتاب، سردیوں میں چبھنے والی ہوا کے جھونکوں اور برسات کی قہر آلود بے رحمی کا سیدھا نشانہ بنتے ہیں۔

دیہاتوں میں اب بھی پینے کے پانی کا مسئلہ کسی نہ کسی شکل میں کم و بیش بنا ہوا ہے جہاں کہیں انتظامات ہو بھی گئے ہیں وہاں حفاظتی تدابیر کا فقدان ہے۔ پرائمری صحت کے مراکز کے مناسب تعداد میں قیام اور توجہ کی کمی سے زچہ بچہ کی دیکھ بھال اور ضروری غذا کی فراہمی سے دیہات اکثر محروم رہتے ہیں۔ نتیجتاً شیر خوار بچوں کی اموات بہت ہوتی ہیں۔

معاشرتی مسائل میں سب سے اہم تعلیم کا مسئلہ ہے جس کی کمی سے اور دوسرے مسائل وجود میں آتے ہیں جیسے نسلی کشاکش، چھوا چھوت، اونچ نیچ کا جذبہ، توہم پرستی لسانی اور مذہبی تناؤ وغیرہ۔ دیہاتوں میں حفاظتی اقدامات باہمی اتفاق اور عوامی بیداری کا تیزی سے فقدان بھی اہم سماجی مسئلہ ہے۔ برطانوی حکومت سے وراثت میں حاصل شدہ غریبی اور پچھڑے پن کے دیرپا مرض سے نجات پانے کے لیے دیہی علاقوں کی معاشی اور سماجی ترقی کر کے ان کو حیات بخش رفتار عطا کرنے کے مقصد سے ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو ملک کے افق پر کمیونٹی ڈیولپمنٹ پراجیکٹ کا تابناک سورج طلوع ہوا جس کی روشنی میں دیہاتوں کی معاشی بدحالی اور سماجی غیر ہمواری رفتہ رفتہ مٹے۔ اس کے تحت دیہاتوں کے چوطرفہ ارتقاء کے لیے بلاکوں کے ذریعے انجام دیئے جانے والے امور اس طرح ہیں:۔

علاقے کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ وسائل سے مختلف پروگراموں کی منصوبہ بندی کرنا، اناج کی پیداوار میں انقلابی تبدیلی لانے کے لیے نئی نسل کے بیجوں مفید کھادوں، چھوٹی آبپاشی، اوسر کو لائق کاشت بنانا، فصل کی بیماریوں، کیڑے مکوڑوں اور چوہوں سے حفاظت، باغبانی، دلہنی اور تلہنی فصلوں کے علاوہ نقدی فصلوں کی کاشت میں سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد فراہم کرنا، سماجی شجر کاری، مویشیوں کی دیکھ ریکھ اور علاج مزید کو آپریٹیو امور قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ غریبی پر سیدھے حملہ آور منصوبے جیسے آئی۔ آر۔ ڈی، این۔ آر۔ ای۔ پی اور ایل ای جی پی کے علاوہ پنچایت اور دیہی صنعتیں، دیہی انجینئرنگ، خواتین اور نوجوانوں کی فلاح کا پروگرام، درج فہرست عوام کیلئے رہائش اور پینے کے پانی کا انتظام، دیگر پسماندہ لوگوں کیلئے بھی رہائش کا انتظام، توانائی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گوبر گیس پلانٹوں کا قیام، چھوٹی بچت، بچوں کے لیے کہیں کہیں مخصوص غذائی اسکیم اور خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ۔ دیہات کے موجودہ مسائل کے تصفیے میں بہت حد تک کارآمد ہیں۔

کمیونٹی ڈیولپمنٹ پراجیکٹ پانچویں پنجسالہ منصوبے کے دوران مکمل طور پر دیہی ترقی کے پروگراموں کے نام سے موسوم ہو گیا۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں دیہی ارتقار سے متعلق غریبی مٹانے کے لیے چھوٹے چھوٹے پروگراموں نے سمٹ کر آئی۔ آر۔ ڈی پروگرام کی شکل اختیار کر لی۔ آئی آر ڈی پی کے تحت چھوٹے و محدود کاشت والے کسانوں مزدور پیشہ بے زمین افراد کے خاندان کو غریبی سے اوپر اٹھانے کی خاطر زراعت، چھوٹی آبپاشی، مویشیوں کی افزائش کے ساتھ ہی ساتھ دیہی صنعت، تجارت اور خدمتی پیشوں کے لیے قرض اور اس میں ۲۵ سے لیکر ۵۰ فیصد تک چھوٹ دی جاتی ہے۔ مزید ۱۸ سے ۳۵ سال کے بیکار افراد کو اپنے پیروں پر خود کھڑے ہونے کے لیے "ٹرائی ایم" (TRYSEM) اسکیم کے تحت مختلف پیشوں میں تربیت دی جاتی ہے۔

دیہاتوں میں موسمی بے روزگاری کو دور کرنے، وہاں پر مستقل و مشترک جائداد کے قیام اور غذا کی کمی کو پورا کرنے کی خاطر این۔ آر۔ ای۔ پی جیسا قومی پروگرام ۱۹۷۷ء کے "کام کے بدلے اناج" پروگرام کے نعم البدل کی شکل میں چھٹے پنجسالہ منصوبے سے شروع کیا گیا ہے۔ اس طرح دیہاتوں میں ایک طرف تو عورتوں اور مردوں کی بیکاری دور ہو کر آمدنی کا ایک ذریعہ فراہم ہوتا ہے اور وہیں دوسری طرف اسی دیہات میں سڑک، کنواں، پنچایت گھر، پلیا، پرائمری اسکول کی بلڈنگ وغیرہ تعمیر بھی ہو جاتی ہے۔

اسی کی طرح آر۔ ایل۔ ای۔ جی۔ پی کے تحت ہر بے زمین خاندان کے کم از کم ایک فرد کو ۱۰۰ دن کا روزگار گارنٹی کے طور پر مہیا کرایا جاتا ہے۔

۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو آنجہانی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کے اعلان نے مذکورہ بالا سبھی ترقیاتی منصوبوں کا احاطہ کر لیا۔ ان ۲۰ نکاتی پروگراموں نے دیہی مسائل کے حل میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ معاشی ترقی کا غیر متوازن ڈھانچہ ہونے پر ہی متعدد مسائل پرورش پانے لگتے ہیں۔ لہٰذا ترقی کا تعلق سماجی عدل سے ہونا چاہیئے۔ دیہی علاقے میں جغرافیائی حالات کے مطابق اور حسب ضرورت کسی بڑے صنعتی پروجیکٹ کا قیام ضروری ہے جس سے ایک طرف تو مقامی لوگوں کو روزگار فراہم ہوگا اور دوسرے مشترک استعمال کی شے کی پیداوار میں اضافے سے عوام کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ کھیتی میں مددگار متعلقہ پیشوں کے لیے مزید امداد اور دلچسپی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ زمینی اصلاحی قانون میں سدھار کر کے جوت کی حد بندی سے حاصل فاضل زمین کو زرعی مزدوروں اور بے زمین عوام کے درمیان تقسیم کر دینا چاہیئے۔

اگر بچے مستقبل کی طاقت ہوتے ہیں تو بوڑھے ہماری قابل فخر روایات کے آئینہ دار ہیں۔ بچوں کی تعلیم اور

(آگے ص ۱۰ پر)

یکم فروری ۱۹۸۷ء

پٹرول کی قیمت

اوپیک کی نئی پالیسی

ار این گنیش

تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم اوپیک نے تیل کی منڈیوں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کرنے اور اپنے تیل کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کے لئے حالیہ برسوں میں سب سے زیادہ اور بظاہر ممکن العمل کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ اس طرح اوپیک نے ایک بار پھر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنی تیل پیداوار کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے اور قیمت کا تعین کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر اوپیک کے حالیہ فیصلے کو مناسب طور پر لاگو کیا جائے تو اس بات کی پوری توقع کی جاتی ہے کہ سال رواں کے ابتدائی تین ماہ میں تیل کی عالمی منڈیوں کے تخمینے نمایاں طور پر بدل جائیں گے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اوپیک دس دن کی گرما گرم طویل بحث کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اوپیک ممالک اپنے تیل کی پیداوار میں تخفیف کر کے اس کو ۱۵٫۸۰ ملین بیرل یومیہ تک لے آئیں گے یکم فروری ۸۷ء سے منڈی میں تیل کی قیمت فی بیرل ۱۸ ڈالر ہو جائے گی۔ گو کہ تمام اوپیک ممالک تیل کی زیادہ قیمت کے حصول اور پیداوار میں کٹوتی پر ایک رائے تھے۔ لیکن تنہا عراق ہی ایسا ملک تھا جسکو ان تجاویز سے اتفاق نہیں تھا۔ عراق کو ہر روز ۱٫۲۵ ملین بیرل تیل نکالنے کا کوٹہ تجویز کیا گیا لیکن چونکہ یہ مقدار ایران کے ۲٫۳ ملین بیرل یومیہ کوٹے سے کم تھی اس لئے عراق نے اپنی پیداوار کم کرنے سے انکار کر دیا۔ اوپیک کے تمام ممبر ممالک کی اتفاق رائے کے باوجود عراق کا انکار بلاشبہ ایران کے ساتھ اس کی طویل اور مہنگی جنگ کے سبب تھا۔

اوپیک کی جنیوا بات چیت کے مطابق ہر ایک ممبر ملک جنوری ۸۷ء سے اپنی پیداوار میں کم از کم سات فیصد کمی کر دے گا۔ اس فیصلے کا ایک ڈرامائی پہلو، جسکا اندازہ شاید تیل کے خریدار ملکوں کو بھی نہیں ہے وہ یہ ہے کہ تیل کی خرید و فروخت کے ان معاہدوں کا کیا ہوگا جو کھلی منڈی کی قیمتوں اور مقررہ قیمت کے ڈھانچے پر مبنی ہیں۔ اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے اوپیک نے اپنے ممبر ملکوں کو قیمتوں کی ایک فہرست مہیا کی ہے جو وہ فروری ۸۷ء سے وصول کریں گے۔

اوپیک کے نئے فیصلے کے پس منظر میں یہ سوچنا بالکل جائز ہے کہ نئے سال کے ابتدائی مہینوں میں اوپیک ممبران اور تیل کے خریدار ملکوں کے درمیان رسہ کشی کا آغاز ہو جائے گا۔ اس امر کی عکاسی اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اوپیک ممبروں کا معاہدوں کے نظام سے انحراف اور نئی اور وہ بھی اضافہ شدہ قیمتوں کے حصول کی کوشش کا مقابلہ تیل کمپنیاں اپنی پوری قوت سے کریں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان ملکوں کی تیل کی پیداوار ۱۵٫۸ بیرل یومیہ کی سطح سے بھی مزید نیچے چلی جائے۔

اوپیک کے اس فیصلے سے عراق کا علیحدہ رہنا۔ ۱۸ ڈالر فی بیرل کی نئی قیمت پر کس طرح اثر ڈالے گا۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ اوپیک تیل کی نئی قیمتوں کے مستقبل کے رجحان کا انحصار غیر اوپیک ممالک کے رویے پر منحصر ہے۔ اگر تیل پیدا کرنے والے ایسے ممالک بھی جو اوپیک کے ممبر نہیں ہیں، اپنی پیداوار میں کٹوتی کا اعلان کرتے ہیں تو اوپیک کے اس فیصلے سے کامیابی کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ناروے نے پہلے ہی ۸۷ء میں اپنی پیداوار میں دس فیصد کمی کر دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ ان تمام حالات کے باوجود یہ ظاہر ہے کہ اگر اس معاہدے کو سختی سے عمل میں لایا گیا تو سال رواں کے دوران تیل کی قیمتوں میں نمایاں اضافہ ہوگا اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ انڈونیشیا، نائجیریا اور میکسکو جیسے ملکوں کی آمدنی بھی بڑھ جائے گی۔ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے نتیجے میں تیل درآمد کرنے والے ملکوں کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں۔

ایک بات ابھی سے طے ہوا ہے کہ اوپیک کے اس فیصلے کی صحیح پرکھ فروری ۸۷ء میں ہوگی جب یہ تنظیم عالمی منڈی کی طاقتوں کے مقابل اگر ۱۸ ڈالر فی بیرل قیمت کا مطالبہ کرے گی۔ اس بات چیت اور معاہدے پر دستخط ہو جانے کے کچھ دلچسپ پہلو بھی ہیں۔ پہلا یہ کہ اس معاہدے کو اوپیک ممبروں میں نام نہاد اعتدال پسند اور انتہا پسند ملکوں کے درمیان ایک مرعوب کن سیاسی گٹھ جوڑ سے مضبوطی دی گئی۔ کہ گذشتہ کئی برسوں میں پہلی بار سعودی عربیہ اور ایران نے ایک دوسرے سے اتفاق رائے کیا تاکہ دیگر ممبر ملک ایک عمومی فیصلے تک پہونچ سکیں۔ تیل کی قیمتوں کے سلسلے میں اوپیک کی نئی پالیسی کے نتیجے میں ہندوستان کو کن مسائل کا سامنا کرنا ہوگا؟ تیل کی آئندہ قیمتوں میں اضافہ سے بھارت کی ادائیگی کے توازن پر ہونے والے اثر کا تخمینہ لگانے میں نہایت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جنیوا بات چیت کی روشنی میں حکومت کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ پٹرول اور اس سے بننے والی اشیاء کی قیمتوں میں مزید اضافہ کیا جائے یا نہیں۔ تمام امکانات کا بغور جائزہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ فعل دانشمندانہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ درون ملک تیل کی قیمت میں اضافہ تمام صنعتی اکائیوں کے لئے نئی اور بڑی دشواریاں پیدا کر دے گا۔ اس کے ساتھ ہی روز افزوں مہنگائی کی کمر پر مہمیز ثابت ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ ان صنعتوں کی جو تیل پر منحصر ہیں انرجی کی بچت کے لئے حوصلہ افزائی کی جائے۔ (ایکسٹرنل سروسز ڈویژن سے نشر)

بقیہ:- دیہات کے موجودہ مسائل

بوڑھوں کو تحفظ فراہم کرنے کا تہیہ تو حکومت کر ہی چکی ہے معاشی طور پر کمزور، بے سہارا بوڑھوں اور معذور افراد نیز بے سہارا بیواؤں اور دیگر عورتوں کے ساتھ ہی ساتھ ملازمت سے سبکدوش ہونے والے مجبور فوجیوں کو سرکاری پالیسیوں کے بموجب مالی فائدہ پہنچایا جا رہا ہے۔ دیہات کے موجودہ مسائل کے حل کے لیے سرکار کتنی فکرمند ہے اسکا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے لیے کل رقم میں سے ۹۰ ارب ۴۷ کروڑ ۲۲ لاکھ روپے دیہی ترقی کے لیے اور ۵ ارب ۳۷ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے زراعت کے لیے رکھے گئے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ دیہات کے سبھی مسائل کا مکمل حل کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے مگر جو کچھ اس وقت تک کیا جا چکا ہے اور متواتر تیز رفتاری سے کیا جا رہا ہے وہ مسائل کے حل کی ایک مضبوط بنیاد تو ہے ہی۔ (گورکھپور سے نشر)

یونانی طب کے میدان میں ترقی

طب علم کی وہ شاخ ہے جس میں جسم انسانی کو موضوع بحث بنا کر اس کی صحت زوال صحت اور علوم صحت سے بحث کی جاتی ہے تاکہ صحت کی حالت میں اس کا تحفظ کیا جائے اور زوال صحت یا عدم صحت کی صورت میں اس کو بحال کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ اس طرح علم طب انسانی عقل اور تجربہ کی تخلیق ہے

یونانی طب کے تاریخی پس منظر اور اس کے ارتقائی منازل کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات مظہر ہوتی ہے کہ اس فن کے معرض وجود میں آنے کا زمانہ ۵۰۰ سال قبل مسیح سے لے کر ۵۰۰ سال بعد از مسیح تک جاتا ہے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے انسانی جسم میں رونما ہونے والی امراض کو مافوق الفطرت مظاہر سمجھنے کے بجائے انہیں مظاہر فطرت اور عقلیت پر مبنی نقطہ نظر سے سمجھنا شروع ہوا اور امراض کا علاج علمی اور عملی بنیادوں پر پیش کیا گیا

یونانی طب اپنے نقطہ آغاز کے لئے یونانی فلاسفہ اور معالجین کی رہین منت ہے۔ اس فن نے یونان میں جنم لیا اور اس کی آبیاری صدیوں تک اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں وہاں کے نامور حکما اور فلاسفہ کرتے رہے۔ کیونکہ یہ طب اپنی ابتدا سے ہی بدیہی طور پر فلاسفۂ یونان کے مطالعۂ قدرت اور مشاہدہ کی بنیاد پر وضع کردہ بنیادی اصول وضوابط اور قدیم فلسفیانہ نظریات سے متاثر رہی ہے اس لئے اس طریقۂ علاج کو آج تک یونانی طب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور یونانیوں کو اس طرز علاج کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے یونان کی یہ طبی سرگرمیاں مختلف ادوار سے گذرنے اور اپنے زوال کے بعد سن عیسوی کی اوائلی صدیوں میں وسطی مشرقی یورپی ممالک سے ہوتی ہوئی عرب اور ایران کی سرزمین تک پہنچیں تو عربوں نے اس فن میں اپنی تحقیقی کاوشوں اور نئے نئے تجربات کے ذریعے تمام عصری علوم سے مدد لے کر بیش بہا اور بے شمار اضافات کئے۔ پھر ۱۲ ویں صدی عیسوی میں یہ فن یونانی طبی مبادیات اور عربی طبی اضافات کا مجموعہ بن کر ایک منضبط طریقۂ علاج کی صورت میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہندوستان پہنچا اور اس ملک میں ایک مستقل اور مقبول عام طرز علاج بن کر رائج ہوگیا۔ ہندوستانی عوام کے مزاج سے عین مطابقت رکھنے والی اور اپنی شفا بخش صلاحیتوں کی بنا پر رفتہ رفتہ اس کی جڑیں ہندوستانی معاشرہ میں کافی مضبوط ہوگئیں اور آج بھی ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے لوگ عوام و خواص اسی طریقۂ علاج سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس فن نے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک اپنی ہمہ گیر افادیت کی بنا پر بنی نوع انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے حقیقی معیار کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں یونانی طب کو خاص کر مغلیہ دور میں بہت فروغ حاصل ہوا اور اس دوران طب پر معیاری کتابیں تصنیف کئے جانے کے علاوہ قدیم ہندی طریقۂ علاج کے علمی تعلقات سے طب کے اہم شعبہ علم الادویہ میں بہت سے اضافات ہوئے اور اس فن کو روز افزوں ترقی حاصل ہوتی گئی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد انگریزی اور دوسری یورپین اقوام کے ہندوستان میں آمد کے بعد سے مشرقی علوم وفنون کو اور خاص کر طب یونانی کو فنا کرنے والی ان کی پالیسی نے اس فن کے لئے تباہی اور بربادی کے سامان پیدا کیے اور گذشتہ صدی کے اواخر سے تو سیاسی اور ثقافتی پشت پناہی کے باعث ایک غیر فطری اور کیمیاوی طریقۂ علاج نے اس نباتی اور مطابق فطرت طریقۂ علاج کی جگہ لے لی ہے۔ ایلوپیتھی گو کہ ہندوستان کے عوام کی فطرت اور مزاج سے مناسبت رکھنے والا طریقۂ علاج نہیں تھا۔ لیکن اس دور میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور کیونکہ یہ ایک زود اثر علاج ثابت ہوا تھا اس لئے یہ مقبول بنتا گیا اور تمام دیسی طریقہائے علاج بشمول یونانی طب دھیرے دھیرے اپنی مقبولیت کھوتے گئے۔ خاص طور پر یہ طب یونانی کے لیے ایک نازک دور تھا اور قریب تھا کہ یہ فن زوال اور بضاعتی کا شکار ہو کر متروک ہو جائے گا کہ چند نامور اطبا کی مساعی اس فن کے بقا کی ضامن ہوئی جنہوں نے اپنی شاہکار تصنیفات اور فنی حذاقت کے ذریعے اسے حیات نو بخشی اور ترقی و کمال کی منزلیں طے کرائیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں طب یونانی کی ترقی کیوں ضروری ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام دیسی طبوں کی ترقی اور ترویج اور ان کے مسائل کا حل ہی ہمارے ملک کے صحت کے مسئلہ کا حل ہے کیونکہ عام طور پر لوگ اپنی بیماریوں کے علاج کے لئے دیسی طریقہائے علاج کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ انہیں دیسی طریقہائے علاج کے زمرہ میں آنے والی یونانی طب بھی ایک ایسا طرز علاج ہے جو اس ملک کے عوام میں مقبول اور رائج ہے۔ گذشتہ زمانہ سے یہ طریقۂ علاج یہاں کے عوام کا آزمایا ہوا ہے اور آج کے دور میں بھی ملک کے طول و عرض میں آباد عوام کی صحت اور تندرستی کا ایک ذریعہ یونانی طب کا علاج ہی رہا ہے۔ ہندوستان کی ۸۰ فی صد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو علاج ومعالجہ کی وہ سہولیات میسر نہیں ہیں جو کہ شہروں میں رہنے والے لوگوں کو حاصل ہیں کیونکہ زیادہ تر جدید طرز کے تعلیمی ادارے اور شفاخانے صرف شہروں تک محدود ہیں اور ان سے دور دراز علاقوں میں رہنے والے غریب عوام فیض یاب نہیں ہو پاتے ہیں۔ یہ بات ہندوستان جیسے وسیع وعریض اور ترقی پذیر ملک کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے یونانی طریقۂ علاج خاص طور پر دیہات میں رہنے والے ہمارے ملک کے عوام کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہے کیونکہ ایک تو اس میں استعمال کی جانے والی جڑی بوٹیاں ہر جگہ بآسانی دستیاب ہیں دوسرے یہ طرز علاج نسبتاً ارزاں اور عوام کے مزاج سے مطابقت رکھنے کی وجہ سے ان کی روزمرہ کی تکلیفوں کا ایک کامیاب علاج ہے اس کے علاوہ جدید دواؤں کے استعمال کے بعد ظاہر ہونے والے مضرات کے پیش نظر اس طریقۂ علاج کی اہمیت اور بھی واضح ہوگئی ہے

قومی صحتی ترسیلی نظام کی بارآوری کے لئے ڈاکٹری علاج پر کلیتاً انحصار نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے دیسی طرز کے علاجوں کو ترجیح دینا ہوگا۔ اس پس منظر میں یونانی طب کے میدان میں ترقی ملک کے عوام کی صحت اور فلاح و بہبود کے مسئلہ سے جڑ گئی ہے۔ یونانی طب کے میدان میں ترقی کو جاری رکھ کر جہاں اس طریقۂ علاج کے بے شمار فائدے ملک کے عوام کو پہنچائے جا سکتے ہیں۔ وہیں نیشنل ہیلتھ پالیسی پر عمل درآمد میں انسدادی تحریکی اور عالیاتی سطح پر بھی مدد مل سکتی ہے اور صحت کے ترسیلی سسٹم میں عاملین طب کی افرادی قوت کا استعمال کرکے سب کے لئے صحت کے پروگرام کو بھی کامیاب بنانا آسان ہو سکتا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے نصب العین سن ۲۰۰۰ء تک سب کے لئے صحت کے نشانہ کو پورا کرنے کے لئے جس پر عمل درآمد کے لئے ہماری سرکار پابند ہے یونانی طب کو ترقی اور وسعت دینا ضروری ہوگیا ہے۔

اس بات کے واضح ہو جانے کے بعد کہ طب یونانی کے میدان میں ترقی ناگزیر ہے تو اگلا سوال اٹھتا ہے کہ اس طریقۂ علاج کی ترقی کے لئے کیا خطوط متعین کئے جائیں۔ اس کی ترقی کے میدان میں حائل ہونے والے مسائل کیا ہیں اور ان کے حل کے لئے کون سے امور قابل غور اور ضروری ہیں نیز اس ضمن میں کیا پیش ورفت ہو رہی ہے۔

کسی بھی فن کو ارتقار کی منزلیں طے کرنے کے لئے کچھ چیزیں نہایت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جن پر اس فن کی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے پہلی اور اہم بات فن پر تصنیف وتالیف کا کام ہے چاہے وہ معیاری درسی کتابوں کی تیاری کی شکل میں ہو یا مختلف موضوعات پر تحقیقی مجلات کی مستقل اشاعت کی صورت میں ہو دوسری چیز اس فن میں تعلیم دینے کے لئے مطلوبہ وسائل اور آلات سے لیس تعلیمی درسگاہوں کا قیام اور ان میں دی جانے والی تعلیم کا معیار اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل ہوتا ہے کیونکہ افراد کی تعمیر اور تیاری سے ہی کسی فن کو ترقی دینا ممکن ہے۔ تیسرا اہم نکتہ جو سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے وہ فن پر ہونے والا مسلسل تحقیقی تحریکی کام ہے جو کسی فن کے ارتقار کا صحیح معنوں میں ضامن ہوتا ہے

طب کی ترقی کے میدان میں دوسرا اہم مسئلہ طب یونانی کی تعلیم کا ہے تعلیم کے مسئلہ کو نظر انداز کرکے خاطر خواہ طریقہ پر اس طریقۂ علاج کو ترقی نہیں دی جا سکتی۔ ایک زمانہ تک صرف خاندانی درس و تدریس اور شاگردی نظام کے ذریعہ طب کی تعلیم کی ترویج کا سلسلہ جاری رہا پھر زمانہ کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اس فن کی تعلیم کے لئے باقاعدہ طبی درسگاہیں قائم کئے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ موجودہ دور میں طبی تعلیم کا رجحان بڑھ رہا ہے اور اب بیشتر طبی درسگاہوں میں داخلے مقابلہ کے امتحانات کے ذریعے ہو رہے ہیں اور زیادہ تر سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلباء ان طبی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں اب ضرورت اس بات کی ہے کہ یونانی طب کی تعلیم کے خطوط اس طرح معین کئے جائیں کہ طب کی ترقی کے لئے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ طبی تعلیم کی درسگاہوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جائے اور موجودہ طبی درسگاہوں کو مزید ترقی دے ان کا معیار بلند کیا جائے صحیح فنی تعلیم اور تربیت کے لئے ان درسگاہوں میں ایسے اساتذہ مقرر کیئے جائیں جو سائنس اور فن طب دونوں سے بیک وقت واقفیت رکھتے ہوں۔ سرکاری نئی ترقی پذیر تعلیمی پالیسی سے مناسبت رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ نہ صرف پرائیویٹ زمرہ میں بلکہ سرکاری تحویل میں بھی ہر صوبہ میں کم از کم ایک یونانی طب کی تعلیم کا کالج قائم کیا جائے۔ ان سب مقاصد کے لئے یونانی طب میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کی ضرورت ناگزیر ہو گئی ہے کیونکہ اب زمانہ کی رفتار اتنی تیز و تند ہے کہ کسی ایک شخص کے لئے کسی علم یا فن کے تمام گوشوں پر یکساں توجہ دینا ممکن نہیں رہا ہے۔ اسی لئے طب کے ایک خاص مضمون کے تفصیلی مطالعہ کے بعد اس میں تخصیص حاصل کرنا وقت کی اہم ضرورت بن گیا ہے یہ بات خوش آئند ہے کہ طب یونانی میں اس طرح کی تعلیم کی طرف اب خاص توجہ دی جانے لگی ہے اور مختلف طبی درس گاہوں میں پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے شعبہ جات قائم ہو گئے ہیں۔ پہلا پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ مرکزی وزارت صحت کے تعاون سے ۱۹۷۲ میں علی گڈھ یونیورسٹی میں علم الادویہ کے مضمون میں قائم کیا گیا اور اس کے بعد طب کے دیگر مضامین معالجات اور امراض نسواں و اطفال میں بھی پوسٹ گریجویٹ تعلیم کے شعبے جات مزید معالجات اور کلیات طب جیسے اہم طبی مضامین میں قائم کرنے کی منظوری مرکزی وزارت صحت نے دی ہے اس کے علاوہ طب یونانی میں اعلیٰ تحقیق اور تعلیم کے لئے حکومت ہند نے ایک "نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن" کے قیام کی بھی منظوری عطا کی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ طب کے کچھ مضامین جیسے جراحیات، حفظان صحت اور امراض چشم وغیرہ میں بھی اعلیٰ تعلیم کی ایسی ہی سہولیات مہیا ہونی چاہیے۔ طب یونانی کی ترقی کے میدان میں سب سے اہم نکتہ عاملین طب کے ذریعہ اس فن میں تحقیق اور تخلیقی سرگرمیوں کو فروغ دینے کا ہے یہ موجودہ وقت کا ایک مبارزت طلب مسئلہ ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ فن کی بحالی اور تجدید کے لئے علمی اور عملی میدان میں طاری موجودہ جمود کی صورت حال کو توڑ کر عملی تحقیقی کاوشیں کی جائیں۔ یونانی طب میں رسرچ کا مفہوم اس طرز علاج کے مبادیات کو سائنسی زبان میں واضح کرنا اور ان مسائل کو فروغ کرنا ہے جن کا سامنا وقت موجودہ کے سائنسی دور میں اس طرح کے علاج معالجہ میں کرنا پڑتا ہے تاکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی جا سکے طب یونانی میں تحقیق اور جدید سائنس سے استفادہ حاصل کرکے اس کو ترقی دینے کا نظریہ سب سے پہلے حکیم اجمل خاں نے پیش کیا تھا۔ یونانی طب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیے جانے کی وجہ سے زوال پذیر ہوتے دیکھ کر انہوں نے یہ ضرورت محسوس کی اگر اس طرز علاج کو زندہ رکھنا ہے اور عوام میں اسے مقبول بنانا ہے اور ایک افادیت کا حامل رکھنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ میڈیکل سائنس کے میدان میں ہونے والی تازہ ترین سائنسی ترقیات سے بہرہ مندی حاصل کرکے طب کو ترقی دی جائے اور اس کی اصلاح کی جائے طبی دواؤں پر تحقیقات کی صورت حال یہ ہے کہ یونانی طریقۂ علاج میں مستعمل تقریباً ایک ہزار جڑی بوٹیوں اور دیگر دواؤں میں سے بمشکل ۱۰ فیصد پر سائنسی تحقیقات عمل میں آئی ہیں اور زیادہ تر ادویات پر کوئی تحقیق نہیں ہو سکی ہے دواؤں کی معیار بندی بھی نہیں کی گئی ہے اور ان کی کاشت کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر ایک یونانی معالج کو یونانی ادویات کے استعمال کے وقت بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے علم طب کو ترقی کی راہوں پر گامزن کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ علمی اور عملی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ فنی اور علمی تحقیقات کی جائیں۔ اور دوائی پودھوں کی کاشت کا معقول انتظام کیا جائے۔ طبی مفردات اور مرکب نسخوں کی معیار بندی پر تحقیق کے سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے جدید سائنس کی مختلف شاخوں سے تعاون لینا ضروری ہوگا۔ خاص کر ماڈرن میڈیسن کے ان ترقی یافتہ تکنیک اور طریقوں سے منفعت حاصل کرنا ناگزیر ہوگا جو اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں دواؤں پر تحقیق کی ذمہ داری ایسے لوگوں پر ڈالنی ہوگی جو طب کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارمیکولوجی فارمیکوگنوسی اور میڈیسنل کیمسٹری میں بھی استعداد رکھتے ہوں تاکہ وہ ان ادویات پر تحقیق کے بہترین ذرائع دریافت کر سکیں۔ اور ان کے تجزیہ اور سائنسی تجربات کے ضابطہ مقرر کر سکیں ان تمام چیزوں پر زور دینے کے ساتھ ساتھ عاملین طب کو اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا ہوگا کہیں یہ طریقۂ علاج جس نے خود جدید طرز علاج کو جنم دیا ہے اس کھوج بین اور تحقیق میں ماڈرن طریقۂ علاج میں گم ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس فن کی انفرادیت ہر صورت میں قائم رہنی چاہیے۔

یہ بات قابل قدر ہے کہ یونانی طب میں فن کی ترقی کے تعلق سے حوصلہ افزا نتائج کا حامل تحقیقی تحریکی کام شروع ہو چکا ہے۔ اور یہ کام وقت کی ضرورت اور تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے سائنسی علوم سے استفادہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس طرح کے تحقیقی کام کی شروعات مرکزی وزارت صحت کی سرپرستی میں ۱۹۷۹ میں سنٹرل کونسل فار رسرچ ان میڈیسن کے قیام کے بعد سے ہوئی ہے ایک خود مختار تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے اس کونسل کی تشکیل طبی تحقیق کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تحت تقریباً چالیس ادارے فی الوقت ملک کے طول و عرض میں قابل ستائش کام انجام دے رہے ہیں جن میں تحقیق کی غرض سے مختلف النوع رسرچ پروگرام چلائے جا رہے ہیں۔ اس کونسل کے تحت ایک سنٹرل رسرچ انسٹی ٹیوٹ سات ریجنل رسرچ انسٹی ٹیوٹ گیارہ کلینکل رسرچ انسٹی ٹیوٹ دو سروے آف میڈیکل پلانٹس یونٹ دو موبائل کلینکل رسرچ یونٹس ایک کمپوزٹ ڈرگ رسرچ اسکیم دو خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق اسکیمیں اور ایک انفارمیشن سنٹر چل رہا ہے۔ اس کونسل میں جن مختلف امراض پر تحقیقی کام ہو رہا ہے ان میں برص۔ فائلیریا۔ ملیریا۔ وجع المفاصل۔ ہزمن ہیپیٹائٹس ورم غار الانف۔ التحعاب بو اور ضیق النفس جیسے فوری توجہ کے حامل امراض شامل ہیں۔ ان امراض پر کئے جا رہے کلینیکی مشاہدات سے یونانی طب میں صدیوں سے استعمال کی جانے والی دواؤں کی سائنسی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے خاص کر برص جیسے پیچیدہ مرض کے علاج میں قابل ذکر کامیابی ملی ہے۔ برص پر منتخب آزمائشی یونانی دوا سے تقریباً ۵۰ فیصد سے زیادہ کیسز میں کامیابی ملی ہے۔ کونسل کے ادویات پر معیار بندی کے پروگرام کے تحت دوائی پودھوں کے سروے کے پروگرام کی مدد سے اب تک تقریباً ۷ ہزار سے زیادہ دوائی پودھوں کے نمونے جمع کیے جا چکے ہیں اور ۵ ہزار سے زیادہ ہربیریم شیٹ تیار کی جا چکی ہیں۔ حکومت کے فیملی پلاننگ کے منصوبہ سے تعاون کی خاطر برائے ذہن استعمال کی جانے والی مانع حمل یونانی ادویات کی اسکریننگ کا کام بھی کیا جا رہا ہے اس کے لٹریری ریسرچ پروگرام کے تحت نادر اور قدیم طبی کتابوں کا اردو و انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے اب تک کونسل کے ذریعے کلیات ابن رشد۔ کتاب الابلال۔ آئینہ سرگذشت اور مفردات ابن بیطار جیسی اہم کتابوں کا ترجمہ کرکے شائع کیا جا چکا ہے۔ اور مزید کتابوں جیسے معالجات بقراطیہ اور کتاب التیسیر کا ترجمہ کیا جا رہا ہے اس طرح یونانی رسرچ کونسل کی یہ طبی سرگرمیاں طب یونانی کو ترقی دینے کے پروگرام میں زبردست رول ادا کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں قائم طبی تعلیم کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ جات بھی تحقیقی کام بڑی مستعدی سے انجام دے رہے ہیں خاص کر اس میدان میں علی گڈھ میں قائم علم الادویہ کا کام قابل ذکر ہے اس شعبہ کے قیام کے بعد سے جس میں ایم ڈی (یونانی) کی تعلیم بھی دی جاتی ہے مفرد اور مرکب یونانی ادویات کی تحقیق میں ایک نیا موڑ آیا ہے اور یہ ادارہ اپنی تاسیس سے لے کر اب تک متعدد یونانی دواؤں پر تحقیقات مکمل کر چکا ہے اور مزید قابل قدر پیش رفت جاری ہے۔

وقت موجودہ میں جب کہ یونانی طب کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور ملک کی قومی صحتی ترسیلی پالیسی میں اس طریقۂ علاج کو شامل کر لیا گیا ہے اور عالمی ادارہ صحت نے بھی طب یونانی کو باقاعدہ ایک ہیئتی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے ہندوستان کے عوام کی ضروریات کے عین مطابق اس فن کے میدان میں مناسب پلاننگ کے ذریعہ ترقی ناگزیر ہو گئی ہے کیونکہ یہ طریقۂ علاج اس ملک کے لوگوں کی صحت کے مسئلہ سے نبرد آزما ہونے میں ایک متبادل طرز علاج کا کردار بخوبی ادا کر سکتا ہے۔

(گورکھپور ے)

سیاحت

نریندر لوتھر

سیر و سیاحت کا شوق کسے نہیں؟ یہ انسان کا تجسس ہے جو اسے دنیا کے صحراؤں، جنگلوں، پہاڑوں اور نہ جانے کیسی کیسی جگہوں پر جانے کو اکساتا ہے۔ نئی جگہیں دیکھنا نئے لوگوں سے ملنا، نئی چیزوں کو حاصل کرنا انسان کی فطرت ہے قیس اور مجنوں کو شوق صحا نوردی تھا تو جو لوگ عشق سے بچے ہوئے ہیں انہیں شوق شہر نوردی ہے۔ اسی لئے ہر عہد میں لوگ اپنے گھروں سے نکل کر دنیا کی سیر کو نکلے اور اگر وہ بالآخر گھر واپس آگئے تو لوگوں نے انہیں بدھو نہیں کہا، صرف ان پر بھولنے اور بھٹکنے کا الزام لگایا۔

ادھر پچھلے کچھ عرصے سے خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد سیاحوں کی اس یورش نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بیشتر ملکوں کی حکومتوں نے سیر و سیاحت کے فوائد کی بنا پر ایسے حالات پیدا کرنے اور ایسی ترغیبات دینے کی کوشش کی ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں ان ملکوں کی سیر کرنے کی خواہش پیدا ہو۔ سیاح جب بھی کہیں جاتے ہیں تو ظاہر ہے کھانے پینے پر تو خرچ کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی قسم کی چیزیں اور نشانیاں یادگار کے طور پر یا اپنے عزیزوں اور دوستوں کو تحفوں کے طور پر دینے کے لئے لے جاتے ہیں اس طرح ٹورازم سے ملک کی معاشی حالت کو تقویت ملتی ہے اور بیرونی زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے ٹورازم بجائے خود ایک قسم کی صنعت ہے۔ صنعت کے بارے میں ساحر لدھیانوی مرحوم نے کہا تھا ؎

وہ کارخانے میں لوہے کا شور و غل
وہ ہے جس میں لاکھوں غریبوں کی روح کا نغمہ

لیکن ٹورازم ایسی صنعت ہے جس میں نہ شور و غل ہے، نہ دھواں ہے نہ گندگی کی موت۔ بلکہ غائبانہ طور پر لاکھوں لوگوں کو روزگار ملتا ہے۔ گھریلو اور چھوٹی صنعتیں، دستکاری اور ان گنت قسم کے دھندے ٹورازم کی وجہ سے پھلتے پھولتے ہیں۔ ہوٹل اور رسٹورنٹ، ہوائی جہاز، بسیں، کاریں سکوٹر، رکشا کا دارومدار بہت حد تک ٹورازم پر ہے قصہ کوتاہ ہماری معیشت پر بحیثیت مجموعی ٹورازم کے اثرات مفید اور دور رس ہوتے ہیں۔ یوروپ کے بیشتر ممالک نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی معاشی حالت میں جو نمایاں سدھار کیا ہے اسکی بنیاد ٹورازم پر ہی رکھی گئی تھی۔ آج بھی بیشتر ممالک ٹورازم کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ ان کے بجٹ کی آمدنی کا زیادہ حصہ ٹورازم سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح آسٹریا کی ۸۰ فیصد آمدنی ٹورازم سے ہے۔ اسپین میں ہر سال آنے والے بیرونی سیاحوں کی تعداد وہاں کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔ انگلستان میں سیاحوں کی سالانہ تعداد وہاں کی کل آبادی کے تقریباً برابر ہی ہے۔ ہندوستان میں کشمیر کی آمدنی کا زیادہ حصہ سیر و سیاحت پر ہی منحصر ہے۔ ٹورازم کے سود مند نتائج کی وجہ سے ہر ملک کی یہی کوشش رہتی کہ ٹورازم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔

ٹورازم کا انحصار کسی خطے یا ملک کے تہذیب و تمدن آرٹ اور کلچر اس کے تاریخی ورثہ اس کے قدرتی نظاروں اس کی عالیشان عمارتوں، لوگوں کے طرز معاش اور ایسے کئی اور عناصر پر ہوتا ہے۔ ان تمام زاویوں سے ہمارا ملک بہت امیر ہے یہاں ہر قسم کی آب و ہوا ملتی ہے دنیا کے اونچے سے اونچے پہاڑ، ہزاروں میل لمبا اور خوبصورت ساحل، انواع و اقسام کے جانور، نباتات تاریخی مقامات، کھنڈرات سب کی بھرمار ہے۔ ہمارا ملک درحقیقت براعظم نما ہے اسی لئے اسے برصغیر کہا جاتا ہے۔ ہم قدرتی اور ثقافتی دولت سے مالا مال ہیں لیکن ہم نے ابھی ان کا پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔

دنیا کے کئی ممالک ہیں جو ایسی نعمتوں سے محروم ہیں لیکن پھر بھی ٹورازم کو بڑھاوا دینے کے لئے انہوں نے جنگلوں میں منگل منانے کے سامان مہیا کئے ہیں اور بیابانوں کو بسا دیا ہے۔ ٹورازم کا دوسرا نام ہے دشت و صحرا پر تخیل کا کھیل جہاں کچھ نہیں ہوتا وہاں کچھ پیدا کیا جائے مثلاً امریکہ کے ڈزنی لینڈ میں مصنوعی جانور، انسان، آبشار کوہسار بلکہ پورے کا پورا طلسم ہوشربا وجود میں لایا گیا ہے۔ اور اس سے ان گنت بچے اور بڑے لوگ محفوظ ہوتے ہیں اور امریکہ کو کروڑوں ڈالر کی آمدنی ہوتی ہے ٹورازم کے لئے ہمیں اپنے قدرتی اور ثقافتی دھن دولت کا پورا فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اور عوام کی دلچسپی کے لئے نئے ذرائع پیدا کرنے ہوتے ہیں۔

ہندوستان کو ابھی ٹورازم سے پورا استفادہ حاصل کرنا ہے۔ ساری دنیا کے ٹورازم کا صرف ایک فیصد کا تین فیصد ہندوستان کے حصے میں آتا ہے۔ اس کے باوجود ٹورازم ہندوستان کی برآمد ہے۔ سن ۸۲-۸۱ میں ہم نے اس کے ذریعہ تقریباً ۱۲۰۰ کروڑ زرِ مبادلہ کمایا پاکستان اور بنگلہ دیش سے آنے والے لوگوں کو چھوڑ کر ہندوستان میں تقریباً آٹھ لاکھ نوے ہزار بیرونی سیاح آتے ہیں ہماری یہ کوشش ہے کہ ۱۹۹۰ تک یہ تعداد پچیس لاکھ ہو سکے۔ اس طرح ہماری آمدنی بھی چار ہزار کروڑ روپے تک پہونچنے کی توقع ہے۔

ہندوستان جیسے ملک کے لئے جہاں مختلف مذہبوں کے پیروکار، بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ اور کئی قسم کے قبائلی لوگ بستے ہیں ٹورازم صرف اقتصادی ترقی کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعہ قومی یکجہتی کو بھی فروغ دیا جا سکتا ہے۔ جب ایک خطہ کے لوگ دوسرے خطے جائیں گے، ایک ریاست کے باشندے دوسری ریاستوں کے لوگوں سے ملیں گے تو ان کے دلوں میں باہمی تفریق کے بجائے باہمی یگانگت کا جذبہ ابھرے گا۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہم باہمی تفرقات رکھتے ہوئے بھی دوستی اور رفاقت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اسطرح ہمارے ملک کی دولتِ مشترکہ کی بنیادیں اور بھی مضبوط ہوں گی۔

اسی طرح عالمی سطح پر ٹورازم امن اور باہمی خیر سگالی کے جذبے کو تقویت دیتا ہے۔ ٹورازم نسلوں کا، رنگوں کا زبانوں کا، جغرافیائی حدود کا فرق مٹاتا ہے اور انسانیت کی بنیادی اکائی کے تصور کو استوار کرتا ہے۔

اس لئے عالمی اور قومی سطح پر ٹورازم کو بجا طور پر اہمیت دی جا رہی ہے۔ آج ہندوستان میں بھی ہر ریاست مختلف طریقوں سے ٹورازم کو ترقی دینے کیلئے کوشاں ہیں۔ اس کام میں آندھرا پردیش بھی آگے آگے ہے۔ یہ سچ ہے کہ پچھلے کئی برسوں سے ہم نے اس اہم شعبہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی اور اس طرح ہم بیشتر ریاستوں سے پیچھے رہ گئے ہیں لیکن ساتویں پنچسالہ پلان کے آغاز سے حکومت نے اس طرف خصوصی توجہ دینی شروع کی ہے۔

سب سے پہلے تو ساتویں منصوبہ میں ٹورازم کا

بجٹ تقریباً آٹھ گنا بڑھا دیا گیا ہے۔ اور ایک نیا پلان بنایا گیا ہے جس کے تحت پانچ شہروں اور علاقوں میں ٹورازم کے فروغ پر خاص توجہ دی جائے گی یہ اہم مقامات ہیں۔ حیدر آباد، ناگارجن ساگر، وشاکھاپٹنم اور وارنگل۔ ویسے تو ساری ریاست میں ٹورازم کے لئے قدم اٹھائے جائیں گے۔ لیکن ان مراکز پر زیادہ دھیان دیا جائے گا۔

ویسے تو شہر حیدر آباد ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ابراہیم قلی قطب کے دور کے شاعر ملا وجہی نے واقعی صحیح کہا تھا: "دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ"۔ آج بھی یہ شہر گلہائے رنگا رنگ کا ایک گلدستہ ہے۔ لیکن ابھی بھی اس کے کئی پہلو توجہ کے طلبگار ہیں۔ اب ہم قلعہ گولکنڈہ پر روشنی اور آواز کے پروگرام کا انعقاد کرنے جا رہے ہیں۔ اس قسم کا پروگرام لال قلعہ دہلی میں ہوتا ہے۔ اور اس سے انتہائی دلچسپ اور مؤثر انداز میں دکن کی تاریخ پیش کی جائے گی۔ قطب شاہی مقبروں پر بھی ایک کروڑ سے زیادہ رقم خرچ کی جائے گی۔ اس طرح گولکنڈہ قلعہ اور قطب شاہی مقبروں کو قومی ورثہ کا پراجکٹ بنایا جائے گا۔ حسین ساگر میں تو کشتی رانی شروع کر دی گئی ہے۔ آبی کھیلوں کا اضافہ بھی کیا جا رہا ہے حسین ساگر پر ہی "ڈزنی لینڈ" کی طرز کا ایک عصری تفریحی پارک بنایا جائے گا جس پر پچاس کروڑ سے اوپر صرفہ ہو گا۔

ناگارجنا ساگر بدھ مت کے پیرو کاروں کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں مہایان فرقے کی بنیاد پڑی تھی۔ اس لحاظ سے دنیا بھر کے بدھ لوگوں کے لئے یہ زیارت کا مقام ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دنیا کا سب سے اونچا پتھر اور اینٹ کا بندھ ہے۔ کشتیوں کے ذریعہ لوگ ایک جزیرہ پر جاتے ہیں جہاں بدھ مت کے آثار قدیمہ ایک عجائب گھر میں رکھے گئے ہیں۔ یہاں مہاتما بدھ کا ایک تبرک بھی ہے اس مقام پر بھی سہولیات میں اضافہ کیا جائے گا۔ آبی کھیلوں کا انتظام کیا جائے گا اور اسے عالمی بدھ مت مرکز بنایا جائے گا۔

وارنگل جو کاکتیہ حکمرانوں کا دار سلطنت رہ چکا ہے۔ ایک دلچسپ سیاحی مرکز ہے۔ وارنگل کے رامپا اور پاکھال میں مندر، جھیلیں اور جنگل، سیاحوں کے لئے دلکش مقامات ہیں۔ ان پر بھی خاص توجہ دی جا رہی ہے

شاکھاپٹنم کا سنہری ساحل اور بھملی پٹنم تک کی ساحلی سڑک بہت ہی خوبصورت اور دلاویز نظارہ پیش کرتے ہیں۔ فی الحال وہاں سیاحوں کے رہنے کے لئے یا تیراکی اور آبی کھیلوں کی سہولیات نہیں ہیں۔ یہ مہیا کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ وہاں بڑے پیمانے پر رہنے اور جلسے منعقد کرنے کے سہولیات بھی مہیا کئے جائیں گے۔ سمندر کی سیر کے لئے کشتیوں کا انتظام کرنے کا بھی منصوبہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری ریاست میں اتنا طویل ساحل ہے اور اتنی جھیلیں ہیں کہ ہم مختلف مقامات پر سینکڑوں کشتیاں چلا سکتے ہیں اور کافی تعداد میں آبی کھیلیں شروع کر سکتے ہیں۔

تیروپتی بھی ایک نہایت ہی مقبول اور کامیاب سیاحتی مرکز ہے۔ لیکن وہاں دیواستھانم کی انتظامیہ خود خاطر خواہ سہولتیں مہیا کرتی ہے اور انہیں اور بھی بہتر بنانے کی کوشاں رہتی ہے۔ ٹورازم بھی اس کار خیر میں ان کے ساتھ کچھ حد تک ہاتھ بٹاتا ہے

وجے واڑہ آندھرا پردیش کا بہت ہی اہم شہر ہے۔ وہاں دریائے کرشنا پر بندھ باندھنے سے ایک خوبصورت جھیل بن گئی ہے۔ اس کے اندر ایک جزیرہ بھی ہے۔ وہاں بڑے پیمانے پر کشتی رانی اور عصری آبی کھیلوں کا مرکز بنایا جانے والا ہے۔

اس طرح پوری ریاست میں جہاں بھی تھوڑی بہت ڈیولپمنٹ ممکن ہے مناسب پروگرام رو بہ عمل لائے جا رہے ہیں۔ تمام شاہراہوں پر جگہ جگہ ہوٹل بنائے جائیں گے۔ امید ہے پہلا ہوٹل اکتوبر میں وجے واڑہ میں تیار ہو جائے گا۔

اس وقت ہم ٹورازم کی طرف سے سیاحوں کے لئے بسیں اور کاریں چلا رہے ہیں۔ حیدر آباد ہوائی اڈے سے سیاحوں کو کاریں مہیا کی جاتی ہے۔ ہر ریلوے اسٹیشن پر معلومات فراہم کرنے کا کاونٹر ہے۔ ہوٹلوں میں فون کے ذریعہ بکنگ کی جاتی ہے۔ تمام اہم آثار قدیمہ میں کینٹین کھولی گئی ہیں۔ فلمیں اور تصویری پوسٹ کارڈ بھی بنائے گئے ہیں۔ وایودوت کے ساتھ معاہدے کر کے ناگارجنا ساگر اور دوسرے مقامات پر ہوائی سروس کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ تمام گیسٹ ہاؤزوں کو خوبصورت اور آرام دہ بنایا جا رہا ہے۔ دوسری ریاستوں کے ساتھ بین ریاستی پیکج ٹوروں کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

اس پروگرام میں مرکزی حکومت بھی مالی اور دوسری امداد دے رہی ہے۔ پچھلے سال ہمیں کافی مالی امداد ملی اور امید ہے کہ آئندہ یہ اور بھی زیادہ بڑھے گی۔

اس طرح آندھرا پردیش ٹورازم کے اعتبار سے اس دیو کی مانند ہے جو اب نیند سے بیدار ہوا ہے اسے اپنی طاقت دولت اور ورثہ کا احساس ہوا ہے اور اب وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کا پوری آب و تاب کے ساتھ مظاہرہ کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ عنقریب ہم بڑے اطمینان اور قدرے فخر کے ساتھ ٹورازم کے تعلق سے شاہد صدیقی مرحوم کے اس شعر کو دہرا سکیں گے۔

جنون جہد مسلسل ہے بے نیاز مکاں
کہاں کے شہر بیاباں سجا دیئے ہم نے

(حیدر آباد سے نشر)

نریندر لوتھر
۱۰۹۰-۳-۶، سوماجی گوڑا
راج بھون روڈ، حیدر آباد

قصہ تنخواہ بڑھنے کا

کیا آپ کرمچاری ہیں — ؟ ارے واہ! آپ سرکاری کرمچاری ہیں! بہت خوب! یک نہ شد دو شد۔ آپ کے چہرے سے پتہ چلتا ہے۔ ہو نہ ہو آپ سرکاری نوکر ہیں اور اگر آپ اپنے مُہرے کی پوچھتے ہیں تو صاف پتہ چلتا ہے — ٹھپہ لگا ہے، بالکل گہرا اور پکا ٹھپہ —! تو ایک عدد مہ ہو نہ خوشخبری نوٹ کر لیں — نوٹ کے نام پر ان کے کان، قلم بر گوش کھڑے ہو کر یوں پوچھتے ہیں، کیا کیا —؟ خوش کن خبری —!

اجی اور نہیں تو کیا — آپ کے تو پو بارہ ہیں، سنا ہے پے کمیشن بیٹھ گیا ہے۔ خدارا اسے کسی کاروبار کے بیٹھنے پر محمول نہ کریں، اجی جناب تنخواہ میں اضافے پر برسوں غور کرنے والا کمیشن بیٹھ گیا ہے۔

یہ سننا تھا کہ آں حضور اپنی بیمار ہچر مچر کرتی Aristocratic کرسی سے یوں اچھل پڑتے ہیں جیسے سرکس کا تماشہ گزرا یا بجلی کے اتفاقی شاک لگنے پر کوئی دیہاتی نووارد شہر! سوالات کی تابڑ توڑ بوچھار تلے آپ بالکل نہا جائیں گے، کب بیٹھا —؟ کب کھڑا ہو گا —؟ اور بالآخر کب مژدۂ جانفزا کا اعلان ہو گا؟ وغیرہ وغیرہ —

ایسا لگتا ہے "پے کمیشن" کوئی کمیشن نہ ہو کر حاتم طائی ہو گیا جو عشق فوبیا کے شکار شہزادہ منیر شامی کے لیے شہزادی شہر بانو کے الٹے سیدھے سوالوں کا جواب ڈھونڈ لایا ہے اور اب عشق پیچاں کی بیل کھل کھل کر منیر شامی کی گردن میں لپٹنے ہی والی ہے —!

"واہ واہ چہ خوب" کے نعرۂ مستانہ ہر سو اسی پے کمیشن کی ستم ظریفیوں، بے پناہ عنایتوں اور وفا آمیز بے وفائیوں کا ذکر خیر و شر چھڑا ہوتا ہے۔ اخبارات دھواں دھار خبریں اور اداریے لکھ لکھ کر ہزاروں صفحات سیاہ کرتے جاتے ہیں اور الفاظ کے تاریک جنگلوں اور بھیانک سایوں میں ہماری آنکھیں گڑ گڑا کر فیوض و برکات کی جستجو میں بھٹکتی ہیں، کبھی آہ نکلتی ہے تو کبھی واہ! کبھی تبصروں کے

محمد اکرام الحق

نشتر چلائے جاتے ہیں، کبھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اور کبھی تاسف کا نامراد شکر ذہن و دماغ کے ایوانوں پر شب خوں مارنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے ۔ کوئی صاحب تو ایسے کمیشنوں کی پوری تاریخ ازبر کیے ہوئے ہیں اور یوں فرفر دہراتے ہیں جیسے تیلی پر نشر سے الفاظ چھپتے ہیں ۔

ساتھ میں ان کمیشنوں کے ارباب بست وکشاد پر بھی بے لاگ نقد و تبصرے ہوتے ہیں ۔ وہ یوں ہوا کہ "اجی حضرت! وہ بہت "مردم شناس" تھے، انھوں نے غریب کرمچاریوں کے لیے وہ "کارنامہ" انجام دیا کہ اب وہ خود اپنا منہ دکھانے کے لائق نہ رہے ۔۔ اور فلاں صاحب نے تو دربار داری کی انتہا کر دی، بے چارے نوکروں کو کہیں کا نہ رکھا، قومی یک جہتی کا پورا نمونہ پیش کر دیا۔ آج یہاں تو کل وہاں، تبادلے پر تبادلے اور ترقی پر ترقی ۔۔ بھلا ان صاحب کو دیکھیے کل تک کلرکی کو ترستے تھے اور آج ڈپٹی بنے ہر کس و ناکس پر برستے ڈپٹتے نظر آتے ہیں ۔۔ ضابطے کی وارننگ کے باوجود سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے ہیں ۔۔ نہ گاڑی نہ کار، بس! "بس" پر سوار دندناتے پھرتے ہیں۔

جب ماحول پر تنخواہ کمیشن کا پورا مدھمات چھا جاتا ہے تو یہ حضرات لال فیتہ شاہ اپنی اپنے سیلیوں، ہاؤز رینٹوں اور بھتوں کے توزع و تناظر میں یوں کھو جاتے ہیں جیسے روایتی گوالن یا گوالے ۔ لیکن تصورات کے پیچ و خم کے بعد جب حقائق کی راہ پر خطر نظر آتی ہے تو عجیب و غریب اسرار سامنے آتے ہیں :

ہاؤز رینٹ ! توبہ! اس قلیل رقم میں تو پناہ گزینوں یا سیلاب زدوں کو دیا جانے والا کھپچیوں کا ایک جھونپڑا تک نصیب نہ ہو گا ۔۔ ایسا لگتا ہے یہ ہاؤز رینٹ نہ ہوا، کوئی انگریز ریزیڈنٹ ہوا، جو سابق نوابوں، راجاؤں اور شکست خوردہ بادشاہوں کی طرح آج کے لال فیتہ شاہوں پر کچھ اس طرح مسلط ہے کہ بس کچھ نہ پوچھیے ۔ وہ ریزیڈنٹ صاحبان تو پھر بھی گوشت پوست کے انسان تھے، اور اپنے دلوں میں دوسروں کے لیے کسی نہ کسی حد تک نرم گوشے رکھتے تھے ۔ مگر یہ ہاؤز رینٹ تو آپ کو چند ٹکے دیتا ہے اور فرنش محلوں میں اپنا Status برقرار رکھنے پر مجبور کرتا ہے ۔۔ اس معاملے میں آپ کی طبیعت اس وقت اور مکدر ہو جاتی ہے جب مالک مکان کی ہر روز کی جھڑکیوں اور فی الفور مکان خالی کر دینے کی جان لیوا دھمکی سے آپ کے کان سن سن کرنے لگتے ہیں اور آپ پر نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن والی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔۔ بے چارگی کے اس عالم میں آپ صرف اور صرف ایک ہی دعا کی قبولیت پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں:

خدایا جب تو نے نوکری مقدر کی تھی تو ایک عدد مکان عنایت کرنے کی بھی زحمت فرمائی ہوتی ۔۔ ایسے ہی لمحوں میں کرمچاری کی زبان پر بے اختیار یہ شعر آ جاتا ہے ؎

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

شعر پڑھتے ہی آپ میدانِ ادب کے شہسوار ہو جاتے ہیں ۔۔ اور پھر ادب میں بے ادبی کی گنجائش کہاں ۔۔ غصے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔ ایک شکایت تھی، کر دی گئی، جی ہلکا ہوا اور یہ سوچتے ہوئے گھر کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں کہ چلو دیش آزاد ہے، ہم آزاد ہیں، پے کمیشن آزاد ہے ۔۔ تنخواہ میں اضافے سے صرف یہی ہوتا ہے نا کہ ہم سرج کا سوٹ بنوا لیتے اور سردیوں میں گرمیوں کے مزے لوٹتے ۔۔ لیکن جناب کچھ تو قومی غیرت ہونی چاہیے ۔۔ ارے بھائی! گاندھی آشرم کا "پرنس کوٹ"، خوب جچے گا ۔۔! جو ایک طرف کھادی بھی ہے ۔۔ پیارے باپو کی نشانی اور دوسری جانب "پرنس"، بھی ہے، اپنے سابق "مائی باپ" یعنی راجکماروں کی یادگار، اور کوٹ بھی ہے یعنی گورے صاحبوں کا چہیتا لباس ۔۔!

اس رنگا رنگی اور بوقلمونی کا خیال آتے ہی آپ بشاش ہو جاتے ہیں اور آپ کے قدم گھر کی طرف تیزی سے اٹھنے لگتے ہیں ۔۔ آج ہی تو موقع ہے "ان کو" خوش کرنے کا ۔۔۔۔ مگر جب آپ گھر میں داخل ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ تنخواہ میں اضافے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح آپ سے بہت پہلے گھر تک پہنچ کر "بیگم" کی آرزوؤں کو تمناؤں کے ذخیرے کو خاکستر کر چکی ہے ۔۔ اور آپ کی "وہ" "مٹھو کو دودھ بتاشہ کھلانے کا حسین وعدہ دہراتے دہراتے نڈھال ہو چکی ہیں ۔۔۔ ان کیفیت آگیں لمحوں میں آپ قربان ہوتے ہوتے بچ جاتے ہیں ۔۔ کاش وہ مٹھو نہ ہوتا، آپ ہوتے"۔ یہ خیال بڑی تیزی کے ساتھ ذہن و دماغ پر دستک دیتا ہوا گزر جاتا ہے!

آپ کی یہ لمحاتی خوشی بھی اس وقت داغ مفارقت دے جاتی ہے، جب پتہ چلتا ہے ۔۔ آپ کی تنخواہ میں سو پچاس اضافے کی خبر، دوکانداروں، قرض خواہوں، رشتہ داروں اور "عزت مند" دامادوں کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے ہزاروں میں تبدیل ہو گئی ہے اور اسی حساب سے بازاروں کے بھاؤ، مالک مکانوں کے تاؤ اور ایرون غیروں نتھو خیروں کی طلب و اشتہا دو دونی چار نہیں بلکہ چار چوکے سولہ میں بدل گئی ہے ۔۔ اور آپ کے پلے کچھ نہیں آیا ہے ۔ بھائی بندھوؤں کے نام آپ کا "اضافہ" منہا ہو چکا ہے ۔۔!

بہر کیف گھبرائیے نہیں ۔۔ اللہ صابروں کے ساتھ ہے ۔۔!! دس سال مزید انتظار کیجیے ۔۔ شاید پھر "تنخواہ کمیشن" بیٹھے ۔۔ لیکن کہیں اس وقت تک آپ خاکم بدہن! خود اس دنیا کے لیے نہ اٹھ چکے ہوں!

(گورکھپور سے نشر)

نور عالمی

ہر گلی کوچے میں، گھر میں، مجھکو دیوانے ملے — بستیوں کو غور سے دیکھا تو ویرانے ملے
بس گئے صحرا میں جو ایسے بھی فرزانے ملے — جن کو صہبا خوش نہیں آئی وہ پیمانے ملے
عشرت صہبا سے خالی سارے میخانے ملے — مسجدیں دو ایک تھیں باقی صنم خانے ملے
ایک تارہ ہوں بھٹکتا ہوں رہِ منزل میں میں — آسماں پر جب ملے مجھکو تو انجانے ملے
بت نہیں تھے جن میں ایسے بھی صنم خانے ملے — شمعیں تھیں بے نور اور غمگین پروانے ملے
قصر شاہی میں جہاں ہر رنگ کے فانوس تھے — آج جب دیکھا تو ویرانے ہی ویرانے ملے

خوبصورت ہر کتاب نور تھی لیکن رفیق
جب ورق الٹے تو افسانے ہی افسانے ملے

(رام پور سے نشر)

سچ بولنا

فکر تونسوی

میں نے سچ بولنے کا موضوع اس لئے چنا ہے کہ میرے لئے سچ پر لکھنا آسان ہے۔ سچ بولنا مشکل ہے۔ کیونکہ جو آدمی سچ بولتا ہے اس پر سنگ باری کی جاتی ہے اور سنگ باری اس آدمی کو بری نہیں لگتی جو احمق ہو یا انھیں اچھی لگتی ہے جو کسی عقیدے پر اس حد تک ایمان رکھتے ہوں۔ کہ ہسپتال اور شمشان کو اپنی آخری جائے پناہ سمجھتے ہوں۔

چند برس پہلے میں نے اپنی محبوبہ سے پوچھا تھا۔ "کیا تم سچ مچ مجھ سے عشق کرتی ہو؟" وہ بولی "خدا کی قسم"۔

ان دنوں میں خدا کو نہیں مانتا تھا آج کل بھی معاملہ کچھ مشکوک سا ہے۔ لیکن یہ چیز مشکوک نہیں تھی۔ کہ ہم دونوں اندھوں کی طرح عشق کرتے تھے۔ یعنی عشق ہم دونوں کا عقیدہ تھا۔ اور یہ سلسلۂ عشق ہم سچ ہی بولتے تھے۔ پھانسی وغیرہ پر چڑھنے کے لئے تیار تھے۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا۔ کہ ہماری آخری جائے پناہ ہسپتال یا شمشان ہوتی لیکن برسوں میری وہ محبوبہ مجھے ایک شاپنگ سینٹر پر مل گئی اس کے ساتھ چار بچے تھے۔

وہ محبوبہ تو میری تھی مگر بچوں کا باپ کوئی مختلف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اپنے بچوں سے کہنے لگی "بیٹو! انھیں سلام کرو۔ یہ تمہارے ماموں ہیں"۔

بچوں نے سلام کیا۔ ان کا سلام سچ تھا مگر مجھے وہ سچ کڑوا لگا۔ کیونکہ یہ لوگوں سے سن رکھا تھا۔ کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ مجھے ماموں کہتے وقت میری محبوبہ کی آنکھوں سے دو چار آنسو نکل آئے۔

میں نے چار بچوں والی محبوبہ سے کہا "سنو بالکل ایسے ہی دو آنسو تمہاری آنکھ سے اس وقت بھی نکلے تھے جب خدا کی قسم کھا کر تم مجھ سے عشق کیا کرتی تھیں۔ مگر یہ ہو کیسے گیا"۔

وہ بولی "ہم نے اس وقت جھوٹ بولا تھا"۔

میں نے کہا "مگر میں تو سمجھا تھا۔ تم سچ بول رہی ہو"۔

کہنے لگی "تم نے ٹھیک ہی سمجھا تھا۔ کیونکہ میں سچ ہی بول رہی تھی"۔

لیکن .....

بہر کیف مجھے اپنے بچوں کا ماموں بنا کر وہ تیز رفتاری سے لوٹ جانا ہی وقت کا سب سے بڑا سچ تھا۔

مگر جیسے کہ میں نے سب سے پہلے کہا تھا کہ سچ پر لکھنا آسان ہے، سچ بولنا سب سے مشکل کام ہے یہ محض میرا ذاتی خیال ہو۔ سماج میرے اس خیال سے متفق نہ ہو۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ جو لوگ سماج سے اتفاق نہیں کرتے وہ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ دو چار دن پہلے میں نے ایک ذہین دوست سے پوچھا "دوست! یہ بتاؤ۔ آج کل کی دنیا میں سب سے آسان کام کون سا ہے، سچ بولنا یا جھوٹ بولنا"۔

وہ بے ساختگی سے بولا۔ جھوٹ بولنا۔ کیونکہ آج کل چھوٹے سے لیکر بڑے آدمی تک اس آسانی سے جھوٹ لیتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے"۔

میں نے کہا "لیکن شاستروں میں جو یہ لکھا ہے کہ جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے۔ یعنی جھوٹ لنگڑا ہوتا ہے۔ تو لنگڑا کر چلنا کوئی آسان کام ہے؟"۔

مگر اس نے مجھے بتایا کہ تم نے جن شاستروں میں یہ پڑھا ہے وہ شاستروں کے پرانے ایڈیشن تھے۔ اب مارکیٹ میں نئے ایڈیشن آگئے ہیں اور پھر انھوں نے مجھے ایک حساب کی مثال دے کر بتایا کہ وہ لنگڑا تھا۔ جھوٹ بول رہا تھا مگر اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ آج وہ تین کوٹھیوں چار فیکٹریوں اور پانچ کاروں اور چھ امپورٹڈ کتوں کا مالک ہے۔ اور اگر وہ سچ بولتا تو جھگی جھونپڑی سے آگے نہ بڑھ پاتا۔

اس مثال اور ایسی کئی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ سچ بولنا وقت کا مشکل ترین کام ہے۔ اور چونکہ مشکل ترین ہے۔ اس لئے کوئی آدمی سچ بولتا ہی نہیں۔ اگر بدقسمتی سے بولتا بھی ہے تو لوگ کہتے ہیں، اجی اسے چھوڑو۔ وہ تو احمق ترین آدمی ہے۔ دنیا میں سچ کو تو کوئی دو کوڑی وقعت بھی نہیں دیتا۔

لہٰذا میرا خیال ہے۔ کہ لوگ سچ بولنے سے اس لئے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی آدمی اپنے آپ کو احمق گردانا پسند بھی نہیں کرتا۔ اگرچہ میں یہ مانتا ہوں کہ دنیا راست گفتاروں سے کبھی خالی نہیں رہی بلکہ احمقوں سے بھی کبھی خالی نہیں رہی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ راست گفتار بھی سچ بولنے سے آنا کانی کرنے لگے ہیں میرے ایک دوست ہیں۔ انتہائی صاف دل اور نکھرے ستھرے انسان۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا آپ نے بھی آج کل سچ بولنا ترک کر دیا ہے"۔

وہ بولے "ترک نہیں کیا۔ کئی مواقع پر سچ بولنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جب سچ بولنے لگتا ہوں تو وہ حلق میں ہی اٹک کر رہ جاتا ہے، آگے نہیں بڑھ پاتا۔

میں نے کہا "کہ اس سچ میں تھوڑے سے جھوٹ کی آمیزش کر دیا کرو۔ تو یقیناً آگے بڑھے گا۔ آزما کر دیکھ لو"۔

وہ بولا "کیوں مذاق کرتے ہو مجھ سے"۔

میں نے کہا "اور سچ کیا ہے؟ آج کی دنیا کا سب سے بڑا مذاق ... سامعین کرام، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو لوگ سچ بولنا چاہتے ہیں، دنیا والے اسے مذاق سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تو وہ جھوٹ سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ جسے دنیا والے جھوٹ سمجھیں وہ نہیں۔ اور ایسا جھوٹ ہی آج کی دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے۔

کل میں نے نئی نسل کے ایک رشتے دار لڑکے سے کہا۔ "برخوردار! میرا ایک کام ہے"۔

وہ سر جھکا کر بولا "بزرگوں کا کہنا سر ماتھے پر ہماری تہذیب نے مجھے یہی سکھایا ہے"۔ مجھے تہذیب کی اس کارستانی پر حیرت تو ہوئی۔ لیکن میں نے اسے ایک روپے کا کرنسی نوٹ دے کر کہا "دیکھو ایک روپے سے میرے لئے چھ پوسٹ کارڈ پوسٹ آفس سے لے آؤ، اچھا بتاؤ، ایک پوسٹ کارڈ پندرہ پیسے میں آتا ہے تو چھ پوسٹ کارڈ کتنے میں آئیں گے"۔

وہ بولا "ایک روپے میں"۔

میں نے کہا "لگتا ہے برخوردار ریاضی میں کمزور ہو۔ چھ پوسٹ کارڈوں پر نوے پیسے لگیں گے"۔

وہ بولا "نہیں ایک روپیہ لگے گا۔ کیونکہ باقی جو دس پیسے بچیں گے۔ وہ میری آنے جانے کی محنت کے"۔

میں آپ کو نہیں دوں گا۔"

میں مسکرا دیا۔ اس نے سچ بولا تھا۔ اور اگر سچ میں معصومیت شامل ہو۔ تو وہ کڑوا کبھی نہیں لگتا۔ البتہ اگر قتل گاہ میں معصومیت کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے اور پھر ڈھول دھماکے سے نعرے لگائے جائیں۔ کہ یہ قتل نہیں تھا۔ بلکہ سچ تھا۔ تو منہ کا مزا کڑوا ہو جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں ایک بڑے آدمی نے ایک سکول کے پرنسپل کو میرے سامنے ٹیلی فون کیا۔ کہ فلاں لڑکے کو داخلہ دے دیجئے۔ مگر بار ہا چکر بازی کے جب داخلہ نہیں ملا۔ تو میں نے اس بڑے آدمی سے پوچھا۔

"کیا آپ نے ٹیلی فون میرے سامنے نہیں کیا"

وہ بولا: "کیا تھا؟"

پرنسپل صاحب سے پوچھا؟ کیا آپ کو ٹیلی فون آیا نہیں تھا۔

وہ بولا: "آیا تھا"

گویا دونوں سچ بولتے تھے۔ مگر داخلہ پھر بھی نہیں ملا۔ کیونکہ دونوں کے ٹیلی فونوں میں سچ کم اور ٹیلی فون زیادہ تھا۔ کیوں؟ کیونکہ آج کل سچ بولنا مشکل ترین کام ہے۔ اور کوئی آدمی سچ بول کر احمق نہیں بننا چاہتا۔

(اردو مجلس دلّی سے نشر)

خورشید سحر

یہ سوچتا ہوں تو کچھ کھلبلی سی ہوتی ہے
کہ میرے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے موتی ہے
کسی کی چیخ ہو، دستک ہو اس سے کیا مطلب
بہت سکون سے دنیا ابھی بھی سوتی ہے
ہر ایک شخص سے برہم ہے زندگی لیکن
نہ جانے کیا ہے کہ رشتوں کا بوجھ ڈھوتی ہے
طلوع ہوتے ہی جھکنے لگی غروب کی سمت
کہ یہ صدی بھی اب اپنا وقار کھوتی ہے
کبھی جو برسی تو بس تتلیوں کے پر بھیگے
سلگتے شہر کو بارش کہاں بھگوتی ہے
بہت ملول بہت ہی نڈھال ہے پھر بھی
یہ زندگی تری یادوں کا بوجھ ڈھوتی ہے
دل و دماغ پر قابو تو پا لیا ہے سحر
مگر یہ آنکھ ہے ایسی کہ اب بھی روتی ہے

(پٹنہ سے نشر)

سلّو اور اس کی دلہن

عطیہ پروین

صبح گھر میں وہ ادھم مچتا کہ اللہ کی پناہ۔

بیگم صاحبہ اپنی طرف صاحب اپنی طرف۔ ایک کو اسکول کی جلدی دوسرے کو آفس کی عجلت اور جان سولی پر بیچارے سلّو کی۔

"سلّو ابے او سلّو"،

"جی آیا صاحب"

"چائے لا"

"بہت اچھا صاحب"

"سلّو۔ ارے او سلّو کے بچے!"

"آیا۔ آیا بیگم صاحب۔"

"ارے آ بھی چک کمبخت۔ چائے لا۔ دیکھ کتنی دیر ہو گئی"

"چائے تیار ہے بیگم صاحب"

"سلّو ابے سلّو سنتا نہیں کہاں مر گیا؟"

"مرا نہیں صاحب زندہ ہوں اور سن رہا ہوں۔ ٹوسٹ سینک رہا تھا"

"دیکھ بیگم صاحب کو بول دے آج رات دیر سے آؤں گا۔"

"صاحب آپ خود بول دیجئے نا میں تب تک ناشتہ لے آؤں"

"صاحب کے بچے دیکھتا نہیں ایک سیکنڈ کی فرصت نہیں ہے مجھے۔ چل باتھ روم میں ہی شیو بنا لوں گا تولیہ دے اور بھاگ کے ایک پیالی گرما گرم چائے اور لا یہ تو ٹھنڈی ہو گئی"

"سلّو۔ اے سلّو۔ میں نہا کے تیار بھی ہو گئی ناشتہ کیا اگلے سال لائے گا"

"نہیں بیگم صاحب اسی وقت اسی سال لاؤں گا۔ آپ بس دو منٹ صاحب سے بات کریں"

"او احمق۔ مجھے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ہے ارے۔ میری سینڈل کہاں ہے؟"

"جی بیگم صاحب یہ لیجئے"

"پالش کی تھی؟"

"جی ہاں بیگم صاحب یہ لیجئے اپنا پرس!"

"تھینک یو۔ دیکھ صاحب سے کہہ دے میں شام کو دیر سے آؤں گی"

"سلّو۔ اے سلّو"

"آیا صاحب!"

"میرا جوتا کہاں ہے؟"

"یہ ہے صاحب"

"موزے؟"

"یہ صاحب۔"

"چشمہ؟"

"یہ صاحب"

"شاباش۔ لا اب میرا بیگ دے۔ یہ دیکھ پینٹ کا بٹن آج بھی نہیں ٹنکا۔ بیگم صاحب کو بول دے اسکول سے آکر ٹانک دیں گی میں دوسرا پینٹ پہن لوں گا۔ الماری کھول۔ یہ سفید والا پینٹ نکال"

"صاحب اس کے سارے بکسوئے غائب ہیں"

"لاحول ولا قوۃ۔ وہ نیلا نکال"

"صاحب اس پر پریس نہیں ہے"

"جہنم میں جا تو۔ اور یہ پینٹ۔ لا وہی والا دے میں بیلٹ کس لوں گا۔ لا ناشتہ دے۔ اچھا رہنے دے ایک ٹوسٹ اٹھا۔ او گاڈ۔ اتنی دیر ہو گئی"

"صاحب دودھ کا ایک گلاس پی لیجئے۔ بھوکے ہو جائیں گے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ وقت نہیں ہے۔ میری طرف سے تو پی لینا۔"

"سلّو میں چلی"

"بیگم صاحب ناشتہ"

"بہت دیر ہو گئی۔ اب تو ہی کر لینا۔"

کپڑوں کا انبار۔ ہر چیز بے ترتیب۔ ناشتہ میز

پر دھرا کا دھرا اور صاحب میم صاحب روانہ۔

سلو۔ سلیم محمد ۲۵ برس کا گٹھیلے جسم والا اور بلا کا محنتی، غضب کا ایماندار گاؤں کا پلا بڑھا، صاحب اور بیگم صاحب کا چہیتا ملازم سر پکڑے بیٹھا رہ گیا۔

دو سال ہوئے جب اس نے یہ نوکری کی تھی۔ ویسے تو بڑے مزے میں تھا۔ بیگم صاحب پیاری سی صورت اور سریلی آواز والی بیگم صاحب لڑکیوں کے ایک کالج میں لکچرار تھیں اور صاحب اونچے گورے بڑے ہی اسمارٹ صاحب، کسی پرائیویٹ فرم کے منیجر تھے۔ بہت پیسہ تھا۔ بڑا شاندار بنگلہ تھا۔ گاڑی بھی تھی موٹر سائیکل بھی تھی ضرورت، شان اور آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ مگر فرصت نہ تھی۔ سکون بھی نہیں تھا۔ دوڑ۔ بھاگ، عجلت مارا ماری نہ صاحب کو فرصت کہ ذرا دیر بیگم صاحب سے ہنس بول لیں نہ بیگم صاحب کو فرصت کہ صاحب کی خیریت پوچھ لیں۔ شام کو دونوں کے الگ الگ پروگرام ہوتے۔ اپنی اپنی دلچسپیاں ہوتیں۔ جب الگ الگ وہ واپس آتے تو سلو کو بڑا برا لگتا مگر کرتا کیا دو ٹکے کا نوکر۔ وہ نمک حلال تھا۔ مخلص تھا اس لیے چاہتا تھا صاحب اور بیگم صاحب اور لوگوں کی طرح آپس میں گھل مل کر رہیں ایک ہو جائیں گھر میں بیٹھ کر ہنسیں بولیں گھر کی دیواریں ہنسی کو ترس گئی تھیں ایک دوسرے کو ساتھ دیکھنے کے لئے ترس گئی تھیں۔ صاحب کو آکر چھین جھپٹ کر ایک آدھ منٹ بیگم صاحب سے مل جاتا تو کہتے نوکری چھوڑ دو کیا ضرورت ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بیگم صاحب کہتیں۔ میں اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج کیوں بناؤں۔ جب اس لائق ہوں تو اپنے پیروں پر کیوں نہ کھڑی ہوں۔ دونوں کا بینک بیلنس تو بڑھ رہا تھا۔ لیکن گھر کا شیرازہ بکھرتا ہی جا رہا تھا کوئی اور ملازم ہوتا تو جی بھر کر فائدہ اٹھاتا۔ سارا انتظام اس کے سپرد تھا وہ سیاہ کرے یا سفید۔ مگر وہ احمق بیگم صاحب کا چھوڑا ہوا ناشتہ اور صاحب کا گلاس بھر گاڑھا ملائی دار دودھ فرج میں رکھ دیتا اور اپنے حصے کی چائے روٹی ہی کھاتا۔

دوپہر میں کھانا بنا کر اسے بیگم صاحب کے لئے الگ اور صاحب کے لئے الگ پہونچانا پڑتا۔ وہ اکیلا بعض وقت اتنی بھاگ دوڑ کر کے گھبرا جاتا اطمینان کی سانس نہ لینے پاتا کہ رات کے کھانے کا وقت آجاتا اس سے نپٹتا کہ صاحب آجاتے۔ بیگم صاحب آجاتیں اور پھر اسکی کھینچا تانی شروع ہو جاتی۔

"سلو ــــ او سلو۔"

"سلو۔ اے سلو۔"

"سلو ادھر آ۔"

"سلو بات سن۔"

"سلو یہ دے۔"

"سلو وہ دے۔"

باپ رے باپ وہ پھرکی کی طرح ناچتا اور رٹے ہوئے طوطے کی طرح گردان کرتا۔

"آیا صاحب۔"

"آیا بیگم صاحب۔"

بیگم صاحب اور صاحب میں اکثر بول چال بند ہوتی اس سرد اور خاموش جنگ میں سلو ہتھیار بنایا جاتا۔

"سلو صاحب سے کہدے میرا انتظار نہ کریں ناشتہ کریں۔"

"سلو بیگم صاحب سے کہدے میں گاڑی لے جاؤں گا موٹر سائیکل سے چلی جائیں ــــ!"

سلو کا دم اور بھی سوکھ جاتا۔ صاحب نے اسکو موٹر سائیکل چلانا کیا سکھا دیا تھا کہ جب دیکھو تب اسے بیگم صاحب کو کالج پہونچانے کی ڈیوٹی بھی انجام دینی ہوتی۔ اب پیچھے بیگم صاحب بیٹھی ہوں اور اپنے معطر وجود کے ساتھ اپنے نازک ہاتھ کی نفیس رسی کو کبھی کبھی اس کے کندھے پر لپیٹ کر اس کو سنبھل کر چلنے کے لئے ڈانٹ بھی رہی ہوں تو کتنا برا لگتا ہے۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ سوچتا۔ بیمار بن کر لیٹ جائے۔ دونوں کو ذرا مزا چکھا دے۔ مگر پھر ترس آجاتا کبھی سوچتا بھاگ جائے۔ مزے سے گاؤں کی ہوا کھائے آزادی سے گھومے بلا سے سوکھی روٹی چٹنی ملے گی اس قید و بند سے تو چھٹکارا ہو گا مگر پھر اس گھر کی محبت روک لیتی۔ اور یہ چکی اسی طرح چلے جا رہی تھی۔

"سلو۔"

کہ ایک دن سلو نے دھماکہ کر دیا۔

"صاحب۔ میں بیاہ کر رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"بیاہ صاحب بیاہ۔ اب اور کنوارا نہیں رہ سکتا!"

"اچھا پھر کرلے۔ مگر کہاں کرے گا؟"

"صاحب۔ گاؤں سے لڑکی لاؤں گا۔ اماں نے طے کر رکھی ہے۔ ٹھیک ہے۔ بیگم صاحب سے بھی پوچھ لے۔"

"بیگم صاحب۔"

"بول۔"

"میں بیاہ کر رہا ہوں۔"

بیاہ۔ ارے تو! مگر کس سے۔

"بیگم صاحب ایک لڑکی سے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کرلے۔ میں خرچہ دے دوں گی مگر لڑکی کہاں ہے؟"

"گاؤں میں ہے۔ چھٹی دے دیجئے۔ آٹھ روز میں اس کو لے کر واپس آجاؤں گا۔"

"باپ رے آٹھ روز۔ مگر یہاں کیا ہو گا۔"

"بیگم صاحب مجبوری ہے کچھ روز تکلیف اٹھا لیں میری عورت آجائے گی تو آرام ہو جائے گا۔ ہم دونوں مل جل کر کام کریں گے۔"

"ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ وہ میرا کام کرے گی تو صاحب کا کون؟"

"جی نہیں بیگم صاحب۔ وہ صاحب کا کام کرے گی میں آپ کا۔"

کان کھڑے ہو گئے بیگم صاحب کے ڈپٹ کر پوچھا

"ایسا کیوں؟"

"صاحب کو عورت کے ہاتھ کی ضرورت ہے۔ بیگم صاحب۔ عورت کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے ان کے کپڑوں میں کوئی بٹن ٹانکنے والا چاہیئے۔ کوئی پیار سے ناشتہ کرانے والا چاہیئے کوئی کھانا کھلانے والا چاہیئے میں تو بیگم صاحب۔ دو حصوں میں بٹا ہوں کس کس کا کام کروں کس کس کا خیال رکھوں وہ صاحب کو آرام پہونچائے گی میں آپ کا کام کروں گا۔"

بیگم صاحب کو کسی سوچ میں ڈوبی چھوڑ کر وہ گنگناتا چل دیا۔ ضرورت۔ ضرورت ہے ایک شریمتی کی۔۔۔۔

آٹھ روز گھر پر صاحب اور بیگم صاحب پر کیا گزری۔ سلو کو نہیں معلوم۔ مگر جب وہ ایک بوٹا سے قد کی گوری سی، پہاڑی سی تندرست چھن من کرتی دلہن کو لیکر واپس آیا تو گھر کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی اور بیگم صاحب حواس باختہ تھیں۔ میلے کپڑوں کا انبار تھا۔ کوڑے کے ڈھیر تھے۔ کچن میں قیامت کا سماں تھا۔ چینی اور شیشے کے ٹوٹے برتنوں کی کوئی گنتی نہ تھی۔ اب اللہ جانے یہ کیسے ٹوٹے تھے۔ یہ صاحب اور بیگم صاحب جانیں۔ سلو آتے ہی کام میں جٹ گیا ساتھ ہی بیوی کو جٹا لیا۔ گاؤں سے اسکو خوب پڑھا لکھا کر چلا تھا۔ بڑی اچھی شاگرد نکلی وہ۔ سویرے اٹھتے ہی کولہ سنگھار کر کے پائل جھنکاتی وہ صاحب کو بیدار کرنے

کرنے پہونچ جاتی صاحب چائے!

صاحب اس طرح مسکرائے کہ پوری باچھیں کانوں تک جا پہونچیں۔ اب ان کو سلو بہت کم یاد آتا سلو کی دلہن زیادہ یاد آتی۔

"سلو کی دلہن۔"

"آئی صاحب جی۔"

"چائے بناؤ۔"

"اچھا صاحب جی۔"

"کپڑے نکالو۔"

"اچھا صاحب جی۔"

"شیو کا سامان لاؤ۔"

"اچھا صاحب جی۔"

یہ کرو۔ وہ کرو۔

پائل کی کھنک اور لوچ دار آواز "اچھا صاحب جی"

آئی ۔" بیگم صاحب کے سر پر خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ان کو اب سلو پر بری طرح اور بات بات پر غصہ آنے لگا تھا۔

"سلو کے بچے ۔"

"جی بیگم صاحب؟"

"تو بہت کمبخت ہے۔"

"جی بیگم صاحب۔"

"نمک حرام ۔"

"جی بیگم صاحب ۔"

"یہ کون سی علت لگا لایا ہے احمق ؟"

"کیسی علت بیگم صاحب؟"

"بے وقوف !"

"جی بیگم صاحب ۔"

مگر کلکلا کر رہ جاتیں وہ۔ اس کمبخت سلو کے بچے کو ملازمت سے الگ بھی تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آٹھ روز میں ہی کلیجہ منھ کو آ گیا تھا اور ہوٹل کے کھانے نے دونوں میاں بیوی کے منھ کا کچومر بنا دیا تھا۔ نہ ایسا ملازم اور کوئی مل سکتا تھا نہ کوئی ترکیب اور سمجھ میں آتی تھی۔ اور سلو کی بیوی تھی کہ وہ مردار صاحب کے دل و دماغ پر چھاتی جا رہی تھی۔

ان کو گھر سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہاں بھاگے بھاگے پھرتے۔ کہاں اب ٹھیک ۵ بجے ان کی گاڑی پورٹیکو کے اندر۔

کہاں چہرے پر بارہ بجے رہتے کہاں اب یہ عالم کردن بہ بدن نکھار آتا جا رہا تھا۔

بیگم صاحب بچہ تو نہ تھیں۔ صاحب کے تیور بھانپ گئی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں وہ کام کریں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سوچتی رہیں اور صاحب کے رنگ دیکھتی رہیں۔ ایک روز دیکھا صاحب کے ہاتھ میں ایک پیکٹ ہے لہک کر پکارا۔

"سلو کی دلہن !"

وہ چھن من کرتی دوڑی۔

"جی صاحب جی ۔"

"یہ لو تمہارے لئے لایا ہوں۔ تمھیں منھ دکھائی دینا تھی نا ۔"

"یہ سب میرے لئے صاحب جی۔ میرے لئے۔ صاحب جی آپ کتنے اچھے ہیں ۔"

وہ خوشی سے لال چقندر بنی پیکٹ کھول کر سامان نکالے جا رہی تھی۔ طرح طرح کی کریمیں، پاؤڈر ربن، سنہری چوٹیاں، لپ اسٹک، نیل پالش، رنگین ہیئر پن، چوڑیاں، کنگن، انگوٹھیاں۔ ہار اور کانوں کی بالیاں۔

صاحب اس کی خوشی دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

بیگم صاحب نے گرج کر آواز دی۔

"سلو۔ او سلو کے بچے ۔"

"جی بیگم صاحب ۔"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔"

"صاحب میری گھر والی کے لئے سامان لائے ہیں۔ لانے دیجئے بے چارے کو عورت کے لئے یہ سب چیزیں لانے کا ارمان ہو گا۔ اب مجھے چھٹی کہاں تھی کہ یہ جنجال پالتا ۔"

"سلو تو بے غیرت ہے ۔"

"نہیں بیگم صاحب بڑا غیرت دار ہوں۔ دولہا بنکے اپنی گھر والی سے زیادہ شرمایا تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے دلہن سے زادہ میرے اوپر نور اترا ہے ۔"

"بھاڑ میں جائے تیرا نور۔ ارے گدھے میں تو یہ کہہ رہی ہوں تمہاری عورت صاحب سے بڑی بے تکلف ہو گئی ہے اسے روکو ۔"

"نہیں۔ بیگم صاحب میں نے ہی کہا ہے بے تکلف نہ ہو گی شرم کرے گی یہ لمبا گھونگھٹ نکالے گی ؟ تو کام خاک کرے گی ۔"

"ارے گدھے۔ گھونگھٹ کی بات نہیں ہے ۔"

"پھر اور کیا بات ہو گی۔ ارے باپ دال چڑھا آیا تھا جل رہی ہو گی ۔"

بیگم صاحب دانت پیس کر رہ گئیں۔ انھوں نے دیکھا سلو کی دلہن نے صاحب کے لائے ہوئے سارے زیورات پہن لئے ہیں بالوں میں سنہری چوٹی چم چما رہی ہے لبوں پر لپ اسٹک ہے گالوں پر روز ہے ماتھے پر بندی ہے۔ اور وہ اٹھلاتی پھر رہی ہے۔

انھوں نے اتنے عرصے میں پہلی بار صاحب سے براہ راست بات کی۔ غیر متوقع طور پر ان کے کمرے میں گھس گئیں کالج سے واپس آئی تھیں۔ ساڑی بھی نہ بدلی تھی دن بھر کی تکان اور غصے کی گرمی چہرے پر تھی بال الجھ رہے تھے۔ صاحب نے ایک نگاہِ غلط انداز ان پر ڈالی اور پکارے۔

"سلو کی دلہن"

"سلو کی دلہن گئی بھاڑ میں۔ ادھر دیکھو میری طرف میری طرف میں تمہاری بیوی ہوں ۔"

"ارے اچھا! یہ تو میں نے بھی سنا ہے ۔"

"مذاق مت کرو۔ کہو کیا کہہ رہے تھے ۔"

"سلو کی دلہن سے کہہ رہا تھا ۔"

"مجھ سے کہو۔ مجھ سے۔ میں کروں گی وہ کام ۔"

"تمہیں فرصت ہے ۔"

"نکالوں گی فرصت ۔"

"چلو شکر ہے۔ اس کا خیال تو آیا۔ مگر پہلے اپنے کو درست کرو۔ یہ لباس، یہ چہرہ، یہ بال، کیا تمہارا سنگھار صرف پارٹیوں اور سہیلیوں کے لئے ہوتا ہے ۔"

"سلو کی دلہن کو دیکھو . . . . سلو کے لئے سجتی ہے ۔"

"سلو کے لئے نا . . . . . ۔"

"انگارے مت چباؤ۔ میں تمہاری بے رخی بے زاری اور عدم موجودگی کا عادی ہو چکا ہوں۔ بات کرنا ہو تو سلو کی دلہن سے سیکھو۔ پھول جھڑتے ہیں اس کے منھ سے۔ بیگم صاحب نے غسل کیا جسم پر پاؤڈر چھڑکا بہترین ساڑی باندھی سلیو لیس بلاؤز پہنا بالوں کو نئے ڈھنگ سے سنوارا ماتھے پر بندی سجائی ہلکے پھلکے زیورات پہنے۔ کتنے دنوں کے بعد دل سے سجی تھیں۔ آئینہ میں ایک بے حد خوبصورت نئی نئی سی پیاری سی عورت کھڑی تھی۔ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ انھوں نے کہا۔

"یہ ہوئی نا بات ۔"

"چلئے کہیں گھوم آتے ہیں ۔"

"نہیں گھر پر ہی بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔

عبدالاحد ساز

زندگی ۔۔ تم بھی سمجھ پائے کہاں، میں بھی نہیں
نام دے دو اسے کچھ اپنے تئیں اپنے تئیں

ذہن کی راہ پہ یہ گوشت کے ریشوں کا سفر
نشۂ ناف و کمر، مرحلۂ چرخ و زمیں

کیا سزا، کیسی جزا، اپنا سخن، اپنا نشاط
ساتھ لے جائیں گے ہم حشر میں فردوس بریں

دیدہ ریزی ہے مسلسل کہ گرہ لگ جائے
پیچ ہے میری نظر کا خم منظر کے قریں

کس مزے سے نئے اظہار کے دُکھ میں نہیں ہے
وہ روایاتِ دلِ سوختہ و جانِ حزیں

وہ بدن جامِ ازل، شہد بھی ہے زہر بھی ہے
شہد شیریں سہی، زہر آب سا دل چسپ نہیں

مفلسی بھوک کو شہوت سے ملا دیتی ہے
گندمی لمس میں اک ذائقۂ نانِ جویں

ساز! اگر ذوقِ نشاطِ غمِ ہستی ہے تو سن
گیت میرے الم انگیز و مسرت آگیں

(بمبئی سے نشر)

صدیاں بیت گئیں شام کو ساتھ بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے۔"

"سلو کی دلہن کرسیاں لاؤ۔"

"لایا صاحب لایا۔"

"ابے تجھ سے کب کہا تھا۔ تیری دلہن کو پکارا تھا"

"صاحب اب کیا کروں۔ شرم آتی ہے۔ اس سے کرسیاں نہیں اٹھوا سکتا۔ کیوں بھئی کیوں؟۔"

"صاحب اس کا پاؤں بھاری ہے نا۔"

"مبارک ہو سلو!"

"آپ کو بھی مبارک ہو صاحب۔ بیگم صاحب کی واپسی کی۔"

"بہت بولنے لگا ہے تو!"

بیگم صاحب ہنس رہی تھیں۔ صاحب ہنس رہے تھے۔ گھر کے در و دیوار ہنس رہے تھے بڑی خوبصورت رات گذار کر صاحب نے آنکھ کھولتے ہی سلو کی دلہن کو پکارا ہی تھا کہ بیگم صاحب چائے کی ٹرے لئے سورج کی پہلی کرن بن کر نمودار ہوئیں۔

نہائی دھوئی تر و تازہ۔ مہکتی۔ مسکراتی۔ پھولدار دیدہ زیب گاؤن پہنے لمبے لمبے بالوں میں گلاب ٹانکے۔

"آہا۔ یہ چاند کہاں سے نکلا۔"

"آپ کے دل سے۔"

"اب غزدب تو نہیں ہوگا؟"

"نہیں بہکتے ہوئے قدموں کو تھامنا جو ہے۔"

"ہاہاہاہا۔"

در و دیوار ہنس رہے تھے۔ ماحول ہنس رہا تھا۔ فضا ہنس رہی تھی۔

اسکول نہیں جاؤ گی؟

"نہیں لمبی چھٹی لی ہے۔"

"کیوں؟"

"سلو اپنی دلہن کو چھوڑنے گاؤں گیا ہے نا کیا جانے کب واپس آئے۔"

"ارے کب!"

"ابھی کچھ دیر پہلے۔ اٹھئے چائے پیجئے۔"

"ٹھہر جاؤ ذرا سلو اور اس کی دلہن کے لئے اللہ سے چاند سا بیٹا مانگ لوں۔ کہ یہی ان دونوں کا انعام ہے . . . . . مگر یہ تو بتاؤ ہمارا انعام کب ملے گا۔"

"انشاء اللہ بہت جلد۔ لیجئے چائے پیجئے۔"

تم بھی پیو۔ میرے کپ سے ایک گھونٹ تم ایک ہیں۔"

"ارے ہٹیے بھی۔"

"تمہیں میری قسم۔"

"اللہ آپ کتنے اچھے۔"

"اور تم بھی تو! کتنی حسین۔ کتنی دلربا . . . ."

(آکاشوانی لکھنؤ سے نشر)

دل کی دنیا کا اجالا

اکرم فاروقی

اس شام علی شیر خاں کی رگوں میں خون نہیں بجلی دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے اس کی نس نس میں کانٹے چبھو دیئے ہوں اور آنکھوں میں شعلے ——!! وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح راتوں رات شیر گڑھ پہونچ جائے اور بختیار خاں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے۔ وہ بختیار خاں جو اسی کی طرح بدنام زمانہ ڈاکو تھا سفاک لٹیرا تھا بے رحم رہزن تھا ——!!

مخبر نے خبر دی تھی کہ بختیار خاں کسی ناپاک ارادے سے شیر گڑھ پہونچ رہا تھا گو کہ کبھی وہ اسی کے گروپ کا ایک سرگرم رکن تھا اور دونوں کا مسکن تھا کالی گھاٹی۔ دونوں کا پیشہ نہیں دھرم تھا لوٹ مار، قتل و غارتگری اور عیاشی —— انھوں نے اپنی سفاکیوں سے تمام علاقے میں وحشت و بربریت کا ننگا ناچ نچوا رکھا تھا لیکن جانشینی کے معاملے کو لیکر دونوں کے بیچ ایک کھائی پڑ گئی تھی۔ اور پل بھر میں دونوں دریا کے دو کنارے بن گئے تھے۔ پرطے پایا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے علاقے میں کوئی دخل اندازی نہ کریں گے۔ گروہ کے لوگوں کو لالچ دے کر توڑنے کی کوشش نہ کریں گے اور کسی بھی متنازعہ مسئلہ کو تھری ناٹ تھری کے ذریعہ نہیں گفت و شنید کے ذریعہ طے کریں گے۔

لیکن یہ فیصلے اور معاہدے کی کھلی خلاف ورزی تھی کہ اس دن بختیار خاں کسی ناپاک ارادے سے شیر گڑھ کی طرف کوچ کر رہا تھا دراصل علی شیر خاں کے لئے یہ کوئی معمولی خبر نہ تھی، ایک چیلنج تھا ایک چنوتی تھی۔ اس کی جواں مردی کو، اسکی دلیری کو اور اس کے ان اصولوں کو جنھیں وہ زندگی اور دھندے کے سنہری اصول کہتا تھا وہ یہ خوب جانتا تھا کہ اس دن بختیار خاں جانشینی کے معاملے کا انتقام لینے اس کے آبائی گاؤں جا رہا تھا جہاں وہ پھلجھڑیاں چھوڑے گا۔ گولے داغے گا گویا اپنی آتشبازی کے کرتب دکھا کر اپنی بہادری کی جھوٹی دھاک جمائے گا اور پھر علی شیر خاں کے گھر والوں کے خون سے اپنی پگڑی رنگ کر اسے دھول چٹائے گا ——!!

علی شیر خاں نے گھوڑے کی باگ بانسوں کے گھنے جنگل کی طرف موڑ دی اور ایک ایسی ایڑ لگائی کہ بلو، بجلی کے مانند ہوا سے باتیں کرنے لگا اس وقت اس کے ساتھ نو جیالے ساتھی تھے جن میں ٹھاکر بھنور سنگھ اور کرتار سنگھ اوّل اور دوئم افسر اعلیٰ کی حیثیت سے رسالے کی سربراہی کر رہے تھے لیکن دونوں سربراہ اپنے آقا علی شیر خاں کے حکم کے غلام تھے وہ انھیں جس بساط پر چاہتا، لگا دیتا تھا اور وہ دونوں بھی ہر محاذ پر اپنی بہادری اور وفاداری کے وہ جوہر دکھاتے کہ ان کے خون کی صداقت اور عظمت نکھر نکھر جاتی تھی ——!!

علی شیر خاں کسی معمولی گھرانے کا شخص نہ تھا یہ اسی گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس نے آزاد نگر آباد کیا تھا۔ یہ وہی گاؤں تھا جو ملک کی جنگ آزادی میں فرنگیوں کے خلاف مرکزی حیثیت رکھتا تھا کہا جاتا ہے کہ روٹیوں کی تقسیم اسی گاؤں سے شروع ہوئی تھی اور غدر پارٹی نے سب سے پہلے اسی گاؤں کی موتی جھیل سے کنول کا پہلا پھول توڑ کر کچھ کر نے یا مرنے کی سوگند کھائی تھی ——

آج بھی گاؤں کے سیوانے پر اُگا قدیم برگد کا وہ عظیم درخت گواہ ہے۔ جس نے چودھری دھرم پال سنگھ اور مولوی احمد اللہ خاں کا خون بہ دل نخواستہ چوسا تھا لگتا ہے جیسے آج بھی بوڑھے برگد کی جھکی جھکی شاخیں اپنے ظلم و تشدد کے لئے شرمسار و سرنگوں ہیں، علی شیر خاں

جب کبھی گاؤں آتا تو از خود عقیدت سے اس کا سر جھک جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے جنگ آزادی کے جیالے آج بھی فرنگیوں کے حکم سے برگد کی شاخوں پر جھول رہے ہوں۔ ٹھاکر بھنور سنگھ جب وہاں جل چڑھاتا تو علی شیر خاں کہتا کہ یہاں جل نہیں خون چڑھاؤ۔ ان لوگوں کا جنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے دیش سے غداری کی ہے اپنی جنتا کی زندگیوں سے کھلواڑ کیا ہے انسان انسان کے بیچ دیواریں کھڑی کرکے انھیں مختلف خانوں میں بانٹ دیا ہے ——— دراصل وہ ایک تعلیم یافتہ شخص تھا وہ چاہتا تھا کہ ایک اچھے شہری کی زندگی گذارے اور اپنے نیک کاموں سے اپنے باپ دادا کا نام روشن کرے جنھوں نے آزادی کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا تھا لیکن محبوب خاں پردھان کے اشارے پر چک بندی ادھیکاری نے اس سے وہ سب کچھ چھین لیا تھا۔ جو اسکی روٹی روزی کا ذریعہ تھا۔ وہ ایسی چھوٹی عمر میں اپنے باپ کے سائے سے محروم ہوگیا تھا جب کوئی لڑکا اپنے اچھے برے کی تمیز نہیں کر پاتا ہے اور شاید یہی وہ جذبہ تھا جب گاؤں نے ماگھ کی ایک رات میں دعائیں . . . دعائیں کی کئی آوازیں سنی تھیں اور اگلی صبح گاؤں ایک ایسے پردھان کے ظلم وستم سے آزاد ہوگیا تھا جس کے اشارے پر چھوٹے بڑے ادھیکاری لوگ بھولے بھالے گاؤں کے معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کرتے تھے ——— !

علی شیر خاں کی گرفتاری کے لئے پولیس نے سر گاڑی اور پیر پہیا کر دیا تھا لیکن وہ کہیں ہاتھ نہیں لگا۔ دراصل اس نے ایک ایسی گھاٹی میں جاکر پناہ لے لی تھی جو سماج زدہ لوگوں کی ایک محفوظ پناہ گاہ تھی یہ وہی گھاٹی تھی جسکی اپنی دنیا تھی اس مختصر دنیا میں مدرسہ بھی تھا اور پاٹھ شالہ بھی۔ مندر بھی تھا اور مسجد بھی اسپتال بھی تھا اور چوپال بھی ——— وہاں کے باشندوں کے لئے ریڈیو اور ٹی۔وی تفریح کے معمولی ذرائع تھے۔ دراصل ان کی تفریح تو یہ تھی کہ کسطرح نشانہ لگایا جائے؟ کیسے رہزنی کی جائے؟ کسطرح لاشوں کو ٹھکانے لگایا جائے اور کسطرح اغوا کئے گئے لوگوں کے عزیزوں سے پھروتی وصول کیا جائے اور کس طرح ماہانہ وظیفے مقررہ افسروں تک پہونچائے جائیں؟ یہی سب امور انکی تفریح کے ذرائع بھی تھے اور دھندے کے نکات بھی۔!

علی شیر خاں کی تربیت استاد دلاور خاں کی نگرانی میں ہوئی تھی یہ وہی شخص تھا جسکی گرفتاری کے بعد سینٹرل جیل کے ڈپٹی جیلر رام پرشاد شکلا نے کہا تھا کہ ہماری جیل کی خوش قسمتی ہے کہ اسے رستم زماں کی مہمانداری کا موقعہ ملا ہے۔ خاں صاحب ساڑھے چھ فٹ کے لمبے تڑنگے ادھیڑ عمر کے شخص تھے جب چلتے تو سینہ آنکھیں اور ہاتھ نکال کر چلتے تھے اور پل پل اپنی بھاری گردن موڑ کر آگے پیچھے دیکھتے جاتے جیسے جنگل کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں بھٹک رہا ہو۔ چھوٹے۔ بڑے سب ہی قیدی صبح و شام خاں صاحب کے پیر چھوتے افسران خوشامد میں رہتے اور ممکن سہولتیں جٹاتے تھے دراصل جیل کے افسران کو احساس تھا کہ جس دن سے خاں صاحب سینٹرل جیل میں آئے تھے جیل کی بلند دیواریں جھک گئی تھیں۔ آہنی پھاٹک سکڑ گیا تھا اور رفقاؤں میں ایک عجیب قسم کی سراسیمگی طاری رہتی تھی لیکن بھلا ہو حافظ عبدالرشید صاحب کا جن کے ہفتے واری وعظ نے خاں صاحب کی زندگی کا کایا ہی پلٹ دی تھی اور وہ جیل میں روزے نماز کے اس طرح پابند ہو گئے تھے۔ جس طرح جیل کے باہر خوں خرابے اور غارتگری کے تھے ——— !!

علی شیر خاں اور بختیار خاں کو یقین نہ تھا کہ استاد اس طرح جیل میں ہتھیار ڈال دیں گے کہ نہ صرف پورا قبیلہ بلکہ تمام گھاٹی اپنی توہین اور رسوائی کے احساس سے چیخ اٹھے گی۔ اور آنے والی نسلیں پھر کسی استاد پر یقین نہ کریں گی۔ لیکن جب علی شیر خاں کی دستار بندی کی گئی تو اس نے گروہ کے سربرآوردہ لوگوں کے سامنے اپنی شہادت کی انگلی چاقو سے تراشتے ہوئے عہد کیا تھا کہ وہ جان دے دے گا لیکن کبھی ہتھیار نہیں ڈالے گا اور یہی اس کا عزم صمیم تھا جس نے اسے گروہ کی سرداری بھی سونپی تھی اور علاقہ کا مہاراجہ ہونے کا اعزاز بھی ——!! اور اب یہ ایک کرارا طمانچہ تھا علی شیر خاں کے منھ پر کہ بختیار اس کے گاؤں پر دھاوا بولنے کے لئے کوچ کر چکا تھا اس نے ایک بار پھر اپنے ولایتی ریوالور پر ہاتھ رکھتے ہوئے بلّو کو بانکی ایڑ لگائی اور ساتھیوں کو پیچھے چلے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے آندھی کی طرح آگے بڑھ گیا ——— !!

رات گہرانے لگی تھی چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا کہیں کسی کٹیا سے چراغ کی مدھم روشنی چھن چھن کر باہر آجاتی تو پگڈنڈی پر روشنی کی ایک لکیر سی کھنچ جاتی۔ بانسوں کے جنگل سے سرسراتی ہوئی ہواؤں میں ملی جنگلی جانوروں کی آوازیں فضاؤں میں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ ایسے پراسرار ماحول میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازوں سے دل دہل رہے تھے ——— اترا سی سے دو کوس کے فاصلے پر پیپل کے پیڑ کی جڑ میں دھونی جمائے سادھو نے خبر دی کہ بختیار خاں اپنے گروہ کے ساتھ شیر گڑھ کے جنوب کی سمت ایکھوں میں اپنا پڑاؤ ڈال چکا ہے یہ سادھو کوئی اور نہیں مہاویر تھا جسے علی شیر خاں نے مخبری کے لئے تعینات کیا تھا۔ اس طرح دو کوس پر اس کے مخبر مختلف بھیس بنائے اپنی اپنی ڈیوٹی پر مقرر تھے!!

رات اپنا آدھا سفر طے کر چکی تھی گہرے سناٹے اندھیروں سے سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں آج سورج خون میں نہا کر ابھرے گا خدا جانے کتنے گھروں کے چراغ گل ہونگے جب ایک قطار میں کھڑا کرکے آتشیں گولیوں کی بارش ہوگی برچھی، بھالے اور بلم اپنی اپنی پیاس بجھائیں گے۔ اور سورج کی پہلی کرن یہ طے کرے گا۔ کہ اب گروہ کا سردار کون ہوگا؟

اور آخرکار وہ لمحہ بھی آپہونچا جب بابر اور ابراہیم لودھی کی فوجیں پانی پت کے میدان میں آکر ڈٹ گئیں دونوں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ بس بگل بجنے کی دیر تھی کہ اسی اثنا میں بختیار خاں کا ایک آدمی سفید رومال میں پھل پھول باندھے ہوئے آیا اور اسے صلح کا پیغام دیا دراصل وہ دونوں ہی اپنے استاد دلاور خاں کے ہتھیار ڈال دینے کے سبب پریشان تھے اس لئے علی شیر خاں نے پیغام قبول کر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اگر دونوں کے گروہ پھر ایک ہو جائیں تو علاقے کے ان ظالموں سے نمٹا جا سکتا ہے جو غریب جنتا کا لہو چوس کر عیش و عشرت کی زندگیاں گزار رہے تھے ——— !!

وہ صبح شیر گڑھ کی ایک سنہری صبح تھی جس نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملا دیا تھا اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو پھر ایک دھاگے میں باندھ دیا تھا اس دن خوب جشن منایا گیا دعوتیں ہوئیں ناچ رنگ کی محفل آراستہ ہوئی اور گاؤں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی یہ خوشی کی لہر اس وقت اور دوبالا ہوگئی جب بانکے لال کے کنوئیں پر الھڑ دوشیزائیں اپنے سروں پر گگریاں اٹھائے پنگھٹ پر اٹھلاتی، مسکراتی اور کھلکھلاتی ہوئی آئیں۔ ان میں لالہ چندی رام کی پھول کماری بھی تھی ——— جس کے نین نقش اور روپ رنگ کے ساتھ مدماتی جوانی کے چرچے بختیار خاں نے بھی سنے تھے یکبارگی اس کی نگاہ پھول کماری پر پڑی۔ اور وہ ایک آن اس پر فریفتہ ہوگیا اور اپنے ساتھ بھگا لیجانے کے لئے تیار ——— !!

"استاد! یہ نگ میں اپنی انگوٹھی میں جڑوں گا"۔ بختیار خاں نے علی شیر خاں کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ یکبارگی علی شیر خاں کا چہرہ غصے سے تمتما گیا اس نے پھول کماری کو آواز دی: "پھلّن یہاں آؤ"۔ "ابھی آئی چاچا جی"۔ پھول کماری" معصومیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے اندر کمرے میں آئی۔ یکایک علی شیر خاں شیر کی طرح گرجا بختیار! یہ لڑکی میرے پڑوسی لالہ چندی رام کی بیٹی ہے۔ گویا میری بیٹی ہے اگر تو اپنی زندگی چاہتا ہے تو اس کے پیر چھو کر معافی مانگ ورنہ آج ہی تیری لاش کتوں سے نچوا دوں گا ——— !!

(اردو مجلس دہلی سے)

ترسیل زرکا پتہ
چیف ایڈیٹر
اکا شوانی گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو
۵ فلور، پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱

وہ آدمی

خورشید عالم

کل ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ پل بھر کے لیے بھی سکون نہیں ملا ہے۔ کل سے میں نے ایک بار بھی بیوی کی طرف نہیں دیکھا ہے اور اپنے ہی بچوں کو پیار کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ـــــ اب تک کئی بار کپڑے بدل چکا ہوں، لیکن ہر ایک سے وہی بو آتی ہے جس کے لیے میں کرونا کو کوسا کرتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ سردیوں میں بھی کپڑے بدن سے چپکنے لگتے ہیں، جیسے کولتار کی سڑک پر تیز دھوپ لگی ہو۔

میں شروع سے ہی شاید اپاہج رہا ہوں، بغیر کسی سہارے کے نہ کھڑا ہو پاتا ہوں اور نہ ہی ٹھیک ڈھنگ سے سوچ سمجھ پاتا ہوں ـــــ ایک بیساکھی پانے کی چاہ میرے اندر میرے جنم کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی ـــــ شاید!۔

کرونا سے پہلے میں نے اس بیساکھی کو رما میں تلاش کیا تھا ـــــ اپنے خطوط میں اس نے ایسا احساس ہی کرا دیا تھا کہ وہ میری بیساکھی بن سکتی ہے اور میں اس کے سہارے پربت پار کر سکتا ہوں۔ آسانی سے وشواس کرنے کے ناتے جب ہم ایک ہو گئے تو میں پورا کا پورا ایک چیخ میں بدل گیا ـــــ رما صرف لینا جانتی تھی ـــــ محبت میں دینا بھی ہوتا ہے ـــــ کھونا بھی ہوتا ہے ـــــ اس بات کا اسے احساس ہی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی پتنی تھی جس کا چناؤ بے شک میں نے کیا تھا لیکن نکلی وہ ویسی ہی ایک عام بیوی جیسی ـــــ جس نے مجھے خط لکھا اور جس نے مجھ سے شادی کی، یہ دو مختلف رمائیں تھیں ـــــ اتنا بنیادی فرق کہاں سے آیا ـــــ؟ میں سوچتا اور الجھ جاتا ـــــ خطوں والی رما اور بیوی بن کر آنے والی رما کے درمیان جو چھتیس کا رشتہ تھا اس نے میری راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

اور یہ کرونا تھی جو آج مجھ سے ملنے میرے شہر آئی تھی۔

"کیا ہمیں اتنی دور جانے کا حق ہے، جہاں سے لوٹنا ممکن نہ ہو؟" ـــــ کرونا کی سنجیدگی نے اپنا چہرہ دکھایا۔

"حق ـــــ؟" مجھے یہ لفظ چبھ گیا ـــــ "ہمیں کتنی دور جانا ہے، اس کے لیے کسی سے اجازت لینی ہوگی؟"

"ہاں ـــــ!" کرونا نے جواب دیا تو میرا ماتھا تپنے لگا۔

"کس سے؟ تمہارے پتی سے ـــــ؟"

"نہیں ـــــ! رما سے ـــــ!!" کرونا شانت تھی۔

"اس لیے کہ وہ میری بیوی ہے" ـــــ؟

"نہیں ـــــ! اس لیے کہ وہ تمہیں اتنا ہی پیار کرتی ہے، جتنا میں ـــــ میں ادھیکار کو تو نظر انداز کر سکتی ہوں ـــــ لیکن محبت کو نہیں!"

"لیکن رما مجھ سے محبت کرتی ہے، یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"رما نے!"

"رما نے؟" میں کانپ گیا ـــــ "رما تمہیں کہاں ملی" ـــــ؟

"ملی نہیں ـــــ! اس کے خطوط ہیں میرے پاس!"

"رما کے خطوط؟" میں لڑکھڑا گیا۔ اچانک لگا جیسے کمرے میں بم پھٹ گیا۔

"تو ـــــ؟"

"میں فوراً کوئی جواب نہیں دے سکتی، میں ایک کمزور عورت ہوں، تمہاری طرح میں بھی کبھی کبھی ٹوٹتی اور بکھرتی ہوں! ساری پریشانیوں کو میں کیوں حل کروں؟ تم مرد ہو کر نہیں لڑ سکتے تو مجھ سے یہ امید کیوں کرتے ہو کہ میں اپنی بھی لڑائی لڑوں اور تمہاری بھی ـــــ!" کرونا کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کیا ہے جو تمہیں سونے نہیں دے رہا ہے ـــــ؟" یہ رما تھی جو بغل کے بستر پر پڑی میرے ساتھ جاگ رہی تھی شاید۔

"کرونا کا ماضی!" میں نے جواب دیا اور اندھیرے میں رما کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی۔

"کون کرونا؟" رما نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"بنو مت!"

"اس کا مطلب، انھوں نے تمہیں بتا دیا!" رما کی آواز زخمی تھی۔ میں نے ان سے بنتی کی تھی کہ وہ تمہیں یہ نہ بتائیں کہ میں ان کے اور تمہارے بارے میں جان گئی ہوں!"

"اس نے شکایت نہیں کی ـــــ تمہاری تعریف کی ہے!" میں نے چڑھ کر کہا۔

"وہ بڑی عورت ہیں ـــــ!" رما شانت تھی۔ لیکن اس کی شانتی سے میں اکھڑ گیا تھا۔

"ہاں! وہ بڑی عورت ہے ـــــ ہر کوئی تمہاری طرح چھوٹا نہیں ہوتا ـــــ!"

"لیکن ـــــ چھوٹا آدمی بن تو سکتا ہے!" یہ رما تھی۔

"اب دیر ہو چکی ہے رما!" میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"بالکل دیر نہیں ہوئی!" اور اس جواب کے ساتھ ہی 'کھٹ' کی آواز کے ساتھ بجلی جل گئی۔

"سنو! مجھے کرونا کی وجہ سے کوئی تکلیف نہیں ہے" رما نے کہا۔ "اگر وہ تمہارے ساتھ آ کر رہنا چاہیں تو میں چپ چاپ چلی جاؤں گی ـــــ!"

رما کی خود سپردگی پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن میں گہرے دکھ سے بھر اٹھا۔ یہ محبت ہے یا رحم کا جذبہ؟ میں نے سوچا اور رما کی آنکھوں میں دیکھا جو بہت دور تک خالی تھیں۔

"کہاں چلی جاؤ گی ـــــ؟" میں نے پوچھا۔

"دنیا بہت بڑی ہے!" رما کے اندر اچانک ہی ایک مضبوط عورت نے جنم لے لیا۔

"کیا مجھے دنیا میں ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو مجھے میرے راہل کے ساتھ اپنا سکے؟"

"آدمی ـــــ؟ راہل؟" ـــــ میرے منہ سے نکلا اور فوراً ہی مجھے پتہ چل گیا کہ کتنے غلط اور کمزور لفظ میرے منہ سے نکلے ہیں۔

رما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ رما کے چلے جانے کا مطلب ہے راہل کا بھی چلا جانا راہل جو میرا بیٹا ہے ـــــ!

میں علی بابا نہیں تھا، شاید قاسم تھا جو غار میں داخل تو ہو گیا تھا اور وہاں موجود تمام اسباب تھیلوں میں بھر چکا تھا لیکن جب لوٹنے کا وقت ہوا تو یہ بھول چکا تھا کہ کیا کہنے سے غار کا دہانہ کھلتا ہے ـــــ میں نے کرونا کو پا لیا تھا لیکن اس کو پانے کے ساتھ ہی خود کو اندر تک خالی محسوس کرنے لگا تھا ـــــ اس پانے کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا کیونکہ جو کچھ میں نے پایا تھا وہ میرے ساتھ جانے والا نہیں تھا۔ یہ ایسی دولت تھی جو اس وقت تک بے معنی تھی جب تک ـــــ یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس پر میرا اور صرف میرا حق ہے۔

وقت گزر چکا تھا اور میں بھول گیا تھا کہ کیا کہنے سے دروازہ کھلتا ہے؟ تھوڑی ہی دیر بعد میں چار ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا جاؤں گا ـــــ اور ـــــ غار کے چاروں گوشوں میں لٹکا دیا جاؤں گا۔

یہ تھا میرا انجام ـــــ کوئی بھی اس انجام سے دوچار ہونا نہیں چاہتا ـــــ میں نے بھی نہیں چاہا تھا

(آگے ص ۲۴ پر)

بوڑھی پلکھن

ظہیر کیفی امروہوی

مس زینی اب لڑکی نہیں رہی تھی ——— !

لیکن اسے بوڑھی عورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا اس کے چہرے کے نقوش کبھی ایرانی نظر آتے تو کبھی یونانی خدوخال کا روپ اختیار کر لیتے تھے اور یہی رنگا رنگ حسن اسکو کبھی عراقی و عربی حسیناؤں کے طرح مشہور کر چکا تھا اور کبھی ملکوں ملکوں کی حسین دوشیزاؤں کے زمرے میں شمار کر چکا تھا۔

لیکن مس زینی کا دکھ ہی تھا کہ وہ اب تک بھی ایسا مرد نہ پا سکی تھی جس کو وہ اپنے سے بہتر دماغ، صحت مند اور بلند و شکوہ شخصیت کا مالک سمجھتے ہوئے خود کو اسکے حوالے کر دینے کے بابت سوچتی۔

ایک طوفان میں اس کے خاندان کی نشانی بوڑھی پلکھن کے گر جانے کا پتہ چلا تو مس زینی اسے دیکھنے کے لئے شہر کی ہلچل سے ناطہ توڑ کر اپنے گاؤں جانے کے لئے بے تاب و بے قرار ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں، اس بوڑھی پلکھن سے اس کا ایسا کون سا رشتہ اور تعلق تھا کہ وہ اس کے ڈھے جانے سے بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں بھونچال سا امڈ آیا تھا۔

جب وہ گاؤں جانے کے لئے اپنا سامان سمیٹ رہی تھی تب ہی اس کے واقف کار چند مردوں نے اسے گھیرا کر اس کا تعلق ان مردوں سے ایسا ہی تھا جیسا کہ روزمرہ کی زندگی میں مختلف چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں قطعی بھی شک و شبہہ کی بات نہ تھی کہ مس زینی کا ان مردوں سے تعلق کسی خود غرضی کے لئے تھا۔ اس لئے وہ ان ممتاز و مال دار مردوں سے کبھی نہ تو مرعوب ہوتی تھی اور نہ ہی متاثر۔

مس زینی نے ہمیشہ ہی اعلیٰ دماغ لوگوں کے درمیان زندگی کے شب و روز گزارے تھے مشہور اور مالدار گھرانوں میں خود کو پایا تھا۔

لیکن اس لمحے مس زینی نہایت ہیجان و انتشار میں مبتلا تھی۔ اس کا دل ان ہمدرد قسم کے لوگوں کے بیچ میں رہ کر بھی سکون، مسرت اور آسودگی سے خالی تھا۔

ریشم کے کروڑ پتی تاجر کھمبات والا نے مس زینی سے پوچھا۔

"مس زینی! یکایک آپ کو باہر گاؤں جانے کی ضرورت کیوں آپڑی . . . . . ؟"

مس زینی نے اس کروڑ پتی سیٹھ کے لہجہ کی غربت پر لعنت بھیجتے ہوئے مختصراً کہا۔

"میرا وہاں پہونچنا ضروری ہے ———"

فلم پروڈیوسر تاناشاہ نے ہمدردی سے کہا۔

"آپ کے جانے سے ہم لوگ تو سیریس ہو کر رہ جائیں گے ———"

مس زینی نے اکھڑے اور بے زار لہجہ میں جواب دیا۔

"میں خود بھی سیریس ہوں سیٹھ جی ——— !"

ادب کے بے تاج بادشاہ علی اکبر نے اپنی عادت کے مطابق فلسفیانہ انداز میں پوچھا۔

"محترمہ! حادثے ہماری زندگی کی تہوں کو اور بھی پختہ کر دیتے ہیں لیکن آپ متاثر ہیں۔ تو مجھے تعجب کرنا چاہیئے ———"

مس زینی نے اپنی سمجھ بوجھ سے اپنے ادبی رفیق کی بات کاٹی۔

"کچا یا پکا ——— عمل جب اپنی تکمیل کو پہونچ جاتا ہے تو خوشی کا سبب بن جاتا ہے۔"

مشہور لیڈر رجیونت لال جی نے بھی اظہار خیال کیا۔

"دو لاکھ برس پہلے بھی سمسیائیں کم نہ تھیں اب صورتیں بدل گئی ہیں، سمسیائیں موجود ہیں!"

"اور میں اس بدلی ہوئی صورت کو دیکھنے جا رہی ہوں ——— !!"

صحافی خواجہ غلام چھڑنے سنجیدگی سے اپنی بات کہی۔

"مس زینی دھرتی سے رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا، اسی لئے انسان کا انسان سے تعلق باقی ہے۔"

"لیکن پست و بلند، ذلیل و شریف، امیر و غریب جاہل و عاقل، حاکم و محکوم کا سمبندھ ابھی کمزور نہیں ہوا ہے ———"

مولانا ابوالفضل علامی مس زینی سے فرمایا۔

"کُلُّ نفسٍ ذائقۃُ الموت، ہر ذی روح کے لئے موت ہے ———"

"میں موت کو چھینک سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی ——— !"

اپنے مختصر سے سامان کو ایک مزدور کے سر پر رکھوا کر کار تک پہونچی۔ اور سب لوگوں کو سوالیہ نشان بنا ہوا چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی تھی ——— !

ایئر انڈیا میں سفر کرتے ہوئے مس زینی نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا: "مہذب ہو کر انسان کتنی خوشیوں سے محروم ہو جاتا ہے، کاش! میرے دوست مجھ سے یہ پوچھ سکتے کہ مس زینی تم نے شادی کیوں نہیں کی ——— ؟ کاش! وہ جان سکتے کہ میں اپنے گاؤں کی بوڑھی پلکھن کو دیکھ کر اپنے کون سے جذبوں کی تشفی کرنا چاہتی ہوں؟"

ایک گھنٹہ پچاس منٹ کے فضائی سفر میں بھی مس زینی اپنے ذہن میں ہی قید رہی۔ مختلف آوازوں جسموں، قوموں، لباسوں اور ذائقوں کو دیکھ اور چکھ کر بھی وہ خود کو گرسنہ اور تشنہ محسوس کرتی رہی تھی۔ انسانی ارتقاء سے سہمی ہوئی مس زینی بے چینی سے اس دھرتی کی طرف لوٹ رہی تھی جو ہزاروں برس سے اپنے آپ میں جی رہی تھی۔ اور ان کے ارد گرد رہنے والوں کی کہانیوں کو اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے لیٹی ہوئی تھی۔

گاؤں جاتے ہوئے مس زینی نے ڈیڑھ سو کلومیٹر کے سفر میں بھی کوئی مرد ایسا نہیں پایا، جو اس کے دکھ پر حیران ہوتا، اور اس کا شریک سفر بن سکتا۔ اس سے سیدھے لفظوں میں پوچھ سکتا: کیوں تم اس قدر سہمی ہوئی اور پریشان ہو؟ آخر تمہارا اس اکھڑی ہوئی بوڑھی پلکھن سے اب کیا واسطہ باقی ہے؟ مانا کہ وہ تمہارے خاندان کی بہت پرانی اور بچی کھچی نشانی تھی، تمہاری جانی پہچانی تھی۔ لیکن اب تو تم خود اپنے خاندان کی قابلِ قدر اور لائق فخر زندہ ہستی ہو ——— !!"

اپنے ذہن میں بکھرتی مس زینی جیسے تیسے کر کے اپنے گاؤں جا پہونچی تھی۔ لیکن وہاں بھی اس کا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی خاندانی اہمیت سمجھنے اور پرکھنے والا اس کی بڑائی، علم اور ترقی جاننے والا اور جتانے والا کوئی بھی تو نہ تھا ——— !

گاؤں کے نیم جاہل لوگوں کے درمیان وہ کھڑی ہوئی تھی ——— !

بوڑھی پلکھن نے گرتے گرتے زمین کے سینے پر اپنا نکیلا پنجہ اس طور پر مارا تھا جیسے دھرتی کا گریبان زبردستی پھاڑ دیا گیا ہے۔

"مس زینی نے پوچھا: جانتے ہو یہ پلکھن کتنی پرانی تھی ——— ؟"

گاؤں کے بوڑھے چودھری نے بتایا۔

"سنتے ہیں کوئی پیر جی تھے انھوں نے بوئی تھی یہ، سنتے ہیں ان کی اولاد گاؤں چھوڑ گئی۔ سنتے ہیں اب ان کے کٹم کے دوسرے دیش میں جا بسے ہیں ———"

اندر ہی اندر مس زینی چیخ کر رہ گئی۔ وہ آہستگی

سے بولی۔

"میں اسی کٹم کی ہوں ———"

گاؤں کے لوگوں نے اسے تعجب سے دیکھا۔ پھر کسی معمولی عورت نے پوچھا۔

"تو پھر بہنا! تمہارا گھر کدھر ہے ———؟"

مس زینی کو ان لوگوں سے باتیں کرنا اچھا لگا۔ سب کچھ بھلاکر اسی فضا اور لہجہ میں بتانے لگی۔

"وہ بڑا پھاٹک جو ڈھے گیا ہے ہمارا گھر تھا ———!"

"اس میں تو بھوت پریت رہواں ہیں۔" کوئی بوڑھی عورت بول اٹھی: "اس پلکھن پر تو ڈنڈر ہوئے تھا جو دھا ———!"

"اچھا ——— کیسے ہیں وہ ———؟" مس زینی نے پوچھا۔

"بوڑھی عورت بتانے لگی: "میرا سسر بتاوے تھا اس پلکھن کے نیچے دھن گڑا ہے۔ ہم نے اس کو کھودا، پر کچھ نہ نکلا، بس دو کھوپڑیاں نکلیں ———!"

"کہاں ہیں وہ ———" مس زینی نے پوچھا۔

"بوڑھی عورت بتانے لگی: "ہم نے دبا دیں اس کھتے میں، سب نے بتایا یہ تو پیر جی کے باوا نے دبوائی تھیں ———!"

"کیسے معلوم کہ انھوں نے دبوائی تھیں یہ کھوپڑیاں ———؟"

"بہنا! تم تو تڑ پڑ ہم سے ہی سوال جڑ رہی ہو، اب ہمیں کیا پتہ کون تھے پیر جی؟

اور ان کے باوا ———؟"

مس زینی نے اور کچھ نہ پوچھا۔ اسے پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس کے خاندانی شجرے تاریخ کے صفحات میں محفوظ تھے ایک اک مرد و زن کی حکایتیں اور کارنامے اور خوبیاں مورخ نے رقم کر دی تھیں وہ اس بوڑھی پلکھن کی تاریخ سے بھی واقف تھی۔ لیکن اس نے ان لوگوں کو کچھ نہ بتایا۔ چپ چاپ وہاں سے چلی آئی ———!

بوڑھی پلکھن ڈھے کر بھی مس زینی کے ذہن میں اُگی ہوئی تھی ———!

ریشم کے کروڑ پتی تاجر کھمبات والا نے اس سے پوچھا۔

"مس جینی آپ دیکھ آئیں اپنا گاؤں؟ وہاں کیا دیکھا آپ نے ———؟؟"

"بس ایک اکھڑی ہوئی پلکھیں ———!"

"یہ کیا ہوتی ہے ———؟"

"ہوتی تھی ——— اب نہیں، ایک سہارا تھی پچھلی یادوں کا، اب نہیں رہی ———!"

فلم پروڈیوسر تانا شاہ نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

"کیا ہوا؟ اس ایڈ و نچر پر تو فلم بنایا جا سکتا ہے ———؟"

"کام کرنے والے نہیں مل سکیں گے ———!" مس زینی نے کہا۔

"کیوں؟ ہم سپر اسٹار اس میں رکھیں گے ایک دم ہٹ فلم نکل آئے گا، ٹائٹل بھی نوا ہے بوڑھی پلکھن ———!"

ادب کے بے تاج بادشاہ علی اکبر نے مشورہ دیا۔

"اس پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا جا سکتا ہے یہ صنم کئی ہزار سال کی تاریخ، سیاست، ثقافت، مذہب اور سماج جنگ و قتال کو یکجا کرنے کا بہت مفید اور معلوماتی ذریعہ بھی ثابت ہوگا ——— کیوں کیا خیال ہے آپ کا مس زینی ———؟"

"لیکن اس پر ریسرچ ہو چکی ہے ———!"

مشہور لیڈر جیونت لال جی نے بھی اس دلچسپ گفتگو میں حصہ لیا۔

"اس پلکھن کی جگہ پر اپنے کسی پرسدھ پرکھے کا بت لگوا دیجئے!"

"گاؤں کے لوگ آدر کرنے کے بجائے اور بھی ڈر جائیں گے۔ سمجھتے ہیں اس پلکھن پر بھوت رہتا تھا جو دھا ———!"

صحافی خواجہ غلام چھرنے تجویز پیش کی۔

"اس پلکھن کی جگہ پر چوپال بنوا دی جائے، کو آپریٹیو بینک سے روپیہ لے کر۔ کمیونٹی ہال ٹائپ کا منڈپ بنوا دی جائے تاکہ باہمی میل ملاپ کو بڑھاوا مل سکے ———!"

"گاؤں میں امن ہے اب شہر کے لوگوں کو دیکھ کر چونکنا اور ڈرنا چھوڑ دیا ہے انھوں نے، منتریوں کے دوروں اور الیکشن کے ہنگاموں نے بھی لوگوں کو اپنی بات کہنے کا حوصلہ بخش دیا ہے"

مس زینی نے اپنے سفر کے تاثرات پیش کئے ———!

حضرت مولانا ابوالفضل علامی نے پیغمبروں کے حوالوں سے ثابت کیا۔

"خدا کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں ہے ———!"

"اسی لئے تو مقدس جگہوں پر اصطبل خانے بنوائے جا رہے ہیں" مس زینی نے حقیقت بیانی کر کے ماحول کو مکدر سا کر دیا تھا ———

"دس چوکا چالیس ——— اور ——— دس پنجے پچاس ———!!"

مس زینی کے کانوں میں قریب کے کمرہ سے کسی بچے کے پہاڑہ پڑھنے کی آواز پڑی تو وہ چونکی۔ وہ اس کے زیچ میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ پیچھے دیکھنے پر مجبور تھی۔ ایک شاندار خاندان کی عظیم الشان زندگی میں وہ پروان چڑھی تھی۔ جہاں ہر چیز کو کھلی آنکھوں اور روشن دماغی سے دیکھا جا رہا تھا۔ بغاوت اور انقلاب جس کے ضمیر و خمیر میں پلتا اور پنپتا اور پھوٹتا رہا تھا۔ خوب دولت اور خوب نام کمانے کے چکر میں زندگی کی بہت حقیر سی آواز کو وہ دبائے جی رہی تھی ———!

پڑوس کا بچہ بدستور "دس چوکا چالیس ———

اور ——— دس پنجے پچاس" کی گردان رٹے جا رہا تھا شاید وہ ان دو ہندسوں میں الجھتا اور اٹکتا رہا تھا اسی لئے بار بار دہرا رہا تھا۔ لیکن مس زینی کے لئے اس کا یہ عمل وبال جان اور اسکی روح کے لیے آزار بن رہا تھا۔ آج نہیں تو کل، وہ بڑھاپے کی دلدل میں پھنس جائے گی۔ اور اس کا انجام بھی شاید اس بوڑھی پلکھن کی طرح نہ ہو، جس کا ناطہ زمین سے ٹوٹ چکا ہے اور جس کے ڈھے جانے پر بھی کسی کو دکھ نہیں ہے، کیونکہ وہ جس طرح خود اس کے آغاز و انجام کے بارے میں واقف تھی۔ دوسرا کوئی بھی اس کے قریب رہ کر بھی اس سے آگاہ نہیں ہے۔ وہ چاہتی بھی نہیں کہ کوئی اس کے وجود سے بلند، اس کے ذہن سے اونچا، اس کی بڑائی سے ٹکراتا ہوا اس کے احساس پر اپنی خود غرضانہ محبت کا لبادہ اوڑھ کر اور اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر اسے ذلیل کرنے کی جرأت کر سکے۔

اسے یہ گوارہ ہوتا تو وہ کیوں اب تک خود کو مس زینی کہلوانا پسند کرتی؟ لیکن بچہ کی آواز ——— پھر اس کے وجود کے اندر کہیں بہت گہرائی میں ڈوب کر بھی ابھرتی رہی۔

مس زینی نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں۔ اب آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ لیکن جیسے اس کی روح بہت زور سے چیخ پڑی۔

"کاش ——— کاش! یہ بچہ میرا ہوتا ———!!"

(اردو مجلس دہلی کے نشر)

بقیہ :- وہ آدمی

لیکن صرف چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟۔

"مجھ سے شادی کرو گے ———؟" یہ سیدھا سا سوال کرونا نے مجھ سے کیا تھا، میرا اس سوال کے جواب میں کہ ——— "کیا یہ ممکن نہیں کہ تم واپس نہ جاؤ!؟"

"شادی ———؟" میری ابلتی ہوئی خواہشوں پر جیسے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا پڑ گیا ہو!

——— "لیکن رما کا کیا ہوگا ———؟"

"اُسے چھوڑ دینا ———!" کرونا نے جس لاپروائی سے یہ جملہ ادا کیا اسے دیکھ کر میں کانپ گیا!۔

"چھوڑ دوں ———!؟"

"ہاں ———!" کرونا کی لاپروائی برقرار تھی۔

——— "میں بھی تو اپنے پتی کو چھوڑ کر ہی یہاں رہ سکتی ہوں!"۔

"لیکن تمہارے پتی اور رما میں فرق ہے!" میں نے ایک کمزور دلیل کا سہارا لیا: ——— "انھیں کوئی دوسری عورت مل جائے گی لیکن رما کو دوسرا آدمی نہیں ملے گا ———!"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"مجھے معلوم ہے!"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم یہ برداشت کرنے کی شکتی نہیں رکھتے کہ رما کسی دوسرے آدمی سے جڑے!"

"ہو سکتا ہے ———!" میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"تو مجھے تم نے کیا رکھیل سمجھ رکھا ہے ———؟"

"کرونا ———! میرے منھ سے چیخ نکل گئی ——— شاید یہی وہ لمحہ تھا، جب میرا رُواں رُواں کہہ اٹھا تھا ——— "کھل جا سِم سِم ———!"

——— اور ——— غار کا دہانہ کھل گیا تھا!!

(گورکھپور سے)

ہم
بھارت کے لوگ

اپنی جمہوریہ کے محبوب آدرشوں

جمہوریت
سوشلزم
سیکولرزم
انصاف
آزادی
مساوات
اخوت
ہم آہنگی
اتحاد
سالمیت
امن اور
ترقی

کے علمبردار ہیں

ہم ہمیشہ ان پر قائم رہیں گے

davp 86/445

آپ کی رائے

اپنے ایک دوست کی وساطت سے آواز کا ۱۶ نومبر ۱۹۸۶ء کا شمارہ دیکھنے کو ملا۔ رسالہ دیکھ کر میں محو حیرت ہو گیا۔ اس گرانی کے دور میں صرف ایک روپیہ میں اتنا جاذب نظر اور دلکش رسالہ اور وہ بھی مواد سے پر میں فرط مسرت سے جھوم اٹھا۔ خدا آواز کو نظر بد سے بچائے۔ سرورق پُر معنی جاذب۔ دلکش حسین اور خوبصورت ہے۔ جیلانی بانو کی تخلیق "ردس کی یادیں" بہت ہی اچھے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان صاحب کا مضمون بھی بیحد عمدہ اور معیاری ہے اس بار گورکھپور سے غزلیں کافی معیاری شائع کی گئی ہیں۔ نفیس غازی پوری، سالک گورکھپوری اختر بستوی کے کلام نے مجھے بیحد متاثر کیا۔

افسانوی حصہ میں مجھے شاہد انور "چاند کی کہانی" میں بے حد پسند آئی۔ یہ کہانی اپنے اسلوب اور انوکھے طرز تحریر کی وجہ سے قاری کا ذہن فوراً اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاہد انور چاند افسانوی دنیا میں گو نو وارد ہی سہی مگر ان کا مستقبل بہت شاندار لگتا ہے۔ اجنبی اور آخری سفر نے بھی قاری پر اچھا اثر چھوڑا ہے۔

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا آواز کے تمام کارکنوں کو نئے سال کی مبارک باد قبول ہو۔

عبدالقدوس۔ بی۔ اے
تھانہ موڑ۔ جھریا۔ (دھنباد) بہار

میں "آواز" کا مطالعہ برابر کرتی رہتی ہوں مگر خط لکھنے کی جسارت میں نے کبھی نہیں کی۔ میں "آواز" اردو آسانی سے پڑھ تو لیتی ہوں مگر تمام مضامین کے متعلق اپنی رائے نہیں دے سکتی ہوں۔ کیونکہ میں نے ہندی لیکر بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی ہے۔ بہر حال آواز ۱۶ نومبر کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ مجھے شبنم نکہت صاحبہ کا یہ شعر بیحد اچھا لگا۔

ہے چراغوں سی داستاں اپنی
زندگی ہے دھواں دھواں اپنی

جیلانی بانو صاحبہ کی "ردس کی یادیں" اچھی لگیں۔ میں نے جب لکھنا سیکھا" ملک راج صراف کا مضمون بھی عمدہ لگا "نرملا" بھی انوکھا اور اچھوتا مضمون ہے۔ افسانوں میں مجھے شاہد انور "چاند کی کہانی" بہت اچھی معلوم ہوئی۔ چاند کے لکھنے کا اسٹائل نیا اور چونکا دینے والا ہے۔ انہیں میری جانب سے مبارکباد عرض کر دیں۔

آپ تمام لوگوں کو بھی نئے سال کی خوشی میں مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

ریحانہ جمال
حور بانو منزل، اولڈ ہزاری باغ روڈ
چونا بھٹہ کے نزدیک رانچی نمبر ۹

میں آواز کا پرانا شیدائی ہوں: "آواز" کا معیار اور مضامین کا انتخاب دیکھ کر بے اختیار مبارکباد دینے کو دل کر رہا ہے۔ اس جذبے کے تحت چند کلمات پیش خدمت ہیں۔

دسمبر ۸۶ء کے "آواز" میں شائع شدہ محمد لطیف احمد کا لکھا ہوا مقالہ "امراؤ جان ادا" پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اور کافی دلچسپ اور معلوماتی پایا لیکن مراسلے کے چوتھے پیراگراف میں دیگر ناول نگاروں کی مشہور طوائفوں کے شاندار اور لافانی کردار کی تعریف کرتے ہوئے مقالہ نگار نے جین آسٹین کی ایک مشہور کردار ایلنر بیتھ کو بھی طوائفوں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ جسے پڑھ کر کافی حیرت ہوئی جبکہ الزابیتھ جین آسٹین کی وہ خوددار اور عزت دار کردار ہے جس نے جین آسٹین کا نام ساری دنیا میں لافانی کر دیا ہے اسے کسی بھی حالت میں امراؤ جان یا دیگر مشہور طوائفوں کے کرداروں کے صف میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

الزابیتھ جین آسٹین کی مشہور ناول "پرائڈ اینڈ پریجڈیس" کی ہیروئن یا مرکزی کردار ہے۔ جس کے ارد گرد سارے کردار گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ بینٹ خاندان کی پانچ بہنوں میں دوسری بہن ہے جس کے اعلیٰ کردار اور حسن کی وجہ کر ڈارسی جو ہیرو ہے اور ناول کے آغاز کے کچھ چیپٹرس میں اپنی بے شمار دولت پر غرور دکھانے والا مغرور اور خوبصورت نوجوان بھی اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ پھر پتہ نہیں کہ مقالہ نگار نے جین آسٹین الزابیتھ کو طوائفوں کے صف میں کیسے کھڑا کر دیا جبکہ اس کا کہیں بھی اس طرح کا کردار نہیں ہے بلکہ اس کا کردار بالکل پاکیزہ ہے۔

محمد توحید
شعبہ انگریزی۔ مارکھم کالج آف کامرس
ہزاری باغ (بہار)

آواز کا شمارہ تازہ ۱۶ سے ۳۱ دسمبر کا زیر مطالعہ ہے اس شمارے کے واقعی تمام مضامین افسانے و منظومات قابل تعریف معلوماتی اور کار آمد ہیں۔ سب سے پہلا مضمون قرآن شریف میں قومی یک جہتی مولانا کبیر الدین صاحب کا کار آمد اور قابل مطالعہ ہے دوسرا مضمون اخلاق ایک بڑی نعمت ہے اور تیسرا مضمون اردو کا سیکولر کردار ایس ایل کالرہ صاحب کا بہترین اور معلوماتی مضمون ہے جس کے مطالعہ سے اردو زبان کو سیکولر ہونے کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے وہ بہت ہی اچھے انداز اور سچے الفاظ میں کیا ہے وہ قابل مبارک باد ہیں۔ جو بھی اردو جیسی زبان سے متعصب ہیں ان کا ذہن صاف ہو سکتا ہے۔ بہر حال اس شمارے کے سبھی افسانے اور مضامین قابل تعریف ہیں۔ خاص کر یہ مضمون "اخلاق ایک بڑی نعمت ہے" واقعی انسانوں کے لئے اخلاق نعمت اور دولت ہے جو انسانوں کے لئے بہت ضروری ہے جس کے سہارے انسان اپنی زندگی کے دن بہت ہی خوش خرم بتا سکتا ہے بہر حال مزاج گرامی بخیر ہو گا۔

سید زین العابدین
گوالا ٹولی۔ رانچی (بہار)

آواز کے ۱۶ دسمبر ۸۶ء کے شمارے کو دیکھ کر ایک بار پھر بے حد خوشی ہوئی کہ اسمیں "بھلائے نہ بنے" کا سلسلہ ساڑھے گیارہ ماہ بعد یعنی تیئس کرداروں کو پیش کرنے کے بعد ختم کر دیا گیا۔ کہہ نہیں سکتا "آواز" نے اس سلسلے کو بجا طور پر قارئین کی دلچسپی کا باعث نہ جان کر اپنے انتخاب مضامین کو نیا موڑ دیا یا "اردو سردس" نے ہی سامعین کو اس میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے دیکھ کر بند کر دیا۔ چاہے کسی نے بھی کیا ہو، خوب کیا۔ کیونکہ شہرۂ آفاق ناول، افسانے یا ڈرامے کے کسی بھی کردار کو چاہے وہ قاری کے ذہن پر کتنا ہی گہرا اثر چھوڑنے والا کیوں ہو۔ کسی بھی سامع یا قاری کو اس وقت تک متاثر نہیں کر سکتا جب تک سامع یا قاری اس کو پہلے سے اس ناول، افسانے یا ڈرامے کی دنیا میں چلتا نہ دیکھ چکا ہو جس سے وہ لیا گیا ہوتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جو تیئس کردار پیش کئے گئے انہیں انکی دنیاؤں میں بہت ہی کم سامع یا قاری دیکھ پائے ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے اب اس سلسلے کی جگہ ایک نیا سلسلہ بہ عنوان "شیشہ کا گھر" لے رہا ہے اس سلسلے کی پہلی کڑی سے ہی پتہ چل رہا کہ یہ ایک مستحسن اور حد درجہ کار آمد اقدام ہے نہ صرف ان جانے مانے تخلیق کاروں اور انکے تخلیقات کو بہتر سمجھنے کے لئے بلکہ ان نئے ابھرتے ہوئے تخلیق کاروں کی راہبری کے لئے بھی۔

یس۔ عمر شریف بنگلور

۱۶ دسمبر کا آواز نظر نواز ہوا۔ بہت اچھا ہے اور یکم جنوری کا بھی دیکھا بہت ہی پسند آیا۔ ۱۶ دسمبر والے میں مولانا کبیرالدین فاران کا "قرآن شریف میں قومی یکجہتی" بہت ہی پسند آیا۔ ان کو بھی مبارکباد۔ مسعود شمس صاحب کی غزل بہت اچھی لگی۔ خاص طور سے ؎

غم بن کے میرا مجھ سے وہ روز ہی ملتا ہے
تم بھول گئے کیسے تم نے بھی تو دیکھا ہے

اور بھی غزلیں اچھی تھیں۔

"مخدوم بی بی ہدیہ" بھی بہت اچھا تھا اور ہم نے سنا ہے کہ آپ آواز کو بند کر رہے ہیں۔ میرے خیال سے اسکو بند نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس کے ذریعہ بہت کچھ معلومات ہو جاتی ہے یہ اچھا رسالہ ہے اس کو جاری رکھنے کی کوشش کیجیے گا۔

سہیل الرحمان خاں
رائے پور والا بہٹ۔ سہارنپور

۱۶ دسمبر ۸۶ء کا شمارہ بہت پسند آیا جس کی خاص وجہ ہے۔ بہترین تقریریں۔ بہت ہی جاندار مضامین جو ہر اعتبار سے بھرپور ہیں پڑھکر بے ساختہ آپ کو اور تخلیق کاروں کو مبارکباد دینے کے لئے قلم میں حرکت ہونے لگی۔ ترقی پسند تحریک کے معمار نقاد میں ڈاکٹر محمد حسن نے کافی موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے ادب و زندگی کا بہت گہرا رشتہ ہوتا۔ ادب زندگی کو تبدیل کرتا ہے اور حال کو دکھاتے ہوئے وہ ماضی کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی اظہار کرتا ہے یعنی ادب معاشرے کو ماضی و حال کی تصویر دکھاتے ہوئے ایک نیا صحت مند راستہ بتانے کی کوشش کرتا ہے ادب فریم ہے اور معاشرہ تصویر، تصویر جیسی ہوگی فریم ویسا ہی نگاہوں کو لگتا ہے۔ فریم حسین ہوا ور تصویر بدشکل تو فریم کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔

اخلاق ایک بڑی نعمت ہے اس اعتبار سے پسند نہیں آیا کہ ثقیل الفاظ کا استعمال زیادہ تھا۔ ریڈیو پر آسان زبان میں مضامین ہونا چاہیئے تاکہ ہر طبقہ کا سامع بخوبی سمجھ سکے۔

اردو کا سیکولر کردار، صداقت در صداقت ہے۔ خواتین کی غزلیات میں چوڑیوں کا سمبل اچھا لگا۔ مسعودہ حیات صاحبہ کی غزل بڑی بحر میں ہے لیکن خوبصورت ہے۔ آپکی رائے کچھ قارئین بند کروانا چاہتے ہیں مگر آپ اسے ہرگز ہرگز مت بند کریئے گا قارئین کی رائے جان کر بھی بہت خوشی ہوتی ہے

شاہانہ نسرین
روز تقی۔ رامپور (یو پی)

نیشنل پروگرام

ایم ایس سوما سندرم کا گائن
ہفتہ ۷ر فروری رات ساڑھے نو بجے

کرناٹک موسیقی کے میدان میں ڈاکٹر ایم ایس سوما سندرم کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم ۱۵ سال تک سنگیتا کلا ندھی سوگر چتور سبرامنیا پلائی سے حاصل کی۔ کرتیوں اور پلویوں کی بخوبی اٹھان انکے فن کی انفرادی خصوصیت ہے اناملائی یونیورسٹی سے موسیقی میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے اس کے علاوہ متعدد خطابات اور اعزازات سے آپکو نوازہ جا چکا ہے۔ ان میں پدم شری، کلا ایمانی اہم ہیں وہ اپنے فن کا مظاہرہ ملک اور ملک سے باہر متعدد بار کر چکے ہیں۔

عاشق علی خاں : سارنگی
مہا پرش مشر : طبلہ
ہفتہ ۱۴ر فروری رات ساڑھے نو بجے

ہفتہ ۱۴ فروری کو رات ساڑھے نو بجے موسیقی کے نیشنل پروگرام میں آل انڈیا ریڈیو کے سامعین ماہر سارنگی نواز عاشق علی خاں کا سارنگی وادن اور مقبول طبلہ نواز مہا پرش مشر کا طبلہ وادن سنیں گے۔

منگل شب کی محفل موسیقی

پریم جین کا الیکٹرک گٹار وادن
۳ر فروری رات دس بجے

کانپور کے ایک تاجروں کے خاندان میں پریم جین نے جنم لیا۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم ملک کے مشہور سنگیت شاستریہ اچاریہ کیلاش چندر دیو برہسپتی سے حاصل کی۔ پریم جین اپنے فن کا مظاہرہ آزادانہ طور

پر اور اچاریہ جی کے ساتھ غیر ملکوں میں کر چکے ہیں آپنے اپنے گرو سورگیہ اچاریہ کی نگرانی میں "انگ رنگ" اور برہسپتی کلیان، راگوں کی ایجاد کی۔ آجکل آپ 'بچوں کی تعلیم میں سنگیت کا یوگدان' کے موضوع پر تحقیق اور بال گیت و سنگیت رچناؤں میں معروف ہیں۔

گوپا سانیال کا گائن
۱۰ر فروری رات دس بجے

خداداد شیریں آواز کی مالک گوپا سانیال نے موسیقی کی تعلیم سورگیہ بھن بالا گھوش سے حاصل کی

شریمتی سانیال ملک بھر میں موسیقی کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ انکی گائیکی کے انداز کی کامیابی ایسے ہے کہ موسیقی انہیں ورثے میں ملی ہے۔ شریمتی سانیال کو خیال گائیکی کو اسکے روایتی انداز میں پیش کرنے میں مہارت حاصل ہے۔

دور درشن

دہلی
چینل 4 تصویر 62.25 MHz
بینڈ 1 آواز 67.75 MHz

مسوری
چینل 10 تصویر 210.25 MHz
بینڈ 3 آواز 215.75 MHz

روزانہ ٹیلی کاسٹ ہونیوالے پروگرام

شام
۶-۰۰ افتتاحی اعلانات (سوائے اتوار)
۶-۵۵ پروگراموں کا خلاصہ اور گمشدہ افراد سے متعلق اعلانات (سوائے ہفتہ)
۷-۰۰ کرشی درشن (پیر، منگل، بدھ اور جمعہ)

نیشنل پروگرام

رات
۸-۴۰ سماچار (ہندی خبریں)
۹-۳۰ دی نیوز (انگریزی خبریں)
۱۱-۴۵ نیوز ہیڈلائن (ہفتہ کو ۱۲-۲۰ پر)

اسکول ٹیلی کاسٹ

پیر
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵
سائنس (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵
انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۱۰-۱۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

منگل
صبح
۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵
انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ کیمسٹری (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

بدھ
صبح
۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵
حساب (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ بائیلوجی (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور شام ۴-۴۵ سائنس (ساتویں جماعت)

جمعرات
صبح
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵
جغرافیہ (دسویں جماعت)
۱۰-۵۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ سائنس (چھٹی جماعت)

جمعہ
صبح
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵
فزکس (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ انگریزی کا سبق
(چھٹی جماعت)

یو جی سی پروگرام

دوپہر ۱۲-۴۵ اور شام ۴-۴۰
اعلیٰ تعلیمی پروگرام (روزانہ سوائے اتوار اور تعطیل)

• • • • •

دہلی I

اتوار
صبح
۹-۳۰ سرب سانجھی گوربانی/ پربھاتی
۹-۴۵ یوگ اور سواستھ
۱۰-۰۰ اپّو اور پپّو (ہندی سیریل)
۱۰-۳۰ بھجن مالا/ سگم سنگیت
۱۱-۰۰ اعلان کے مطابق
دوپہر
۱۲-۰۵ کھیل کھیل میں (ہندی سیریل)
۱۲-۳۵ اعلان کے مطابق
۱-۳۰ علاقائی زبان کی انعام یافتہ فیچر فلم
(I اتوار)
علاقائی زبان کی فیچر فلم
II III اور V
۴-۰۰ ورلڈ آف اسپورٹ
شام
۵-۴۵ اور ۷-۴۵ ہندی فیچر فلم
۷-۳۰ سنرکشن ابھیوگتا کا/ اندھی گلیاں
۹-۰۰ **کوئز ٹائم** (انگریزی)
۹-۵۰ **فوکس: حالات حاضرہ پر انگریزی پروگرام**
۱۰-۲۰ سائنس میگزین
۱۰-۵۰ کوی اور کویتا (اتوار II)
کسٹم اینڈ ٹریڈیشن آف انڈیا
(IV اتوار)
فوک اور اینڈ ٹریڈیشنل آرٹ
(اتوار I اور III)

پیر
شام
۶-۰۰ کھلاڑیوں کے لیے
۶-۱۵ بچوں کے لیے انگریزی فلم (سلسلے وار)
۶-۳۵ جان ہے جہان ہے (صحت سے متعلق)
۷-۳۰ سنسد سماچار/ سنگیت
۷-۴۰ ہندی ناٹک
۹-۰۰ **کبھی دور کبھی پاس** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **سچ کی پرچھائیں**
I اور III
چترمالا II اور IV
شام غزل V
۱۰-۲۰ **کرم چند** (ہندی سیریل)
۱۰-۴۵ **رقص کا نیشنل پروگرام/** I، II، III، V
بیلے (IV)

منگل
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ کھیل کھلاڑی
۶-۳۵ ہمارے کامگار، ہمارے ادیوگ
(II اور IV)
ہمارے ادھیکار اور کرتویہ
(I، III، V)
۷-۳۰ یوتھ فورم I III اور V
یووامنچ II اور IV
۸-۱۰ بزم (اردو ادبی میگزین)
۹-۰۰ **بنیاد** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **جن وانی** I، III
بیانڈ دو ٹمارو II اور IV
۱۰-۵۰ **ایکسپیڈیشن ٹو دی اینیمل کنگڈم**
(انگریزی سیریل)
۱۱-۰۰ **ٹوورڈس پروگریس/ پریورتن**

بدھ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ آنگن واڑی
۶-۳۵ وکاس کی اور
۷-۳۰ سنگیت
۷-۴۰ آپ اور ہم
(ناظرین کے خطوں کے جواب)
۸-۰۰ چترہار (ہندی فلموں سے رقص و گیت)
۹-۰۰ **مالگڈی ڈیز** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **رونگ آئی** I، III
حالات حاضرہ پر پروگرام
اے سورس ٹو لائف II، IV
۱۰-۲۰ پُردی؛ ہندی سیریل
۱۰-۴۵ پریمیر انسٹی ٹیوشنز آف انڈیا
(I، III اور V)
گریٹ ماسٹرز (II اور IV)

جمعرات
شام
۶-۰۰ دیہی بچوں/ دیہی نوجوانوں کے لیے
۶-۱۵ گھریلو نسخے
۶-۳۵ قانونی صلاح
۷-۰۰ رقص
۷-۱۵ وشو درشن
۷-۳۰ سگم سنگیت
۷-۴۰ پتریکا (ہندی ادبی میگزین)
۸-۰۰ باتوں باتوں میں
۸-۲۵ اکنامکس میڈ ایزی: انگریزی سیریل
۹-۰۰ **نقاب** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ **پرشن منچ** I
کیوسٹ II
اسپورٹس کیوز III
واٹ از دی گڈ ورڈ IV
ہیلتھ کوئز V
۱۰-۲۰ ٹوورڈز برائیٹ فیوچر/ انڈیا ان ویلڈ انگریزی پروگرام
۱۰-۴۵ **موسیقی کا نیشنل پروگرام**

جمعہ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (انگریزی)
۶-۱۵ آپ کا پریوار
۶-۳۵ سگم سنگیت/ اُپ شاستریہ سنگیت
۷-۳۰ سنگیت
۷-۴۰ گیان دیپ
۸-۰۰ چترہار
۹-۰۰ **یاترہ** (ہندی سیریل)
۹-۵۰ ڈانسز آف انڈیا/ ان سرچ آف سالوشنز
۱۰-۲۰ **ان دس آور لینڈ** III
اسٹیٹس آف دی یونین II اور IV
سپر ٹیمپر انسٹی ٹیوشن آف انڈیا I

ہفتہ
دوپہر
۱-۴۵ گھر باہر
۲-۱۵ یوتھ ٹائم/ یوتھ فورم
۲-۴۵ اعلان کے مطابق

ا کا شوانی لکھنؤ کی جانب سے گذشتہ دنوں رویندر آلیہ میں ہلکی کلاسیکی موسیقی کی ایک محفل کا انعقاد کیا گیا۔

ادپر) دھرم ناتھ مشرا اور
ویر بائیں) سوتیا دیوی کو گائن
یش کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔
بائیں) آکاشوانی نجیب آباد کے
اسٹیج میں ایک ناٹک کی صدا بندی
ں مصروف کچھ فنکار۔
نیچے بائیں) مزاحیہ اداکار اسرانی
کاشوانی احمد آباد بڑودہ سے
یک سندھی تقریر پیش کرتے ہوئے۔
نیچے)
حالیہ امتحان پالیسی کیسی ہو، کے
زیر عنوان آکاشوانی حیدر آباد
سے نشر ایک مذاکرے میں
دلیپ سنگھ، روی شنکر
مروج پانڈے اور چکرورتی۔

Regd. No. D-(C)39
R.N. No. 14253/57

PRICE : RUPEE 1.00

Awaz
1st. FEBRUARY 1987

Licensed (U-23) to post without prepayment at PSO, New Delhi.

کاوش حیدری

اجلال مجید

افتخار امام صدیقی (مائیک پر) اور
اقبال مجید (ناظم مشاعرہ)

عزیز اندوری

عبدالحئی انجم

فضا ابن فیضی

بشر مہبانی

حمید الماس

اکاشوانی بھوپال
کی جانب سے

گذشتہ دنوں منعقد

مشاعرے کی جھلکیاں

Published by the Director General, All India Radio, at the Office of the Chief Editor, Akashvani Group of Journals, PTI Building, II floor, Sansad Marg, New Delhi-110001.
Printed by the Manager, Govt. of India Photo Litho Press, Faridabad.

یکم سے ۱۵ مارچ ۱۹۸۷ء
۱۱ سے ۲۵ پھاگن ۱۹۰۸ شاکا

آدرش

اشاعت کا ۵۲ واں سال
قیمت ایک روپیہ

آل انڈیا ریڈیو و دوردرشن کے پروگرام، معلوماتی مضامین، دلچسپ افسانے و منظومات

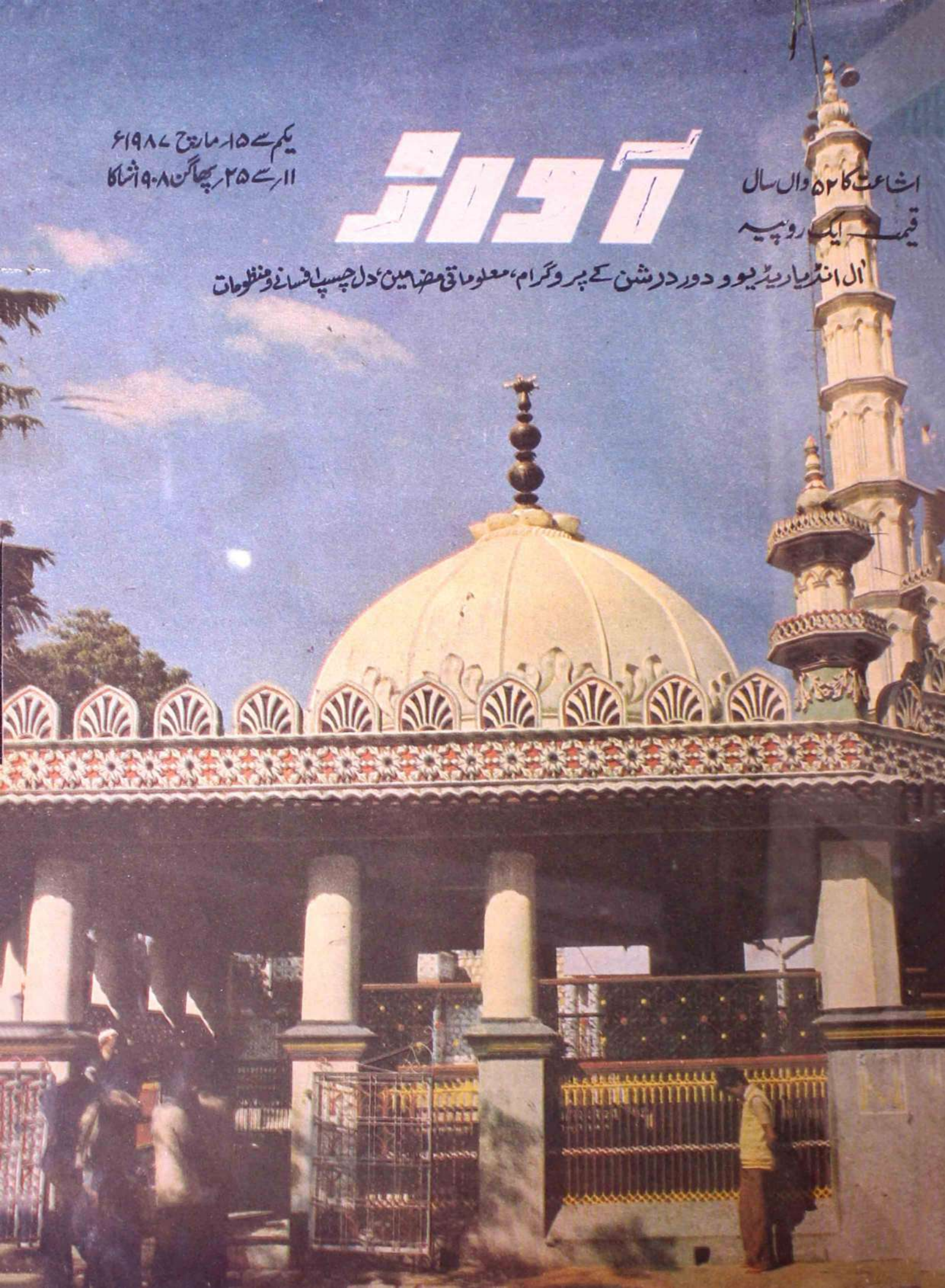

اس بار ناگپور سے غزلیں

اقبال خلش

کرلے جو عزم سعیٔ مکرر کا آدمی
محتاج کیوں رہے گا مقدر کا آدمی

اپنی انا کو ٹھیس نہ پہنچا سکوں گا میں
جو نکلائے گا مجھے مرے اندر کا آدمی

گو زندگی ہے میری بڑی صبر آزما
اُف کیوں کروں کہ میں بھی ہوں پتھر کا آدمی

الفاظ دل کا خون بھی کرتے ہیں بارہا
باتوں سے کام لیتا ہے خنجر کا آدمی

جھلا کے آپ اپنے ہی سائے سے لڑ پڑا
کوئی رہا نہ جب مری ٹکّر کا آدمی

دشمن نہ جانتے مری کمزوریاں خلش
مخبر اگر نہ ہوتا کوئی گھر کا آدمی

ضیا انصاری

بے تعلق میں تھا لیکن مجھ کو الجھایا گیا
نوٹ بک پر اس کی میرا نام لکھوایا گیا

ایک خواہش تھی ہوا کے دل میں سو پوری ہوئی
پھول کب مہکا تھا یوں جیسے کہ مہکایا گیا

میں ہی پہلا حادثہ تھا زندگی کا اس کے بعد
حادثہ جو بھی ہوا مجھ کو ہی دہرایا گیا

ڈھونڈتا پھرتا تھا جس کو پھر نہ آیا ان کے ہاتھ
جس جگہ بھی گم ہوا میں کب وہاں پایا گیا

مجھ کو تڑپاتے تھے پہلے لوگ جس کے نام سے
آج اسی کا نام لے کر مجھ کو بہلایا گیا

شور تھا کمرے میں یخ بستہ ہواؤں کا ضیاؔ
میرے آنگن سے لرزتا کانپتا سایا گیا

شارق جمال

اے زلیخا! مجھ پہ کوئی قہر سلطانی نہ تھا
میں وہ یوسف تھا، کسی صورت جو زندانی نہ تھا

جس کا کوئی وادیٔ کشمیر میں ثانی نہ تھا
وہ مِرا ساتھی رہینِ دستِ انسانی نہ تھا

اس نے توڑے سنگ، ٹوٹے مجھ پہ دنیا کے ستم
ہاں کسی پہلو مِرا فرہاد بھی ثانی نہ تھا

بچ گئی کشتی کمال ناخدا کہئے اِسے
کم کسی لمحہ بھی زورِ موجِ طغیانی نہ تھا

مطمئن تھے جس کے سائے میں گنہگارانِ دہر
ابر کا وہ ایک ٹکڑا ظلّ سبحانی نہ تھا

میں نہ دوڑا العطش کہتا ہوا دریا کی سمت
تھا مِرا خالی گلاس اک بوند بھی پانی نہ تھا

اہلِ بیعت جس کے گرد اگرد تھے پروانہ وار
اس فقیرِ شہر کو شوقِ جہاں بانی نہ تھا

کیوں کوئی قاری ہوا حامل نہ اس کے فہم کا
شعر تھا مری غزل کا حرفِ قرآنی نہ تھا

تذکروں کی شکل میں شارقؔ نے پائی زندگی
یہ وہ شاعر تھا جو بعدِ مرگ بھی فانی نہ تھا

محفوظ اثر

عیب لوگوں کے مت کھروچ ابھی
اپنے بارے میں صرف سوچ ابھی

تیری باتوں میں ہے غرور بہت
اپنی آواز کو دبوچ ابھی

ذہن روشن ابھی نہیں تیرا
ذہن سے تیرگی کو نوچ ابھی

پیڑ کی پختگی پہ ناز نہ کر
ٹہنیوں میں بہت ہے لوچ ابھی

اے اثرؔ جادۂ مسافت میں
دور منزل ہے یہ نہ سوچ ابھی

جہانگیر جوہر

ادھ کھلی کلیوں کو، چشمِ نیم وا کہنے لگے
گُل کے مرجھانے کو، اندازِ حیا کہنے لگے

ہوگئی جن سے وفا رخصت، مثالِ بوئے گل
کیا غضب ہے لوگ ان کو باوفا کہنے لگے

بات کچھ تو ہوگی آخر، کس لیے اہلِ جہاں
آج ظلمِ ناروا کو بھی روا کہنے لگے

نہ تو کوئی چوٹ کھائی نہ جلایا دل کبھی
وہ بھی اپنی آہ کو، آہِ رسا کہنے لگے

ابنِ آدم کا لہو تھا، جانتے بوالہوس
وائے جبرِ مصلحت، رنگِ حنا کہنے لگے

ہم میں حق گوئی کے جوہر تھے، زمانہ ہوگیا
... اکاروں کو بھی ہم بے ریا کہنے لگے

کلیم کاشف

یہ اہلِ دل کو ڈسے گی سنبھالتے رہنا
تم اپنے دوش پہ گیسو نہ ڈالتے رہنا

میں چاہتا ہوں کہ تم پہلے میری بات سنو
پھر اختلاف کے پہلو نکالتے رہنا

رُکے جب اشک تو دردِ جگر نے لی کروٹ
تیرے فراق میں کس کس کو ٹالتے رہنا

ضرور گوہرِ نایاب ہاتھ آئے گا
سمندروں کی تہوں کو کھنگالتے رہنا

کہو یہ ہم نفسو! کونسی شرافت ہے
کسی غریب کی پگڑی اچھالتے رہنا

اندھیری رات ہے چپکے سے پی کے چل زاہد
نہ صبح تک یونہی ساغر اچھالتے رہنا

بھٹک نہ جاؤں کہیں راستہ ہے انجانا
خیالِ یار مجھے تو سنبھالتے رہنا

یہ التماس ہے تم سے تمہارے کاشف کی
گنہگارِ وفا ہے سنبھالتے رہنا

تابش حلیمی

جس قدر خونِ تمنا سے تو روتا جائے گا
گلستانِ دل ترا رنگین ہوتا جائے گا

اجنبی کو تم نہ تنہا کر سکوگے اب وداع
جانے والا گاؤں کی رونق بھی ڈھوتا جائے گا

شاخ کے پنجوں کی پڑتی جائے گی ڈھیلی گرفت
پتہ پتہ خود رہا اک روز ہوتا جائے گا

دل شکن خط کے ستارے ماند پڑتے جائینگے
اشکِ غم تحریر میں موتی پروتا جائے گا

آنسوؤں کو پونچھ کر تم نے لگا دی اور آگ
اپنی منزل تک مسافر اب تو روتا جائے گا

وقت آنسو بھی نچوڑے گا جہاں کی آنکھ سے
رفتہ رفتہ یہ جزیرہ خشک ہوتا جائے گا

آنے والے گاؤں سے پھر جا بسیں گے گاؤں میں
شہر کو تابشؔ اگر دریا ڈبوتا جائے گا

آواز

آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام

جلد ۵۲ | شمارہ ۵

یکم مارچ ۱۹۸۷ء بمطابق ۱۰ پھاگن ۱۹۰۸ شاکا

		ٹیلی فون
چیف ایڈیٹر	ایس کے سندر	۳۸۲۲۴۹
ادارت	سراج احمد	۳۸۲۲۵۴
	ہر مہندر سنگھ وج	
اسسٹنٹ بزنس منیجر :	جگدیش پرساد	۳۸۲۳۵۱

اس شمارے میں

سیرت حضرت علی ——— ناصر زیدی ——— ۳
شیشے کا گھر ——— بلراج کومل ——— ۵
بہادر شاہ ظفر ——— صباح الدین عمر ——— ۶
کرشن چندر ——— یوتی سرن شرما ——— ۸
بہار شریف ——— عبدالصمد ——— ۹
فرقہ واریت اور خواتین ——— شاکرہ بیگم ——— ۱۰
تحقیق اور تنقید میں بنیادی فرق ——— پروفیسر محمود الٰہی ——— ۱۲
بھکتی پر فلمیں ——— احمد سلطان ——— ۱۳
روزمرہ زندگی میں کیمیا کی اہمیت ——— میر معظم علی ——— ۱۴
ضدی بچوں کی اصلاح ——— سلطانہ جلیل قدوائی ——— ۱۶
نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ——— ڈاکٹر ریحان غنی ——— ۱۷
عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار ——— نجمہ بانو حسن ——— ۱۸
آخر کیوں مر نہ جانے کی آرزو ہے ——— ایڈلین روحی ——— ۱۹
پائپ ——— دیویندر اِسر ——— ۲۱
خزاں کے بعد ——— شفق ——— ۲۲
ایک مٹھی تم ——— مشتاق احمد نوری ——— ۲۴
محبوبہ ——— بتول سجاد ——— ۲۶

غزلیات

جوہر ہاشمی ——— ۶
نفیس غازی پوری ——— ۹
منظر بھوپالی ——— ۱۱
فرید تنویر ——— ۱۵
قرار ——— ۲۳

قیمت

فی پرچہ ——— ایک روپیہ
سالانہ ——— ۲۲ روپے
دو سال ——— ۴۲ روپے

ادائیگی بذریعہ چیک / پوسٹل آرڈر / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، بنام: چیف ایڈیٹر آواز شوال گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو، ٹھوکر پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Telegram: 'LISTENER' New Delhi

(ایک سال سے کم کا چندہ قابل قبول نہیں ہوگا)

اندرون ملک ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

سیرت حضرت علی

ناصر زیدی

آسمانی کتاب "انجیل مقدس" میں یہ جملہ ہے کہ "اے لوگو! ان راستوں سے نہ جاؤ جن پر چلنے والوں کی کثرت ہے بلکہ ان راستوں کو اختیار کرو جن پر چلنے والے کم ہیں"!

گویا دنیا میں بزرگی اور عظمت کے طلبگار لوگوں کو اپنے لئے وہ راستہ اختیار کرنا چاہیئے جو عام راہ سے مختلف ہے تبلید اس لئے کہ منزل کمال کا حصول ان انسانوں سے وابستہ ہے جنھوں نے خود اپنے لئے اپنی راہیں معین کی ہیں اور ان راستوں کا انتخاب نہیں کیا جن پر عوام الناس کی بھیڑ رواں دواں ہے۔ اور جہاں ہمیشہ دوسرے ان کے لئے سوچتے اور فیصلہ کرتے ہیں چنانچہ ایک زمانہ تھا کہ علمائے قسطنطنیہ اس اصول کی پیروی میں کبھی شاہراہوں سے نہیں گذرے تھے بلکہ گلی کوچوں کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ عام ذہنوں کے لئے یہ ایک عجیب سی حرکت معلوم ہوتی تھی لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی ایک سچائی ایک گہرائی، ایک عظمت، ایک فکر، ایک گفتگو، ایک سوچ، ان ذہنوں میں کتنی مضحکہ خیز بن جاتی ہے جو اس کے سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے۔

امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ، کی ذات گرامی ایسی ہی عظیم ہستیوں میں سے ایک ہے، بلکہ پیغمبرؐ اسلام کے ماسوا عالمِ انسانیت کی وہ عظیم ترین ہستی ہے جو ایک خاص ہدایت پر مامور ہے اور جو کل سے زیادہ آج انجانا اور اجنبی ہے۔ کاش انجانا اور اجنبی ہی ہوتا تو غنیمت تھا۔ مگر آج کی فکر کی انتہائی پست منزلوں نے اسے چھونے کی کوشش کی ہے۔ کاش اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو بہتر تھا۔ محقق نے علی کو میدانِ جنگ میں ایک ماہر شمشیر زن، حدودِ شہر میں نہایت حساس اور پر عمل سیاستداں اور گھریلو زندگی میں انتہائی شفیق مہرباں اور منظم فرد کی حیثیت سے دیکھا، جبکہ علیؑ زندگی کے تمام شعبوں میں ایک بھرپور اور مکمل انسان کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اکثر آپؑ نصف شب میں لوگوں کی نگاہوں سے چھپ کر اطراف مدینہ کے نخلستانوں میں جاتے اور کنوئیں کے دہانے پر اپنا سر رکھ کر فریاد کیا کرتے تھے۔ آپ کی فریاد کا باعث وہ رنج والم ہرگز نہیں تھا جو آپؑ کو عرب قوم، مدینے کے افراد اور اپنے گرد و پیش کے ماحول سے پہونچا تھا بلکہ علیؑ کا درد و کرب اور رنج والم اس سے بھی کہیں سوا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اس عالم کا اسیر پاتے تھے۔ یہ تنگ اور کم مایہ دنیا ان کی تکامل طلب روح کی راہ میں حائل تھی۔ وہ یہاں ایک گھٹن محسوس کرتے تھے۔ یقیناً علیؑ کی ذاتِ گرامی ہر انسان سے بڑھ کر ان بلند پایہ ضرورتوں کو محسوس کرتی تھی جو اس عالم وجود میں ناپید ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس دنیا میں سب سے زیادہ بیگانہ محسوس کرتے تھے اور اس درجہ احساس بیگانگی کے سبب انھیں اس عالم میں سب سے زیادہ صدائے فریاد بلند کرنا تھا اور غم کی اس انتہا نے اس آسمانی ہستی کو کمال شدت سے اس طرح کی فریاد پر مجبور کر دیا۔

دنیا کے دیگر مفکرین جو اس حقیقت سے نا آشنا رہے، تنگ آکر اسی عالم آب و گل کو سب کچھ سمجھ بیٹھے اور اپنی تمام تر مفکرانہ اور فلسفیانہ زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا کہ انسان اپنے آپ کو یہاں اور صرف یہاں کی زندگی سے وابستہ رکھے۔ سارتر نے اپنی تمام فلسفی تحریروں میں اس عقیدہ کا اظہار کیا ہے کہ انسان اور عالم وجود سے متعلق جملہ حقائق مادّے کی پیداوار ہیں۔ اس کا سارا فلسفہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ انسان اور اس عالم مادّہ کے سوا اور کچھ نہیں، جو کچھ ہے یہی ہے اور یہیں ہے، مگر ایسا نظریہ رکھنے والا بھی غیر شعوری طور پر ایک کرب اور اضطراب میں مبتلا نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کو استغراغ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک یہ کائنات پست، خادم اور احمق ہے لیکن اسے ایسا کہنے کا استحقاق نہیں۔ یہ تو وہی کہہ سکتا ہے جو اس دنیا کے علاوہ کسی اور دنیا کو اس سے زیادہ اعلیٰ، ارفع اور اقدس جانتا ہو اور ایسی مقدس ذات علی بن ابی طالب کی ہے۔ انسانی فطرت کو ایسی گرانقدر عظیم ہستی کی ہر دور میں تلاش رہی اور یہی خواہش رہی کہ زیبائی و تقدس، محبت و شہامت، سخن پردازی و فداکاری کے مختلف بکھرے ہوئے نمونے سمٹ کر ایک ہو جائیں، اس لئے کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے اعلیٰ پاکیزہ اور مطلق نمونوں کی ضرورت ہے جسے وہ زندگی کی راہوں میں ہمیشہ پیش نظر رکھے اور ان سے اپنی روح میں بالیدگی محسوس کرے۔

بشری فطرت اپنی تلاش میں اس وقت منزل مقصود کو پہونچی جب انسانوں کے لئے ارض مقدس پر بنائے گئے سب سے پہلے گھر کے اندر فاطمہ بنت اسد کی آغوش میں ہاشمی خاندان کا چشم و چراغ، عمران کا فرزند، حضور اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قوت بازو و مصداق حدیث أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ رجل کرار، غیر فرار، شہ لافتیٰ شیر خدا، ابوتراب، داماد رسالتمآب، سید الوصیین، امیرالمومنین غالب کل غالب حضرت علی بن ابی طالب علیہما الصلوٰۃ والسلام منصۂ شہود میں آئے۔ دنیا کا یہ پہلا اور آخری حیرت انگیز اور تعجب خیز واقعہ ہے کہ کسی معبد میں کسی بچے کی ولادت ہوئی ہے

علیؑ کو حق نے اتارا تو عین کعبہ میں
کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا

کیا کہنا اس ذات گرامی کا جس کے لئے وہ بیت الحرام زچہ خانہ بنایا گیا۔ جو عظمت و شرف کے علاوہ صفحۂ ہستی پر اپنی اولیت کی بھی سند رکھتا ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ؕ بے شک روئے زمین پر انسان کے لئے سب سے پہلا عبادت خانہ مکہ معظمہ میں بنایا گیا۔ جو سارے جہان کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا أَنَا وَ عَلِيٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ میں اور علیؑ دونوں ایک ہی نور سے ہیں

اے نور کے پتلے! تجھے کیا خاک سے نسبت
احسان ترا ہے جو زمیں پر اتر آیا

اس نور کے ٹکڑے کی سیرت دوسروں کے لئے ایسی راہیں پیدا کرتی ہے جن پر وہی چلتے ہیں جنھوں نے پیغمبر اسلام کی تعلیمات کا صدق دل سے مطالعہ کیا ہے۔ علیؑ کی سیرت کو ہم تاریخ کے آئینہ میں دیکھیں یا مرسل اعظم کی احادیث میں تلاش کریں۔ دونوں ہی میں اسلامی تقدس و زیبائی کا جلوہ نظر آتا ہے اور ایک ایسی عظیم ہستی دکھائی دیتی ہے جو ان تمام اعلیٰ اور مطلق عظمتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو روئے زمین پر ایک انسان میں نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کا نطق اور استعداد گفتگو اس درجہ بلند، خوبصورت، دلآویز اور دلنشیں ہے کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ غور کیجئے تو کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ذات متناقض نمونوں کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ ایک طرف مرد سخن ہے تو دوسری طرف مرد شمشیر۔ جنگ کے میدان میں علیؑ کی تلوار، ان کی شجاعت، طاقت، حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کرتی ہے تو سماجی زندگی میں ایک یتیم کے مقابل انتہائی ضعیف، کمزور، ناتواں، لرزاں اور پریشاں خاطر نظر آتے ہیں۔ میدان رزم میں دشمن کے ساتھ اتنا سخت رویہ ہے کہ وہاں آپ کی ذات سرتاپا مظہر خشونت ہے۔ آپ کی ذوالفقار خونریزی و تباہی کی آئینہ دار ہے اور بزم میں آپ سے زیادہ صابر اور عفو و درگذر کرنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

مرسل اعظم نے علی بن ابی طالب کو ہر موقع پر مختلف حیثیتوں سے متعارف فرمایا اور بعض ایسی ذمہ داریاں بھی سپرد کیں جن پر آج تک تاریخ انگشت بدنداں ہے بیشک

ذات حیدر کو کوئی کیا جانے
یا نبیؐ جانے یا خدا جانے

آنحضرتؐ فرماتے ہیں عَلِيٌّ مِنِّيْ وَ اَنَا مِنْهُ علیؑ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ حُبُّ عَلِيٍّ اِيْمَانٌ وَ بُغْضُهٗ كُفْرٌ علیؑ کی محبت ایمان ہے اور اس کا بغض کفر ہے۔ اَلنَّظَرُ اِلٰى عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ عِبَادَةٌ وَذِكْرُهٗ عِبَادَةٌ علی بن ابی طالب کی طرف دیکھنا عبادت ہے اور ان کا تذکرہ کرنا بھی عبادت ہے۔

انتہا یہ دیکھئے کہ حضور سرور کائنات فخر موجودات فرماتے ہیں "زینوا مجالسکم بذکر علی بن ابی طالب اپنی نشستوں کو علیؑ ابن ابی طالب کے تذکرے سے زینت بخشو۔" یقیناً اس حکم کے پس پردہ یہ راز مضمر نظر آتا ہے کہ علیؑ کی ذات جامع صفات کے سیرت اور کردار۔ جو بنی نوع انسان کی زندگی کے ہر شعبہ کی تمامتر خوبیوں اور کمالات کاملہ کا مظہر ہے اس کے تذکرہ سے ہماری کردار سازی ہوتی ہے اور سیرت سنورتی ہے۔ لیکن اس فہم و ادراک کے لئے ایسے اذہان کی ضرورت ہے جو صالح اور حق پسند ہوں ایسی صالح اور حق پسند مقدس ہستیاں جنھوں نے معرفت وحق شناسی کے بعد ہی مولائے کائنات علی ابن ابی طالب کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار فرمایا ہے۔ ان میں سے چند کے افکار ملاحظ ہوں۔

خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین چشتی فرماتے ہیں

اوصاف علیؑ بہ گفتگو ممکن نیست
گنجائش بحر در سبو ممکن نیست

علیؑ کے صفات کا الفاظ میں بیان ممکن ہی نہیں ہے۔ جیسے پیالے میں سمندر کا سمانا ممکن نہیں ہے۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "بحر المعانی" کی ایک عبارت کا ملخص ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اگر میں علیؑ مرتضےٰ کے مناقب کا ایک کرشمہ ظاہر کروں تو آفتاب کا جمال بالکل محو ہو جائے اور جو کچھ میں نے آنجناب سے مشاہدہ کیا ہے اگر اس کو بیان کروں تو آدمؑ سے عیسیٰؑ بن مریم تک تمام انبیاء کی نبوت کا خاندان اسی جناب سے خیال کرے۔"

امیر المومنین علیؑ بن ابیطالب کے اخلاص اوصاف میں ان کی سیرت کے اعتبار سے بلند ہی نہیں بلکہ سیرت نے اس ستودہ صفات ہستی سے جلا پائی اور سر بلندی حاصل کی۔ علیؑ ایک عدیم المثال شخصیت کے مالک ہیں۔

ایک مرد کامل کے لئے جو صفات لازم ہیں۔ وہ علیؑ کی ذات گرامی میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، چنانچہ ایسی کوئی بھی اعلیٰ صفت نہیں ہے جو انسان کے لئے لازم ہو اور علیؑ میں نہیں پائی جاتی ہو۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے روح اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء و رسل کے اوصاف میں علیؑ برابر کے شریک ہیں۔ جس کے ثبوت میں سید المرسلین، رحمۃ للعالمین، رسول خدا حضرت محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ والثنا کی ایک حدیث شریف کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"جو شخص دیکھنا چاہتا ہے آدمؑ کو ان کے علم میں، نوحؑ کو ان کے فہم میں، ابراہیمؑ کو ان کی خلت میں، موسیٰؑ کو ان کی مناجات میں، داؤدؑ کو انکی قوت میں، سلیمانؑ کو ان کی ہیبت میں، یوسفؑ کو ان کے جمال میں، ایوبؑ کو ان کے صبر میں، یحییٰؑ کو ان کے طریقہ میں، تو اسے علیؑ بن ابیطالب کی طرف دیکھنا چاہئے اس لئے کہ اللہ نے ان میں انبیاء کے خصائل میں سے نوے خصلتیں جمع کر دی ہیں اور ان کے علاوہ کسی میں بھی اکٹھا نہیں کی ہیں۔"

بس یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے علیؑ کے ذکر کو مسلمانوں کی نشستوں اور جلسوں کی زینت قرار دیا اور فرمایا ذِكْرُ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ علیؑ کا تذکرہ عبادت ہے۔

تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ مرسل اعظم کو جب "اقرأ" کا حکم آیا اور آنحضرتؐ نے تبلیغ کا آغاز کیا تو ہر منزل پر آپ کے معاون و مددگار رہے۔ دعوت ذوالعشیرہ کی منزل میں جب فرزند عبداللہ کی طرف سے نصرت کا تقاضا کیا گیا تو وعدۂ نصرت علیؑ نے ہی کیا تھا۔ اس طرح دونوں بھائیوں نے دین کی خدمت کے لئے ملکر قدم بڑھائے اور علیؑ کا وعدۂ نصرت اس امر کا معاہدہ تھا۔ "یا رسول اللہ! قرآن کی تلاوت آپ فرمائیں گے، تفسیر میں بتاؤں گا۔ جہاد کا حکم آپ دیں گے، تلوار سے جہاد کر کے میں دکھاؤں گا۔ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت آپ کریں گے۔ آپ کے پاس موجود امانتوں کو ان کے حقداروں تک میں پہنچاؤں گا۔ شب ہجرت بستر آپ کا ہوگا، آپ کے بستر پر نفس رسول بن کر میں سوؤں گا۔ خانۂ خدا کو آذر کے فن سے پاک کرنے کا حکم آپ دیں گے، آذری خداؤں کو میں مسمار کروں گا۔ شب معراج عرش علی کی طرف آپ جائیں گے، زمین پر رہ کر لشکر اسلام کی حفاظت میں کروں گا۔ صاحب کوثر آپ ہوں گے، ساقی کوثر میں ہوں گا۔ خیبر کی فتح کا وعدہ آپ فرمائیں گے، فتح میں کروں گا۔ ترویج اسلام کے لئے کوشش آپ کریں گے، آپ کی کوششوں کی حفاظت میں کروں گا۔ حق کی اشاعت آپ فرمائیں گے باطل کی کمر میں توڑوں گا۔" اس طرح یہ دونوں ذوات مقدسہ قدرت کا عظیم شاہکار، رفعت انسانی کی بلند ترین مثال اور کرامت انسانی کے لئے جد و جہد کا بے نظیر عملی نمونہ ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے روشن آثار موجود ہیں۔ نہ محمدؐ علیؑ سے جدا ہیں اور نہ علیؑ محمدؐ سے جدا ہیں۔ اس اعتبار سے علیؑ نے جو کچھ حاصل کیا وہ سب اپنے آقا اور مولا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کیا اور علیؑ کی سیرت وہی ہے جو پیغمبر اسلام کی سیرت ہے۔ (پٹنہ سے نشر)

شیشے کا گھر

بلراج کومل

میں شاعر ہوں، میں فنکار ہوں، میں تخلیق کار ہوں، یہ اعلان —— بظاہر بے ضرر اعلان ..... ایک سلسلے کا نقطۂ آغاز ہے۔ مجھ پر جب پہلے پہل یہ انکشاف ہوا کہ میں شاعر ہوں اور میں نے اس غیر معمولی انکشاف کا اعلان اپنے قریب کے لوگوں اور دوستوں میں کیا تو ایک قہقہہ —— ایک خطرناک دھماکہ میرے چاروں طرف فضا میں معلق ہو گیا۔

یہ قہقہہ بظاہر آواز کا اعجاز تھا لیکن عجیب اتفاق تھا کہ مجھے اس قہقہے میں بھری کیفیات کا احساس ہوا۔ سراسر غیر ہمدردانہ مخاصمانہ کیفیات کا۔ ہکسلے فنکار کو ابلیس کے قبیلے کا فرد سمجھتا ہے۔ مجھے یکایک یہ احساس ہوا کہ میں روزمرہ زندگی کے فطری معمول سے ہٹ کر ایک ایسی راہ گذر پر آ گیا ہوں جہاں ہر موڑ پر مجھے خاک و خون کے منظر سے گذرنا پڑے گا۔ یہ ۱۹۴۷ کے دن تھے۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔

فضا میں خون کا ذائقہ تھا اور میری عمر صرف ۱۹ برس تھی۔ اس بات کا تو مجھے یقین تھا کہ میں ابلیس کے قبیلے کا فرد نہیں ہوں لیکن آغاز سفر میں مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر میں ابلیس کے قبیلے کے فرد کا فرد نہیں ہوں تو طے شدہ انداز میں کس نام کے اور کونسے قبیلے کا فرد ہوں۔ یہ دور طلوع آزادی کا دور تھا۔ ہزارہا متضاد تصادموں کا دور تھا اور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ یہ دور فیض کی زبان میں، داغ داغ اجالے کا دور تھا۔ میں اس داغ داغ اجالے کی چلمنوں سے روشنی کے نقطے حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۹۵۴ میں جب میرا پہلا مجموعہ کلام میری نظمیں شائع ہوا تو صورت حال کسی قدر مستحکم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۸ اور ۱۹۵۴ کے درمیانی وقفے میں ادیبوں اور شاعروں کو بہر حال دو خانوں میں تقسیم کرنے کا دستور زیر عمل تھا۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند عمل احتساب کے تحت کچھ اہم ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو واقعتاً غیر ترقی پسند قرار دیا گیا۔ میں چونکہ ابھی بقول راوی آغاز سفر کے مراحل میں تھا اس لئے مجھے صرف مفید مشوروں سے سرفراز کیا تھا۔ میرے ایک کرم فرمانے ۱۹۴۸ اور ۱۹۵۴ کے وقفے میں ایک خط میں تنبیہ کی تھی کہ ذرا سی بے احتیاطی میرے توازن کو بگاڑ سکتی ہے اور میرے لئے فیصلہ کن انداز سے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۴ میں جب میرا مجموعہ کلام "میری نظمیں" شائع ہوا تو اس پر سنگساری یا مجھ پر سنگباری تو نہیں ہوئی۔ لیکن "میری نظمیں" میں شامل زیادہ تر نظمیں چونکہ آزاد نظم کے ذیل میں آتی تھیں اس لئے ان کے بارے میں دو انتہاؤں پر رائے کا اظہار ہوا۔ ایک رائے یہ تھی کہ یہ نظمیں مجموعی طور پر فن کے مطالبات کا احترام کرتی ہیں۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ان نظموں میں ارکان کی ترتیب اس انداز سے رکھی گئی ہے کہ بعض مصرعوں کے خارج از بحر ہونے کا امکان گذرتا ہے اسی قسم کی رائے کا اظہار میرے عزیز دوست قاضی سلیم نے بھی "صبا" حیدرآباد دکن میں "میری نظمیں" پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا تھا۔ ارکان کی ترتیب اور آہنگ کے مسائل دور حاضر میں "نثری نظم" کے اصرار وجود کی حد تک زیر بحث رہے ہیں۔ "میری نظم" کتب خانے میں شائع ہوئی تو کچھ اسی قسم کا اعتراض ادبی دنیا کے صفحات پر عرش صدیقی کی جانب بھی سے کیا گیا۔

اردو شاعری کا حاوی لب و لہجہ چونکہ غزل کے حوالے سے عمومی ہے اس لئے RENDERING یعنی نقش گری کے رویے کو بلا تامل قبول کرنے میں ہمیشہ پس پیش سے کام لیا گیا۔ غزل سے ملتی جلتی اصناف میں بھی ہمارے یہاں عام طور پر عمومی انداز بیان کا سہارا لیا گیا۔ اور عمومی بیان کی بھی آراستہ پیراستہ صورتوں کو سادہ بیان کی صورتوں پر ترجیح دی گئی دور حاضر میں اسی وجہ سے نقش گری کے رویے کو بہ آسانی قبول نہیں کیا لیا۔ ورڈز ورتھ نثری ترتیب میں کامیابی سے تمام تر شعری امکانات دریافت کرتا ہے: بحر و وزن۔ ورڈز ورتھ کے ہاں الفاظ کی نثری ترتیب میں حائل نہیں ہوتے اور نہ ہی ورڈز ورتھ کی تخلیقیت کو مجروح کرتے ہیں۔ میری کچھ نظمیں۔ اکیلی، کاغذ کی ناؤ، سرکس کا گھوڑا بظاہر نثری ترتیب میں ایک صورت حال پیش کرتی ہیں۔ لیکن کیا اکیلی۔ صرف بے یار و مددگار کسی لڑکی کی داستان ہے یا پھر میری نجی داستان ہے جیسا کہ مخمور جالندھری نے میری نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک بار لکھا تھا۔ یا پھر صفدر میر کو 'رشتہ دل' میرے دوسرے مجموعہ کلام کی اکثر نظموں میں شعری محاسن کی کمی کا احساس ہوا کیونکہ ان کا لب و لہجہ اردو شاعری کے حاوی لب و لہجہ سے مختلف تھا

'میری نظمیں'، میرے پہلے مجموعہ کلام میں نظموں کے علاوہ چند غزلیں بھی شامل تھیں۔ میں نے میری نظمیں کے پیش لفظ میں چونکہ اپنے ہی قلم سے یہ جملہ شامل کرنے کی بے احتیاطی کی تھی کہ یہ چند غزلیں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے میں نے کتاب میں شامل کی ہیں اس لئے احباب نے اور تبصرہ نگاروں نے میرے ناگزیر طور پر نظم اور صرف نظم سے منسلک رہنے پر اصرار کیا اور مجھے وقتاً فوقتاً ان خطرات سے آگاہ کرنے کی بھی کوشش کی جو مجھے غزل کے سلسلے میں لاحق ہو سکتے تھے۔ لیکن شاید غزل کا جادو اردو شاعری کے ہر طالب علم کی طرح میرے لئے بھی لازوال تھا۔ میں خطرات کے تمام اعلان ناموں کے باوجود بار بار غزل کی جانب لوٹ کر آتا رہا۔ اس اصرار کے باوجود کہ میں نظم اور صرف نظم کا شاعر ہوں۔ اپنے تمام تر تخلیقی امکانات دریافت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

مجھے آغاز سفر سے لے کر اب تک فکشن سے گہری دلچسپی رہی ہے ۱۹۴۸ کے بعد کے کچھ برسوں کی ابتدائی کوششوں اور نظموں کی تخلیقی یورشوں کے بعد جب ۱۹۶۰ کے آس پاس میں افسانہ نگاری کی جانب از سر نو متوجہ ہوا تو شدید ردعمل نے میرا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں چونکہ میں پیدائشی شاعر تھا اس لئے پیدائشی افسانہ نگار یعنی فنکار تھا۔ دیگر احباب کے نزدیک میری نظموں کے اندر وہ تمام عناصر موجود تھے جن سے افسانے کی تشکیل ظہور میں آتی ہے آہنگ (گیا) میں لکھنے والے ایک تبصرہ نگار کے نزدیک میرے افسانے خاص طور پر "کنواں"، سراسر سپاٹ اور بے روح تھے۔ اور میرے احباب کسی سازش کے تحت مجھے افسانہ نگار کے مرتبے سے سرفراز کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ شاید میں بیک وقت شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اکیلی، کاغذ کی ناؤ، سرکس کا گھوڑا، ایمبولنس، نظمیں بھی تھیں اور افسانے بھی ایک دوسرے کی انفرادیت کو اجاگر کرتے ہوئے شاید اسی طرح تیسرا کتا، کنواں، تصویر، گڑیا، بری کی رات محض افسانے نہیں تھے۔ طریق کار کے اعتبار سے، استعاراتی امکانات کے اعتبار سے، سب کے سب نظموں کا روپ اختیار کر سکتے تھے۔

کیا میں کبھی شیشے کے گھر میں رہتا تھا؟ میں نے اس سوال پر کئی بار غور کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں کسی شیشے کے

گھر کا سرے سے فرد نہیں تھا۔ مجھ پر محبتوں اور قربتوں کی بارش ہوئی۔ اگر مجھ پر سنگباری ہوتی تو میں شیشے کے گھروں کے خطرات کی داستانیں لکھتا۔ میں رہ گزر پر نکلا تو دھماکوں کی فضا سے، تصادموں کی یلغار سے گزرا تو ثابت و سالم گزر گیا، حادثوں سے دوچار ہوا تو زخم سر اور دو نیم بازوؤں کی حد تک وارد رگ و زندگی میں داخل ہوا۔ میرے ذہن میں کوئی خود احتسابی پرزہ تھا۔ جو متواتر اور مسلسل مصروف کار رہا۔ مجھے اپنے جسم و جان، اپنے ارادوں، آرزوؤں کی تمام امکانی صورتوں سے روشناس کراتا رہا۔ منور افسردگی اور یاس انگیز خود بیتی کی ایک موج شب و روز میرے رگ و پے میں رواں ہے۔

میں شاہراہ زندگی پر سفر مدام سفر میں ہوں خوبصورت چہرے، ننھے شگوفے، اور پرندے میرے ہم سفر ہیں۔ ان سب کے ساتھ ہزاروں، لاکھوں، مجروح، تشدد کے جہنم سے گزرتے ہوئے انسان بھی میرے ہم سفر ہیں۔ نظم، غزل، افسانہ، ناول زبان تخلیقیت کے مظاہر ہیں۔ میں فانی ہوں تخلیق غیر فانی ہے۔ اس لئے میں تخلیق کار بھی زندہ و مسلسل ہوں۔

(اردو سروس سے)

جوھر ھاشمی

فضائیں جھوم جاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
امیدیں رنگ لاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
ابھرتا ہے ہر اک ذرہ نمودِ زندگی لیکر
بہاریں گیت گاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
ستم ہے ترکِ مے نوشی پہ یہ کالی گھٹائیں بھی
مرا ظرف آزماتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
تری مخمور آنکھیں دوش پر بکھری ہوئی زلفیں
نیا جادو جگاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
سلوکِ وقت سے مرجھائی مرجھائی امیدیں بھی
نئی فصلیں اگاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے
حدودِ عشق میں جب بھی شباب آتا ہے اے جوہر
وفائیں جھوم جاتی ہیں جہاں برسات ہوتی ہے

(حیدر آباد سے)

'آواز' یکم تا ۱۵ فروری ۸۷ء میں جو مضمون بعنوان ''یونانی طب کے میدان میں ترقی'' شائع ہوا ہے، اس پر سہواً صاحبِ مضمون کا نام نہیں دیا جا سکا ہے۔
مذکورہ مضمون،
ڈاکٹر تاج الدین
لیکچرر ابن سینا طبیہ کالج، اعظم گڑھ
کا تحریر کردہ ہے۔

بہادر شاہ ظفر تحریروں کے آئینے میں

صباح الدین عمر

بہادر شاہ ظفر اردو ادب کی تاریخ میں ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن انھوں نے نثر میں بھی دو کتابیں لکھی تھیں۔ ایک زبان اور لغت پر تین جلدوں میں جس کا نام انھوں نے "تالیفات ابو ظفری" رکھا تھا۔ اور دوسری تصوف پر جس کا نام تھا "خیابانِ تصوف" پہلی کتاب اب معدوم ہے اور "خیابان تصوف" بھی کم یاب ہے۔ ایسی صورت میں بہادر شاہ ظفر کو ان کو تحریروں کے آئینے میں دیکھنا ہے تو ان کے کلام کے چاروں دیوانوں ہی کو وسیلہ بنانا پڑے گا۔ ان دواوین یا ظفر کے کلام میں ظفر کو دیکھا جا سکتا ہے پرکھا جا سکتا ہے۔ ان کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے اندر کو پڑھا جا سکتا ہے۔

شاعر کوئی بھی ہو، اگر اس کے قلم میں طاقت ہے اور اپنے جذبات کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے تو وہ اپنے عہد اپنے ماحول اپنی زندگی کے نشیب و فراز اپنی محرومیوں، ناکامیوں یا کامیابیوں سے متاثر ضرور ہوگا اور اس کے یہی تاثرات اشعار کا پیکر اختیار کر لینگے یہ فطری امر ہے یہ ممکن نہیں کہ اس کی زندگی اور ماحول ایک مستقل عذاب رہا ہو یا اس کا عہد پر آشوب رہا ہو مگر اس کے اشعار جذبہ نشاط سے پر ہوں اور ایک عیش پسند زندگی کی نشاندہی کرتے ہوں۔ اس کا بڑا ثبوت میر کا لہجہ ہے۔

جہاں تک ظفر کا تعلق ہے وہ ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک ایسے خاندان کے اخیری نام لیوا تھے جو ایک مدت تک سارے ہندوستان پر حکومت کر چکا

تھا۔ جس کا سکہ سارے ملک میں چلتا تھا۔ جس کے وزیر اور امرا لاکھوں روپے کے انعام و اکرام دیتے رہتے تھے۔ اور جس نے فتح پور سیکری کے محل، بلند دروازہ، لال قلعہ۔ جامع مسجد اور تاج محل ایسی عمارتیں بنوائی تھیں۔ رہ گئے بہادر شاہ ظفر سو انھیں کوئی اختیار ہی حاصل نہ تھا۔ ان کا حکم لال قلعے کی چہار دیواری سے باہر نہیں چلتا تھا۔ انگریزوں کی مقرر کردہ پنشن پر ان کا گذارہ تھا۔ شاہ خرچ تھے۔ اس لئے شہر کے مہاجنوں کے قرض دار بھی رہتے تھے۔ مگر ان باتوں کے باوجود ملک میں ان کا ایک احترام تھا اور غالب ایسا شاعر "ظفر کا غلام" ہونے کو ایک شرف سمجھتا تھا پھر وہ سال آیا جب شمالی ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک آگ بھڑک اٹھی اور بہادر شاہ ظفر ہند وستانی مجاہدوں کے مرکز نگاہ بن گئے۔ لیکن ۱۸۵۷ کی اس جنگ آزادی میں نہ صرف یہ کہ ہندوستانیوں کو شکست ہوئی بلکہ بہادر شاہ ظفر کے دو بیٹوں کا انگریزوں نے سر کاٹ لیا اور خود بہادر شاہ ظفر کو قید کر کے ہندوستان سے باہر رنگون بھیج دیا۔ ہندوستان کے اس آخری بادشاہ کو قید فرنگ اور بند غم سے نجات اسوقت ملی جب وہ قید حیات سے چھوٹے۔

ظاہر ہے کہ جب سلطنت مغلیہ کے آخری تاج دار کا یہ حال ہو گیا ہو کہ وہ انگریزوں کا دست نگر اور وظیفہ خوار ہی نہیں بلکہ اخیر میں قیدی بن گیا ہو تو اس کے جذبات و احساسات کہاں ہوں گے بہادر شاہ ظفر کے کلام میں یہی جذبات و احساسات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ ان کے اشعار ایک ایسے دکھے دل کی آواز ہیں جسے اپنے اجداد کی سلطنت ہی ختم ہو جانے کا غم نہیں ہے۔ بلکہ جو اپنے آپ کو دوسروں کا قیدی اور غلام محسوس کرتا ہے۔ جسے اپنی بے بسی اور بے چارگی کا پوری طرح احساس ہے۔ جو اپنی زندگی سے تنگ آچکا ہے اور جس کی راتوں میں روشنی کی کوئی کرن کسی وقت بھی نظر نہیں آتی ہے۔ ظفر نے اپنے ساتھ ظلم و جور کرنے والوں کا نام نہیں لیا ہے۔ اور نہ یہ صاف صاف لکھا ہے کہ وہ انگریزوں کے قیدی ہیں۔ مگر اردو شاعری کے رمز و اشاریت کی روایتوں کے مطابق انھوں نے جو الفاظ اپنے اشعار میں استعمال کئے ہیں۔ ان سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے عام معنوں میں لائے گئے ہیں یا ان میں ایک رمز ہے اور ایک حقیقت پوشیدہ ہے۔

قفس، آشیاں، صیاد، باغباں، گریہ، نالہ، سوز محبت، آتش غم، زنجیر، زنداں، دیوانہ و غرضیکہ وہ الفاظ ہیں جن کا استعمال ظفر کے کلام میں اکثر ملتا ہے۔ لیکن ان الفاظ کی رمزیت یا علامتی حیثیت سمجھ لی جائے اور ان کے حقیقی معنوں پر غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ظفر کا اشارہ کس طرف ہے اور ان الفاظ کا واقعی مطلب کیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

اب کہاں ہے طاقت پرواز تا بام قفس
کر دیا صیاد نے بے بال و پر میرے تئیں

دے اگر پروانگی صیاد تو دل کھول کر
اور بھی دو چار نالے ہم قفس ہم کھینچ لیں

اے ظفر ہے دیکھ کھٹکا باغباں کا کس قدر
باغ میں بلبل کی آج آواز بھی آتی نہیں

ہم اپنے کنج غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں
ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

نہ ہوئی گریہ سے کم کچھ بھی تیری گرمئ دل
بلکہ اک آگ سی اے دیدۂ تر اور لگی

اور بھڑکی آتش غم اور دل جلنے لگا
سانس جو ہم ٹھنڈی ٹھنڈی دم بدم لینے لگے

بھڑکی ہے بے طرح یہ ظفر آج دل کی آگ
آگے تو شعلہ سا کبھی بار اٹھ کے رہ گیا

ہو چکی فصل بہار اور تیرا دیوانہ
حیف صد حیف کہ وابستۂ زنجیر رہا

تیرا دیوانہ جو زنداں سے نہ نکلا اب تک
پڑ گیا باتوں میں کچھ ایسا ہی زنجیر کا پیچ

پا بہ زنجیر اور دیوانہ ہے آیا کون سا!
یہ نہیں معلوم پر زنداں میں غل برپا تو ہے

یہاں صیاد، باغباں، قفس، زنجیر، دیوانہ، زنداں سے کیا مراد ہے۔ کیا بتانے کی ضرورت ہے؟ مگر اپنی بے بسی اور قید کی حالت پر ظفر ہمیشہ روتے ہی نہ رہے۔ وہ قید خانہ کے ساتھیوں کو عمل کا بھی پیغام دیتے ہیں اور صیاد سے ہوشیار رہنے کے لئے بھی انھیں آگاہ کرتے ہیں۔

قفس میں ہے کیا فائدہ شور و غل
اسیروں کرو کچھ رہائی کی باتیں

اگر باندھیں کمر مرغان پر بستہ ہمت
تو لیں کھول آپس میں مل جل کے پھندے

بہار آئی اسیران قفس آپس میں کہتے ہیں
پھڑک کر توڑنا ہے گر قفس تیار ہو جاؤ

مرغان چمن کرتے ہو کیا قہقہے دیکھو
وہ دوش پہ صیاد لئے دام ہے آتا

گر اسیروں کو یونہیں صیاد تو بھڑکائے گا
تو نکل بھاگیں گے وہ اک دن قفس کو توڑ کر

اسی کے ساتھ یہ ظفر بھی کہتے ہیں کہ ہم آزاد تو ہو سکتے ہیں مگر اس آزادی کے لئے ہمیں قربانیاں دینا پڑیں گی اور اس کے لئے ہم تیار ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ظفر کا کلام دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سنگلاخ ردیفوں، لفظی بازی گری، قافیہ پیمائی اور اپنی نادر الکلامی اور استادی دکھانے والے ایسے اشعار کثرت سے کہتے تھے جن میں نہ شعریت ہوتی تھی اور نہ تغزل مثلاً

باہم سنگ و آتش آہن و آب
ہر دم سنگ و آتش اہل ادب

دل کے چار پانچ مل کے چار پانچ۔ صنم جھپا جھپ۔ قدم جھپا جھپ۔ گفتگو تراق پڑاق۔ دو بہ دو۔ تراق پڑاق جو ہے معقول چہ خوش۔ کوئی ہے معقول چہ خوش۔ مگر یہ اثر ہے اس زمانہ کے بعض شاعروں کا جو استاد سمجھے جاتے تھے اور اپنی استادی کا ثبوت دینے کے لئے ایسے قافیے اور ردیف اپنی غزلوں میں لاتے تھے۔ ظفر کو غالباً یہ خیال تھا کہ جب تک میں بھی ایسی ہی زمینوں میں غزلیں نہ کہوں گا مجھے شاید نوشق یا طفل مکتب سمجھا جائے گا اس لئے انھوں نے اپنے وقت کے ان استادوں سے اپنا لوہا منوانے کے لئے ایسی غزلیں کہیں۔ لیکن ظفر کے حقیقی مزاج کو سمجھنا ہے تو ان کے اس قسم کے اشعار دیکھے جائیں جن کے کچھ نمونے ابھی پیش کئے گئے اور جن میں ان کے اندرونی کرب و الم کا اظہار کیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے یہ اشعار ان کے مطبوعہ دیوانوں میں ملتے ہیں۔ ان اشعار کے علاوہ انکی وہ چند مشہور غزلیں بھی ہیں۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رنگون میں ظفر نے اپنی اسیری کے زمانہ میں کہے تھے ان میں سے چند غزلوں کے مطلع پیش ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں۔ نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے وہ میں ایک مشت غبار ہوں

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں یہ ارغم سے سینہ فگار ہے

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب و دانہ منع ہے

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا

لگتا نہیں ہے جی میرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں

یہ غزلیں ایک بے بس اور مجبور انسان کے ناتے ایک مظلوم کی آہ و فغاں ایک قیدی کا گریہ و بکا ہیں اور جو اشعار لال قلعے میں کہے گئے تھے۔ ان کا حصہ۔

بہادر شاہ ظفر کے کلام میں غزلیں ہی نہیں۔ دوہے بھی ہیں۔ بھجن بھی ہیں۔ ہولی بھی ہے اور پنجابی زبان کے اشعار بھی۔ یہ دوہے۔ ہولی۔ بھجن اور پنجابی اشعار پیش کرنے کا موقع نہیں۔ مقصد یہ بتانے سے صرف اتنا ہے کہ ظفر اپنی تحریروں یا اپنی شاعری کے آئینہ میں دیکھے جائیں تو یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے تمام ہم وطنوں سے جذباتی ہم آہنگی رکھتے تھے اور اردو کے ساتھ انھیں ہندی اور پنجابی زبانوں سے بھی محبت تھی۔

(آکاشوانی لکھنؤ سے)

کرشن چندر

ریوتی سرن شرما

انسان سمندر میں تیرتا ہوا برف کا پہاڑ ہے۔ ⅓ دکھائی دیتا ہے۔ ⅔ دکھائی دیتا جبکہ یہی ⅔ اسکی اصل شخصیت ہے۔

اس لئے سوانح نگاری کو غیر جانب داری اور ناطرفداری کا فن گردانا گیا ہے۔ لکھنے سے پہلے اپنے کو دھونا اور گنگا میں ڈبکی لگا کر پاک کرنا۔ کسی پہ لکھنے کی پہلی شرط ہے۔ لیکن میرے سلسلہ میں ایک اور مشکل ہے۔ کرشن چندر ایک تو کرشن چندر۔ اس پر میرے سالے تھے۔ میری بیوی سرلا کے بھائی۔ اب لکھوں تو کیسے لکھوں ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

غالب میرے دھرم سنکٹ کو بھلے ہی بھانپ گئے۔ اس لئے کوشش کروں گا کہ مجھ پر طرفداری کا الزام نہ لگے اور اگر لگے تو یہ کہ میں نے ڈنڈی ماری پر کرشن چندر کے حق میں نہیں ماری۔

تو صاحبو! کرشن چندر سب طرح ادیب تھے لیکن دیکھنے میں ادیب نہیں تھے۔ سانولا سا رنگ۔ اوسط سے کم قد۔ بال غائب۔ چشمہ۔ گول مٹول چہرہ۔ انہیں ایسی آنکھیں جو یا تو شرمندہ ہو رہی ہوں۔ یا کر رہی ہوں۔ گردن جھکا کر چلنا۔ کھانستے چلنا۔ رومال میں تھوکتے جانا۔ ایسے نظر آنا کہ نظر میں آنے کی کوئی بات دکھائی نہ پڑنا سوائے اس کے کہ ایک اپنے میں کھویا ہوا آدمی چلا جا رہا ہے جس کے قدم سیدھی سڑک یا پیدل چلنے کی ہموار پٹری پر نہیں پڑ رہے، زمانہ کی اوبڑ کھابڑ ڈگر طے کرنے کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ یہ آدمی آپ کے پاس سے گذر جائے اور آپ اس کے پاس سے گذر جائیں اور پتہ نہ چلے۔ یہ تھا کرشن چندر بس پتہ تب چلتا تھا جب اس کے افسانے میں اچانک ایکسرے نظر آتا تھا۔ کرشن چندر کے پاس وہ نگاہ تھی، جو نگاہ سے کم تھی لیکن شراب میں نشہ کو الگ سے دیکھ لیتی تھی۔

کرشن چندر نے بہت زیادہ لکھا اور بہت کم بولا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا یہ وہی آدمی تھا جو الفاظ تشبیہات اور استعارات کا بھاکڑا ڈیم تھا۔ لیکن جب بولنے کی باری آتی ہے۔ ایک جھجھکتی ندی تھا۔ نہ بولنا۔ ایک دو لفظ بولنا اور بول کر چپ ہو جانا یا پھر اٹھ کر چلے جانا۔ یہ جدید اردو کی سب سے بولتی نثر لکھنے والا کرشن چندر تھا۔

ترقی پسند تحریک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے کرشن چندر کانفرنسوں میں جاتا تھا، بحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ کالجوں میں مدعو کیا جاتا تھا۔ عقیدت اور شراب کے جام لنڈھانے کے لئے ان کے یہاں نام نہاد دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ لیکن کرشن چندر سنتا زیادہ تھا بولتا کم تھا۔ بولنے کی باری آتی تو لکھتا، اور لکھا پڑھتا۔ کرشن چندر سب سے موثر لکھنے والا اور سب سے بے اثر بلکہ نامعلوم بولنے والا تھا۔ کرشن چندر کو ہوں ہاں کرتے اور بچے کی طرح معصوم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے لوگوں نے زیادہ دیکھا ہوگا۔ بولتے ہوئے۔ گرماگرم بحث کرتے کم۔ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ اور جو برستے ہیں ——— کرشن چندر ہوتے ہیں۔

کرشن چندر بہت سادہ لوح انسان تھا۔ غلط نہ ہوگا، وہ غلط برداشت کرنے والا آدمی تھا۔ سنتا رہتا تھا۔ برداشت کرتا رہتا تھا۔ اندر ہی اندر جلتا بھنتا رہتا تھا۔ بھڑکنا۔ زور سے بولنا۔ آتشبار آنکھوں سے دیکھنا۔ اسے آتا ہی نہ تھا۔ یہی اس کی عظمت اور اسکی ٹریجڈی تھی۔ کرشن چندر کی ذاتی زندگی خراب تھی۔ آخری دم تک گھر میں وہ ہوتا رہا۔ جو اسے پسند نہیں تھا۔ اس کے اپنوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی۔ ان کی بے عزتی ہوتی تھی۔ کرشن چندر زہر کے گھونٹ پیتا تھا۔ چوری چھپے معافی مانگتا تھا۔ سمجھاتا تھا ——— میں کیا کروں آدمی کو آدمی ہونا چاہیئے اب نہیں ہے تو میں کیا کروں!

گھوٹ کر تو پلا نہیں سکتا؟ خیال نہ کرنا۔ آدمی بچہ ہے۔ پڑھ لکھ کر بھی بچہ رہتا ہے"۔

یہی بات ادبی مخالفین کے سلسلہ میں تھی۔ کرشن چندر کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ کرشن چندر پڑھتا اور خاموش رہتا۔ کئی بار میں کہتا۔ آپ لکھتے کیوں نہیں۔ جواب کیوں نہیں دیتے؟ میں کیوں جواب دوں؟ جواب دینا بھی کیا میرا کام ہے۔ اب جسے جواب دینا ہے وہ دے۔ میرا کام تو لکھنا ہے۔ میں بس لکھوں گا۔"

یقیناً کرشن چندر کے اندر تلخی تھی۔ لیکن تلخی نہ ہوتی تو کرشن چندر افسانہ نگار نہ بنتا۔ لیکن کرشن چندر تلخ کلام نہیں تھا مجھے کبھی کبھی لگتا تھا کرشن چندر نے بہت موٹا لبادہ پہنا ہوا ہے۔ کہیں وہ بہت بزدل ہے یا بہت بڑا ایکٹر۔ کرشن چندر نے مجھے کسی ایک نتیجے پر پہونچنے کا موقع نہیں دیا۔ لے دے کے اپنے سے ہی کہہ سکا ——— "یہ آدمی قلم سے لکھنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ منہ سے بولنے کے لئے نہیں"!

کرشن چندر لکھتا غریبوں کے لئے تھا، رہتا امیروں کی طرح تھا۔ اردو ادیبوں میں سے بہت کم نے اتنا کمایا جتنا کرشن چندر نے۔ دوسرے ادیب رائلٹی لیتے تھے۔ کرشن چندر پیشگی رائلٹی لیتا تھا۔ اس کی ڈاک میں اکثر پبلشروں کے خط ہوتے تھے "آپ نے رائلٹی لی تھی ابھی تک کتاب نہیں ملی۔ ہم اعلان کر چکے ہیں۔" اگلے خط میں لکھا ہوتا۔ ہم ایک چیک اور بھیج رہے ہیں۔ براہ کرم اب جلدی سے مسودہ بھیج دیجئے۔ کرشن چندر پبلشروں کے پیچھے نہیں پھرتا تھا۔ پبلشر اس کے پیچھے پھرتے تھے۔

کرشن چندر نے جتنا کمایا، اس سے زیادہ اجاڑا۔ اس کے شاہد انکم ٹیکس والے ہیں۔ جنہوں نے کرشن چندر سے رقم وصول کرنے کے بجائے، بخوشی اسے "ناقابل وصول" قرار دیا۔ کرشن چندر پانچ ستارے والے ہوٹلوں میں، شاندار بنگلوں میں رہا۔ دنیا میں گھوما۔ دوستوں کو ولایتی شراب اپنے سے زیادہ پلائی۔ دستر خوان پر جتنے مرغن کھانے اور بمبئی کے چیدہ پھل، اتنے ہی مشکوک دوست اور مداح۔ شراب کے ساتھ ایران کے نمکین پستے۔ کباب اور کاجو سفر کرنا ہوائی جہاز میں یا ایرکنڈیشنڈ کلاس میں۔ خاندان ایک نہیں چار چار خاندان پالنا۔ ایک منکوحہ مگر متروک بیوی کا۔ دوسرا اپنا اور اپنی عزیز ترین دوست کا، تیسرا اپنی والدہ کا اور چوتھا ٹیکسی والوں کا۔

کرشن چندر نے گاڑی نہیں لی۔ ایک بار لی۔ وہ ہاتھی کی طرح بس ڈیوڑھی پر کھڑی رہی پھر اسے پونے کردی کرشن چندر کو ٹیکسیوں سے والہانہ عشق تھا۔ بس چلتا ایک ٹیکسی چوبیس گھنٹے باہر کھڑی رہتی۔ ایک مرتبہ عارضی تنگ حالی کے دوران میں نے ٹیکسی نہ لینے کا مشورہ دیا۔ مان گئے۔ میں بہت خوش ہوا۔ لیکن ایک دن بلبلا پھوٹ گیا۔ کرشن جی کوئی بارہ بجے گھر آئے تھے۔ کوئی تین بجے ایک لیم شیم ٹیکسی ڈرائیور نے دروازہ کھٹکھٹایا ——— اور بادجی

کہاں۔ کہاں ہیں یہ پوچھا کدو چلیں گے؟۔" باو جی ٹیکسی میں آئے تھے؟" آہو۔ جی ۔ مندر کولوں کھڑی ہے۔ یہ کیا حرکت ہے کرشن جی؟" یار تو ضد پکڑ گیا۔ اس لئے اوپر مندر کے پاس ٹیکسی کھڑا کر دیا کرتا۔ میرا ٹیکسی کے بنا گزارا نہیں۔ تو جل بھن مت۔

کرشن چندر کو پیسے لٹانے کا شوق تھا۔ اگر لکھنے کے معاملہ میں وہ پرولتاری تھا تو پیسہ جوڑ کر نہ رکھنے کے معاملہ میں بھی پرولتاری تھا۔ کرشن چندر نے مکان نہیں بنوایا۔ والدہ کہتے کہتے چلی گئی۔ —— کا کا ایک مکان بنوا لے۔ لیکن کا کا سن کر کہتا رہا۔ ایک کیا کئی مکان گھول کر پی گیا ہے ماں جی تمہارا بیٹا۔

جیسا کھانے کا شوق تھا۔ ویسا کتابیں خریدنے اور انہیں پڑھنے کا شوق تھا۔ سفر کرتے تو سو پچاس کی کتابیں خریدتے اور جب بمبئی جاتا تو ان کے پڑھنے کا ثبوت مل جاتا۔ کرشن چندر آخری دم تک کتابیں پڑھتے رہے۔ "یار لکھنے والے کو کتابیں ضرور پڑھنی چاہیں"۔

کرشن چندر نے کتابوں کا ترکہ چھوڑا۔ نسل کا نہیں گو انکی تین اولادیں ہیں۔ لیکن اولاد کے قابل ہونے کا سکھ انہیں نہیں ملا۔ ایک لڑکی پاگل۔ لڑکا کچھ نہ بن سکا۔ بس ایک لڑکی قدرے بہتر۔ شاید حالاتِ زندگی ہی ایسے تھے کہ کرشن چندر اپنی ذاتی نسل کی ترویج نہ کر سکا۔ اس کا غم۔ کہانی "میرے دوست کا بیٹا" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں سانپ سب جگہ ٹیڑھا چلتا ہے۔ پر بل میں سیدھا چلتا ہے۔ کرشن چندر بل میں بھی سیدھا نہیں چلا۔ اس کی زندگی ایک طوفانی زندگی تھی۔ جس میں جذبات کے بھیانک مد و جزر تھے۔ کرشن چندر کو دل کا پہلا دورہ ایک ایسے ہی جزر کا نتیجہ تھا۔ جس نے بالآخر اس کی جان لی۔ لیکن لوگ ابھی جیتے ہیں۔ اس لئے مرنے والے کے اوپر سے پردے کھینچنے کا وقت نہیں آیا۔

افسانہ نگار کرشن چندر کے پیچھے سے کرشن چندر کے نکلنے میں ابھی دیر ہے۔

(اردو سروس سے نشر)

نفیس غازی پوری

رواں دواں ہے زندگی کا کارواں جہاں جہاں
فضائے دشت ساتھ ہے اٹھائے سر وہاں وہاں
غبارِ راہ جسم پہ سجائے پیرہن سا ہم
تلاش کرتے پھر رہے ہیں منزلیں کہاں کہاں
بہک نہ جائیں آج کیوں ہوش نہ ہم گنوائیں کیوں
یہ چاند سر پھرا سا ہے یہ رات ہے جواں جواں
قدم قدم پہ سُن رہے ہیں جسم کی پکار ہم
فسوں زدہ سے چل رہے ہیں بے خبر کشاں کشاں
کوئی چراغ بجھ گیا یہ نیند کس کو آگئی
نفیس روئے ماہتاب کیوں ہیں پھر دھواں دھواں

بہار شریف

عبدالصمد

شہروں کی کہانی میں کیا رکھا ہے چند ٹیڑھی میڑھی سڑکیں، چند گلیاں، چند اوپر تلے مکانات اور آسمانوں کے سائے میں زندگی بسر کرنے پر مجبور انسان —— یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی کی سڑکیں ٹیڑھی میڑھی نہ ہوں، گلیاں، بدنام اور گندی نہ ہوں، مکانات کی منزلیں اور بڑھی ہوئی ہوں اور آسمانوں کے سائے تلے انسان زندگی بسر کرنے پر مجبور نہ ہوں۔

لیکن اگر کہیں سے ہمیں شیو مل جائیں اور وہ ہمیں اپنی تیسری آنکھ دے جائیں تو شاید ہم سیاسیات، معاشیات تواریخ، ادب اور سماجیات وغیرہ کی کتابیں کہیں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک آئیں اور انہیں شہروں میں دیکھتے پھریں کیونکہ تمدن زندگی میں پڑھنے اور دیکھنے کی چیزیں تو شہر ہیں —— گھروں میں، سڑکوں پر، گلیوں میں، بولنے چالنے میں اور قلوب میں —— لیکن افسوس صدیاں گزر جاتی ہیں اور ان سے ہماری ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ ہم تو شو کی تیسری آنکھ کے انتظار میں صدیوں کی زنجیریں کاٹتے رہتے ہیں۔

پٹنہ رانچی روڈ پر قومی شاہراہ نمبر ۳۱ پر پٹنہ سے پچاس میل کی دوری پر واقع بہار شریف ایک چھوٹا سا پرانا شہر ہے لیکن اگر میں آپ کو یہ بتانے بیٹھ جاؤں کہ بہار شریف میں اتنی ٹیڑھی میڑھی سڑکیں ہیں گندی گلیاں ہیں، غلیظ نالیاں ہیں، پانچ چھ ہائی اسکول ہیں تین چار کالج ہیں اور لوگ —— لوگ تو ہر جگہ اور ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں تو شاید آپ کو کوئی نئی بات نہیں معلوم ہو گی کیونکہ شہر کی تعریف میں اتنی باتیں تو آتی ہی ہیں —— آیئے ہم شیو کی سخاوت سے کام لیں۔

اس قدیم شہر کی تواریخ غالباً کتابوں میں قید نہیں کی گئی ہے کیوں کہ اس نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جس کی بنا پر اس کے نام کا طالب علموں کی زبانوں پر ورد کرایا جائے لیکن قرین قیاس ہے کہ تقریباً دس ہزار سال قبل قدیم نالندہ یونیورسٹی کے لئے یہ ایک بازار کا کام دیتا ہو گا۔ یہ بین الاقوامی مقام بہار شریف سے صرف چند میل کی دوری پر ہے آس پاس کوئی بڑی آبادی کا نشان نہیں ملتا اس لئے اندازہ یہی ہے کہ یہ شہر ان قدیم باشندوں کے لئے ایک اہم ضرورت بن گیا ہو گا —— آج نالندہ، بہار شریف کی ایک اہم ضرورت اس طرح بن گیا ہے کہ اس کے سر پر ضلع کا جو تاج سجا ہے اس میں نالندہ ہی نام کا ہیرا جڑا ہے۔ شہر میں جگہ جگہ مزارات اور چھوٹی چھوٹی ان گنت مسجدیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ یہ شہر کبھی ایک ایسا میدان رہا ہو گا جس سے اس زمانے کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی ہونگی جن میں جنگ و جدال شامل ہے اور خلوص و محبت اور قربانیاں بھی۔

بہار شریف کی آبادی کو پیشہ کے اعتبار سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کپڑے بننے والے، بیڑی بنانے والے، درمیانی اور نچلے درجے کے تاجر، زمینداروں اور شرفا کے قدیم خاندان، دیہاتوں سے آکر شہر کو اختیار کرنے والے لوگ اور شہر کی نئی روشنی میں کھوئے ہوئے بلا تفریق انسانوں کے مجموعے کپڑا بننا اور بیڑی بنانا —— دو یہاں کی خاص صنعتیں ہیں۔ نوے ہزار کی پوری آبادی میں تقریباً بیس پچیس ہزار آبادی کپڑا بننے کی صنعت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اور تقریباً پندرہ ہزار آدمی بیڑی کی صنعت سے وابستہ ہیں۔ یہاں کی ساڑیاں، لنگیاں، رومال اور تولئے وغیرہ تقریباً سارے ہندوستان میں بھیجے جاتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں۔ سرکار نے بھی اس کی اہمیت کو سمجھا ہے۔ اور محکمۂ امداد باہمی کے تحت کئی ادارے کھولے گئے ہیں۔ اس صنعت پر مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بیڑی کی صنعت البتہ اچھی حالت میں نہیں ہے لو راس کی خاص توجہ اس پر بے توجہی ہے۔ اس میں کھلم کھلا استحصال کے مواقع ہیں اور اس سے وابستہ لوگوں کی معاشی حالت دگر گوں ہے۔ اس صنعت پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے

سیاست اور استحصال کے چنگل سے اس کو نکال لیا جائے تو یہ چیز بڑی کار آمد ہو سکتی ہے ——— پھر درمیانی اور نچلے درجے کے تاجر ہیں، دوکانوں کے سلسلے ہیں جو تقریباً ہر معروف سڑک کی زینت ہیں۔ چھوٹے بڑے بے شمار مارکیٹ بن گئے ہیں اور بن رہے ہیں جن سے بہار شریف کا چہرہ ایک تاجر کا سا ہو گیا ہے۔

شہر چاروں طرف سے کاشت کی زمینوں سے گھرا ہوا ہے۔ ان زمینوں میں آلو ہوتا ہے۔ یہ آلو ہندوستان اور ساری دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ آلو کی کاشت نے کولڈ اسٹوریج کی صنعت کو جنم دیا ہے۔ یہاں درجنوں کولڈ اسٹوریج ہیں۔ شاید پورے ہندوستان میں کسی ایک شہر میں اتنے کولڈ اسٹوریج نہیں ملیں گے۔ ان کولڈ اسٹوریج میں آلو کے علاوہ دوسرے سبزیاں اور پھل بھی رکھے جاتے ہیں۔ مسلسل بجلی کی سپلائی ناکافی رہنے کے باعث یہ بزنس بہت زیادہ منافع بخش نہیں رہا ہے۔

بہار شریف کی جغرافیائی پوزیشن اسے ایک بہت ہی اہم شہر بناتی ہے۔ قومی شاہراہ ۳۱ پر واقع یہ شہر چھوٹا ناگپور اور جنوبی و مشرقی بہار کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔ سڑک کے ذریعہ دور دراز لیکن نزدیک علاقوں کے رشتے کی گرہ صرف بہار شریف ہی باندھ سکتا ہے۔ راجگیر اور گیا کے راستے بھی یہیں سے جاتے ہیں۔ راجگیر، بہار شریف سے بارہ تیرہ میل کی دوری پر، بہار شریف گیا روڈ پر ایک بہت ہی مشہور صحت افزا مقام ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سردیوں کے لئے ہل اسٹیشن کا کام دیتا ہے جب کہ دوسرے فرحت افزا مقامات گرمیوں میں یہ کام دیتے ہیں۔ پہاڑیوں کے گرم جھرنے، چاروں طرف پھیلے ہوئے باغات اور فطری انداز دلربائی دکھلاتے ہوئے جنگل یہاں کے خاصے کی چیزیں ہیں۔ راجگیر کو مذہبی اہمیت بھی حاصل ہے۔ شانتی اسٹوپا، مخدوم کنڈ اور برہمن کنڈ نام کے جھرنے اپنی مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔

بہار شریف خاندان میں پہاڑ بھی ایک فرد ہیں جن کے سرے پر حضرت ابراہیم ملک بیا کا مقبرہ اور مزار اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ قوموں کی تواریخ چہار دیواریوں میں قید رہنے سے نہیں بنا کرتی۔ شہر کے ایک سرے پر حضرت مخدوم شرف الدین یحیٰی منیری رح کا مقبرہ اور مزار آج بھی پکار پکار کر لوگوں کو کہہ رہے ہیں کہ وصال یار کے لئے آزمائش کے کوچوں سے گزرنا لازمی ہے۔ سات آٹھ سو برس گزر جانے کے بعد بھی یہ مقام دنیا کے لئے رشد و ہدایت کا ذریعہ اس لئے بنا ہوا ہے کہ اس کے مکین نے کبھی رضائے الٰہی کے لئے اپنے آپ کو مٹایا تھا ورنہ بارہ برس بہیا کے جنگل میں کھڑے رہنا کوئی قصہ کہانی نہیں ہے۔ بلکہ ریاضت، عبادت اور قربانی کی ایک ایسی داستان ہے جس کے صرف نقوش ہمارے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

اس شہر میں منی رام بابا نام کا ایک بہادر انسان بھی گزرا ہے جس کی طاقت، دلیری اور مردانگی کے اعتراف میں ہر سال ہزاروں آدمی اس کے اکھاڑے پر جمع ہوتے ہیں اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

۱۹۲۰ء کے آس پاس جب ہندوستان کی سیاسی بیداری غلامی کے بطن سے جنم لے رہی تھی اس وقت یہ چھوٹا موٹا شہر بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ اس نے اپنے قلب کے دروازے علی برادران، مہاتما گاندھی، مدن موہن مالویہ، بادشاہ خاں، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دوسرے رہنماؤں کے لئے وا کر دیئے۔ آج بھی اس شہر میں ایسے گھرانے موجود ہیں جن کو ان عظیم رہنماؤں کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا تھا اور آج بھی ایسے انسان موجود ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے بہار شریف کو ان عظیم انسانوں پر نچھاور ہوتے دیکھا تھا۔ شاید انہیں بزرگوں کا فیض ہے کہ اس چھوٹے موٹے شہر میں سیاسی شعور اور بیداری بدرجۂ اتم ملتا ہے جس کا مظاہرہ انتخابات کے مواقع پر ہوتا رہتا ہے اور سیاسیات کے طالب علموں کے لئے غور و فکر کے نئے زاویے نکالتا ہے۔

بہار شریف، بہار صوبہ کے قدیم شرفا کا ایک مقام رہا ہے۔ لیکن اب وہ تمام گھرانے یا تو نئے زمانے کی چکا چوند میں کھو گئے ہیں یا پھر سمٹ سمٹا کر وجود اور عدم وجود کے فلسفے کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے ہیں ماضی نے جہاں ہمیں رسم و روایات کی فرسودہ زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا وہیں اس نے علم و فن کی بے شمار قندیلیں بھی روشن کر رکھی تھیں۔ چنانچہ جب ہم الٹے قدم چلتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بہار شریف علم و ادب اور فن کا گہوارہ بھی رہا ہے۔ حافظ شفیع الدین، الیاس یاس بہاری شاہ نجم الدین، پروفیسر معین الدین دردائی، سید احمد نواب ماہ، منظور الرحمٰن اختر کاکوی، حکیم فہم الدین اور گرو بہاری وغیرہ وہ چند نام ہیں جن کے دم سے یہاں کی ادبی اور علمی فضا گرم تھی۔ افسوس اس باب میں ماضی کے سوا ہماری مٹھیوں میں کچھ بھی نہیں رہا۔ ان میں کچھ تو اللہ کے پیارے ہوئے، کچھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو بیٹھے اور کچھ دیار غیر کے مکین ہو گئے۔

بہار شریف میں ترقی کے نئے ذرائع اور مواقع بیدار ہو رہے ہیں۔ شہر کے دائیں بائیں سرکاری و غیر سرکاری تعمیرات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔

(پٹنہ سے نشر)

سرورق

بڑی درگاہ ــ بہار شریف

کیمرہ : دھرم ویر جینز

فرقہ واریت اور خواتین

کہتے ہیں جس میں چنگی ڈال بی جمالو دور کھڑی یعنی بعض عورتیں لگائی بجھائی کر کے خود تو الگ ہو جاتی ہیں مگر کئی دلوں کو جلا کر راکھ کر دیتی ہیں اور کبھی کبھی تو بات اتنی بڑھ جاتی ہے کہ کسی کا مال تباہ ہوتا ہے اور کسی کی جائداد برباد ہوتی ہے اور کسی کی جان جاتی ہے۔ لیکن صرف بی جمالو کو کیوں الزام دیں اس میں کچھ بھوسہ کا بھی تو قصور ہے کہ وہ کیوں اتنی جلد جل اٹھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر سننے والے بہت جلد برافروختہ نہ ہو جائیں تو بی جمالو کی چھوڑی ہوئی چنگاریاں اور شرارے خود بخود بجھ کر رہ جائیں۔ رقص شرر کا دور ہی کتنا۔ بھڑکے گا اور بجھ جائے گا اگر بی جمالو کے ساتھ ان کے بھائی بند، گھر والے اس بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔ چھرے بازی، آتش زنی کا تو بی جمالو تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ تو بس ایک چھوٹے سے ہتھیار سے وار کرتی ہیں وہ ہے تو ان کی ڈیڑھ انگل کی زبان مگر کبھی اس کے گھاؤ چھری تلوار کے لگائے گھاؤں سے بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔ سوائے اس کے اسی زبان کی مٹھاس سے ان زخموں پر مرہم لگا کر ان کو مندمل کیا جائے۔ کسی نے لقمان سے پوچھا تھا کہ بھلا سب سے اچھی اور بری چیز کونسی ہے۔ دونوں ہی سوالوں کے جواب میں انھوں نے گوشت کے اسی لوتھڑے کو پیش کر دیا جسے زبان کہتے ہیں

سچ تو یہ ہے کہ تلوار سے زیادہ تیز اکسیر سے زیادہ موثر اس زبان سے خواتین اچھے سے اچھا کام انجام دے سکتی ہیں۔ ان اچھے کاموں میں فرقہ واریت کی قطع برید اور کاٹ چھانٹ بھی شامل ہے۔

ایک بار نپولین نے اپنی ایک رفیق خاتون سے دریافت کیا تھا کہ فرانسیسی نوجوانوں کو اچھی تعلیم دینے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہے۔ فوری جواب ملا: "اچھی مائیں" اور یہ ایک مانا ہوا مقولہ ہے کہ جو ہاتھ جھولا جھلاتا ہے وہی ہاتھ دنیا پر حکومت بھی کرتا ہے۔ اسی مقولہ کو سامنے رکھ کر تصور کیجئے کہ کیسے ایک ماں، ایک خاتون فرقہ واریت کو دور کر

شاکرہ بیگم

کے امن چین کی فضا تیار کر سکتی ہے۔ سنیئے مائیں اپنے ننھے منوں کو لوریاں سنا رہی ہیں۔ میٹھی میٹھی سروت سے محبت کے گیت جب مائیں مسلسل "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" ترنم کے نغمے گنگنائیں گی تو ننھوں کے لاشعور میں کہیں ان نغموں کی گونج رہ جائے گی۔ اور ایسے اس کے من میں سما جائیں گے کہ نفرت کی آوازیں ان کو زہر آلودہ نہ کر سکیں گی۔ یہ علم نفس کا ایک نظریہ ہے۔

ننھے منے کچھ اور بڑے ہوئے بات سمجھنے لگے۔ قصہ کہانیاں سننے لگے تو ماں انہیں سنائیں گی کہانیاں محبت کی۔ کہانیاں الفت کی۔ ان کہانیوں سے وہ عظمت آدم کو بچوں کے شعور کی خالی سلیٹ پر مرتسم کر دے گی نفسیات کی رو سے یہ ان مٹ نقوش ہمیشہ بچے کی رہنمائی کریں گے۔

کچھ اور سمے بیت جاتا ہے۔ بچے گھر میں آنے جانے والوں کو پہچاننے لگے۔ پپا کے دوستوں سے زیادہ وہ ممی کی سہیلیوں کے قریب آجاتے ہیں کہ یہ زیادہ محبت شعار ہوتی ہیں۔ ان سہیلیوں میں ماں مختلف مذہبوں اور فرقوں کی خواتین کو شامل رکھتی ہے۔ سب کی سب ممی سے بڑی قریب ہیں۔ کہ ممی ہر ایک کو اپنا سمجھ کر سبھی سے پورے خلوص و یگانگت سے ملتی ہیں۔ اپنا دکھ درد ان سے کہتی ہیں ان کے دکھ درد کو اپناتی ہیں۔ انکی کمزوریوں کو نظر انداز اور خوبیوں کو اجاگر کر دیتی ہیں۔

بچے کچھ اور بڑے ہوئے اڑوس پڑوس کے گھروں میں جانے لگے۔ ماں انہیں اچھے سمجھدار ہمسایوں کے گھروں کو بھیجتی ہے جن میں سبھی فرقوں کے گھر شامل ہیں۔ ساتھ ساتھ ماں اپنے بچوں کے ذہن نشین کرتی ہے کہ حق ہمسایہ ماں کا جایا۔

دیکھتے دیکھتے بچے اسکول میں شریک ہونے کی عمر کو پہونچ گئے۔ مائیں ایسے اسکول کا انتخاب کریں گی جہاں یکجہتی کا ماحول ہے۔ فرقہ واریت کی فضا نہیں ہے۔ اپنے بچوں کو سمجھائیں گی ساتھیوں کے ساتھ "سب ساتھ ہیں" اصول کی پابندی کریں۔ ماں خود بھی بچوں کے سبھی ساتھیوں سے ربط ضبط رکھے گی۔ انہیں اپنے گھر بلائے گی اس کے ساتھ اپنے بچوں جیسا سلوک کرے گی۔ گورے کی قدردانی ہوگی نہ کالے کی ناقدری۔

اب بچے پڑھنے لکھنے لگ گئے۔ بچپن سے ماں کی زبانی دلچسپ مزیدار کہانیاں سن کر انہیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہوگیا۔ ماں نے انہیں مختلف تہذیبوں، مذہبوں اور ملکوں کی داستانیں سنائی تھیں۔ اب بچے بھی مختلف فرقوں اور مذہبوں کی تعلیمات کا کھلے دل سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ایسی کتابیں ماں ان کے لئے فراہم کرتی ہے جو احترام آدمیت کا سبق دیتے ہیں۔ جس سے بچوں کا ذہنی افق وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ان میں مساوات اور بے تعصبی کے صفات پرورش پاتے ہیں۔ اپنے مذہب اپنے فرقہ کے پابند ہوتے ہوئے بھی وہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہیں انہیں سب انسان ایک جیسے لگنے لگتے ہیں جنہیں خالق کائنات نے بڑی ہم آہنگی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ وہی دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں پھر کان، ناک اور دوسرے اعضا، وہ سمجھتے ہیں کہ اچھے برے ہر جگہ ہیں کیونکہ بچپن سے ہی ماں نے اپنے طرز عمل سے ذہن نشین کرا رکھا ہے کہ برائی سے نفرت کرو مگر برے آدمی کو مت دھتکارو بلکہ اس کی برائیوں کو دور کر کے اسے اپنالو۔

کل کے بچے آج کے جوان اس طرح اچھی ماں کی اچھی تربیت سے اچھے انسان اچھے شہری بن جاتے ہیں۔ جو فرقہ واریت کی لعنت سے پاک ہوتے ہیں۔

کچھ اور سوچیں ایک خاتون ماں ہے بہن ہے بیوی ہے یا بیٹی یہ سب پیار بھرے رشتے ہیں۔ یہ اپنے ہم جنسوں کے درد کو بہتر طریقے سے محسوس کر سکتی ہیں۔ اور اسے دور کرنے کی تدبیریں بھی کر سکتی ہیں

ہر ماں کے لئے اسکی اولاد پیاری ہے دلاری ہے وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ اس کی اولاد اچھی سے اچھی بنے سنسار کا سارا سکھ بھوگے دکھ سے دور رہے۔ ممتا کے اس تصور کو جو ہر عورت کا اثاثہ ہے صرف ایک ماں ہی محسوس کر سکتی ہے۔ اور اس پر عمل پیرا بھی ہو سکتی ہے۔ کہ سبھی ماؤں کے لال پھلیں پھولیں آباد رہیں۔

اسی طرح ہر بہن کے لئے بھائی لازوال دولت ہیں۔ ہمت ہیں سہارا ہیں۔ امیر خسرو کی گیت کے دھن میں میکے سے دور بہنیں گنگناتی ہیں۔

نیم کی نرزول پکی، ساون بھی کبھی آوے گا
جیو سے میرا ماں جایا ڈولی بھیج بلا دے گا

گھروں میں نیم کا درخت، ان کی نمبولیاں اور ڈالیاں اب ماضی کی یادیں بن گئی ہیں۔ مگر بھائیوں کی محبت اور بہنوں کی یاد اب بھی برقرار ہے بہنوں کی اٹوٹ محبت کے سامنے فرقہ واریت کہاں تک اور کب تک ٹک سکے گی۔ بشرطیکہ ہر بہن دوسری بہن کے بھائی کو بھی اپنا بھائی سمجھ لے اور خواہرانہ احساسات کو سینہ میں موجزن کر لے۔

پھر ایک خاتون خاص کر بھارت دیش کی پتی ورتا بیوی جس کے لئے اس کا میاں ہی سب کچھ ہے جہاں ہر عورت بوڑھ سہاگن ہونے اور اپنی مانگ سیندور اور صندل سے بھری رکھنے کی آرزومند ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس کے سہاگ کی ہوتی ہے وہی اپنی جیسی خاتون کے سہاگ کے قائم رکھنے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

اور بیٹیاں جو ماں باپ کی بلکہ سارے گھرانہ کی لاج ہیں جو گھر کی عزت کے لئے خاک میں مل جاتی ہیں۔ وہ ضرور تائید کرے گی کہ سبھی بیٹیوں کی لاج سلامت رہے ان کے سہارے آباد رہیں۔

محبت کے یہ بھاؤ یہ رس اور جذبہ ہر خاتون ہر ماں ہر بہن، ہر بیٹی کے دل میں رہتے ہیں۔ فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لئے ان جذبات کو جگانے چمکانے کی ضرورت ہے۔ یہ کام خواتین ہی معقول انداز سے انجام دے سکتی ہیں۔ یہ خاتون شہری ہو خواہ وہ خاتون خانہ ہو یا آفس اسکول دواخانہ وغیرہ میں کام کرتی ہو محلہ داری، دفتری، شہری پریم سبھائیں۔ کلب انجمنیں اور اسوسی ایشن قائم کر کے اسکا کام ہے کہ وہ خواتین کے دلوں میں امن اور شانتی کی دنیا آباد کریں۔ قائم رکھیں۔

(حیدرآباد سے نشر)

منظر بھوپالی

کوئی بچنے کا نہیں سب کا پتہ جانتی ہے
کس طرف آگ لگانا ہے ہوا جانتی ہے

اجلے کپڑوں میں رہو یا کہ نقابیں ڈالو
تم کو ہر رنگ میں یہ خلق خدا جانتی ہے

آندھیاں زور لگائیں بھی تو کیا ہوتا ہے
گل کھلانے کا ہنر باد صبا جانتی ہے

آپ سچ بول رہے ہیں تو پشیماں کیوں ہیں
یہ وہ دنیا ہے جو اپنوں کو برا جانتی ہے

ٹوٹ جاؤں گا بکھر جاؤں گا ہاروں گا نہیں
میری ہمت کو زمانے کی ہوا جانتی ہے

یہ کسی اور ہاتھوں میں نہیں رچ سکتی
حسن والوں کو ہمیشہ سے حنا جانتی ہے

(الہ آباد سے نشر)

تحقیق اور تنقید میں بنیادی فرق

پروفیسر محمود الٰہی

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ الفاظ کے معنی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہی بات اصطلاحوں پر بھی صادق آتی ہے۔ آج جس معنویت کے اظہار کے لئے جو اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کل اس اصطلاح کی معنویت میں کوئی فرق نہ آئے۔

علم و دانش کی دنیا میں خاص طور پر جس علم و دانش کا شعر و ادب سے تعلق ہے اس میں آج دو الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں ——— ایک ہے تنقید اور دوسرا تحقیق۔ دراصل یہ دو اصطلاحیں ہیں جو مدتوں سے رائج ہیں۔ لیکن موجودہ صدی میں جب یونیورسٹی کی سطح پر اردو کی تدریس عام ہوئی تو ان اصطلاحوں کا چلن بھی بڑھا اور انکی معنویت میں اتنی لچک آگئی کہ کبھی کبھی ان دونوں کو ہم معنی اور مترادف اصطلاح سمجھ لیا گیا آج صورت حال یہ ہے کہ دانشوروں کا جو طبقہ شعر و ادب کی خوبیوں اور خامیوں سے یا ان کے متعلقات سے بحث کرتا ہے اسے نقادوں کے زمرے میں رکھا جاتا ہے اور جو اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس شعر کا اصل متن کیا ہے یا اس کا کہنے والا کون ہے یا کس زمانے میں اور کس موقع پر کہا گیا اسے محقق کہا جاتا ہے میں اس بات کی مزید وضاحت کے لئے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ امتیاز علی عرشی مرحوم نے غالب کا جو دیوان مرتب کیا ہے، اسے تحقیقی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور عبدالرحمان بجنوری نے نسخۂ حمیدیہ کے لئے جو مقدمہ لکھا تھا اور جو "محاسن کلام غالب" کے نام سے الگ سے شائع ہو گیا ہے۔ اسے بجنوری کا تنقیدی کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میں دو اور مرحومین کا نام لوں گا: "اردو شاعری پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک نظر" کے خالق پروفیسر کلیم الدین احمد کو نقاد کہا جاتا ہے اور قاضی عبدالودود کو جنھوں نے دوسروں کی غلطیوں کی اصلاح و تصحیح میں ساری عمر گذار دی، محقق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے کی بحث اس وقت بطور خاص شروع ہوئی جب ریسرچ یعنی تحقیق کا وہ نقطۂ نظر سامنے آیا۔ جس کے دائرہ کار میں بڑی وسعت تھی۔ جہاں کسی خطی نسخے کی تدوین یا کسی شاعر کے متداول دیوان کی ترتیب نو کو ریسرچ کا موضوع بنایا گیا اور اس طرح کے تحقیقی کام پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی، وہاں حقائق کی بازیافت، مسلمات کی نئی تعبیر و تفسیر اور شاعروں کے کلام کے تنقیدی مطالعے کو ریسرچ کے موضوعات میں شامل کیا گیا اور اس طرح کے موضوعات پر بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ آج بھی یونیورسٹیوں میں ریسرچ کی جو تعریف کی جاتی ہے اور اس کے جو حدود متعین کئے جاتے ہیں، ان میں حدبندی کے باوجود بڑی وسعت ہے اور آج جو عظیم تنقیدی کارنامے گنائے جاتے ہیں۔ اگر یہ یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری کے لئے لکھے جاتے تو ان پر ریسرچ یعنی تحقیق کی اصطلاح منطبق کی جاتی۔ یوں بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کے ایسے مقالات کی تعداد اچھی خاصی ہے جو عام اصطلاح میں تنقید کے دائرے سے آگے نہیں بڑھے۔

اب تک جو باتیں کہی گئی ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تحقیق و تنقید کے باہمی رشتے سے بحث کرتے وقت ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے تحقیق کا جو دائرۂ کار مقرر کیا گیا ہے وہ وسیع تر ہے اور تنقیدی موضوعات بھی اس میں شامل ہیں لیکن تحقیق و تنقید کی اصطلاحیں ڈگریوں کے حصول تک محدود نہیں ہیں بلکہ عام علمی اور ادبی دنیا میں یہ دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں اور دونوں کا اطلاق علم و ادب کے مختلف کارناموں پر ہوتا ہے یہ تو اصطلاحوں کی بات ہوئی مگر ہمیں تحقیق و تنقید کے بنیادی فرق کو سمجھنے کے لئے ان اصطلاحوں سے آگے بھی جانا پڑے گا۔

میں نے اکثر تحقیق و تنقید کو لازم و ملزوم گردانا ہے اور ایسا کرتے وقت میرے سامنے ان الفاظ کی بے پناہ معنویت رہتی ہے اگر تحقیق نام ہے تلاش حق کا تو کیا یہ تلاش تنقیدی صلاحیت کے بغیر ممکن ہے۔ اگر ہمیں ادبی تاریخ کے اوراق کو مرتب کرنا ہے تو کیا ترتیب کا یہ کام وہ انجام دے سکتا ہے جو قوت نقد سے محروم ہے اگر کسی کو میر و غالب کا شاعری کی تاریخ میں مقام متعین کرنا ہے تو اسے تلاش و تفحص کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔ شاعری کے محرکات کا پتہ لگانا اور اس کے پس منظر سے بحث کرنا جہاں ایک قوت تنقید کا متقاضی ہے تو دوسری طرف تحقیقی صلاحیت بھی اس کی بنیادی شرط مانی جائے گی۔

دراصل ہم سہل پسندی کے شکار ہو گئے ہیں اسی لئے اپنی علمی بے مائیگی پر پردہ ڈالنے کے لئے ہم تحقیق کو تنقید سے جدا کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں اس طرح جو خطی نسخوں پر کام کرتے ہیں وہ فکر و نظر کو اپنے دائرے سے باہر نکال دیتے ہیں اسی کو افراط و تفریط یا عدم توازن کہتے ہیں جنھیں مشرقی علم و ادب سے دلچسپی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محقق کا لفظ قدیم زمانے میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور اس لفظ کا اطلاق عظیم علمی شخصیتوں پر کیا جاتا تھا کیونکہ محقق کا مطلب تھا عالم اور اسکالر۔ جو علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں امتیازی شان کا مالک ہوتا تھا اسی کو محقق کہا جاتا ہے ——— ان شعبوں میں نقد ادب کا شعبہ بھی شامل ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں جب ادبی تنقید کو بجا طور پر ایک مستقل فن کی حیثیت دی گئی اور کچھ لوگوں نے اس فن میں شہرت حاصل کی تو ہر کس و ناکس نے قلم ہاتھ میں لیا اور اپنے کو نقاد کہلائے جانے کے لئے جدوجہد کرنے لگا۔ جب تنقید و تحقیق کے باہمی رشتے سے بحث کی جائے گی تو تو ظاہر ہے کہ اس میں ایسے علم فروشوں اور جہالت مآبوں کی گنجائش کہاں رہے گی۔

علم کی وسعت جہاں بہت سے مباحث کا دروازہ کھول دیتی ہے وہاں وہ بہت سے مباحث کو ناقابل اعتنا بھی قرار دیتی ہے تحقیق کو تنقید کے باہمی منافرت عجز علم کی بیساکھیاں ہیں اور بس۔

(گورکھپور سے)

ترسیل زر کا پتہ
چیف ایڈیٹر
آکاشوانی گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو
۵ فلور، پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱

بھکتی پر فلمیں

احمد سلطان

بھکتی جس کے معنی دین داری، پرہیزگاری، زہد ریاضت، عبادت، پوجا، پرستش نذر کرنا، وقف کرنا ہیں ہر مذہب کا ایک اہم جزو ہے اسی لئے اس کو ہندوستان میں غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ بھکتی کا مطلب اپنے مذہب پر اعتقاد، خدا یا کسی مقدس و متبرک ہستی کا پوجا کے ذریعہ احترام، اس کے لئے قربانی اور دیگر مذہبی عملیات ہیں۔ یہ خدمت سے مختلف ہے۔ بھکتی ہندو اور جین مذہب میں ایک مثالی تحریک ہے۔ بھکتی کا ذکر گیتا میں آتا ہے اس میں اور خدا سے محبت کے عیسائی عقیدہ میں مماثلت پائی جاتی ہے یہ مذہبی احساسات کے اظہار کی قبول عام صورت ہے۔ سنسکرت میں بھکتی کو اعتقاد، وابستگی، وفاداری اور عقیدت کے معنی و مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بھگوت گیتا میں جو غالباً دوسری صدی عیسوی میں لکھی گئی اور جیہ دیو کی گیتا گووندا میں بھکتی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ رادھا کرشنا کی محبت کا ذکر نہایت چاؤ لگاؤ اور عقیدت سے کیا گیا ہے چیتنا نے پندرہویں صدی میں وشنو بھکتی کا پرچار کیا سولہویں صدی کی ایک شہزادی میرا نے جو چوبیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی سب کچھ تج کر کرشن سے لو لگالی اور بھکتی کے کئی گیت لکھے اور گائے جو آج بھی مقبول ہیں۔ کبیر نے ۱۲۰ سال کی عمر پائی اپنے دوہوں کے ذریعے بھکتی کے انمول شہ پارے عوام تک پہونچا کر بھکتی کے تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔ بھکتی کی تحریکوں نے چاہے کرشن بھکتی ہو، رام بھکتی یا شیو بھکتی ہندوستانیوں کے دل میں گہرا اثر قائم کیا۔ کئی مہاتما، سنتوں اور سادھوں نے اپنے مذہبی اعتقادات زہد و ریاضت اور پرہیزگاری کی وجہ سے ہر دلعزیزی پائی اور بھگوان کی طرح ان کو بھی عزت و احترام ملا۔

ہندوستانی فلمی صنعت نے عوام کی پسند اور عقیدت کے پیش نظر بھکتی پر کئی فلمیں بنا کر عوام کا دل جیت لیا۔ فلموں کی ابتدا ہی سے دھارمک فلموں کی طرح کئی بھکتی پر فلمیں بنائی گئیں۔ یوں تو ہر زبان میں بھکتی پر فلمیں بنی ہیں اس مضمون میں صرف ہندی زبان میں بھکتی پر فلموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ دادا پھالکے کی دھارمک فلم راجہ ہریش چندرا کو جو ۳ مئی ۱۹۱۳ء کو ریلیز ہوئی پہلی ہندوستانی فیچر فلم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن جدید تحقیقات سے اس کا علم ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں آر جی تورنے اور این جی چترے کی بنائی ہوئی بھکتی پر فلم پنڈالک پہلی اسٹوری فلم ہے جسے ڈبل پروگرام کے طور پر دکھایا گیا۔ اس طرح بھکتی پر فلمیں ابتدا ہی سے بننے لگی تھیں دھارمک فلموں کی طرح بھکتی پر فلمیں بھی ہندوستانی فلمسازوں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ خاموش فلموں کے دور میں بشمول پنڈالک ۵۰ فلمیں اور بولتی فلموں کے آغاز سے اب تک ۱۲۰ سے زیادہ بھکتی پر فلمیں بن چکی ہیں۔ بھکتی پر فلمیں بنانے والے چند فلم سازوں، ہدایتکاروں اور اداکاروں کا صف اول سے تعلق رہا ہے۔ بھکتی پر فلمیں زیادہ تر بھگوان کے بھکتوں، سنتوں اور سادھوؤں کی زندگی ان کی تعلیمات اور انکی کرامات کا آئینہ ہیں۔ ان سنتوں اور مہاتماؤں کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں اور زبانوں سے ہے ان کے نام ہیں۔ پنڈالک، بلوامنگل، کبیر، نرسنہہ مہتہ، میرا، سنت تکارام، اجامل، داماجی، کالیداس، سنت نام دیو، بھگت گورے کمہار، پیپاجی، چنتامنی، دھرم وجے، تلسی داس، ماناتری، سنت گیانیشور، سنت جنابائی، بھکت شری ایکناتھ، جیہ دیو، چنڈی داس، شنکر آچاریہ، چندراہاسا، رام داس، بھکت وتسلا، ہری مایا، لکشمی داس، امبریش، نرسی بھکت، سورداس، رائے داس، بودنا، رتناول، گوپال بھیا، چیتنیہ مہاپربھو، سنت رگھو اور راہل ہیں۔ سب سے زیادہ بھکتی پر فلمیں میرا پر بنیں اس کے بعد کبیر، پنڈالک، بلوامنگل، گیانیشور اور تلسی داس کا نمبر آتا ہے پنڈالک پر ۳ خاموش اور ایک بولتی فلم بنی بلوامنگل پر پہلی خاموش فلم ۱۹۱۹ء میں ایلفنسٹون بائسکوپ کمپنی نے بنائی جس کی ہیروئن مس گوہر ہے۔ گوہر نے آگے چل کر فلمساز و ہدایت کار چندولال شاہ کی شرکت میں رنجیت مووی ٹون کی بنا رڈالی جسکو فلموں کی پیداوار کے لحاظ سے اولیت حاصل رہی اور جہاں بیک وقت پانچ سے سات فلمیں مختلف سیٹس پر زیر تکمیل رہتی تھیں۔ ۱۹۳۲ء میں مدن تھیٹرز نے بولتی فلم بلوامنگل بنائی جس کے اداکار مسٹر کوپر، نثار اور گہن تھے۔ نثار اور گہن کی جوڑی نے کئی کامیاب فلموں میں کام کیا۔ پرکاش پکچرز نے بھی جس نے بھرت ملاپ (۱۹۴۳ء) اور رام راج (۱۹۴۳) بنا کر شہرت پائی۔ شانتی کمار کی ہدایت میں بھکت بلوامنگل بنائی۔ سہراب مودی جن کو کئی تاریخی فلمیں بنانے اعزاز حاصل ہے منروا مووی ٹون کے لئے مشہور شاعر ڈی این مدھوک کی ہدایت میں فلم بلوامنگل بنائی جس میں اس زمانے کے مشہور گلوکار ثریا اور سی۔ ایچ آتما نے کام کیا۔ مہاتما کبیر جن کو بچپن میں ایک مسلمان جلاہے کی بیوی نے ایک کنوئیں میں پانی پر تیرتا ہوا پایا تھا اور اپنا بیٹا بنا کر پرورش کی ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی نمونہ ہیں ان پر بنی ۶ فلموں میں سے ایک بھگت کبیر (۱۹۴۲ء) میں مشہور ہیرو بھارت بھوشن اور دوسری فلم مہاتما کبیر (۱۹۵۴ء) میں مشہور گلوکار سریندر نے کبیر کے رول ادا کئے۔ میرا پر کئی مشہور فلمیں بنیں۔ پہلی خاموش فلم ۱۹۲۱ء میں کوہ نور فلم کمپنی نے بنائی ۱۹۳۳ء میں قابل فخر ہدایت کار دیوکی بوس نے نیو تھیٹرز کلکتہ کے لئے بولتی فلم راج رانی میرا بنائی جس میں درگا کھوٹے پرتھوی راج اور سہگل جیسے منجھے ہوئے فنکاروں نے حصہ لیا۔ دیوکی بوس نے نیو تھیٹرز کے لئے ایک فلم پورن بھگت (۱۹۳۳) بھی بنائی جس میں مرکزی رول کمار کا تھا۔ ایک راجکمار پر اس کی سوتیلی ماں ڈورے ڈالتی ہے۔ انکار پر راجہ سے شکایت کر کے ہاتھ کٹوا دیتی ہے۔ واضح ٹرک فوٹو گرافی کے ذریعہ ہاتھ کٹنے اور اڑ کر جڑ جانے کے مناظر کو بے حد پسند کیا گیا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق عوام خوب تالیاں بجاتے تھے۔ مشہور نابینا کے۔ سی ڈی کے گیت خصوصاً جاؤ جاؤ اے میرے سادھو رہو گرو کے سنگ بہت مقبول ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں نئی فلم متوالی میرا میں اس زمانے کی مشہور گلوکارہ ممتاز بیگم نے نثار اور سلطانہ کے شانہ بہ شانہ کام کر کے عوام کا دل جیت لیا۔ ۱۹۴۷ء میں دو فلمیں میرا اور میرا بائی پیش کی گئیں۔ فلم میرا کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں میرا کا رول بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکارہ ایم ایس سبالکشمی نے کیا اور اپنی آواز کے سحر سے مسحور کیا یہ فلم ۱۲ فروری ۱۹۸۴ء کو دوردرشن پر دکھائی گئی۔ فلم میرا بائی کو ترقی پسند ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد نے اپنی فلم کمپنی شالیمار کے لئے بنایا اور اپنی بیوی پراسرار نینا کو میرا کے روپ میں پیش کیا۔ اتنی حسین میرا شاید ہی کبھی جلوہ گر ہوگی۔ میرا کا شیام مشہور ہیرو شیام تھا۔ جو فلم شبستان (۱۹۵۱ء) کی فلمبندی کے دوران گھوڑے پر سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ میرا کی آخری کڑی گلزار اور ہیما مالنی کی میرا (۱۹۷۹ء) ہے جس کے گیتوں کی دھنیں روی شنکر نے ترتیب دیں۔ فلم کی باکس آفس پر ناکامی نے گلزار کے حوصلے پست کر دیئے اور شاید اب کوئی اور فلمساز اس موضوع کو فلمانے کی جرأت نہ کر سکے۔

سنت تکارام پر فلموں کی ابتدا خاموش فلموں کے دور میں ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ پربھات فلم کمپنی پونہ نے ۱۹۳۶ء

میں سنت تکارام بنائی جس کے ہدایت کار فتح لال اور ڈاملے تھے۔ مرکزی کردار وشنو پنت پاگنیس نے ادا کیا۔ اسی فلم کو ۱۹۴۸ء میں ہندی میں ڈب کرکے ریلیز کیا گیا۔ اس کو کلاسیکل فلم کا درجہ حاصل ہے۔ عظیم مرہٹی اداکار پاگنیس نے سنت تکارام کے رول کو اس خوبی سے ادا کیا کہ حقیقت کا گمان ہوتا تھا پاگنیس کا جنم گویا بھگتوں کے کردار کے لئے ہوا تھا۔ پاگنیس نے رنجیت مووی ٹون کی فلم سنت تلسی داس (۱۹۳۹ء) اور پرکاش پکچرز کی فلم نرسی بھگت (۱۹۴۰) میں اپنی فطری اداکاری کے جوہر دکھا کر زبردست خراج تحسین حاصل کیا۔ نیو تھیٹرز کی فلم چنڈی داس (۱۹۳۴ء) جس کے ہدایت کار نتن بوس ہیں اور جس میں سہگل نے مرکزی کردار ادا کیا ایک کلاسیکل فلم ہے۔ ایک برہمن اور ایک دھوبن کی عشقیہ داستان ہے اس فلم کے گیت بھی بہت مقبول ہوئے پربھات فلم کمپنی کی سنت گیانیشور (۱۹۴۰ء) جسے فتح لال اور ڈاملے نے بنایا ہندی بھگتی فلموں میں ایک بیش بہا اضافہ ہے ایک ننھے لڑکے کا ایک ودھوان سادھو سے مقابلہ ٹرک فوٹو گرافی کے ذریعہ گائے کی زبان سے منتر پڑھوانا۔ سادھو کا شیر پر سوار ہوکر آنا بچوں کا دیوار کو اڑا کرلے جانا حیرت انگیز مناظر تھے۔ رنجیت مووی ٹون کی فلم بھگت سورداس (۱۹۴۲ء) کو سہگل اور خورشید کی جوڑی کی وجہ سے اہمیت حاصل ہوتی اس جوڑی نے رنجیت کی فلم تان سین (۱۹۴۳ء) میں خوب دھوم مچائی۔ پرکاش پکچرز کی فلم شری چیتنیہ مہاپربھو (۱۹۵۳ء) میں بھارت بھوشن نے اس قدر دل لگا کر کام کیا کہ اسکو بہترین اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔ پہلی سنسکرت فلم آدی شنکر آچاریہ کو صدر جمہوریہ کا طلائی تمغہ ملا۔

بھگتی پر فلموں کے علاوہ بھگتی پر کئی فلموں کے فلمی گیت شامل ہیں ان میں سے بعض بھگتی کے گیت اس قدر مقبول ہوئے کہ آج بھی جب کبھی کوئی مذہبی تقریب منعقد ہوتی ہے تو ان کے ریکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ دوسرے فلمی گیتوں کی طرح ان بھگتی کے گیتوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت سب شوق سے سنتے سر دھنتے اور زیر لب دہراتے ہیں۔ ہر گھریلو فلم میں ایک ایسا گیت ضرور ہوتا ہے جو پوجا یا مصیبت کے وقت گایا جاتا ہے۔ یوں تو بھگتی کے گیتوں کے آغاز سے ہوا لیکن فلم "پکار" (۱۹۳۹ء) میں شیلا کا بھگتی کا گیت ؎ تم بن ہمری کون کھبرے گوردھن گردھاری بہت مقبول ہوا۔ سب سے زیادہ جس گیت کو مقبولیت ملی وہ شاعر پردیپ کا لکھا ہوا امیر کرناٹکی کا گایا ہوا فلم قسمت (۱۹۴۳ء) کا گیت ؎

اب تیرے سوا کون میرا کرشن کنہیا
بھگوان کنارے سے لگا دے مری نیا

ہے۔

ہزاروں بھگتی گیتوں میں سے چند گیت یہ ہیں۔

من تڑپت ہری درشن کو آج (بیجو باورا ۱۹۵۲ء)
رادھا کے پیارے کرشن کنہائی (امر ۱۹۵۴ء)
پہچان سکے تو پہچان کن کن میں چھپا بھگوان (جگت گرو شنکر آچاریہ ۱۹۵۵ء)
بڑی دیر بھئی کب لوگے خبر مورے رام (بسنت بہار ۱۹۵۶ء)
ذرا سامنے تو آؤ چھلیے (جنم جنم کے پھیرے ۱۹۵۷ء)
موہے پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گئیو رے (مغل اعظم ۱۹۶۰ء)
میری پت راکھو گردھاری (گھونگھٹ ۱۹۶۰ء)
بنواری رے مرے جینے کا سہارا تیرا نام رے (ایک پھول چار کانٹے ۱۹۶۰ء)
من موہن مرلی تیری بیرن بن گئی ہائے (پیا ملن کی آس ۱۹۶۱)
جے جے جگدمبے ماتا (گنگا کی لہریں ۱۹۶۴ء)
بڑی دیر بھئی نندلالہ تری راہ تکے برج بالا (خاندان ۱۹۶۵ء)
گووند بولو ہری گوپال بولو (جانی میرا نام ۱۹۷۰ء)
شنکر مورے کب ہونگے درشن تیرے (بیراگ ۱۹۷۶ء)

چاہے کتنی ہی تشدد اور سیکس سے بھرپور فلمیں ہوں جب تک ہندوستان میں مذہب سے لگاؤ سنتوں، سادھوں اور بھگتوں سے عقیدت و احترام باقی ہے۔ دھارمک اور بھگتی پر فلمیں بنتی رہیں گی۔ (حیدرآباد سے)

روزمرہ زندگی میں کیمیا کی اہمیت

میر معظم علی

کیمیاء ایک تجرباتی سائنس ہے۔ یہ سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں مادے کی ساخت ترکیب خواص اور مختلف مادی اشیاء کے آپسی تعملات سے بحث کی جاتی ہے۔ علم کیمیاء کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ زمانۂ قدیم میں جن قوموں نے کیمیاء کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں یونانی، ہندوستانی، چینی، مصری اور عرب شامل ہیں۔ آج کے دور میں سائنس کی اس شاخ نے اتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ ان کے بغیر ہم زندگی میں ایک قدم اٹھا نہیں سکتے۔

قدرتی مرکبات چونکہ ناقص ہوتے ہیں اس لئے کیمیاء دانوں نے انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے مصنوعی مرکبات کی ایجاد کی۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ علم کیمیاء اور کیمیائی اشیاء نے ہماری روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل میں کتنا حصہ ادا کیا ہے۔ جب ہم صبح بیدار ہوتے ہیں تو ہماری نظر سب سے پہلے ٹوتھ پیسٹ یا ٹوتھ پاوڈر پر پڑتی ہے جن میں کیلشیم کاربونیٹ، سوڈیم فلورائیڈ اور منتھال جیسے اجزاء موجود ہوتے ہیں۔ جب ہم شیونگ کا ارادہ کرتے ہیں تو شیونگ اور آفٹر شیو لوشن کا خیال آتا ہے۔ ان میں موجود اہم کیمیائی اجزاء اسٹیرک اور بورک ایسڈ، پھٹکری، منتھال اور ایتھایل الکوحل ہوتے ہیں۔ جب غسل کے ارادے سے ہم حمام کا رخ کرتے ہیں تو ٹائیلٹ صابن یا شیمپو کی ضرورت پیش آتی ہے، جن میں بالوں کی نشو نما کے لئے تیلوں کے علاوہ سوڈیم یا پوٹاشیم اسٹاریٹ موجود ہوتا ہے۔ کپڑوں کو دھونے کے لئے آجکل مصنوعی ڈٹرجنٹ اور واشنگ پاوڈر نے صابن کی جگہ لے لی ہے۔ ان میں سوڈیم سلیکٹس اور سوڈیم الکائل بنزین سلفونیٹ پائے جاتے ہیں جو ہلکے اور بھاری پانی دونوں میں بھرپور جھاگ پیدا کرتے ہیں۔ نہا دھو کر جب ہم ناشتہ کے لئے ٹیبل پر جاتے ہیں تو ہمارے سامنے کھانے کی مختلف اشیاء روٹی، مسکہ ، اور جام وغیرہ ہوتے ہیں۔ روٹی اور چاول میں کاربوہائیڈریٹ۔ مسکہ اور گھی میں چربیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام اجزاء جسم میں تحلیل ہو کر اس کو طاقت اور توانائی مہیا کرتے ہیں۔ اگر کھانے میں انڈا گوشت اور مچھلی بھی ہو تو یہ مطلوبہ پروٹین فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دودھ اور مختلف پھل بھی غذا میں شامل ہوں تو ان سے ضروری وٹامن بھی حاصل ہوتے ہیں جو ہماری بہتر صحت کے ضامن ہوتے ہیں۔

غذاؤں اور مختلف قسم کے جام۔ اسکوائیش اور اچاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے سوڈیم بنزوایٹ اور پوٹاشیم میٹا بائی سلفائیٹ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ گلریسن اور سیکرین کو مٹھاس پیدا کرنے والی اشیاء کے طور پر کام میں لایا جاتا ہے۔ بیکری میں بسکٹ، کیک اور ڈبل روٹی کو خستہ بنانے میں بیکنگ پاوڈر کا ہاتھ ہوتا ہے جو سوڈیم بائی کاربونیٹ اور سوڈیم ہائیڈروجن ٹارٹاریٹ کا آمیزہ ہوتا ہے۔ وناسپتی گھی کو نباتی

تیلوں میں سے ہائیڈروجن گیس کو نکل دھات کی موجودگی میں گذارنے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ چائے اور کافی میں کیمیائی مرکب کیفیلن پایا جاتا ہے جو بدن میں تازگی اور چستی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح تمباکو کا بھی انسانی زندگی میں یہی رول ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے صحت پر مضر اثرات پڑتے ہیں۔ کیونکہ اس میں کیمیائی عنصر نکوٹین ہوتا ہے۔

اس دور جدید میں لباس کو کافی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ لباس ہمارے ذوق اور مزاج کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سوت، ریشم اور اون یہ دراصل قدرتی مرکبات سلولوز اور پروٹین ہوتے ہیں۔ آجکل مصنوعی ریشوں یعنی سنتھیٹک فائبر سے بنے کپڑوں نے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ کیونکہ یہ سوتی اور ریشمی کپڑوں سے زیادہ پائیدار اور انٹی کریز ادھونے میں آسان اور جاذب نظر ہوتے ہیں۔ جیسے ریان، نیلان اور ٹریلین۔ جن میں سلولوز، پولی مائیڈ اور پولسٹر مرکبات پائے جاتے ہیں ڈرائی کلینگ میں پٹرول، کاربن ٹیٹرا کلورائیڈ اور ویسٹروسل جیسے نامیاتی محلل کا استعمال کیا جاتا ہے جس سے کپڑوں کا رنگ روپ برقرار رہتا ہے اور انکی عمر میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ کپڑوں کو پرکشش بنانے کے لئے ان کی رنگ سازی میں مصنوعی خوشنما رنگوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں بعض رنگ خوردنی بھی ہوتے ہیں جن کو مٹھائی اور مشروبات کی تیاری کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

لکھنے پڑھنے کی اشیاء جیسے پن، پنسل اور کاغذ میں گیلک میتھائیل الکوحل، گرائیفائیٹ اور سلولوز موجود ہوتا ہے۔ روشنائی، رنگ، پان اور آئیوڈین کے دھبوں کو دور کرنے میں ہائیپو، اوکسیلک السڈ وشکر کا آبی محلول استعمال ہوتا ہے۔ اگر آپ گرہست خاتون ہیں تو کیمیا ایک وفادار خادم کی حیثیت سے آپ کی خدمت میں ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جب آپ باورچی خانہ کا رخ کرتی ہیں تو آپ کو وہاں سب سے پہلے ایندھن کی ضرورت پیش آتی ہے۔ آج کل کوئیلے کی جگہ کیمیائی ایندھن نے لی ہے۔ جیسے مٹی کا تیل، لیکوفائیڈ پٹرولیم گیس۔ سگریٹ لائیٹر میں مائع گیس استعمال ہوتی ہے۔ یہ تمام مرکبات پٹرولیم سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ پٹرولیم سے حاصل ہونے والی دوسری اشیاء میں پٹرول، ڈیزل اور گیسولین ہیں جن کو موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں میں استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ پیرافین ویکس کو ہر قسم کے مرہم کی تیاری، جوتے کی پالیش اور موم بتیوں کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے تارکول کو سڑکوں کی تعمیر میں اور کوک کو بطور ایندھن استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

خواتین اپنے حسن کو نکھارنے کے لئے میک اپ کا سہارا لیتی ہیں جو ایک فطری بات ہے اس میدان میں کیمیا نے اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ حسن کو نکھارنے والی اشیاء یعنی کاسمٹکس جیسے فیس پاؤڈر، لپ اسٹک وینشنگ کریمس، نیل پالش، بالوں کا خضاب اور مانگ بھرنے کے لئے استعمال کئے جانے والا سیندور کیمیائی مرکبات کی دین ہے۔ جنکی بدولت بیوٹی پارلرس خواتین میں دن بدن مقبول ہوتے جارہے ہیں۔

عطریات اور خوشبوئیں انسانی دماغ کے لئے تسکین کا باعث اور روح پرور ہوتی ہیں۔ قدرتی عطر مہنگے اور کمیاب ہوتے ہیں جب کہ مصنوعی عطر سستے اور دل خوش کن ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ عوام میں کافی مقبول بھی ہیں۔ ان کو مختلف قسم کے سینٹس، اسپرے اور اگربتی کے مسالے تیار کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے Terpenyl Acetate اور Geraneol گلاب اور انگلش لیونڈر کی خوشبو کا احساس دلاتے ہیں۔ مٹھائی آئسکریم اور مختلف قسم کے کیکس کو خوش ذائقہ بنانے میں مصنوعی خوشبودار مرکبات اور ایسنز کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے و نیلا آئسکریم میں Vanilline استعمال ہوتا ہے۔ مصنوعی مشروبات جیسے سوڈا، لیمن وغیرہ میں اہم کیمیائی جز کاربن ڈائی اکسائیڈ، فاسفورک ایسڈ اور اسٹیرک ایسڈ موجود ہوتے ہیں۔

پلاسٹکس اور پولیمرس نے ہماری روزمرہ زندگی کی ضروریات کی تکمیل میں زبردست رول ادا کیا ہے۔ نرم اور ملائم اشیاء جیسے اسپنج سے لے کر شعلہ فشاں راکٹ اور مصنوعی سیاروں کی تیاری میں جہاں دھات بخارات بن کر اڑنے لگتی ہے وہاں پلاسٹک ہی کارآمد ثابت ہوا ہے۔ جیسے پولیتھیین، پولیاشاورین میلامن۔ پولی یوریتھن اور ٹیکیلائیٹ کو واٹر پروف گھریلو برتن، ریڈیو و ٹی۔ وی کے کیبینیٹ، ٹیبل ٹاپس الکٹرک وائیرنگ، گراموفون، ریکارڈس، نہ ٹوٹنے والی کراکری اور اسپنج کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مصنوعی ربر موٹر کاروں اور ٹرکس کے ٹائیر و ٹیوب میں مستعمل ہوتا ہے۔

مصنوعی پولیمرس جیسے آرکیلک نے وارنش اور پنٹیس کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ خوشنما، جاذب نظر، چمکدار ہونے کے علاوہ واٹر پروف اور جلد خشک ہونے والے مرکبات ہوتے ہیں۔

ایرکنڈیشنگ اور ریفریجریشن کے جدید طریقوں میں مایع اموینا، سلفر ڈائی آکسائیڈ اور فرزون جیسے مرکبات کا استعمال ہوتا ہے۔

آج کل زراعت میں زمین کو قابل کاشت بنانے اور بہتر غذا کی فراہمی میں کیمیائی اشیاء کا بہت بڑا دخل ہے۔ امونیم سلفیٹ، سوپر فاسفیٹ اور یوریا جیسی مصنوعی کھاد یعنی فرٹیلائیزرز کا استعمال بہتر فصل کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ پھلوں کو مصنوعی طور پر پکانے کے لئے گیس استعمال ہوتی ہے۔

عمارتوں کی تعمیر کے شعبے میں علم کیمیا نے ہمارے رہائش کے معیار کو بلند کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے فلک بوس عمارتوں اور بندوں کی تیاری میں چونا اور سمنٹ استعمال ہوتے ہیں جن میں کیلشیم ہائیڈرو اکسائیڈ، کیلشیم کاربونیٹ اور ایلیومینیم کے Silicates موجود ہوتے ہیں۔

فوٹوگرافی میں سلور برومائیڈ اور ہائیپو کا استعمال ہوتا ہے۔ شیشہ سازی میں کیلشیم اور سوڈیم سلیکیٹس استعمال ہوتے ہیں۔ جب کہ آئینہ سازی میں سلور نائیٹریٹ اور ٹارٹارک ایسڈ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ریڈیو ٹرانسسٹر ٹی۔ وی اور کمپیوٹر کی تیاری میں سلیکن، جرمینیم گیلیم اور ان کے مرکبات مستعمل ہیں۔

صحت کی برقراری اور روزمرہ زندگی کی ضروریات میں پانی کے استعمال کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لئے اس میں چونا، پھٹکری، کیلگون، کلورین گیس اور دھونے کے قابل بنانے کے لئے واشنگ سوڈا اور کیلگون جیسے مرکبات کو استعمال کیا جانے لگا ہے۔

آج کل بازار میں اگربتی کی شکل میں بکنے والی مچھر بار داؤن Pyrathion اور Malathion جیسے مرکبات موجود ہوتے ہیں۔

طب اور عمل جراحی میں ادویاتی کیمیا نے بڑا انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس میدان میں اس نے بنی نوع انسان کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ کیمیا کی یہی شاخ ہماری بہتر صحت کی ضامن اور طویل عمر کا باعث بنتی ہے۔ اس کی بدولت مہلک امراض جیسے چیچک طاعون اور تپ دق کا مکمل خاتمہ ممکن ہوسکا ہے۔ اور کوئی عجب نہیں کہ مستقبل میں کینسر اور ایڈس جیسی جان لیوا بیماریوں کا علاج ممکن ہوسکے۔ اور اس فتح کا سہرا یقیناً سائینس کی اس شاخ یعنی "علم کیمیا" کے سر ہوگا۔

(حیدرآباد سے نشر)

فرید تنویر

رنج ہوتا، نہ خوشی ہوتی، نہ صدما ہوتا
کاش ہیں بھی کوئی ٹوٹا ہتا ہوتا
دھن کو کیوں ابر کرم کہتے ہیں دنیا والے
ابر ہوتا تو یہ کٹیا پہ بھی برسا ہوتا
ان اجالوں نے تو دنیا کا سکوں چھین لیا
روشنی سے تو بہتر تھا اندھیرا ہوتا
ماہ تاباں ہی سہی کام کا میرے تو نہیں
دیپ ہوتا تو مرے گھر کا اجالا ہوتا
آرزو دل کی گہر بار تو ہوتی تنویر
ابر نیساں کی طرح کاش وہ برسا ہوتا

(ناگپور)

ضدّی بچوں کی اصلاح

سلطانہ جلیل قزلباش

سماج، قوم اور ملک کا سب سے اہم سرمایہ بچّے ہوتے ہیں انھیں پر قوم اور ملک کے مستقبل کا دار و مدار ہوتا ہے۔ بچوں کو اچھے شہری بنانا والدین کے لئے ان کا صرف نجی معاملہ نہیں بلکہ ملک اور قوم کے لئے ان پر ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے جس کو بخوبی نبھانا بچوں کے والدین اور ہر اس شخص کا فرض ہے جو بچوں کی تربیت کا ذمہ دار ہے۔

بچے پیدائشی طور پر مختلف مزاج کے ہوتے ہیں کچھ سنجیدہ اور سیدھے ہوتے ہیں تو کچھ شریر اور شوخ۔ لیکن ضد کی عادت بچوں میں پیدائشی نہیں ہوتی، بلکہ اس ماحول کی دین ہوتی ہے جس میں بچہ پرورش حاصل کرتا ہے۔ ماحول کا گہرا اثر بچوں کے ذہنی نشو نما پر پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ طرح طرح کی اچھی یا بری عادتوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بچوں میں ضد کی عادت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی ذہنی نشو نما کا ماحول صحیح نہیں ہے، ضرور کہیں کوئی خامی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ضدّی بچوں کی اصلاح کے لئے سب سے پہلے اس ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ جس میں وہ پرورش پا رہا ہے۔

بچوں کے لئے سب سے اہم چیز محبت ہے جس کو حاصل کرنا ان کا پیدائشی حق ہے۔ بچّے کو اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ اس کے والدین اس سے محبت کرتے ہیں، اگر یہ محبت اور شفقت بچّے کو حاصل نہ ہو تو اس میں ذہنی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں بچّہ ضدی ہو سکتا ہے فطرتاً بچہ اپنے لئے ایک مثالی شخصیت یا آئیڈیل کی تلاش میں رہتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اس کو اپنے والدین میں تلاش کرتا ہے اگر والدین میں محبت اور خلوص ہے تو بچے کا حساس دماغ اسے محسوس کر لیتا ہے اور وہ والدین ہی کو اپنا آئیڈیل مان لیتا ہے۔ اور انھیں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے، ایسا بچہ عام طور پر فرمانبردار ہوتا ہے۔ اگر وہ والدین میں اپنے لئے محبت کی کمی پاتا ہے تو والدین اس کے لئے آئیڈیل نہیں رہتے، پھر وہ اپنی مثالی شخصیت کہیں اور تلاش کرتا ہے، لیکن اب وہ بھی اپنے والدین کی محبت حاصل کرنے کے اپنے پیدائشی حق سے دست بردار نہیں ہوتا بلکہ اور مضبوطی سے ان کا دامن پکڑ لیتا ہے، ان کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لئے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔ زور زور سے رونا اور ضد کرنا یہی وہ طریقے ہیں جو لاشعوری طور پر بچّہ والدین کی محبّت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی لئے ضدّی بچوں کی اصلاح کے لئے ان کو محبت کا احساس دلانا ضروری ہے۔

بچّوں پر سختی کر کے ان سے اپنی بات منوانا، یا بغیر کسی مقصد کے ان پر اپنا رعب ڈالنا ہی بچوں میں ضد کی عادت کا خاص سبب ہے۔ اکثر والدین کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کا بچّہ گھر پر تو ذرا ذرا سی بات پر ضد کرتا ہے اور کسی کی کوئی بات نہیں مانتا لیکن اسکول میں اس کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے۔ اسکول کی ہر بات اس کے لئے پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق اس کی وجہ یہ ہے کہ گھر سے نا امید اپنے آئیڈیل کی تلاش میں بچّہ ٹیچر ہی کو اپنا آئیڈیل بنا لیتا ہے اور یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ مس جو بات بھی بتائیں گی وہ اس کے لئے اچھی اور بھلائی کی ہی ہوگی۔ اس بچّے کے نزدیک دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ احترام شخصیت اسکول کی ٹیچر ہی ہو جاتی ہے، اب وہی بچّہ جو گھر میں ضد کرتا تھا اسکول پہونچ کر نہایت فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اگر بچّے کے گھر والے بھی اس میں اس طرح کا اعتماد اپنے لئے پیدا کر سکیں تو اس کی ضد کی عادت خود بخود سدھر جائے گی۔

اکثر بچوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے، عام طور پر عمر میں بڑے لوگ بچوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اگر بچہ بڑوں کے بیچ میں بولے یا اپنی رائے دینے لگے تو اسے ڈانٹ کر خاموش کر دیا جاتا ہے اور اسے یہ سمجھایا جاتا ہے کہ بڑوں کے بیچ میں بولنا بدتمیزی ہے، ایسا کرنے سے بچّوں کی خود اعتمادی مجروح ہوتی ہے، جو نفسیاتی الجھنوں اور ان میں احساس کمتری کا باعث بنتی ہے اور نتیجتاً بچہ ضدّی ہو جاتا ہے، اس لئے بڑوں کو چاہیئے کہ بچّوں کی باتوں کو توجہ سے سنیں اور ان کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کریں ان کے سوالوں کا معقول جواب دیں اور بچّے کی کسی اچھی بات کو لے کر اس کی تعریف اور ہمت افزائی کریں اس طرح بچے میں خود اعتمادی پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتا اور نہ ہی دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے ضد کا سہارا لیتا ہے۔ ضدّی بچہ چونکہ عام طور پر عدم خود اعتمادی اور احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے، اس لئے اس کی اصلاح کرنے کے لئے ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اگر بچّہ کسی غیر مناسب چیز کے لئے ضد کرے تو ڈانٹ ڈپٹ اور سختی کے بغیر اس کی توجہ بہت ہوشیاری سے کسی ایسی چیز کی طرف موڑنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس سے اس کو دلچسپی ہو، زور، زبردستی اور مار پیٹ ضدی بچّے کو اور زیادہ ضدی بنا دیتا ہے۔

بچوں میں خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں، اگر انھیں پھلنے پھولنے اور اجاگر کرنے کے صحیح اور بروقت مواقع مل جائیں تو وہی ضدّی بچہ ایک دن زبردست کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اکثر بچوں کا رجحان پڑھائی سے زیادہ مصوری موسیقی یا کھیل کود کی طرف ہوتا ہے لیکن اکثر والدین کے چند مفروضہ معیار شرافت ایسے رجحانات کی ہمت افزائی نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک گانا بجانا ایک غیر معیاری فعل ہے اور کھیل کود محض تضیع اوقات۔ اگر مناسب طریقے پر ان کی خداداد صلاحیتوں کی دیکھ بھال اور ہمت افزائی کی جائے تو تعجب نہیں کہ وہی بچہ آگے چل کر ایک کامیاب فنکار کی حیثیت حاصل کرے۔

بچّوں میں ضد کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بڑوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اکثر اپنی غلطیاں بھی ان سے منوا لیتے ہیں۔ ایسا ان گھروں میں ہوتا ہے جہاں کا ماحول نظم و ضبط سے کافی دور ہے اور جہاں اصولوں کی سختی سے پابندی نہیں ہوتی۔ اگر گھر کا نظام نظم و ضبط کے ساتھ چل رہا ہو اور ہر چیز میں اصول اور پابندیاں ہوں تو بچہ خود بخود اپنے کو اس ماحول میں ڈھال لے گا اور چونکہ اسے اس بات یقین ہو گا کہ ہر بات اصول اور قاعدے کے مطابق ہی ہو گی تو وہ کسی طرح کی بے جا ضد کو حصولِ مطلب کے لئے بے سود سمجھے گا۔

پرانے معاشرے کے مشترک خاندانوں میں جہاں دادا، دادی یا نانا، نانی کے سامنے بچے کے والدین اپنے منہ بھی نہیں کھولتے وہاں بچّے اپنے والدین کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور اس طرح والدین کی اپنے بچوں کے لئے اصلاحی کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔

اپنی جا و بے جا باتوں کو منوانے کے لئے بچہ سیدھا دادا، دادی یا نانا، نانی کے پاس پہونچ جاتا ہے اور والدین کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر اپنی بے جا بات بھی ضد کے ذریعے منوا لیتا ہے۔ اس طرح اس کو ضد کرنے کی عادت سی پڑ جاتی ہے، اور اس کے لئے ڈسپلن کی بندشیں کوئی ایسی بندشیں نہیں رہ جاتیں جو توڑی نہ جا سکیں۔ حالانکہ ضدی بچے کو سدھارنے کے لئے اسکو سخت ڈسپلن کی بندشوں

(آگے ص ۷ اپر)

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے

ڈاکٹر ریحان غنی

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں سب نے اخلاقیات کی تعلیم دی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسان کس طرح زندگی گذارے کہ اس سے اس کا بھی بھلا ہو اور دوسروں کا بھی۔ کسی مذہب نے بھی انسان کو اپنی زندگی اپنے ہی ہاتھوں تلف کرنے یا دوسروں کی جان و مال عزت و آبرو کو برباد کرنے کی تعلیم نہیں دی ہے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ آج ہم اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہلاکت کا سامان مہیا کرتے جا رہے ہیں اور اس کی ہمیں کوئی فکر نہیں کہ مستقبل میں ہمارے ہی معاشرے میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے

آج ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار ہے ان میں ایک بڑا مسئلہ شراب نوشی اور منشیات کی عادت بھی ہے بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مسئلہ تمام ترقی پذیر ملکوں کے لئے ایک سنگین مسئلہ بن گیا ہے اور اس لعنت کا شکار نوجوان طبقہ ہو رہا ہے۔ جس کے کندھوں پر اپنے ملک کو ترقی کی منزل پر لے جانے کی ذمہ داری ہے۔ ایسی صورت میں شراب نوشی اور منشیات کا استعمال ترقی پذیر ملکوں میں صحت کے لئے نقصان دہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سماجی اور معاشی مسئلہ بھی بن گیا ہے۔ عالمی صحت تنظیم نے اپنی سالانہ رپورٹ میں بھی اس مسئلہ پر تشویش ظاہر کی ہے اور اس کے انسداد کے لئے ایک جامع پروگرام بنانے کا مشورہ دیا ہے۔

ہمارا ملک بھی ترقی پذیر ملک ہے اور ابھی اسے بہت آگے جانا ہے۔ ایسی صورت میں اگر نئی نسل مختلف قسم کی نشہ آور اور خواب آور دوائیاں استعمال کرنے لگے تو یقیناً یہ تشویش کی بات ہے۔ خاص طور پر طلبا اگر اس لعنت کا شکار ہوتے ہیں تو یہ اور بھی سنگین ہے کیونکہ یہی وہ طاقت ہے جس سے ملک مستحکم اور مضبوط ہوتا ہے۔ انڈین میڈیکل ریسرچ کونسل کی ایک جائزہ رپورٹ میں جو باتیں منظر عام پر آئی ہیں اس کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا ہے کہ طلبا کو اس لعنت سے نجات دلانے کے لئے بھرپور کوششیں کی جائیں ورنہ ہمیں مستقبل میں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ کونسل کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ذہین اور اچھے طلبا کند ذہن طلبا کے مقابلے میں زیادہ منشیات کا استعمال کرتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ منشیات کا عام استعمال امتحانات کے وقت میں ہوتا ہے اور زیادہ تر طلبا منشیات کا استعمال تھکان دور کرنے یا ذہنی ہیجان کم کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ کچھ طلبا یہ سوچ کر منشیات کا استعمال کرتے ہیں کہ اس سے ان کی یادداشت تیز ہو جاتی ہے جائزہ میں بتایا گیا ہے کہ بڑے شہروں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اوسطاً ۲۵ فی صد طلبا منشیات کا استعمال کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عمرانیات کے ایک پروفیسر کا خیال ہے کہ منشیات کا استعمال کرنے کی خاص وجہ اساتذہ اور طلبا کے درمیان گہرے تعلقات اور روابط کی کمی ہے اور اسی دوری نے طلبا کو مختلف طرح کی برائیوں میں مبتلا کر دیا ہے جن میں شراب نوشی اور منشیات کا استعمال شامل ہے۔ آج نئی نسل کو اس لعنت سے بچانے کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ ہمارا معاشرہ اتنا کمزور، اتنا خراب اور اتنا گھناؤنا ہو جائے گا کہ ہمیں خود شرم محسوس ہونے لگے گی۔ اس کے لئے ہر سطح پر کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف تنہا حکومت کوئی کام بھی انجام نہیں دے سکتی۔ وہ کوئی بھی کام کرنے کے لئے ذرائع اور وسائل فراہم کر سکتی ہے اس پر عمل کرنا تو دراصل عوام کو ہے۔ ملک کے اندر جس تیزی سے منشیات اسمگلنگ ہو رہی ہے وہ ہمارے لئے تشویش کا باعث ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں نشیلی چیزوں کو ضبط کئے جانے کی خبریں آئے دن ملتی رہتی ہیں۔ لوگوں کو سزائیں بھی ہوتی ہیں۔ لوگ پکڑے بھی جاتے ہیں۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اگر ہم اس پر سنجیدگی سے غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبات میں بھی لوگ کسی نہ کسی نشہ کے استعمال کے عادی ہیں۔ اب تو عالم یہ ہے کہ کم سن بچے بھی خواب آور اور نشہ آور دوائیں استعمال کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ پرانی اور نئی نسل، طلبا اور اساتذہ اور اصلاح معاشرہ کا کام انجام دینے والی تنظیموں اور عوام کے درمیان روابط اور اعتماد کی کمی ہے۔ پرانی نسل نئی نسل کو اور نئی نسل پرانی نسل کو، طلبا اساتذہ کو اور اساتذہ طلبا کو شکوک اور شبہات کی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پورا معاشرہ ایک ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے مصنوعی طریقے سے ذہنی سکون حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ منشیات کا استعمال دراصل حقیقت سے فرار کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اس کے استعمال سے ہمیں وقتی طور پر ذہنی آسودگی اور سکون ضرور مل سکتا ہے لیکن ہم دائمی طور پر دماغی اور جسمانی کمزوری کے بھی شکار ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم گرتوں کو تھامیں اور معاشرے سے اس لعنت کو ختم کرنے کی منظم کوشش کریں۔ کیونکہ ؎

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

(پٹنہ سے نشر)

بقیہ :- ضدی بچوں کی اصلاح

میں رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس میں تمام گھر کے افراد کا تعاون چاہئے۔ اچھے اسکولوں کے ہاسٹلز میں نظم و ضبط کی بہت سختی کے ساتھ پابندی ہوتی ہے۔ اور مقررہ وقت پر اٹھنا، ورزش کرنا، نہانا، کھانا، پڑھنا، کھیلنا و سونا ضروری ہوتا ہے۔ ہاسٹل میں بچے ان تمام پابندیوں پر عمل کرنے میں کوئی بھی دشواری محسوس نہیں کرتے اور اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ضد کے ذریعہ وہ ان تمام پابندیوں میں سے کسی ایک کو بھی توڑ کر اپنی من مانی کر سکتے ہیں۔ ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہیں۔ اگر گھروں میں بھی اسی طرح کا ڈسپلن قائم کیا جا سکے اور اصولوں پر عمل کرنے کا بچوں کو عادی بنایا جا سکے تو ضدی بچوں کی اصلاح کا کوئی مسئلہ نہیں رہ جائے گا لیکن بات وہیں آجاتی ہے کہ بچوں کی اصلاح کرنے والے خود کتنے پانی میں ہیں

سچ تو یہ ہے کہ اصلاح کی ضرورت ضدی بچوں کو نہیں بلکہ اس ماحول کو ہوتی ہے جس میں وہ پرورش پاتے ہیں۔

(آکاشوانی لکھنؤ سے نشر)

سلطانہ جلیل قدوائی معرفت
ڈاکٹر جے۔ آر۔ قدوائی
اسسٹنٹ ڈائرکٹر سی۔ ڈی۔ آر۔ آئی۔ لکھنؤ۔

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار

نجمہ بانو حسن

یہ عنوان سن کر آپ لوگ بے شک حیران ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ اس موضوع پر بولنے کی جرأت کرنا جوئے شیر لانے سے ہرگز کم نہیں ہے۔ مگر ہم بھی آج سر سے کفن باندھ کر تیار ہوئے ہیں۔ میرا جو کچھ حشر ہوگا اس کا اللہ مالک ہے۔

ویسے اگر آپ لوگ ایمانداری سے کام لیں تو میرے خیال میں یہ تسلیم کریں گے کہ یہ مسئلہ کسی ایک فرد کا نہیں بلکہ ہم سب کا ہے۔

یہ رشتے دار بھی بس عجیب چیز ہوتے ہیں واقعی عجوبہ ہیں عجوبہ۔ آپ لاکھ سر پٹخ ڈالئے کوششیں کر ڈالئے مگر ان کو خوش اور راضی کرنا ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ رشتے دار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو کھلے عام بغاوت پر آمادہ رہتے ہیں اور ایک وہ جن کے لئے منافق سے بڑھ کر کوئی دوسرا لفظ نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری قسم بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر خاندان میں کہیں شادی بیاہ کی سُن گن مل گئی تو ان حضرات کے پیٹ میں بڑے زوروں کا درد شروع ہو جاتا ہے جس کی شدت سے بیقرار ہو کر یہ فوراً حرکت میں آجاتے ہیں پہلے تو باہر ہی باہر تفتیش کی جاتی ہے۔ پھر گھر کے اندر پہنچ ہو جاتی ہے۔ اور گھر والوں سے ہمدردی دِکھا دِکھا کر کسی ماہر سی آئی ڈی آفیسر کی طرح سب کچھ اگلوا لیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے کچھ مخصوص مکالمے اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اے واہ بہن ہم کو بالکل غیر سمجھا جو یوں بالا بالا بات طے کی۔ اے ہم تمہارے ہی ہیں تمہارا بھلا ہی چاہیں گے۔ جیسے تمہاری بچی ویسے ہی میری بھی خدا اس کا نصیب اچھا کرے کچھ بتاؤ تم نے کہاں بات طے کی ہے۔ اے ہاں بھلا میں پتہ تو لگاؤں کیسے لوگ ہیں کیا خاندان ہے۔ سنو بی بی ایسے اکیلے اکیلے طے کرو گی تو خدانخواستہ نقصان اٹھاؤ گی تم اکیلی جان کیا معلوم تم ٹھیک پتہ لگا بھی پاؤ یا نہیں۔ یہ کام تم مجھے سونپ دو سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے آجائے گا۔ ایسے کسی نے کہہ دیا کہ خاندان اچھا ہے اور تم مان گئیں۔ دیکھو میں کہتی ہوں کہ آج کل بنے ہوئے سیدوں، صدیقیوں سے ہوشیار رہنا۔ وہ ایسا کچھ دہلاتیں کہ آدمی بیچارہ ان کو اپنا سب سے بڑا ہمدرد جان کر سارا راز اگل دیتا ہے۔ بس! پھر دیکھئے وہاں سے نکلنے کے بعد ان کے رنگ، خاندان بھر میں ہیروئن بن جاتی ہیں اتنا بڑا پالا مار کر اپنے کو بہت بڑا فاتح تصور کرتی ہیں اپنی ہی جیسی ساتھیوں کو ساتھ لیے سر اکڑا اکڑا کر فخر یہ انداز میں سلا قصہ کچھ اس طرح دوہرایا جاتا ہے۔

ارے وہ بڑی سیانی ہیں وہ بھلا کیا بتاتیں مجھ کو، مگر میں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی ایک ایک بات اگلوا لی بندی سے اونہہ بہت بنتی ہیں کہ اچھے گھر میں رشتہ طے کیا ہے۔ ارے میں تو ریزے ریزے سے واقف ہوں جانے کن اوچھوں چھچھوروں میں طے کر دیا۔ کہتی تو ہیں کہ لڑکا ڈاکٹر ہے ضرور ہوگا بھئی آج کل جانوروں کے ڈاکٹر ٹیلے ٹیلے گھومتے ہیں اے رشوت کھا کھا کر دوا اینٹ کی دیوار کیا کھڑی کر لی کہ وہ شاندار گھر ہو گیا۔ بھئی بتائیں جا کے اس کو جو کچھ جانتا نہ ہو لیجئے ان بیچاروں کا ستیاناس کر دیا موصوفہ نے۔ اب پورے خاندان میں بات اڑ گئی کہ لڑکا جانوروں کا ڈاکٹر ہے رشوت خور ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تمام خاندان والوں کے ہاتھ ایک چٹپٹا موضوع آگیا جو ایک دوسرے کو بار بار نئے نئے رنگ میں سنایا جاتا۔

جو کچھ زیادہ اسمارٹ ہوتیں اکثر وہ ان لوگوں تک بھی پہنچ جاتیں جن میں رشتہ طے ہوا ہے۔ اور سمدھن سے تو ایسے ملتیں کہ واقعی ملنے کے لئے کیا ترس رہی تھیں۔ اپنی اداؤں سے وہ جلد ہی سمدھن کو بھی راضی کر لیتیں مثلاً اے بہن آپ لوگ تو بہت شریف نکلے میں نے تو خدا معلوم کیا کیا سن رکھا تھا۔ مگر بہن میں تو خدا لگتی کہوں گی وہ لوگ لاکھ میرے عزیز رشتہ دار صحیح لیکن میں تو ایمان کی بات جانتی ہوں۔ کہاں بھلا آپ اور کہاں ...... اب سمدھن کا چونکنا فطری تھا ان کے استفسار پر فرماتی۔ ہوگا چھوڑیے یہ نگوڑی زبان یونہی سچی بات کہنے میں پھسل جاتی ہے۔ بعد میں آپ تو الگ ہو جائیں گی اور میں پکڑی جاؤں گی۔ لیجئے! ان کو ہشکا کر آپ نو دو گیارہ ہو گئیں۔

اگر خاندان میں کوئی خوشحال ہے تو اس کی وہ گتیں بنتی ہیں کہ اللہ توبہ۔ اے لو بھلا فلاں کی دلہن کو دیکھو ہر وقت ایسا سجی بنی رہتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی محفل میں جا رہی ہوں بھئی شریفوں کے یہاں کے یہ قاعدے تو نہیں ہوتے دوسری فرماتیں ارے بھئی ایسا بھی کیا چھچھورا پن کہ جو کچھ اپنے پاس ہے وہ سب لاد لیا گیا۔ آخر میرے پاس بھی اتنا کچھ ہے کیا لوگوں کو دکھانے کی خاطر میں بھی یہی کروں؟ بھئی سادگی نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

اگر کوئی شامت کی ماری سادگی پسند ہیں تو ان کے ساتھ بے جا ہمدردیاں ہونے لگتیں۔ آپس میں کُھسر پُھسر ہوتی کہ معلوم ہوتا ہے ان کے میاں کا کام ٹھیک ٹھاک نہیں چل رہا ہے دیکھو غریب کے ہاتھ میں کل دو دو چوڑیاں پڑی ہیں۔ فلاں کے یہاں محفل میں آئیں تھیں کہ دوپٹہ میں کچھ ٹنکا بھی نہیں تھا۔ بھئی یہ سادگی وادگی تو سب ڈھونگ ہے ایسی بھی کیا سادگی کہ آدمی شادی بیاہ میں نہ پہنے اوڑھے ارے یہ موقع آتے کاہے کے لئے ہیں بھئی میری مانو تو دال میں کچھ کالا ہے ضرور۔

اگر کسی کی فرسٹ ڈویژن آجاتی یا خدانخواستہ کوئی ٹاپ کر لیتا تو بھی خاندان والوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ منھ پر تو خوب شاباشی دی جاتی ہے مگر ادھر پیٹھ مڑی ادھر اس غریب کو ایسی قہر آلود نظروں سے گھورا جاتا گویا کہ اس نے یہ امتیاز اخلاقی حدود سے باہر جا کر حاصل کیا ہو۔ آپس میں چہ میگوئیاں ہوتیں کہ بہت دیکھے ہیں ایسے قابل، ارے پڑھ لکھ کر فرسٹ کلاس آئے تو کوئی بات بھی ہے ایسے نقل کر کے فرسٹ ڈویژن لے آنا کیا مشکل ہے ایک ہمارا لڑکا ہے پڑھ پڑھ کر دبلا ہوا جا رہا ہے مگر فرسٹ ڈویژن آتی ہی نہیں ارے کوئی ہنسی کھیل تو ہے نہیں ادھر تاک جھانک کے کتابیں رکھ کے امتحان دے دیا اور جھنڈے پر یہ جھولنے لگے کہ فرسٹ ڈویژن آگئی۔

اگر خاندان میں یا باہر آپ کی کسی سے دوستی ہے اور آپ لوگ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہوتے ہیں تو لیجئے صاحب ادھر اعتراض ہو گیا کہ فلاں سے بہت چھن رہی ہے آخر بات کیا ہے۔ مانو نہ مانو کچھ ہے گڑبڑ۔

بدقسمتی سے اگر آپ کی دوستی کسی ایسے شخص سے ہو گئی جو خود یا اس کے خاندان کا کوئی فرد کسی باعزت عہدے پر فائز ہے تو آپ کے یہاں کی ساری ترقیاں انہیں کے مرہون منت کر دی جائیں گی اگر نوکری مل گئی ہے تو کہا جائیگا کہ اتنے راہ و رسم ہی اس لئے بڑھائے گئے تھے مطلب کی دوستی ہے۔ خدانخواستہ کسی اچھے کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا تو بھی انہی بیچارے کو صلواتیں سنائی جائیں گی۔ اے سب انہی کم بخت کا کیا دھرا ہے ورنہ ان میں بھلا کیا صلاحیت

خدا نہ کرے اگر آپ نے اپنے یہاں کسی تقریب کا اہتمام کیا ہے تو بس شامت بلا لی۔ پھر تو آپ کی بد انتظامی

پھوہڑپن کو اس قدر ادھیڑا جائے گا کہ آپ خود اپنے کو بدسلیقہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے آپ کی ہجو کے ساتھ، ساتھ اپنی مدح کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ارے ایک ہمارے میاں کا انتظام تھا کیا مجال کچھ الٹا سیدھا ہو بہن تم نے ہم ہی سے مشورہ لے لیا ہوتا تو کم سے کم اتنا پھوہڑپن تو نہ نظر آتا۔ اور آپ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی کیونکہ عافیت بھی اسی میں ہوتی ہے۔

کبھی کبھی تو معاملہ حد سے زیادہ گذر جاتا ہے ہماری ایک عزیز دوست اپنے عزیز داروں کا زبردست شکار ہو گئیں۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ وہ بازار سے گھر کے لئے کچھ نئی چادریں اور پلنگ پوش وغیرہ خرید کر لائی۔ اس وقت گھر میں اسی قسم کی ایک خاتون براجمان تھیں۔ انھوں نے بڑے اشتیاق اور بے تابی سے سارے پیکٹ کھلوا کھلوا کر دیکھے بڑی تعریف کی۔ ہماری دوست کے ذوق کی بہت داد بھی دی اور بعد میں سارے میں مشہور کر دیا کہ ان کے یہاں بڑا سامان خرید، خرید کر آرہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کی بات چیت کہیں طے ہو گئی ہے۔

میرے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا ایک حادثہ ہوا دور کی چچی ایک دن تشریف لائیں، کمرے کی ہر چیز پر طائرانہ نظر ڈال کر صوفے پر براجمان ہوئیں۔ ان کی نظر میز کے پائے سے ہوتی ہوئی خوبصورت سے میز پوش پر اٹک گئی۔ وہ یہ سمجھیں کہ یہ بازار کا بنا ہے اس لئے غلطی سے دل کھول کر تعریف کر دی۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ نامعقول حرکت میری ہے تو تڑسے بولیں اے سچ کہو کہیں کسی اور سے تو نہیں بنوایا۔ اس کے بعد خاندان بھر میں آپ نے چرچہ کیا کہ بازار سے خریدی چیزوں کو بتاتی ہیں کہ ہم نے بنایا ہے جیسے میں جانتی ہی نہیں ان کے ہاتھ میں بھلا یہ صفائی کہاں؟ واہ بھئی واہ اپنے سگھڑاپے کے خوب جھوٹے چرچے ہوتے ہیں مگر ہم کو یہ خوشی ضرور ہوئی کہ وہ میز پوش اتفاق سے اتنا اچھا بن گیا کہ وہ ہرگز میرا بنایا ہوا نہیں مانا گیا۔ یہ بھی ایک کریڈٹ ہے

ہماری ایک دوست ہے جو بہت گھر گھسو قسم کی ہے تو اس پر یہ الزام ہے کہ بھئی کتنی بیک ورڈ ہے آج کل کے زمانے میں پڑھی لکھی لڑکیاں دیکھو کیسی ترقی کر رہی ہیں اور ایک یہ ہیں آدم بیزار۔ ایسی پڑھائی لکھائی کس کام کی بھئی کچھ اسمارٹ نیس تو ہونی ہی چاہئے۔ اس کی دوسری بہن جو ٹاپ کرتی ہیں اس کا شکار ہیں کہ اے تو بہ لڑکی ہے کہ طوفان پیروں میں تو جیسے سینچر ہو۔ بھئی لڑکی کو ایسی آزادی تو ہرگز نہ دے کہ اس کے قدم زمین پر ہی نہ پڑیں۔ آخر لڑکیاں تو گھر کی زینت ہوتی ہیں۔ ارے سب قہر الٰہی سے ڈرو۔

میری اس بات چیت سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیے کہ میں رشتے داروں اور خاندان والوں سے بیزار ہوں۔ سبھی لوگ تو ایک جیسے نہیں ہوتے مگر کچھ لوگ ایسی حرکتیں کر کے سب کے لئے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ اپنے اس جذبے کی تسکین کی خاطر یہ سب سے زیادہ نشانہ رشتے داروں کو ہی بناتے ہیں اور ایسا کرنا اپنا جائز حق سمجھتے ہیں۔

بہرحال! اتنا کچھ بول لینے کے بعد میری خیریت کی تو ساری امیدیں ختم ہو چکی ہیں۔ دیکھئے اب ہم کو کن کن محاذ سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے عبرتناک انجام کے لئے خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرے حق میں آپ لوگ دعائے خیر فرمائیے۔ بلکہ زیادہ آثار تو اس کے ہیں کہ آپ کو میرے لئے دعائے مغفرت کرنا پڑے گی۔

مگر یہ دل کم بخت نہیں مانتا۔ اس لئے یہ کہتے ہوئے ہی اپنی بات ختم کروں گی کہ ؎

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار
الگ رہیں تو دھواں دیں جو پاس ہوں تو جلیں

(آکاش وانی لکھنؤ سے نشر)

آخر کیوں مر نہ جانے کی آرزو ہے

ایڈلین روحی

اس جہانِ رنگ و بو میں ہے کچھ ایسی بات کہ اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اسکی مقناطیسی طاقت ایسی کشش رکھتی ہے کہ انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور انسان اسکی بھول بھلیاں میں گم ہے۔ ہر شخص مصروف کار ہے۔ اتنی فرصت ہی کہاں کہ مرنے کی سوچیں بھی۔ اس لئے جب تک زندہ ہیں۔ کیوں نہ زندگی کے مزے لوٹیں۔ کھائیں، پئیں اور عیش کریں۔

زمانہ کیا قیامت کی چال چل رہا ہے۔ دنیا اپنے محور پر تیزی سے گھومتی جا رہی ہے۔ اک ریس جاری ہے۔ جس میں ہر انسان سرپٹ بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی ننانوے کے پھیر میں کوئی خوب سے خوب تر کی تلاش میں۔ کوئی رتبے و اقتدار کے لئے دیوانہ۔ کوئی اسرار جہاں کی کھوج میں گم اور کوئی عشق حقیقی و عشق مجازی کے چکر میں۔ یعنی کوئی کام کے پیچھے۔ کوئی نام کے پیچھے۔ دم کیلئے فرصت نہیں۔ وقت بہت کم ہے۔ وقت وقت کا انتظار نہیں کرتا وقت تو بس گذر جاتا ہے۔ اور کام اتنا ڈھیر ہے کہ نپٹائے نہیں نپٹتا۔ تو جی مرنے کی آرزو کیسے آرزو ہے۔ پھر صاحبو جب "موت کا ایک دن معین ہے"؛ تو پھر نیند رات بھر کیوں نہیں آتی۔ ذرا غور فرمائیے نیند کیوں نہیں آتی اور جنھیں نیند نہیں آتی تو ان کے لئے میرا نیک مشورہ یہ ہے کہ نیند کی گولی کھائیں اور آرام سے سو جایئے صبح زندگی آپ کو جگا دے گی اور آپ کی خواہشیں۔ تمنائیں اپنی تکمیل کے لئے آپ کو مصروف کار کر دیں گی۔

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں۔ کیا فرصت کے حسین دن تھے۔ جب بابا آدم اور اماں حوا۔ خالق کی تخلیق پر کام سے بے نیاز۔ ہر فکر سے آزاد۔ پھولوں، پھلوں سے لدی پھندی جنت میں جہاں دودھ و شہد کی نہریں بہتی تھیں۔ معطر فضائیں اور مترنم موسم بہار تھی۔ سارا سارا دن حسین نظاروں میں سیر کرتے۔ بھوک لگتی۔ تو خوش رنگ خوشبودار سے پھل توڑ کر کھاتے۔ آب حیات کا شیریں پانی انکی پیاس بجھاتا۔ اور وہ نیلی چھتری والے کی سیوا بھگتی میں مگن ہو جاتے۔ کیا پیور ویجیٹرین لائف تھی کیونکہ مرغ و ماہی اور غذائے مرغن کا تو کہیں ذکر نہیں ملتا مگر ہائے ری قسمت حضرت ابلیس تو یہ دیکھ کر جل ہی گئے کہ بھئی واہ کیا فرشتے کم تھے جو یہ نئی تخلیق اپنی حمد و ثنا کے لئے پیدا کر لی۔ انکی شیطانی رگ پھڑکی وہ موقع کی تلاش میں رہے۔ آدم و حوا جب محوِ خواب تھے تو شیطان نے اپنے جادو سے ایک مقناطیس وائرس بنامِ نفس امارہ انکے اندر داخل کر دیا۔ ٹھہریئے نفس امارہ آپ سمجھ نہیں پائے۔ کام کرودھ لوبھ موہ اور اہنکار کا مرکب ہے۔

جب وہ دونوں جاگے تو بدلے بدلے میری سرکار نظر آتے تھے۔ بی بی حوا نے ہزار ناز و نخرے سے انگلی شجرِ ممنوع کی طرف اٹھا دی۔ بابا آدم بھاگے بھاگے گئے۔ اور پھل حسن کی سرکار میں محبت سے پیش کیا۔ دونوں نے کھایا اور توصیفی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے قادر مطلق نے یہ منظر دیکھا۔ تو مارے غصے کے نہ تو تین مہینے کا نوٹس ہی دیا۔ نہ زادِ راہ کا سوچا دھڑام سے سنگلاخ زمینوں پر پٹخ دیا۔ بھئی یہ بابا، اماں، بی بی وغیرہ بڑے دقیانوسی نام ہیں۔ دودھ و شہد اور شیریں پھلوں پر پلا حسین جوڑا۔ یعنی جواں مردی اور قوت کا شاہکار مرد اول۔ اور مرقع چغتائی کی جیتی جاگتی تصویر خاتون اول۔ بچارے کام دام کے عادی نہ تھے

زباں سے نابلد، مگر ہمت نہ ہاری دونوں نے مل کر زمین کو بنایا سنوارا۔ اپنی تنہائی دور کرنے کے لئے خوب نسل بڑھائی۔ کہ ہر طرف آبادی ہی آبادی ہو گئی اور جگہ کم ہونے لگی۔ بھئی وہ فیملی کا زمانہ تھوڑا ہی تھا سمندروں کو زیر کیا۔ پہاڑوں پر کمند ڈالی، ہواؤں میں پرواز کی۔ کائنات قدرت کے ہزاروں راز اپنی کھوج و تجسس سے پالئے۔ زمین سے اٹھے تو چاند پر پہونچے۔ انسان نے اپنی ذہنی، جسمانی اور روحانی عیش و عشرت کو سکون دل کے لئے اک جہان آرزو پیدا کیا۔

اوپر والے نے جو یہ کرامات دیکھی تو کہا ویل ڈن یہ مشت خاکی تو ماہ کامل ہوا جاتا ہے۔ پکارا۔ آدم۔ آدم۔ تو انسان چیخ اٹھا۔

سیماب کس نے عرش سے آواز دی مجھے
کہہ دو کہ انتظار کرے آرہے ہیں ہم

اقبال شکایت کر بیٹھے۔

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب تو میرا انتظار کر

کیا چیلنج ہے کیا خود داری ہے۔ بھئی داد دیجئے۔ اب کارِ جہاں اتنا دراز ہے۔ اتنا دراز ہے۔ کہ شیطان کی آنت بھی کم پڑے ہے۔ اس جہانِ آرزو میں انسان کی آرزوئیں اور خواہشیں ایسی ہیں۔ کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ اجی یہ سب کیا دھرا اسی وائرس کا ہے۔ جو نسل در نسل ہمارے خون میں گمنام مسافر کی طرح دھن دھناتا پھرتا ہے۔ اور ہر طرف میں ہی میں ہوں کا نعرہ لگاتا ہے اور انسان کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ ایسے میں مرنے کی فرصت کہاں۔ ویسے تو یقین مانئے آج کا انسان پرستش کے قابل ہے۔ کہ روز مرتا اور روز جیتا ہے۔ مر مر کے بھی جئے جانے کی ہمت رکھتا ہے۔ اس پر قیامتیں ٹوٹتی رہتی ہے اور پھر بھی حوصلہ دیکھئے قیامت کا منتظر ہے۔

آپ کو کبھی ایسے انسان سے واسطہ پڑا ہے جو اداس درروتی صورت بنا۔ آہ بھر کے کہے۔ دیکھ لیا سب کچھ دیکھ لیا۔ جینے کو جی نہیں چاہتا اب تو مرنے کی آرزو ہے۔ آپ ہمدرد بن کر کہیں۔ بجا فرمایا آپ نے۔ کب ارادہ ہے آپ کا یعنی کب پران تیاگ رہے ہیں۔ تو وہ رونی صورت والے غصے سے لال پیلے ہو کر پنجے جھاڑ کے پیچھے پڑ جائیں گے آپ کے۔ اچھے خیر خواہ ہیں، ہم کیوں مریں تم مرو اور آپ دم دبا کر بھاگیں گے۔ جی جناب۔ مرنے کو کسی کا جی نہیں چاہتا۔

بچپن کا زمانہ بھی کیا حسین و محفوظ زمانہ ہے موت کے نام تک سے بے خبر ہر طرف زندگی ہی زندگی کلکاریاں مارتی ہیں۔ بالک چاند کو چھونا چاہتا ہے۔ سانپ سے کھیلتا ہے۔ لعل و جواہر چھوڑ کر دہکتے انگارے پر ہاتھ ڈال سکتا ہے۔

اور اگر کوئی شرارتی بچہ ماں کو تنگ کرے تو وہ جھنجھلا کر کہتی ہے۔ تو مر کیوں نہیں گیا۔ نظروں سے دور ہو جا مر کہیں، وہ نظروں سے اوجھل ہو۔ آنے میں دیر ہو جائے۔ تو ممتا کی ماری رو رو کر زمین و آسمان ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ مل جائے تو زندگی پا جاتی ہے سینے میں چھپا لیتی ہے اور عمر درازی کی ہزار دعائیں دیتی نہیں تھکتی ——— ذرا سوچئے تو دعائیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ لمبی زندگی ہو۔ عمر دراز ہو۔ اور پھر ان سر پھرے شاعروں نے تو حد ہی کر دی۔ جیو ہزاروں سال اور ہر سال کے دن ہو پچاس ہزار۔ توبہ۔ توبہ لمبی زندگانی بزرگوں کی دعاؤں نے مار ڈالا۔ آج کے انسان کو تو پچاس وال سال لگے تو وہ آثار قدیمہ کی اینٹیک چیز نظر آنے لگتا ہے۔ اجی موت تو صرف دشمنوں کے نام لکھی جاتی ہے۔

مگر صاحبو۔ عالم جوانی جو عمر کی موسم بہار ہے۔ اس کا کیا کہنا۔ سب کچھ کرنے کی ہمت سب کچھ پالینے کی خواہش آرزوئیں مچلتی ہیں۔ اور تمنائیں امر بیل کی طرح بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ دنیا حسین سے حسین تر نظر آتی ہے۔ یہ عیش مقام یہ رنگا رنگی۔ یہ ہنگامہ پرور رات دن راگ و رنگ کی محفلیں۔ غزلوں کے نئے نئے کیسٹ۔ فلموں کی بھرمار۔ پسندیدہ ایکٹر و ایکٹریس حسیناؤں کے جھرمٹ۔ مغلئی دعوتیں اور نت نئے مشروب جنت میں یہ سب کچھ کہاں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ کس نے دیکھا۔ اپنی دنیا ہی جنت اور اپنی دنیا ہی دوزخ کار جہاں کی دلچسپیاں۔ جہان آرزو کا طلسم۔ بھئی کون جائے ساجن کی گلیاں چھوڑ کر ——— دیکھئے ویسے ہم پرمیشور یعنی اللہ میاں کے خادم ہیں۔ اس نے ہر ایک کو ہک لگا رکھا ہے۔ جب چاہتا ہے۔ نہ عمر دیکھتا ہے نہ موقع نہ محل بس کھینچ لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ انسان کی پسند پوچھتا تو ہر بار یہی جواب ملتا ابھی تو نہ مرنے کی آرزو ہے۔ کتنے کام ادھورے پڑتے ہیں کتنے نئے کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی فرصت نہیں۔ آپ نے ایک بات پر غور فرمایا۔ چاہے جتنی بھی بلندی پر پہونچ جایئے۔ زمین کی طرف جھک کر دیکھئے وہ آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بلاتی ہے۔ آسمان میں یہ مقناطیسی کشش نہیں ہے۔ اس رنگ و بو کی دنیا کو دیکھ کر دل کہہ اٹھتا ہے۔ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ۔ بلکہ ہزار بار دیکھ۔ یعنی جی ہے۔ کہ بھرتا ہی نہیں۔ پھر چھوڑیں کیسے اسے۔

اب بڑھاپے کی سوچئے۔ عجیب نفسیاتی نکتہ کہ موت کو بڑھاپے کے ساتھ لازمی قرار دیا گیا ہے مگر کسی بوڑھے سے پوچھیئے تو پتہ چلے گا۔ اسے زندگی سب سے زیادہ پیاری ہے۔ پاؤں قبر میں ہوں گے۔ مگر باتیں بھر پور زندگی کی کریں گے۔ یہ جوان ہمت تو ماضی حال و مستقبل کو کندھوں پر اٹھائے چلتے ہیں۔ کبھی کسی بوڑھے کی گردن ہلتے دیکھی ہے۔ آپ نہیں سمجھ پائیں گے۔ وہ فرشتۂ اجل کے ساتھ سوال جواب میں ہلتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اے بڈھو تیرے دن پورے ہو چکے۔ اب چل سرکار نے بلایا ہے۔ بوڑھا جواب میں گردن ہلا کر نہیں نہیں ابھی نہیں کہتا ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔

ایک دفعہ اک شاعر بزرگ سے انٹرویو لینے کا اتفاق ہوا خاصے ضعیف العمر تھے۔ دانتوں سے بے نیاز آنتوں سے نالاں۔ جوڑ جوڑ مارے بغاوت کے کانپ کانپ رہا تھا۔ اچھا خاصہ انٹرویو چل رہا تھا۔ شامت اعمال، ہم یہ سوال کر بیٹھے۔ جناب آپ چراغ سحری ہیں نئی نسل کے نام کوئی پیغام دیجئے۔ اس پر وہ بدک گئے مجھے چراغ سحری کہا یعنی میں مر رہا ہوں۔ ارے ابھی تو میری شاعری جوان ہو رہی ہے۔ اور تم بجھتا چراغ بتا رہے ہو اک جیتے جاگتے انسان کو۔ لعنت ہے اس نئی نسل پر جنہیں ادب و لحاظ کچھ بھی نہیں۔ ہزار معافیاں مانگیں تو جان چھوٹی۔ بتایئے مرنے کو کون کم بخت چاہتا ہے۔

محلے میں اک ۸۰ سالہ بزرگ چل بسے۔ ہم بھی بڑی اماں کے پاس تعزیت کو پہونچے۔ زار و قطار رو رہی تھیں۔ اور کہہ رہی تھیں ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔ ابھی تو بہت سے کام کرنے تھے۔ ہم جو اداس صورت بنا نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔ یہ سن کر چونکے اور بمشکل ہنسی روک پائے۔ ابھی انکی عمر ہی کیا تھی۔ کیا بلند حوصلے پائے ہیں خواتین کی عمر تو گھٹتی رہتی ہے بڑھتی نہیں۔ ہمیشہ ہی عمر کا گھپلا ہو جاتا ہے۔ ہماری نانی جان ہیں۔ ہماری صورت سے نالاں۔ اکثر نوک جھونک چلتی ہے ارے مردود کبھی اوپر والے کو بھی یاد کر لیا کر۔ اسے بھی یاد کر لیا کر۔ اسے بھی سجدہ دے۔ ہم چھیڑیں گے بھئی اوپر والے کی تو فقط آپ پر نظر ہے۔ آپ سے ہی پیار ہے۔ ڈانٹیں گی۔ بدتمیز کا فر جا مر کہیں۔ ہم مسکرا کر جواب دیں گے۔ نہ۔ نہ۔ نانی جان آپ سے پہلے مرنے کی گستاخی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ پہلے آپ۔ اب ان کی خیر کہاں۔ روتی جائیں گی اور کہیں گی۔ "دیکھو تو کیسے میرے مرنے کی بات کہہ دی۔ کیا میں اتنی بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔ غور فرمایئے۔ ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ او ہو ساماں سو برس کا دل کی خبر نہیں۔ دھت تیرے کی محاورہ بھی غلط ثابت ہوا۔ یہ ہے نہ مرنے کی آرزو کی تصویر۔

اس جہان آرزو کا طلسم ہے۔ اسکی جادوگری نے ہمیں چاروں طرف سے جکڑ رکھا ہے۔ اسے چھوڑ کر جانے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی یہیں اسی جہاں میں جینے کی تمنا ہے۔ گناہ و ثواب کا نقشہ کھینچئے عذاب دوزخ سے ڈرایئے۔ جنت کی شہد و دودھ کی نہروں اور آبِ حیات و شراب طہورا کا لالچ دیں۔ ہمیں تو یہی جہاں پسند ہے اپنی مرضی سے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اس لئے نہ مرنے کی آرزو ہے۔ کہ کبھی مرتی ہی نہیں۔

(جموں سے نشر)

پائپ

دیویندر اِسر

"تو تب تم پائپ سلگا لیتے ہو؟"

ہاں. جب بھی مجھے شام کی تنہائی ڈسنے لگتی ہے تو میں پائپ سلگا لیتا ہوں. اس نے کہا میرے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر وہ بولا. تم جانتے ہی ہو کہ میں ہر دسمبر کی سردیوں میں نارکنڈے جاتا ہوں. کئی برس پہلے کی بات ہے. میں آتشدان کے قریب بیٹھا موہنی تارا کا انتظار کر رہا تھا. اور جب اطلاع ملی کہ وہ نہیں آ رہی تو میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ سیاہ پتھر سی شام کیسے کٹے گی. باہر بارش زور سے ہونے لگی تھی. چاروں طرف سے اندھیرا گھر کر برآمدے میں گہرا ہو گیا تھا. ایسی شاموں میں مجھے کبھی کبھی تنہائی کا اتنا شدید احساس ہوتا ہے کہ میں سوچنے لگتا ہوں کہ انسان کیوں زندہ رہنا چاہتا ہے. کس کے لئے؟ آخر کیوں ——"

تم پائپ کے بارے میں بتا رہے تھے. میں نے کہا.

ہاں. اسی دن کی بات ہے. برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی. میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا. اندھیرے میں ایک سایہ حرکت کر رہا تھا. نیم سیاہ چہرہ کالے کوٹ اور سفید پتلون میں ملبوس کوئی ستون کے سہارے کھڑا تھا. اس نے جیب سے پائپ نکالا اور دیاسلائی سلگانے کی کوشش کی. لیکن یکے بعد دیگرے کئی دیاسلائیاں سلگانے کے بعد اس نے ڈبیا پھینک دی. بارش میں ماچس بھیگ چکی تھی. اس نے پائپ جیب میں رکھ لیا. کھڑکی کا پردہ ہٹنے سے روشنی کی ایک مستطیل برآمدے میں پھیل گئی. میں نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی دعوت دی. اسے میں نے بھیگے ہوئے کپڑے بدلنے کے لئے اپنی قمیص، پاجامہ اور تولیہ دے دیا. پھر اسٹوو جلایا اور چائے کا پانی رکھ دیا. میں اکیلا تھا. لیکن ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو زندگی کی قریباً ساری شامیں گزار چکا ہو میں شام بتانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا. ایک بوڑھے آدمی کے پاس کیا ہو سکتا ہے؟ سوائے بوسیدہ ماضی کی چند دھندلی یادوں کے —— وہ باتھ روم سے واپس آگیا تھا. میرے قمیص اور پاجامے میں وہ ایسے لگ رہا تھا. جیسے بانس کے بنے ہوئے کسی پنجر پر غلاف چڑھا دیا گیا ہو. اس نے اپنا پائپ نکالا اس میں تازہ تمباکو بھرا. آتشدان سے لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر اسے سلگایا اور کرسی کی پشت پر جھک کر پائپ پینے لگا. جب وہ آتشدان پر جھکا تو آگ کی لال لپٹوں میں اس کے چہرے کی جھریاں اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں جادوئی طور پر پراسرار نظر آئیں.

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا.

شملے سے. راستے میں بارش نے گھیر لیا. اور ابھی مجھے اور آگے جانا تھا. اس نے جواب دیا.

"کیا آپ اکیلے ہیں؟" میں نے پوچھا.

"اکیلا؟ وہ اس سوال سے جیسے چونک پڑا." ہاں اسی معنی میں کہ میرا کوئی گھر بار نہیں، ٹھور ٹھکانا نہیں. وہ بولا.

"آپ کے بیوی، بچے؟" میں نے سوال کیا.

وہ مسکرایا. شادی نہیں ہوئی اور ابھی کوئی ارادہ نہیں. وہ بولا.

ابھی کوئی ارادہ نہیں والی بات سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی.

"آپ برا نہ مانیں تو کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپکی عمر کیا ہوگی؟" میں نے پوچھا.

ساٹھ برس پہلے پیدا ہوا تھا. تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ بولا. لیکن یہ بھی کوئی عمر ہے؟

لیکن آپ نے شادی نہیں کی. میں نے کہا. اس عمر میں تو کسی ساتھی کی بڑی ضرورت پڑتی ہے. اکیلے پہاڑ جیسی زندگی کاٹنا مشکل ہوتا ہے.

میں اکیلا کہاں ہوں؟ اس کے چہرے پر روشنی اور سائے کا ایک دوسرے سے ہمکنار ہوتے گئے. اس نے پائپ کا ایک لمبا کش لیا. میرے اور اس کے درمیان دھوئیں کا غبار پھیل گیا. دھوئیں کے دھندلکے کے پیچھے اس کے لب ہل رہے تھے.

"مجھے دیش بدیش گھومنے کا بڑا شوق ہے اسی شوق کے باعث میں بچپن ہی میں گھر سے بھاگ نکلا تھا. جب میں رنگ برنگے پھولوں سے لدے کسی پودے کو دیکھتا ہوں تو میرا جسم رنگ، خوشبو اور خوشی سے بھر جاتا ہے. جیسے میں خود ایک خوشنما نازک سا پودا ہوں. ہوا کی باہوں میں جھومتا، لہلہاتا. جب کبھی کہیں کسی پہاڑی علاقے میں دور بانسری کی آواز سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے. کہ سر کی لہریں میرے چہرے کی جھریوں میں داخل ہو گئی ہیں اور میرا سارا جسم ستار سا بج اٹھتا ہے ——"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیسے کسی غیر مرئی شئے میں تحلیل ہو گیا.

یہ سب شاعری ہے یا فلسفہ. میں نے اسے چائے کی پیالی پیش کرتے ہوئے کہا. آدمی تو اس بھری پوری دنیا میں بھی اکیلا ہے.

وہ خوب زور سے ہنسا. شاعری ہو یا فلسفہ. بس میں تو اتنا جانتا ہوں کہ زندگی اس کے بغیر محض سانس کی آمد و رفت ہے. محض ایک دوڑ دھوپ، ایک صحرا سے دوسرے صحرا تک.

اس کے ہاتھ کانپے. چائے کی پیالی گرتے گرتے بچی. معاف کرنا بھائی. شاعری اور فلسفے کی بحث میں کبھی کبھی ایسے حادثے ہو ہی جاتے ہیں. وہ پھر ہنسا.

تھکن، کمزوری، بڑھاپے، چائے اور آگ کی گرمی کے باعث اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں. آتشدان میں آگ دھیرے دھیرے سرد پڑنے لگی. کوئلوں پر دھیرے دھیرے راکھ جمنے لگی تھی. وہ آرام کرسی پر ہی سو چکا تھا. مجھے نیند نہیں آ رہی تھی. میں ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا. بارش بند ہو گئی تھی. رات اور بھی گہری ہو گئی تھی. میں کتاب پڑھتے پڑھتے سو گیا. جب میں صبح اٹھا تو وہ نہیں تھا. میرے کپڑے چارپائی پر پڑے تھے. وہ اپنے کپڑے پہن کر جا چکا تھا. ایسا لگتا تھا جیسے اس کمرے میں رات کوئی نہیں آیا تھا. اسی طرح خالی کمرہ اور میری تنہائی ——

—— لیکن یہ پائپ —— میں نے پوچھا.

ہاں. میز پر اس کا پائپ رہ گیا تھا ——

میرا دوست تھوڑی دیر خاموش رہا —— اور پھر دھیرے دھیرے بولا جیسے بہت دور سے اس کی آواز آ رہی تھی —— اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں. لیکن جب بھی مجھے تنہائی کا سانپ ڈسنے لگتا ہے. اور میں زندگی کی راہوں میں بھٹکنے لگتا ہوں تو میں الماری میں سے اس کا پائپ نکال لیتا ہوں. اس میں تازہ تمباکو بھرتا ہوں اور سلگا لیتا ہوں. دھیرے دھیرے کش لیتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے. جیسے ہم باتیں کر رہے ہیں. ایک دوسرے کے بہت قریب. آتشدان کے پاس —— جہاں جسم، وقت اور مقام کے فاصلے مٹ جاتے ہیں.

(اردو سروس سے نشر)

خزاں کے بعد

شفق

دھول اڑاتی ہوئیں دروازے پر رک کاریں گئیں۔

کار سے بوڑھا مرد، عورت اور جوان لڑکا اترا تینوں کی نظریں اطراف کا چکر لگا کر ایک گھر پر ٹھہر گئیں، چہار دیواری پر گھاس کی فصیل کھڑی ہو گئی تھی، چھپر کے کھپڑے ادھڑ گئے تھے دیواروں کا رنگ و روغن خراب ہو کر عجیب سی صورت اختیار کر گیا تھا، کہیں کہیں سے عہد رفتہ کی نشانی جھلک رہی تھی، آنگن کے سائبان پر گرد کی موٹی تہہ جم گئی تھی پورے گھر کا باہری جائزہ لے کر ان کی نظریں دروازے پر پڑے زنگ آلود قفل پر رک گئیں۔

کنجی کہاں ہے ——— ؟ نوجوان نے بوڑھے کی طرف دیکھا تو وہ بوڑھی کی طرف دیکھنے لگا جو نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی۔

کنجی آئی ہے یا وہیں چھوڑ گئی؟ نوجوان کے تیز لہجے پر بوڑھی عورت چونک کر اپنا آنچل ٹٹولنے لگی۔

کنجی کیسے چھوٹ سکتی تھی، اس نے آنچل سے کنجی کھول کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھ دی، جیسے اس کی امانت سونپ رہی ہو۔

نوجوان نے جلدی سے کنجی قبضے میں کی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

آج یہ دروازہ پھر کھلے گا ——— بوڑھے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ تمہیں وہ دن یاد ہے جب اس میں قفل لگا تھا۔

بوڑھی کے چہرے پر بادل سا گزر گیا، اس نے اپنے کانپتے ہوئے قدم مضبوطی سے دھرتی پر جمائے۔ ہاں شائد سیلاب آیا تھا۔ یا بہت تیز آندھی اور رات کا وقت تھا یا گھٹا ٹوپ اندھیرا، رشید میری گود میں کانپ رہا تھا تم نے قفل بند کر کے کنجی مجھے تھمائی تھی اور رٹین کا بکس اٹھا لیا تھا۔

ہاں تب یہ گلی کچی تھی اور نالی کا پانی گلی میں پھیل جاتا تھا۔

نوجوان قفل سے زور آزمائی کر رہا تھا مگر نہ جانے کتنے موسموں کی گرد اس میں داخل ہو کر بیٹھ گئی تھی کہ وہ کسی تبدیلی کو قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ جب نوجوان کی انگلیاں کنجی اینٹھتے اینٹھتے دکھنے لگیں تو وہ کار کے پاس واپس آ گیا۔ جہاں وہ دونوں چپ کھڑے برسوں پیچھے دیکھ رہے تھے، انہیں اس کی بھی خبر نہیں تھی کہ میلے کچیلے بچوں نے کار کے ساتھ انہیں حصار میں لے لیا ہے اور پڑوس کے دروازوں پر کھڑے لوگ انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

کنجی بدل تو نہیں گئی۔ قفل نہیں کھل رہا ہے۔

کنجی کیسے بدل سکتی ہے بیٹا، اس امانت کی حفاظت میرا ایمان تھا اور آج میں خوش ہوں کہ . . . . . .

افوہ . . . . . نوجوان نے جھنجھلا کر بات کاٹ دی، دروازہ کیسے کھلے گا اتنے دنوں میں بالکل جام ہو گیا ہے، کیا میں توڑ دوں؟

بوڑھی، بوڑھے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، دونوں کی آنکھوں میں انکار تھا، جب انھوں نے یہ قفل بند کیا تھا تو کیا انہیں یہ امید تھی کہ ایک دن ایسا بھی ہو گا جب بلندیاں انکے قدموں میں ہوں گی اور رات کے گئے دن کے اجالے میں ایسے واپس ہوں گے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چوندھیا جائیں گی۔

آپ لوگ چپ کیوں ہیں؟ منا تھکا ہوا پریشان ہے، ابھی تو اندر جا کر نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے، اگر قفل میں ہی الجھے رہے تو پھر . . . . . ڈرائیور . . . . . اس نے سامان سے لدی بڑی گاڑی کے ڈرائیور کو پکارا، چیک سے قفل توڑ دو۔

دروازوں پر کھڑے پڑوسی دھیرے دھیرے قریب آنے لگے تو بوڑھی کار میں چلی گئی۔ شیشے چڑھا دیئے گئے اندر بیٹھی ہوئی بہو نے ضد کرتے ہوئے بچے کو اس کی گود میں دے دیا اور خود باہر جھانکنے لگی۔

آپ شاید عابد چچا ہیں، ایک نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ اتنے دنوں بعد۔

ارے تم لوگ، مقبول، ارشد، شاہد کتنے بڑے ہو گئے تم لوگ، جب میں گیا تھا تو تم لوگ بس اتنے سے تھے، بھائی نظام کیسے ہیں؟

اب بہت کمزور ہو گئے ہیں گھر سے کم ہی نکلتے ہیں آپ لوگ رہنے کے لئے آئے ہیں؟

بوڑھے کو اپنے منجمد خون میں روانی کا احساس ہوا۔ رگوں میں پھنسی ہوئی شئے ہٹ گئی اور ابھی وہ مسرت کی لہر کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پائے تھے کہ قفل ٹوٹ گیا۔ چرچرا کر دروازہ کھلا، گرد اڑی مگر نوجوان اپنے بیش قیمت کپڑوں کی پرواہ کئے بغیر اندر داخل ہو گیا، بوڑھے کے قدموں میں تیزی آ گئی، بوڑھی کے قدم بھی ان میں شامل ہو گئے۔

بوڑھے نے در و دیوار پر ہتھیلیاں پھیریں، گرد اس کے ہاتھ اور کپڑوں سے لپٹ کر کچھ پوچھ رہی تھی، بوڑھی کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ ہم کتنے دنوں بعد اپنے گھر واپس آئے ہیں؟ بوڑھے کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا تھا، تم اب بھی رو رہی ہو جیسے جاتے وقت روئی تھیں۔ دراصل اس روز بہنے والے آنسو آج تھمیں گے۔ پوتا حیرت سے دادی کو روتے دیکھ رہا تھا۔

اندر کمروں میں گرد کی موٹی تہہ اور مکڑیوں کے جالے ادھر ادھر بھاگتے ہوئے چوہے اور آنگن میں خود رو پودوں کا جنگل۔

بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ نوجوان آستین کی گرد جھاڑتے ہوئے ڈرائیور سے کہنے لگا۔ تم سامان اتارو۔ نہیں ٹھہرو، صرف فولڈنگ پلنگ لے آؤ تاکہ امی ابو بیٹھ سکیں تب تک ہم ایک کمرہ صاف کر لیں گے۔ بلکہ حنا کو بھی لے آؤ۔

ٹھہرو! دلہن کو میں لاؤں گی۔ بوڑھی کے پیروں میں تیزی آ گئی۔

گڑیا سی سجی سجائی دلہن کے قدموں میں نہ جانے کیا سوچ کر لڑکھڑاہٹ پیدا ہو گئی تھی، چہرہ حیا سے سرخ ہو رہا تھا۔

یہی ہمارا اصل گھر ہے دلہن، بوڑھی کی آواز کانپ رہی تھی، آج تم پہلی بار اپنے سسرال میں قدم رکھ رہی ہو اسی دن کی تمنا برسوں سے ہمارے دل میں تھی۔ خدا نے آج پوری کی۔

جب دھوپ املی کے پتوں پر پر سکھانے لگی اور فضا میں خنکی بڑھ گئی تو انھوں نے اطمینان بھری نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔

اب یہ گھر پھر سے رہنے کے لائق ہو گیا ہے۔

یہاں اس جگہ میری چارپائی رہتی تھی اور یہاں تیرا تو کی، آج تو یہاں سوئے گا اور اس جگہ بہو، ماں نے چیزیں قرینے سے رکھ دیں۔ بہو تمہیں وہاں جیسا آرام نہیں ملے گا کہ یہاں

نہ سینک ٹینک ہے نہ شاور نہ باتھ ٹب مگر یہاں بڑی میٹھی نیند آتی ہے، کل تمہیں رشتہ داروں سے ملانے لے چلوں گی۔

جوان الیکٹرک سپلائی کے لئے تار پھیلا رہا تھا، بلب گھریلو جنریٹر کی مدد سے جگمگا اٹھے اور سیلن زدہ گھر میں جیسے سورج اتر آیا۔ جنریٹر پر لگا اڑیں اور پورے محلے کے دروازے کھٹکھٹا آئیں۔ چلتے ہوئے لوگ گھر میں تیز روشنی اور چہل پہل دیکھ کر ٹھٹھک جاتے۔

وہ بہت دنوں بعد وطن واپس آئے ہیں۔ اب تو بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں۔ یہ دونوں گاڑیاں انھیں کی ہیں۔

اس رات ماں باپ دیر تک جاگتے رہے بیتے ہوئے بلیک دن رینگ رینگ کر کمرے میں آجاتے اور آنکھیں بھیگتی رہتیں۔

اب سو جایئے، ڈاکٹر نے زیادہ جاگنے کو منع کیا ہے۔

تم بھی تو جاگ رہی ہو۔ آج کی رات ان راتوں سے کتنی مختلف ہے جب لالٹین تک جلد بجھا دینی پڑتی تھی، کیا ہمیں امید تھی کہ ایسی جگمگاتی رات بھی دیکھیں گے، اس آنگن میں رات کو بھی سورج نکلے گا۔

صبح ہوئی تو پڑوسیوں کی آمد شروع ہوئی۔

یہ تم ہو بھائی عابد حسین، مجھے رات ہی تمہارے آنے کی خبر ملی تھی مگر سردی کا دن اور بڑھاپا، تمہاری صحت تو ماشاء اللہ اب تک بہت اچھی ہے۔

بس اللہ کا کرم ہے بھائی، تم لوگوں سے بہت ملنے کو جی چاہتا تھا مگر کاروبار اتنا پھیل گیا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی، اس پر رشید نے ایک اور اپارٹمنٹ خرید لیا ہے، کسی بڑی کمپنی کا ہول سیل ڈپو قائم کرنے کا ارادہ ہے، اچھوٹی کمپنیوں نے تو بہت آفر دیئے مگر ہم اپنی ساکھ کے مطابق چیز چاہتے ہیں، اب ہفتہ دس دن جو یہاں رہیں گے تو کاروبار بند رہے گا اور لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا! اور تم لوگ اپنی سناؤ، میں تو تم لوگوں کی باتیں سننی چاہتا ہوں اتنے دنوں میں کیا کچھ ہوا یہاں تمہارے بچے کیا کر رہے ہیں؟

ان کے چہرے مزید سکڑ گئے۔ ہمارے بچے ۔ ۔ ۔ ۔

انھوں نے لمبی سانس کھینچی، زندگی کا بوجھ ڈھونے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

عابد حسین کو پھر اپنی رگوں میں خون کی گردش کا احساس ہوا، بہت دنوں بعد بند دریچے کھلے اور ٹھنڈی ہواؤں نے گدگدایا۔ عابد حسین نے غور سے ان چہروں اور آنکھوں کو دیکھا جن میں حسرت و یاس کے ان گنت دیئے روشن تھے۔

پھر ساری نظریں دروازے پر ٹھہر گئیں، رشید آرہا تھا۔ جدید تراش کے قیمتی سوٹ میں ملبوس، چمکتے ہوئے سیاہ بوٹ، انگلیوں میں جگمگاتے نگینوں والی انگوٹھیاں سونے کی ٹائی پن میں جگمگاتا ہوا ہیرا، وہ ایسے قدم رکھ رہا تھا جیسے راستہ شیشے کا بنا ہو۔

آؤ بھئی رشید، تمہیں ان لوگوں سے ملاؤں، یہ تمہارے سہیل چچا ہیں یہ محسن ماموں یہ کلیم خالو یہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ۔

رشید نے ادب سے انہیں سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور کہنے لگا، میری دیرینہ خواہش تھی کہ اپنے عزیزوں سے ملتا، انکی محبت پاتا۔ ان سے مشورے لیتا، قیمتی باتوں سے فیض اٹھاتا اور میں ضد کر کے سب کو لایا ہوں، بزنس میں آنا جانا تو لگا ہی ہوا ہے مگر پھر وقت نہ جانے ہمیں کہاں لے جائے۔ امی ابو کی زبانی آپ لوگوں کی باتیں سنتا تھا۔ بڑی تمنا تھی آپ لوگوں سے ملنے کی۔ ابو کا ارادہ ہے کہ منے کے عقیقہ کی ایک چھوٹی سی تقریب کریں تاکہ عزیزوں سے ملنے اور قریب آنے کا ایک بہانہ مل جائے، دوسری بات یہ ہے کہ ہم تو اب یہاں کے لئے اجنبی ہیں آپ کے تعاون اور مشوروں کی ضرورت ہو گی۔

عورتیں آئیں تو ماں نے ایک ایک کو پہچان کر گلے لگایا آنسو بہائے، بیٹیوں کی شادیاں کہاں کہاں ہوئیں، کتنے بچے ہیں شوہر کیا کرتا ہے، سسرال والے کیسے ہیں؟ تم لوگ بہت یاد آتی تھیں، مجھے تو سونے کے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے جہاں کوئی دل کا حال سننے والا نہیں دل چاہتا تھا اڑ کر چلی آؤں، یہ میری بہو ہے ابراہیم سیٹھ کی بیٹی، اس کی شادی میں، میں منع کرتی رہی کہ کچھ دینے کی ضرورت نہیں، مجھے صرف گوشت کا لوتھڑا چاہئے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر کہنے لگے، میرا بھی تو ارمان ہے آپ کچھ نہ کہئے کہ شادی بار بار نہیں ہوتی۔

یہ کار کیا جہیز کی ہے ——؟ کسی نے پوچھا تو وہ کہنے لگیں، اسے ملا کر ہمارے پاس چار گاڑیاں ہیں، میں تو کہہ رہی تھی کہ بڑی گاڑی میں سامان کے ساتھ ہم لوگ بھی بیٹھ جائیں گے مگر رشید کہنے لگا، آپ لوگوں کو تکلیف ہو گی، بہن میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ سب کو ایسی اولاد دے۔

لڑکیوں نے دلہن کو گھیر لیا، اللہ یہ نیکلس کتنا خوبصورت ہے، بہت بھاری لگتا ہے۔

یہ خود کیا نیکلس سے کم خوبصورت ہیں۔ دوسری بولی۔

اب نظر مت لگاؤ۔

تو ابھی تک آپ کو نظر لگ جاتی ہے؟ دوسری نے معصومیت سے پوچھا۔ دلہن صرف مسکراتی رہی۔ یہ ساڑی تو باہر کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ خود بھی باہر کی ہیں، آنکھیں دیکھو نا کیسی نیلی نیلی ہیں جیسے گہری جھیل۔

آپ کو کہاں سے منگوایا گیا ہے، چین، جاپان سے؟

نہیں پرستان سے ۔ ۔ ۔ پہلی نے کہا اور سب قہقہے لگانے لگیں۔

عقیقہ کی چھوٹی سی تقریب کسی شادی کی تقریب سے کم ہنگامی نہیں تھی، دوسرے نوجوانوں کے ساتھ رشید خود مہمانوں کی خدمت میں لگا ہوا تھا، معمولی حیثیت کے لوگوں کے لئے یہ پذیرائی اعزاز سے کم نہیں تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کچھ خدمت نہ کر سکا ابھی تو ہم خود یہاں مسافروں جیسے ہیں کبھی آپ میرے یہاں تشریف لایئے، میرے دروازے آپ کے منتظر رہیں گے۔

شہرت کا پرندہ دور دور کے گھر جھانک آیا۔ اتنے بڑے لوگ اور غرور نام کو بھی نہیں کیسے جھک کر ملتے ہیں۔

ہاں بھائی پھلدار درخت جھک ہی جاتا ہے۔

ایک ہفتہ پلک جھپکتے گزر گیا، مشن پورا ہو گیا تھا۔ اور رخصت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لوگوں کی بھیڑ صبح ہی سے انہیں گھیرے ہوئے تھی۔ ہائے بھابی جی چاہتا ہے آپ یہیں رہ جایئے، لڑکیاں دلہن سے کہہ رہی تھیں، کیسا اچھا دن گزرا آپ کے ساتھ۔

رشید بھائی چھوڑیں گے تب نا؟

وہ تو چھوڑیں گے مگر تمہارا دولہا ڈھونڈنا بھی تو ضروری ہے۔

ہٹیئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی بے شرم ہیں آپ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شرم سے گلنار ہو گئی۔

رشید دوستوں کو گلے لگا رہا تھا۔ میرے دوست میرے بھائی، تم لوگوں نے مجھے جو محبت اور اپنائیت دی ہے وہ مجھے یاد رہے گی۔ میں پھر آؤں گا، تمہاری محبت مجھے کھینچ لائے گی۔

کاریں روانہ ہوئیں، دیر تک ہاتھ ملتے رہے مسرتیں نقطۂ عروج پر پہنچ گئیں۔ بچے کار کے ساتھ دوڑتے رہے گلیاں ختم ہو گئیں اور کاریں ہموار سڑک پر نکل آئیں۔ آبادی پیچھے چھوٹنے لگی تو ان کے دل جیسے بیٹھنے لگے۔

انھوں نے حسرت بھری نظروں سے گزرتی آبادی کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر سوچنے لگے۔

اب پھر وہی پتھر کا شہر ہو گا، لوہے کی عمارت اور سڑکوں پر چلتے پھرتے روبوٹ۔

(پٹنہ سے نشر)

قرار

خوش ذائقہ سفر کے پروں پر اُڑا مجھے
کب تک یونہی جلائے گی ٹھنڈی ہوا مجھے
وہ دھوپ تھی کہ آس کی کھیتی جلا گئی
اے رات کوئی سبز کہانی سنا مجھے
کیا یہ بھی کوئی پیاس بجھانے کی ریت ہے
برسا تو اس نے آگ کا دریا کہا مجھے
آئینے چل رہے ہیں کوئی پوچھتا نہیں
پتھر نہیں ہوں راستہ دینا ذرا مجھے
لفظوں کی کائنات غضب تھی طبق طبق
پھر یوں ہوا کہ میں ہی لگا مرحلہ مجھے
دل کو قلم لکھوں تو نظر کو زباں کہوں
مشکل نہیں ہے بھیڑ میں پہچاننا مجھے
رُت جو بھی قرار یہی برگ و بار ہے
طبیعت ہری بھری ہے تو موسم سے کیا مجھے

(بمبئی)

ایک میٹھی تم

مشتاق احمد نوری

میں ابھی ابھی وہاں سے لوٹا ہوں اور کمرے میں بیٹھا سامنے کی دیوار پر نظریں گڑائے اس دیوار کے آر پار دیکھ رہا ہوں۔ دور ــــ بہت دور ــــ ذہن میں اس کی کہی گئی باتیں ہی گونج رہی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں ــــ مگر نہیں ــــ سوچ کب رہا ہوں ــــ ذہن میں سوچنے کے لئے کچھ ہے ہی نہیں وہ تو خالی ہے ــــ نہیں، نہیں، خالی کب ہے؟ وہاں تو ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا ہے۔

"ہاتھ دھونا پڑتا ــــ ہاتھ دھونا پڑتا ــــ ہاتھ..."

ایک ہی جملہ پورے ذہن میں چکر کاٹ رہا ہے۔ پھر اس کے سارے حروف مٹ گئے ہیں، ذہن میں گھل گئے ہیں صرف ہاتھ رہ گیا ہے ــــ ہاتھ، بس ہاتھ ــــ

اس کا نازک ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھا ہے۔ انگلیاں میری انگلیوں میں الجھی ہیں اور نگاہیں کہیں دور بہت دور آسمان کی وسعت میں ٹکی ہوئی ہیں جہاں ایک تنہا پرندہ ہوا کے دوش پر اڑتا جا رہا ہے۔ خاموشی کے ساتھ۔ اپنے پروں کو پھیلائے۔ ساکت ــــ اسے کچھ بھی فکر نہیں کہ آگے کیا ہے۔ دائیں بائیں کیا ہے اور پیچھے ــــ نہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اسے نہ تو فرصت ہے اور نہ ہی ضرورت ــــ

ہر معاملے میں پیچھے مڑ کر دیکھا بھی تو نہیں جاتا۔ کچھ معاملہ نتیجہ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

اچانک میں نے اپنے ہاتھوں پر سرد سی لمس محسوس کی ہے اور چونک پڑا ہوں۔

"اس کا لمس اتنا سرد کیسے ہو گیا؟"

میں دیواروں کے درمیان لوٹ آیا ہوں سامنے خسرو کھڑا ہے۔ میرا تین سال کا بیٹا۔ میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھے۔ میری انگلیوں سے کھیلتا ہوا۔

میں جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں۔

"یہ تم نے کیا کیا بیٹے۔؟"

خسرو حیران کھڑا ہے اس کی سمجھ میں میری باتیں نہیں آ رہی ہیں وہ کچھ کہہ رہا ہے مگر میں سن نہیں رہا ہوں میں تو ان دیکھے اور انجانے حصار میں گھرا ہوا سوچ رہا ہوں

"اجی ــــ سنتے ہیں کچھ۔؟ گھر میں ہیں تو گھر میں ہی رہیے۔ آپ ہمیشہ گھر میں رہتے ہوئے بھی باہر کی سیر کیوں کرنے لگتے ہیں؟"

یہ میری بیگم کی آواز ہے۔ شریک حیات کی، مگر اس میں مٹھاس کیوں نہیں ہے ــــ؟ میں اس کی جانب دیکھتا ہوں۔ اس کی نگاہیں میری پیشانی پر ٹکی ہوئی ہیں۔ اور اتنی تیز ہیں گویا دماغ کے اندر داخل ہو کر سارا راز جان لینا چاہتی ہوں۔

"ہوں ــــ تم نے کچھ کہا؟"

"میں نے کچھ نہیں ــــ بہت کچھ کہا ہے۔ مگر کوئی سنے بھی تو۔"

"سن تو رہا ہوں۔"

"کب سے کہہ رہی ہوں کہ تیس روپے دیجئے ننھی کے لئے دودھ منگوانا ہے۔"

"تیس روپے؟"

"ہاں تیس روپے ــــ دو دن ہو گئے دودھ ختم ہوئے۔ گوالا جو سفید پانی دیا کرتا ہے وہ تو میں ننھی کو پلانے سے رہی۔"

بیگم کی آواز میں مٹھاس تلاش کرنا صحرا میں پانی کی تلاش کے مترادف ہے۔

"فی الحال تو میری جیب خالی ہے۔ تمہارے پاس رقم موجود ہے منگوا لو۔"

"میں اپنی رقم سے دودھ نہیں منگوا سکتی۔ اس کی ذمہ داری آپ پر ہے۔"

"ذمہ داری ــــ؟ بچی صرف میری نہیں۔ تمہاری بھی ہے بیگم۔"

"میں نے پیدا کرنے کی فرمائش نہیں کی تھی، سمجھا آپ نے۔ مجھ سے ان فضول باتوں کی توقع نہ کیا کریں۔ دودھ منگوائیے، ورنہ یہ رہی بچی، سنبھالیے۔ میں ہاسٹل چلی جاؤں گی۔"

میں دنگ رہ گیا ہوں۔ یہ ایک ماں کی آواز ہے جس کی بچی صرف چھ ماہ کی ہے۔ یہ میری شریک حیات کی آواز ہے۔ ایک ہم سفر ــــ ہم نوا ــــ

"میاں بیوی ایک دوسرے کے لباس ہیں"

"میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں"

اف ــــ کس نے کہی تھی یہ بات

میں اپنے کان بند کر لیتا ہوں مگر آنکھیں کھلی ہیں اور ریل کی دو پٹریاں نظر آ رہی ہیں۔ زندگی بھر ساتھ چلنے والی پٹریاں۔ کبھی مل نہیں سکتیں۔ جب بھی ملنے کی کوشش کریں گی ایک حادثہ ہو جائے گا۔ سنگین حادثہ۔

میں بیگم کے بڑبڑانے کی آواز سن رہا ہوں۔ یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب تو اس کا عادی ہو گیا ہوں میں، وہ ہاسٹل جانے کی دھمکی دیتی ہے چلی جائے مگر میں کہاں جاؤں؟

سوچتا ہوں۔ اکثر سوچتا ہوں۔ کیونکہ اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا۔

ایک دن میں نے نلنی سے کہا بھی تھا۔

"جانتی ہو تم ــــ میں اپنی ازدواجی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ بیوی کی شکل میں ایک مستقل عذاب میرے سر پر مسلط کر دیا گیا ہے اور۔۔۔۔ اور۔۔۔۔"

"یہ کس کی بات کر رہے ہیں آپ؟" نلنی نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"اپنی بیوی کی۔؟" پھر وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں ابل پڑی تھیں اس کی۔

"آپ کی بیوی جیسی بھی ہے۔ میرے لئے عظیم ہے صرف اس لئے کہ وہ آپ کی ذات سے جڑی ہے۔ اور آپ کی ذات سے منسلک ساری اشیاء میرے لئے قابل احترام ہیں۔ اس لئے آپ مجھ سے ان کی شکایت نہ کریں۔ میں شاید برداشت نہیں کر پاؤں گی۔"

نلنی ایسا سوچ بھی سکتی ہے ــــ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ میری بیوی کی شکایت صرف اسلئے نہیں سن سکتی کہ وہ میری ہے۔ اور میں جس کا ہوں اسے میرا خیال ہی کب ہے؟

یہ نلنی بھی عجیب لڑکی ہے آخر یہ کون ہے میری؟ میں اکثر سوچتا ہوں۔ "ساجد اور نلنی کا رشتہ کیسا ہے؟"

یہ عجیب سا رشتہ کب اور کیسے ہمارے درمیان آ گیا ــــ؟ کسی کو پتہ ہی نہیں، دونوں کو احساس اس وقت ہوا جب سوچنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

نلنی سے ملنے کے بعد میں خالی خالی سا کیوں ہو جاتا ہوں؟

وہ مجھ سے گھنٹوں باتیں کرتی ہے سارے جہان کی باتیں۔ میرے ارد گرد کی باتیں۔ پھر بھی جب میں لوٹتا

ہوں خالی خالی سا لگتا ہوں۔
"نلنی اتنا کچھ دے کر سب کچھ کیسے لے لیتی ہے؟"
میں کبھی کبھی سوچتا ہوں۔
میں شہر کا ایک ذمہ دار شخص ہوں ایک شوہر جس کی بیوی ایم اے ہے۔ میں لکچرر ہوں تو بیوی اسکول میں ٹیچر ـــــ دو بچوں کا باپ ـــــ دنیا کے بہت سارے جھمیلے ـــــ ذمہ داریوں کی سل اٹھائے۔
"مجھے کب اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اتنی باتیں سوچ لیتا ہوں"
نلنی بھی خوب ہے۔ اتنے چپکے سے میری زندگی میں داخل ہوئی کہ میں محسوس بھی نہ کر سکا۔ احساس تو تب ہوا جب وہ آ چکی تھی۔
سیدھی سادی سی لڑکی۔ سانولا رنگ، بوٹا سا قد، معمولی ناک نقشہ۔ اور آنکھیں ـــــ ہاں آنکھیں ہی تو ہیں ـــــ جب وہ میری جانب دیکھتی ہے تو میں سب کچھ بھول جاتا ہوں، دائیں ـــــ بائیں اور پیچھے کی ساری باتیں بھی صرف سامنے نظر آتا ہے۔ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے کی طرح ـــــ
یہ کیسی عجیب محبت ہے ـــــ؟ کیسا پیار ہے یہ؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔
مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نلنی کے گھر والے زبردست ڈھنگ سے اس کی سرزنش کر چکے ہیں۔
"سماج سے تمہارا کیا رشتہ ہے ـــــ؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ سماج تمہیں زندہ رہنے بھی دے گا؟ تمہاری یہ پاگل محبت کتنوں کو پاگل کر دے گی اور گلی کوچوں میں پاگل کتے بھونکتے پھریں گے۔ سڑک اور چوراہے لاشوں سے بھر جائیں گے ـــــ گلیاں ویران ہو جائیں گی ـــــ سرخ شعلے آسماں سے باتیں کرنے لگیں گے ـــــ اور ـــــ اور ہوائیں سسکیوں اور آہوں سے گونج اٹھیں گی ـــــ"
مگر وہ یہ سب کب سوچتی ہے۔
یہاں بھی ریل کی دو پٹریاں ہیں۔ ساتھ چلنے والی پٹریاں ـــــ جن کے ملن سے حادثہ ہو سکتا ہے عظیم حادثہ ـــــ
ایک بار میں نے خود بھی کہا تھا۔
"نلنی میں سوچتا ہوں ـــــ ہاں سوچتا ہوں اکثر سوچتا ہوں ـــــ کہ زندگی کے نازک پل کو آخر ان گھونگھوں سے کیوں باندھیں جو خود ریت میں گڑے ہوں"
"آپ بھی سوچتے ہیں ـــــ؟ ضرور سوچئے ـــــ میں کیوں سوچوں۔؟
کیا ہو گا ـــــ کب ہو گا ـــــ کیوں اور کیسے ہو گا؟
اتنے سارے سوالات ایک ساتھ ـــــ نا بابا نا ـــــ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے"
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی،

کتنی عجیب ہے یہ لڑکی ـــــ نہیں عجیب یہ نہیں عجیب تو ہم ہیں جو سوچتے ہیں۔
میرا سلسلہ پھر ٹوٹ جاتا ہے ـــــ گاڑی کا دوسرا چکا سامنے آ جاتا ہے چکروں چکروں کی آواز کانوں میں رینگنے لگتی ہے۔
جب چکے بے میل ہوتے ہیں تو گاڑی کا منزل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ گاڑی گڈھے میں الٹ سکتی ہے حادثہ کا سبب بن سکتی ہے
میں بھی ایسے ہی بے میل پہیے سے جڑا ہوں
گاڑی سے ایک پہیہ نکال دیا جائے تو؟
گاڑی رک جائے گی ـــــ منزل دور ہو جائیگی
ـــــ پھر ـــــ پھر ـــــ اور یہ پھر پھیل کر بہت بڑا ہو جاتا ہے۔ دائرے بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایک معمولی سی کنکری بہت بڑا دائرہ بنانے کا سبب بن سکتا ہے اور وہ دائرہ ساحل سے ٹکرا کر اپنا وجود کم کر دیتا ہے۔ کنکری موجود رہتی ہے۔ دائرہ گم ہو جاتا ہے۔ تاکہ دوسرے دائرے بنیں ـــــ دائرے ـــــ دائرے ـــــ
"کیا یہ زندگی صرف سوچنے کے لئے ہی ہے"
اس نے پوچھا تھا ـــــ میں کیا جواب دیتا
وہ اکثر ایسی ہی باتیں کہہ دیتی ہے جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا۔
کتنی پاگل ہے یہ لڑکی ـــــ پیار کرتی ہے۔
کتنا عجب ڈھنگ ہے اس کا۔ اور اس کا اپروچ بھی کتنا مختلف ہے۔ ہاں وہ یقیناً مجھ سے مختلف ہے۔
"پھر یہ ہم آہنگی کیسے ـــــ؟ ایک سوال سر اٹھاتا ہے"
"یہ ہم آہنگی صرف اس لئے ہے کہ وہ جب سامنے ہوتی ہے میں انہیں ہوتا ـــــ صرف وہی ہوتی ہے دوئی مٹ جاتی ہے اور اکائی ـــــ اکائی، اکائی ہوتی ہے بس ـــــ"
میں گھر سے بھاگ کر سکون کی تلاش کرتا ہوں۔ غم دور کرنا چاہتا ہوں۔ اور جب واپس ہوتا ہوں ـــــ خود کو گم کر آتا ہوں
نلنی مجھ سے میرے میں کو چھین لیتی ہے اور خود اکائی بن جاتی ہے۔ میں خالی ہاتھ لوٹتا ہوں ـــــ بالکل ہلکا پھلکا ـــــ سوچتا ہوا ـــــ جب کہ ذہن میں کچھ نہیں ہوتا ـــــ مگر ہوتا ہے۔ کچھ ہوتا ہے۔ اس کی کہی ہوئی باتیں رہ جاتی ہیں ذہن کی دیواروں میں جذب ہو جاتی ہیں۔
آج بھی ذہن کے خالی گوشے اس کی باتوں سے بھرے ہیں ایک ہی جملہ بار بار گونج رہا ہے ـــــ ہاتھ دھونا پڑتا ـــــ ہاتھ دھونا پڑتا ـــــ"
سارے الفاظ ذہن میں جذب ہو گئے ہیں صرف ہاتھ رہ گیا ہے اور یہ ہاتھ پھیل کر کافی لمبا ہو جاتا ہے آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے کو پکڑنا چاہتا ہے جو اپنے وجود سے بے نیاز اڑتا جا رہا ہے ـــــ منزل سے بے خبر ـــــ
پروں کو پھیلائے۔
"پیار کا یہ کون سا انداز ہے؟"
"اس احساس کو آخر کون سا نام دیا جائے؟"
"پوجا ـــــ؟ نہیں ـــــ!
یہ مقدس جذبہ انام ہے۔ اسے نام دے کر میلا نہیں کیا جا سکتا۔
"جانتے ہیں آپ ـــــ؟" مسکراتی ہوئی میری جانب دیکھ رہی ہے۔ آج وہ بہت خوش نظر آ رہی ہے۔
"جانتے ہیں آپ ـــــ میں نے کل صبح سے اب تک دانے پانی کو ہاتھ نہیں لگایا ہے"
"برت رکھا ہے تم نے؟" میں مسکرا پڑا ہوں۔
"برت ـــــ؟ ہاں برت ہی سمجھئے ـــــ دوسرا نام کیا دوں اسے ـــــ اور پھر برت بھی تو بھگوان کے لئے ہی رکھا جاتا ہے نا ـــــ؟"
وہ مسکرائی نہیں۔ پہلی بار سوچ رہی ہے۔
"کس سوچ میں گم ہو گئیں ـــــ؟"
"گم نہیں ہوئی ـــــ گم ہونا چاہتی ہوں۔ یہ بھوک پیاس کا جذبہ مٹ کیوں گیا؟ یہی سوچ رہی تھی۔"
"تو واقعی تم نے کچھ نہیں کھایا؟"
"ہاں واقعی ـــــ" وہ مسکرانے لگی ہے۔
"کافی پریشانیاں ہوئیں مگر میں مسرور رہی بھوک کا احساس تک نہیں تھا ـــــ"
"کیوں آخر ـــــ؟"
وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی رہی ـــــ پھر اس نے اپنی ہتھیلیوں کو میری ہتھیلیوں کے درمیان رکھا ـــــ انگلیوں کو میری انگلیوں میں الجھا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر ایک لمبی ـــــ بہت لمبی سانس لے کر بولی۔
"جانتے ہیں آپ ـــــ"
"اس دن میں نے اپنی ہتھیلیوں میں آپ کے لمس کو قید کر لیا تھا۔ ہتھیلیوں سے ہوتی ہوئیں لمس کی یہ کرنیں میرے انگ انگ میں سرایت کر گئی تھیں
یہ میری زندگی کا ایک انوکھا تجربہ تھا ـــــ
میری ہتھیلیوں میں لمس کا سورج قید تھا ـــــ
میں اس لمس کو کھونا نہیں چاہتی تھی ـــــ
اور کھانے کے لئے ہاتھ دھونا پڑتا ـــــ اور ہاتھ دھوتے ہی لمس کا یہ سورج میری ہتھیلیوں سے پھسل پڑتا ـــــ
تو ـــــ تو ـــــ"
اس کی گرفت میری ہتھیلیوں پر مضبوط ہو گئی ہے سخت بہت سخت اور میں ملار کی وسعتوں میں گھور رہا ہوں
آسمان میں اڑتا ہوا پرندہ میری نگاہوں کی گرفت سے دور ہو گیا ہے ـــــ اور میں ـــــ نہیں نہیں ـــــ میں وہاں کب ہوں ـــــ وہاں تو صرف نلنی ہے ـــــ اکائی کی صورت میں بس ـــــ!!

(پٹنہ سے نشر)

محبوبہ

بتول سجاد

پروفیسر انور نے آج جونہی اپنے سامنے کی بنچ پر نظر ڈالی جہاں پہلی صف میں انھیں ایک نئی لڑکی بیٹھی نظر آئی۔ لڑکی تھی یا قیامت !!! وہ چند سکنڈ حیران ہو کر رہ گیا۔ طالبہ نئی تھی باقی سب جانی پہچانی تھی اسے حیران دیکھ کر سلمہ نے مسکرانا شروع کر دیا۔ سلمہ کی مسکراہٹ ہی انور کی کمزوری رہی تھی وہ اس ادا سے مسکرائی کہ انور بالکل کھو سا جاتا۔ مگر اس نئی لڑکی کے حسن میں وہ اسقدر حیران ہو کر رہ گیا کہ سلمہ کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے سکا۔ پھر سلمہ نے کھڑے ہو کر کہا۔

"سر! یہ لڑکی آج ہی آئی ہے"۔

"ہوں، اچھا"! انور نے گھبراہٹ سے رجسٹر اپنی طرف کھینچا اس کے بعد نغمہ اٹھی اپنا دھانی پلو سنبھالا اور انور کے قریب گئی۔ انور کو ایسے لگا جیسے وہ ہوش کھو دینے والا ہے۔

"میرا نام نغمہ امجد ہے سر"۔ وہ کہہ رہی تھی گویا پھول جھڑ رہے تھے کانوں میں مدھر گھنٹی بج رہی تھی۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں انور نے رجسٹر میں اس کا نام درج کر لیا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی جگہ پر جا بیٹھی مگر اس کی مہک چند سکنڈ تک قائم رہی۔ اس نے دھانی شفان کی ساڑی پہن رکھی تھی اور روکھے لامبے لامبے بال پشت پر بل کھا رہے تھے کسی قسم کا میک کیے بغیر ہی وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ انور نے کنکھیوں سے دیکھا۔ سانولی رنگت بھولا چہرہ اور اس پر بلا کی سادگی بالکل قریب بیٹھی ہوئی سلمہ ہر قسم کا میک اپ کیے ہوئے تھی، وہ جل ہی تو گئی، آج انور صاحب نے اسے دیکھ کر مسکرایا تک نہیں وہ پوری کلاس میں ایسی الجھن میں رہی — اور انور نغمہ کی جانب دیکھتے ڈرتا تھا وہ پڑھاتے وقت بہکنے لگا حسن کے سامنے تو سب ہی بہک جاتے ہیں فرشتے بھی، وہ تو ایک انسان تھا۔ اس کا پریڈ ختم ہوا سب ہی کالج کے چمن میں آ گئے مسلمہ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انور سے باتیں کرنے لگی

"انور صاحب آج آپ کھوئے کھوئے نظر آتے ہیں؟"

انور نے گھبرا کر کہا "نہیں تو سلمہ ..... اچھا کہو شام ساتھ چل رہی ہو نا۔ میں سیدھے گھر جا رہا ہوں"۔

"ضرور چلوں گی مگر آپ اسی طرح کھوئے کھوئے رہے تو میں خود کہیں کھو جاؤں گی۔ کیوں ہے نا؟ سلمہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔ نغمہ سب لڑکیوں سے الگ تھلگ لان پر بیٹھی میگزین دیکھنے لگی۔ نئے لوگ نیا ماحول وہ گھبرا رہی تھی۔ لڑکے اسے صرف دیکھتے ہی رہ گئے کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اس مغرور حسینہ پر آواز کسے یا چھیڑے۔ جیسا کہ ہر نئی طالبہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کی سنجیدگی ہی اس کا رعب بنا رہا۔ مگر ادھر پروفیسر انور تو بلا کھٹکے اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔

ہر روز کئی مہینوں سے ایسا ہوتا رہا کہ ادھر کالج ختم ہوا اور سلمہ سیدھے انور کی کار میں جا بیٹھی اس لیے کہ انور سے اس کی پرانی دوستی تھی اور وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور آپس میں دونوں پیار کرتے تھے اور پیار نے رنگ لایا دونوں کے بزرگوں نے جلد ہی ان کی شادی کر دینے کی ٹھانی۔ ایک دن انور اسٹاف روم سے نکلا ہی تھا کہ سامنے سے نغمہ گلابی ساڑی لہراتے ہوئی گزر گئی انور دنگ رہ گیا۔ گلاب کا پھول ہوا کے جھونکے سے لہرا رہا ہے اس پل کو غنیمت جان کر وہ اس کے پیچھے جا کر آواز دی۔

"سنئے"۔

وہ قریب جا کر نہایت شائستگی سے پوچھا "مس نغمہ میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑنے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں"

"جی شکریہ! میری کار اب آتی ہی ہو گی"۔

اس خشک جواب کے ساتھ ہی انور نے سر جھکا لیا۔ پھر نغمہ اپنی کار کا انتظار کرنے لگی اور انور یونہی اپنی کار میں بیٹھا ہوا اسے تکتا رہا۔ سلمہ قریب ہی بیٹھی ہوئی جلدی چلنے کا اصرار کر رہی تھی۔ پھر تو انور نے موٹر کے نہ اسٹارٹ ہونے کا بہانہ بنا دیا۔

"اوہو مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔ معاف کرنا انور صاحب، میں آٹو لے لوں گی آپ کچھ خیال نہ کیجئے"۔

وہ جلدی ہی کالج کے باہر چلی گئی تب انور نے سکون کی سانس لی۔ کار اسٹارٹ کر کے سامنے کھڑی ہوئی نغمہ کے قریب لے گیا۔ کار کا دروازہ کھول کر آنکھوں میں پیار سے مسکرا کر بولا۔

"آ جائیے نا مس نغمہ"

اس کے لہجے میں اپنائیت اور پیار بھرا ہوا تھا۔ نغمہ انکار نہ کر سکی اور اس کے بازو میں بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب تصور کر رہا تھا۔ وہ اب کالج کے احاطے سے باہر آ چکے تھے اور کافی ہنس بول کر باتیں کر رہے تھے انور بڑے ترنگ سے گنگناتے ہوئے کار چلا رہا تھا اور بازو میں بیٹھی ہوئی نغمہ بھی مسکرا رہی تھی، ابھی وہ باتوں میں مصروف تھے کہ نغمہ بول اٹھی۔

"پلیز ٹھہریئے۔ وہ دیکھئے میری کار آ رہی ہے۔ ذرا کنارے رک جائیے"۔

انور کو ایسے لگا جیسے وہ آسمان سے نیچے آ گرا ہو۔ اس کے خواب ٹوٹ گئے اور وہ کنارے کار کھڑی کر دی۔ انور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نغمہ اپنی کار میں جا بیٹھی ..... اسے بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اے کاش وہ اس راہ پر ہنستے بولتے چلتے رہتے۔ رات بھر انور اس کے خوابوں کی نگری بساتا رہا۔ دوسرے دن اتفاق سے سلمہ و نغمہ ساتھ ساتھ کلاس میں داخل ہوئے۔ انور دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کل کے واقعے کے بعد نغمہ شرمندہ تھی۔ انور کے بدلے بدلے تیور دیکھ کر سلمہ نے محسوس کیا کہ اب وہ انور کی محبوبہ نہ رہی اور انور کی دلچسپی لیتی ہوئی محبت بھری نظریں سلمہ سے چھپی نہ رہ سکی اور اسے برسوں کی محبت دم توڑتی نظر آئی اور وہ نغمہ کو اپنا رقیب سمجھنے لگی۔ کالج کی چھٹیوں سے ایک دن پہلے انور نغمہ سے ملا۔ باتوں باتوں میں پوچھا۔

"ان چھٹیوں میں کہیں باہر جا رہی ہیں آپ؟"

"جی ہاں، اپنے چچا مجید ساجد کے پاس جا رہی ہوں کشمیر"۔

"مجید ساجد"۔ انور ایک دم چونکا۔ وہ ہنسی۔ اس میں حیرانی کی کیا بات ہوئی۔ جی انکل ساجد میرے محسن ہیں۔ میرے والد کے عزیز دوست۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے انھوں نے ہی پالا پوسا۔ اس لائق بنایا۔ آپ تو پہلی بار جا رہی ہیں کشمیر میں تو ہر سال نثار کے اصرار پر جاتا ہوں"۔ "اوہو ... تو آپ نثار کو جانتے ہیں"۔ پلٹ کر نغمہ نے پوچھا۔ انور خوش ہو رہا تھا کہ اب کے نغمہ بھی کشمیر اس کے ساتھ چلے گی تو خوب مزہ آئے گا۔

"ارے واہ نثار تو میرے محسن کے بیٹے اور میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ وہ بیحد پیارا انسان ہے۔ نغمہ سست سی ہو گئی یہ کیا ہو گیا نثار اور انور ایک ساتھ کیسے رہیں گے وہ انور سے پیار کرنے لگی تھی۔ اداسی سے بولی۔ مجھے کل ہی ابا کا خط ملا ہے کہ چچا ساجد نے مجھے نثار کے ساتھ منسوب کر دیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ چھٹیوں میں میں کشمیر جاؤں۔ نثار سے ملنے ... کاش انور صاحب ابا کا خط نہ ملا ہوتا۔ ... اس خط سے میں ہراساں ہو گئی ہوں۔ انور یہ سب سنتا رہا اسے ایسے لگا جیسے وہ آسمان سے نیچے گر رہا ہو ہوش و حواس جاتے رہے اور دل میں اپنے آپ نغمہ سے بھی .... انجانے میں اپنے پیارے دوست کی محبوبہ سے پیار کرنے لگا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ نغمہ نے پکارا کب چل رہے کشمیر۔ اس نے پلٹ کر درد بھری آواز سے کہا۔ آپ جائیے مس نغمہ۔ میں اب کبھی نہ جا پاؤں گا ..... دور سے اس کے ہارن کی آواز آ رہی تھی وہ دوڑ کر اپنی کار میں جا بیٹھا۔ جہاں سلمہ بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ مسکرا کر بولی "تو جناب ہر سال کی طرح کشمیر جا رہے ہیں آپ۔ جائیے ہم تو کھنڈالہ جائیں گے اپنے ماموں کے پاس۔ ایک جھٹکے سے کار اسٹارٹ کر کے انور نے سلمہ کی طرف دیکھا اور کہا ہم بھی کھنڈالہ چلیں گے ہم نے راہ بدل دی ہے"۔ پھر تو سلمہ حیران ہو گئی۔ "پچ انور" وہ سوچنے لگی یہ اس کی آہ اور چاہ تھی جو اس کا محبوب اس سے آملا۔ مگر اصلی وجہ کا پتہ نہ چلا سارا درد و کرب انور نے دل میں دفن کر لیا۔ سلمہ نے اپنا مقام پا لیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے انور نے دیکھا کشمیر کی حسین وادیوں میں ایک خوبصورت جوڑا گھوم رہا ہے نغمہ و نثار۔ اس کے دل پر چوٹ لگی وہ باہر دیکھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا یہ سال اس کے لیے کتنا منحوس آیا کہ اس کا پیارا دوست بھی چھوٹ بھی ہاتھ دھویا۔ (حیدرآباد سے محمد نثار)

آپ کی رائے

"آواز" کا ہر شمارہ مطالعے میں آتا ہے اور کچھ نہ کچھ استفادہ کر جاتا ہے۔ اس وقت جنوری ۸۷ء کا دوسرا شمارہ سامنے ہے۔

آج معیار شرافت صرف سیم و زر ہوا
باعث تذلیل انساں تنگدستی ہو گئی

انور کیفی صاحب کو بھی یہ احساس ہو گیا کہ انسانی شرافت کے لئے دولت ضروری ہے اور بات بھی سچی ہے زمانے نے بھرپور وار کیا ہے۔

نا خدا کے کوئی تیور دیکھے
اہل کشتی کا خدا ہو جیسے

اشہر صاحب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جتنا ڈر ملاح سے ہوتا ہے اتنا خدا سے ہوتا تو آج کا ہر انسان فرشتہ ہوتا

کوئی احسان گھٹاؤں کا نہیں ہے مجھ پر!
جس کو شبنم نے نکھارا وہ گل تر ہوں میں

ساغر جیلانی صاحب یہ تو ناسپاسی ہوگی اگر گھٹاؤں کے احسانات کو فراموش کر جائیں۔

ذوق سجدہ تو دیا ہے مرے مالک لیکن
راس آجائے کبھی اشک ندامت سے وضو

شفق شاہ چشتی آپ کی تمنائیں آرزوئیں بڑی نیک ہیں خدا آپ کو اشک ندامت سے وضو نصیب فرمائے اور ساتھ ہی تمام مسلمانوں کو۔

آج دل پھر اداس ہے آجا
تیرا غم میرے پاس ہے آجا

تسنیم صدیقی صاحب آج تو وہ کسی حال میں نہ آئے گی یا پانام واپس لینے کے لئے آ بھی جاتی مگر آپ آگے کہتے ہیں۔ کہ

دیکھ لے آکے میری آنکھوں میں
کیسی شدت کی پیاس ہے آجا

اب تو کسی صورت نہیں آئے گی وہ سمجھ گئی کہ مرد بے وفا ہوتے ہیں پیاس بجھا کر مجھ کو فراموش کر جائے گا۔

رضا جوئی وفاکیشی مروت پیار ہمدردی!
انہیں دو چار لفظوں میں ہماری زیست پنہاں ہے

خواجہ ضمیر صاحب اس دور پرفتن میں رضا جوئی، وفاکیشی مروت، پیار، ہمدردی میں آپ کی زندگی پوشیدہ ہے یہ معجزہ سے کم نہیں۔ جبکہ اس دور میں ان الفاظ کا معنی ہی بدل گئے ہیں۔

مجیب اللہ صاحب کا مضمون بہت اصلاحی ہے ہر مذاہب کے لوگوں کو ان کے مذہبی اصول سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اب بھی انسان نہ سمجھے تو یہی کہوں گا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

"آپ کی رائے" کالم میں کچھ مفتی قسم کے لوگ بھی داخل ہو جاتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ادبی پرچہ ہے مولوی کا حجرہ نہیں۔

دعا گو ہوں کہ آواز ہمیشہ قائم و دائم رہے۔

طبیب احسن تابش
سائی تھا سٹریٹ ہند پیڑھی مدراس

"آواز" یکم تا ۱۵ ار جنوری نظر نواز ہو کر دل و دماغ کو معطر کر گیا تمام مضامین کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد صفحہ غزلیات کی طرف رخ کیا ماشاءاللہ تمام شعرائے کرام کی غزلیں لاجواب ہیں۔ کیا ہی دلیرانہ اور بیباکانہ الفاظ میں شعراء نے کلام پیش کیا ہے۔ ظہیر صدیقی صاحب نے تو اپنی شان اور بہادری کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ دشمنوں کے لئے کھلا چیلنج ہے شام رضوی کا یہ آخری شعر مجھے بہت مرغوب ہے کیا انداز تخاطب ہے شعر ملاحظہ فرمائیں۔

اچانک یہ مجھ پر کھلا شام رضوی
کہ دشمن مری تو مری ہی انا ہے

تارنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ مرحبا مرحبا سبحان اللہ خدا آپ کی شاعری میں قوت عطا فرمائے شبیر حسن شبیر کا کلام بھی لاجواب اور غور طلب ہے ان کے یہ اشعار بہت پر درد ہیں۔ شعر ملاحظہ فرمائیں اور ان کو میرا پیام مبارکباد دیدیں۔

کس شوخ نے کھولی ہے یہ زلف سیاہی
کمرے میں ہوا یارب کس کوچے سے آئی ہے
شبیر زمانے میں کوئی بھی نہیں اپنا
دنیا تو دکھانے کو یوں اشک بہاتی ہے

رانچی سے نشر شدہ مکالمہ فضول خرچی جو عبدالحق انصار اور کوثر آرا نے پیش کیا پسند آیا۔

ایم اسماعیل انصاری
اسٹیل ٹرنک شاپ نمبر ۱۱ چرچ روڈ۔ رانچی۔ بہار

تازہ شمارہ نظر نواز ہوا اپنے پرانے روایت کے سوا پورے مواد لئے اس بار بھی "آواز" اردو ادب کی آواز کو زندہ بنائے ہوئے ہے۔

محمد عرفان خاں ساکت
حبیب پور۔ بھاگلپور

آواز ۱۶ ار جنوری ۸۷ء کا شمارہ ایک حسین گلدستہ لیکر صادر آگیں ہوا۔ سرورق کی تصویر حسین اور دلکش ہے غزلوں کے متعلق میں یہ تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ رامپور سے غزلوں کے جھلملاتے ستاروں میں انور کیفی صاحب کا غزل قمر کی روشنی سے منور ہے۔ علاوہ ازیں غزلیات میں خواجہ ضمیر صاحب اور جوہر وارثی صاحب کی پوری غزل جان غزل ہے۔ مستقل کالم شیشے کا گھر سے ادیبوں اور شاعروں کے دکھ درد کے سفر کو جاننے اور پہچاننے کا ایک اچھا خاصہ موقع فراہم ہو پاتا ہے۔ یوسف ناظم صاحب کا مضمون۔ "آکاشوانی اور ہم" اور شکیل شاہجہاں کا سٹوی صاحب کا "ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے" کو پڑھتے وقت بے تحاشا قہقہہ لگانے کو جی چاہتا ہے تو کبھی زیر لب مسکراہٹ کے قوس ہونٹوں پہ کھینچ جاتے ہیں۔ بہرکیف اس مضمون میں ہنسنے ہنسانے کے موقع کی گنجائش ہوتے ہوئے بھی تلخ حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ اردو کا رول جدوجہد آزادی میں جو رہا ہے وہ بے حد اہم رول ہے اس رول کی مثال خود ایک تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔ جسے کوئی مٹا اور جھٹلا نہیں سکتا۔ ڈاکٹر ابن فرید صاحب کا "جمہوری فکر کی بنیادیں ٹیگور کی شاعری میں" اور حامد علی خاں کا مضمون "چکبست کی وطنیت" میں احساس تشنگی ملحوظ رہتا ہے۔

آبادی اور اس کے مسائل، سید تقی الدین صاحب کا مضمون واقعی ایک غور فکر مضمون ہے۔ روشن مستقبل کے لئے سبھی ہندوستانیوں کو چاہئے کہ ان مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہیں۔ تبھی مستقبل میں سنہرے خواب کی تعبیر کی جا سکتی ہیں۔ اگر آبادی کے اضافہ میں یہی تیز رفتاری آئندہ بھی قائم رہی تو وہ دن دور نہیں کہ ہندوستانیوں کا مستقبل ایک بھیانک شام سے کم نہ ہوگا۔ لہٰذا یہ قابل غور مضمون ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیگر مضمون پسند آئے۔ افسانے میں ذاکرہ صاحبہ کی "زمانے کی ہوا" اور احسان صاحب کا "ایک آسیبی کہانی" پسند آئے۔

اب تحریر کے اختتام پر یہی عرض کروں گا کہ اس شمارے کے سبھی ادباء و شعراء کو میرا ہدیہ خلوص بذریعہ آواز پہونچا دیں۔

محمد افتخار علی انجم
ایٹ۔ حبیب پور
صاحب گنج۔ ۸۱۶۱۰۹

آواز ۱۶ ار جنوری کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو اپنی سبھی خوبیوں کے ساتھ قبل از وقت ظاہر ہوتا ہے اور اس کے مضمون بھی اچھے ہوتے ہیں۔ بہت خوشی ہوتی ہے جب آواز کا شمارہ ہاتھوں میں وقت سے پہلے ہی پہونچ جاتا ہے۔ میں اس کی ترقی اور درازی عمر کے لئے دعاگو ہوں۔

آمنہ عقیل
قصبہ رائے پور، سہارنپور۔ یوپی۔

مجھے اخبارات و رسائل پڑھنے کا بچپن سے شوق ہے اور ہر مہینے بہت سے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔ لیکن جب آواز کا مطالعہ نہیں کرتا بے چین رہتا ہوں۔ جس دن "آواز" کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ بس دو دن کے اندر رسالے کو پڑھ لیتا ہوں اور بعد اس کے اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے اور پھر آپ جانتے ہی ہونگے کہ انتظار کی گھڑیاں کتنی لمبی ہوا کرتی ہیں۔ کیونکہ جو چیزیں ہمیں ملتی ہیں۔ دوسرے رسائل میں ان تمام چیزوں سے محروم رہنا پڑتا ہے خصوصاً افسانے، غزل جو اپنے آپ میں ایک الگ ہی مثال ہیں اس بار یکم دسمبر ۸۶ء کے آواز کے شمارے میں "احمد علوی" صاحب کی غزل بے حد پسند آئی ساتھ ہی ساتھ اعجاز الدین پالپولر صاحب کی غزل

بس ایک ہفتے میں اپنا مشاعرہ ہوگا
ہوا ہے بھابھی کے بیٹا مشاعرہ ہوگا

پڑھنے کے بعد میں بہت ہی لطف اندوز ہوا۔ افسانوں میں احمد یوسف صاحب کا افسانہ "یہاں زینے ہی زینے ہیں" بے حد پسند آئی۔ میرے طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔

اور ۱۶ ار دسمبر کے رسالے میں مسعودہ حیات کی غزل کا خاص کر یہ مقطع

ایک ہی ہاتھ نے جب بنایا ہمیں فرق کیوں ہے یہ پھر نسل اور رنگ کا
ایک ہی زمیں ایک اپنا گلشن، ایک ہو پھر جسم و جاں دوستو

قابل تعریف ہے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر محمد عرفان صاحب کے مضمون اخلاق ایک بڑی نعمت ہے قابل تعریف ہیں افسانوں میں "گھٹن" بہت پسند آئی۔ قاسم خورشید صاحب کو میری طرف سے بہت بہت مبارکباد۔ لیکن آپ نے پھر ریڈیو ناٹک کو آواز میں شامل کرنے کی زحمت گوارہ کی ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ ریڈیو ناٹک کی جگہ اگر افسانے کے لئے ہی ان صفحات کو صرف کریں تو زیادہ بہتر ہوگا آپ خود ہی غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ صرف ایک ریڈیو ناٹک شائع کرنے پر کئی افسانوں سے ہم لوگوں کی نظریں محروم رہ جایا کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے آپ اس ناچیز کی رائے پر غور فرمائیں گے۔ اگر آپ نے میری رائے کو آواز کے مخصوص صفحات "آپ کی رائے" میں شامل کیا تو میرے دل کو اطمینان ہوگا کہ آپ کے دل میں میری رائے کی قدر ہے آپ نے موقع دیا تو آئندہ بھی اپنے رائے سے نوازوں گا۔

امتیاز احمد انصاری
جگجیون مارکیٹ گیٹ آرہ۔ بہار

"آواز" نئے سال ۱۹۸۷ء کا استقبال کرتا ہے اپنی شان اور وقار کو ایک ایسے اعلیٰ و ارفع مضمون سے مستحکم اور دوبالا کرتے ہوئے جو اپنی مثال آپ ہے جو ہر تعریف سے بے نیاز اور بالاتر ہے "جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے" اندر میں رقم کردہ ایک ایسا بے باک اور بلند پایہ مضمون ہے جس کا ہم پلہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا جو اس قدر دقیق گہرا اور غور طلب ہے کہ دوران نثر بہ مشکل اور شاذ و نادر ہی کوئی آپ کو سمجھ پایا ہوگا۔ اور قابل ایڈیٹر صاحب کا ہزار شکریہ جنہوں اسے نئے سال کے "آواز" کے پہلے شمارہ میں اولین اور جائز مقام عطا کر کے۔ اس کے کچھ ہی قاریوں کو ہی کہ اس کی قرار واقعی قدر کرنے کا موقع بہم پہونچایا۔

سوچتا ہوں، کیا ایک مضمون نگار ایسا بھی ہے (خاص کر ہندوستان میں اور وہ بھی مسلمانوں میں) جو اپنے مافی الضمیر کا اظہار اس قدر خلوص و جرأت کے ساتھ کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ بالخصوص ان تنگ نظر، کوتاہ بیں، کور چشم اسلاف و روایات پرست اور متعصب آدمیوں کے سامنے جن کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، جن کے دماغ کے ۹۹ (یہ بر مینڈرسل کا تخمینہ ہے) کے استعمال کی کبھی نوبت نہیں آئی اور باقی ۱ حصہ اپنی زندگی کا واحد مقصد روٹی کپڑا مکان یا سستی اور ناپائیدار خوشیاں حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہوا اور پھر یہ دولت ہوی یا ہویاں حاصل کرنے، جائیداد خریدنے، بچوں کی شادیاں کرنے، زیارت یاترا کرنے اور کئی ایک عیش و عشرت کی چیزوں پر صرف کی جاتی رہی جنہیں حیات و کائنات کی کسی بھی بات پر کسی بھی قسم کے استفسار جانچ، پڑتال یا اس کی تصدیق کی کبھی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ اور سب کچھ چبے چبائے نوالے کی صورت اسلاف و روایات سے انہیں مل جاتا رہا جس پر چوں چرا کئے بغیر چلتے رہنا ہی جن کے لئے محض مصلحت اور عقلمندی رہی اور جس سے سرمو انحراف یا انحراف سراسر بے دینی اور گردن زدنی الغرض۔ یہ مضمون "جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے" حیات و کائنات کے حقائق پر مبنی انتہائی بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کی تشریح کی یہاں گنجائش نہیں اسی زمرہ کے اور بھی مضامین ہیں جیسے شیشہ کا گھر "ٹیگور کی شاعری" "گاندھی جی نے کہا"۔۔۔ سب ہی اردو سروس سے نشر شدہ۔ اور کون نہیں جانتا اردو سروس کی نشریات ہمیشہ سے ہی حد درجہ بلند پایہ، بصیرت افروز اور آفاقی ہوا کرتے ہیں۔ آج ان میں وہ پر لگے ہوئے دکھائی دینے لگے ہیں جن سے انسان کا عرش و کرسی کی خبر پا جانا مشکل نہیں معلوم ہوتا اور ان نشریات کو "آواز" میں زیادہ سے زیادہ جگہ دینا بلکہ اولین درجہ عطا کرنا اس بات کی بین دلیل ہے کہ "آواز" کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔

لیس عمر شریف
نمبر ۲۔ فرسٹ مین روڈ
نیو گوروا پن پالیہ۔ دھرمارام کالج پوسٹ
بنگلور

دوردرشن

دہلی

چینل ۴ تصویر 62.25 MHz
بینڈ ۱ آواز 67.75 MHz

مسوری

چینل ۱۰ تصویر 210.25 MHz
بینڈ ۳ آواز 215.75 MHz

روزانہ ٹیلی کاسٹ ہونیوالے پروگرام

شام

۶-۰۰ افتتاحی اعلانات (سوائے اتوار)
۶-۵۵ پروگراموں کا خلاصہ اور گمشدہ افراد سے متعلق اعلانات (سوائے ہفتہ)
۷-۰۰ کرشی درشن (پیر، منگل، بدھ اور جمعہ)

نیشنل پروگرام

رات

۸-۴۰ سماچار (ہندی خبریں)
۹-۳۰ دی نیوز (انگریزی خبریں)
۱۱-۴۵ نیوز ہیڈ لائن (ہفتہ کو ۱۲-۳۰ پر)

اسکول ٹیلی کاسٹ

پیر

صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ سائنس (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۱۰-۱۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

منگل

صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ کیمسٹری (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

بدھ

صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ حساب (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ بائیلوجی (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور شام ۴-۴۵ سائنس (ساتویں جماعت)

جمعرات

صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ جغرافیہ (دسویں جماعت)
۱۰-۵۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ سائنس (چھٹی جماعت)

جمعہ

صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ فزکس (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ انگریزی کا سبق (چھٹی جماعت)

یو جی سی پروگرام

دوپہر ۱۲-۴۵ اور شام ۴-۴۰
اعلیٰ تعلیمی پروگرام (روزانہ سوائے اتوار و تعطیل)

• • • • •

دہلی I

اتوار

صبح

۸-۳۰ سرب ساجھی گوربانی / پربھاتی
۹-۴۵ یوگ اور سواستھ
۱۰-۰۰ اپو اور پپو (ہندی سیریل)
۱۰-۳۰ رامائن (ہندی سیریل)
۱۱-۱۵ دیٹ از کرکٹ (انگریزی سیریل)
۱۱-۳۰ اولڈ فاکس (انگریزی سیریل)
۱۲-۳۰ زندگی زندگی (ہندی سیریل)
۱-۳۰ علاقائی زبان کی انعام یافتہ فیچر فلم (I اتوار)
علاقائی زبان کی فیچر فلم II، III اور V
۴-۰۰ ورلڈ آف اسپورٹ

شام

۵-۴۵ اور ۷-۴۵ ہندی فیچر فلم
۷-۳۰ سنرکشن ابھوگتا کا / اندھی گلیاں
۹-۰۰ کونٹیکٹ: کوئیز (انگریزی)
۹-۵۰ فوکس: حالات حاضرہ پر انگریزی پروگرام
۱۰-۲۰ فوک اور اینڈ ٹریڈیشنل آرٹ (اتوار I)
میلے (اتوار II)
کوی سمیلن (اتوار III)

پیر

شام

۶-۰۰ ہیلاؤں کے لیے
۶-۱۵ بچوں کے لیے انگریزی فلم (سلسلے وار)
۶-۳۵ جان ہے جہان ہے (صحت سے متعلق)
۷-۳۰ سنسند سماچار
۷-۴۰ ہندی ناٹک
۹-۰۰ ہندی سیریل
۹-۵۰ سچ کی پرچھائیں
I اور III
چترمالا II اور IV
شام غزل V

۱۰-۲۰ کھوج (ہندی سیریل)
۱۰-۴۵ رقص کا نیشنل پروگرام / I، II، III، V
بیلے (IV)
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

منگل

شام

۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ کھیل کھلاڑی
۶-۳۵ ہمارے کلاکار، ہمارے ادیوگ (II اور IV)
ہمارے ادھیکار اور کرتویہ (I، III، V)
۷-۳۰ سنسند سماچار
۷-۴۰ یوتھ فورم I، III اور V
یووا منچ II اور IV
۸-۱۰ بزم (اردو ادبی میگزین)
۹-۰۰ بنیاد (ہندی سیریل)
۹-۵۰ جن وانی I، III
بیانڈ ٹو مارو II اور IV
۱۰-۲۰ انگریزی میں ڈاکومنٹری فلم
۱۰-۵۰ ٹیلی فلم
ٹورڈس پروگریس /
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

بدھ

شام

۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ آنگن واڑی
۶-۳۵ دکاس کی اور
۷-۳۰ سنسند سماچار
۷-۴۰ آپ اور ہم (ناظرین کے خطوں کے جواب)
۸-۰۰ چترہار (ہندی فلموں سے رقص و گیت)
۹-۰۰ صبح (ہندی سیریل)
۹-۵۰ رونگ آئی I، III
حالات حاضرہ پر پروگرام
پرادکشنا
اے جرنی ڈاؤن دی گنگا (اتوار II)
اے سورس ٹو لائف IV
۱۰-۲۰ پُورنیما: ہندی سیریل
۱۰-۴۵ پریمیر انسٹی ٹیوشنز آف انڈیا (I، III اور V)

گریٹ ماسٹرز (II اور IV)
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعرات

شام

۶-۰۰ دیہی بچوں / دیہی نوجوانوں کے لیے
۶-۱۵ گھریلو نسخے
۶-۳۵ قانونی صلاح
۷-۰۰ رقص
۷-۱۵ وشو درشن
۷-۳۰ سگم سنگیت
۷-۴۰ پتریکا ہندی ادبی میگزین
۷-۳۰ سنسند سماچار
۸-۰۰ باتوں باتوں میں
۸-۲۵ اکنامکس میٹیریز: انگریزی سیریل
۹-۰۰ ہندی سیریل
۹-۵۰ پرشن منچ I
گیوسٹ سائنس کوئیز II
اسپورٹس کیوز III
واٹ از دی گڈ ورڈ IV
ہیلتھ کوئیز V
۱۰-۲۰ ٹورڈز برائیٹ فیوچر / پورٹریٹ / ٹورسٹ اسپاٹ (انگریزی پروگرام)
۱۰-۴۵ موسیقی کا نیشنل پروگرام
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعہ

شام

۶-۰۰ بچوں کے لیے (انگریزی)
۶-۱۵ آپ کا پریوار
۶-۳۵ سگم سنگیت / اپ شاستریہ سنگیت
۷-۳۰ سنسند سماچار
۷-۴۰ گیان دیپ
۸-۰۰ چترہار
۹-۰۰ ایک کہانی (ہندی سیریل)
۹-۵۰ ہندی سیریل
۱۰-۲۰ لانگ اسپورٹس / یونٹس III
اسٹیٹس آف دی یونین II، IV، V
پریمیر انسٹی ٹیوشن آف انڈیا I

ہفتہ

دوپہر

۱-۴۵ گھر باہر
۲-۱۵ یوتھ ٹائم / یوتھ فورم
۲-۴۵ اعلان کے مطابق

اسٹر شوبھا ساباد دائیں سے دوسری،
ں ڈائریکٹر آف امریکن ریڈ کراس
س اے کیساتھ واسدیو پاٹھک انٹرویو کرتے ہوئے ◀
یرمیں ڈاکٹر وجے گناشیکی اور
ابھاویر سنگھ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے
۔واگرام
شوانی
ہورے
شر ہوا۔

▲ کمال وساتھی آکاشوانی نجیب آباد سے
قوالیاں پیش کرتے ہوئے ۔

▲ ۸۶-۱۹۸۵ء کے لیے بہترین میجرز کا اسٹیٹ ایوارڈ پانے والی ایس کے سوبھا اور
اے۔ اناپورنما، خواتین ٹیچرز کے ساتھ آکاشوانی بھدراوتی سے نشر انٹرویو کی ایک تصویر۔

▲ آکاشوانی اورنگ آباد سے نیشنل پروگرام میں نشر ہونے والے ناٹک کے شرکاء فنکار ۔

egd. No. D-(C)39 PRICE : RUPEE 1-00 AWAZ 1st. MARCH 1987 Licen (U-23) to post without
N. No. 14253/57 prepayment at PSO, New Delhi.

آکاشوانی بھج کی جانب سے منعقد ایک محفل میں —
▲ وجیا بین وسکھیاں گربا رقص پیش کرتی ہوئی (اوپر) اور سورنگلم گروپ دیپک رقص پیش کرتے ہوئے ▼

Published by the Director General, All India Radio, at the Office of the Chief Editor, Akashvani Group of Journals, PTI Building, II floor, Sansad Marg, New Delhi-110001.
Printed by the Manager, Govt. of India Photo Litho Press, Faridabad.

۲۵ پھاگن سے ۱۰ چیترا ۱۹۰۸ شاکا

آواز

اشاعت کا ۵۲ واں سال
قیمت ایک روپیہ

آل انڈیا ریڈیو دوردرشن کے پروگرام، معلوماتی مضامین، دلچسپ افسانے و منظومات

ڈاکٹر صدیق مجیبی

شکستہ پر طائرِ تخیل کو اتنی اونچی اڑان مت دو
فصیلِ غم پار کرنے والو فضول ہے اپنی جان مت دو
میں جانتا ہوں تمہاری سانسیں تمہارے زخموں کو چھیڑتی ہیں
ہر ایک لمحہ ہے حشر ساماں متاعِ جاں پر دھیان مت دو
تمہاری "مرجانہ" "سیاست یقیں کا چہرہ جھلس چکی ہے
ہمارے سہمے ہوئے مکانوں پہ امتیازی نشان مت دو
ہماری چیخوں کی شاخ اپنے ہی آنسوؤں سے ہری ہے اب تک
لہو کے رشتے ہیں سب ادھورے حسابِ سود و زیان مت دو
تم اپنے زخموں میں آگ بھر کر ٹھٹھرتی راتیں قبول کر لو
سفر کی منزل قریب ہے اب تھکن کو اپنی امان مت دو
تمہاری تہذیب کے صحیفے تمہارے کلچر کے آئینے ہیں
یزید مانگے جو سر تو دے دو مگر تم اپنی زبان مت دو
تم ایک گونگا خیال بن کر ہمارے خوابوں میں بس رہے ہو
ہمارے دکھ مشترک ہیں آؤ ہمیں تم اپنا بیان مت دو
وہ جن کے ذہنوں میں کوئی قوسِ قزح نہیں ہے انہیں مجیبی
تم اپنا دل چیر کر دکھا دو صلاحِ تیر و کمان مت دو

صغرا پروین

جنوں و کیف میں ایسے کئی مقام آئے
بنے تھے دوست جو دشمن! انہیں کے نام آئے
تمام رات رہا مضطرب تمہارے لیے
تم ہی نہ آئے تو کیا اور کوئی کام آئے
غموں کا دور اسی سوچ میں گذارا ہے
خوشی کی کوئی بھی تو زندگی میں شام آئے
یہ کیسا نظم ہے میخانے کا تیرے ساقی
کہ کوئی تشنہ رہے اور کسی کو جام آئے
قصور کس کا ہے؟ اس وقت فیصلہ ہوگا
کہ گفتگو کا کوئی روبرو مقام آئے
چھپا کے غیر کے خط اس لیے پڑھے ہم نے
کسی بھی خط میں تو شاید ہمارا نام آئے

کھڑی ہوں راہ میں پروین اس لیے اب تک
کسی کی معرفت ان کا کوئی پیام آئے

پرکاش فکری

رنگین خواب اس کے نقشے جلا بھی دے
جاں پہ بنی ہے روشنی اس کو بجھا بھی دے
ناموس ضبط بوجھ ہے کب تک لیے پھروں
ساری امیدیں چھین کر مجھ کو رُلا بھی دے
پہنچا ہے کس کی کھوج میں حدِ زوال تک
گم ہو گیا ہے کون تو اس کا پتا بھی دے
بے چارگی کی رات کے غار سیاہ سے
قیدِ سکوت توڑ کے کوئی صدا بھی دے
ہر آئینے پہ وقت کی انگلی کے داغ ہیں
مٹ جو سکیں یہ داغ تو ان کو مٹا بھی دے
اس دشتِ بے گیاہ میں مجبور ہوں کھڑا
منزل کا کچھ نشان دے رستہ بتا بھی دے

جس پہ رُتوں کے ہاتھ کی تحریر ہے لکھی
فکری وہ اپنے جسم کی دیوار ڈھا بھی دے

جوگا سنگھ انور

چراغِ نقشِ کفِ پا جلا گیا نہ رہا
اندھیری شب کا مسافر تھا وہ رُکا نہ رہا
سبھوں کی فکر ہے محدود اپنے آنگن تک
پڑوسیوں سے بھی اب کوئی واسطہ نہ رہا
تعلقات کا موسم بدل گیا شاید
وفا کی شاخ کا پتہ کوئی ہرا نہ رہا
لہو دلوں کا دعاؤں میں اب کرو شامل
سنا ہے عرش پہ پہلا سا وہ خدا نہ رہا
اسے گمان کہ دی ہے سزائے ہجر مجھے
مجھے یقین کہ اک پل بھی وہ جدا نہ رہا
وہی ہے شہر، وہی لوگ، راستے بھی وہی
مگر وہ ملنے ملانے کا سلسلہ نہ رہا

وفا کی راہ بڑی سنگلاخ ہے انور
ازل سے کتنے گئے کوئی نقشِ پا نہ رہا

پروین رحمانی

دھیمے دھیمے آنکھوں میں رنگ مسکراتے ہیں
تیرے خواب کے جھونکے نیند بن کے آتے ہیں
اک مجسمہ تیرا جب سے دل نے سوچا ہے
مجھ سے سارے بت خانے سلسلے ملاتے ہیں
راہ بھول جانے کا کب سوال اٹھتا ہے
جبکہ راستے سارے تیرے گھر کو جاتے ہیں
منزلِ طلب میں بھی جب پتہ نہیں ملتا
تجھ کو ڈھونڈنے والے میرے پاس آتے ہیں
دو گھڑی کی یہ صحبت دوستو غنیمت ہے
گزرے لمحے دوبارہ کس کے ہاتھ آتے ہیں
ہم رفیق رکھتے ہیں دشمنوں کو رحمانی
دوست کب ہمیں اپنا آئینہ بناتے ہیں

شان بھارتی

جدھر نگاہ اٹھی کس کی بارگاہ نہ تھی
مگر جبیں کے لیے کوئی سجدہ گاہ نہ تھی
یہ زندگی تو کبھی اتنی بھی تباہ نہ تھی
اگرچہ شہر تھا میرا مگر پناہ نہ تھی
شبِ الم بھی گذاری کچھ اس طرح ہم نے
نظر میں شور تھا لیکن لبوں پہ آہ نہ تھی
حدِ نظر میں تھا تاریکیٔ گماں کا حصار
دریقیں کے لیے اور کوئی راہ نہ تھی
وہ میکدہ ہو یا مسجد ہو یا ہو بت خانہ
کسی مقام پہ میرے لیے پناہ نہ تھی
وہاں دلوں کی طہارت ہی شرط تھی پہلی
وہ میکدہ تھا میاں کوئی خانقاہ نہ تھی
کہیں نہ فرق ہی عیب و ہنر کا مٹ جائے
سیاہ رات تو اتنی کبھی سیاہ نہ تھی
ہزار انگلیاں اٹھتی رہیں مگر اے شان
مری انا کے لیے کوئی انتباہ نہ تھی

اس بار اپنی سے غزلیں

(دائیں سے)
پرویز رحمانی، جوگا سنگھ انور
صغرا پروین، نواس چندر ٹھاکر
صدیق مجیبی، رحمان امر امیری
پرکاش فکری اور شان بھارتی۔

ادب کا تعمیری مقصد

ڈاکٹر عبدالمغنی

ادب اور مقصد کے رشتے پر مثبت و منفی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور ہنوز کوئی فیصلہ کن بات سامنے نہیں آئی ہے اس سلسلے میں مشکل یہ ہے کہ بحث کرنے والے عام طور پر ادب اور مقصد کو گویا ایک دوسرے کے مقابلے پر رکھ کر دیکھتے ہیں یا کم از کم ایک کو دوسرے سے الگ تصور کرتے ہیں۔ لیکن اگر ادب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ ادب نہ تو فضا میں معلق ہوتا ہے نہ کوئی مجرد وجود رکھتا ہے۔ بہرحال ادب کا کوئی ماحول ہوتا ہے اور وہ کسی ٹھوس مواد پر مبنی ہوتا ہے۔ تخلیق ادب کے لئے ہئیت کے ساتھ ساتھ مواد کی ضرورت تسلیم شدہ ہے۔ اس لئے کہ فن کا اسلوب جو بھی ہو اس سے فکر کے کسی موضوع کا اظہار لازماً ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حالات میں یہ چیز بہت شعوری طور پر نہ ہو بلکہ ادیب کے لاشعور بر آمد ہوتی ہو۔ مگر اس کا ظہور ضرور ہوتا ہے اور فطری طور پر ہوتا ہے۔ یہ بات تو یوں ہر فن میں ہوتی ہے۔ مگر ادب دوسرے تمام فنون لطیفہ سے زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ یہ شعور لفظ ادب کے معنی میں شامل ہے۔ اس معنی کی تلاش کے لئے اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں ادب کے اس استعمال پر بھی غور کرنا چاہیئے جو تمیز اور تربیت کے مفہوم میں ہوتا ہے۔ یہ مفہوم صریحاً ایک اخلاقی قدر ہے اور اس کا تعلق انسان کے کردار سے ہے۔

ادب کے مفہوم میں اخلاق اور کردار کا یہ عنصر ادب کے مقصد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی ادب جس طرح بے معنی نہیں ہو سکتا اسی طرح بے مقصد بھی نہیں ہو سکتا۔ فنکار بہت حساس ہوتا ہے۔ وہ گرد و پیش کے حالات سے شدید طور پر متاثر ہوتا ہے۔ اس تاثر میں ایک قسم کی مشابہت ہوتی ہے۔ فنکار کے سامنے محسوس یا غیر محسوس طور پر کوئی معیار ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ ہر قسم کے واقعات کو دیکھتا ہے اور جو باتیں معیار کے مطابق نہیں ہوتیں فنکار کا ذہن اس کے خلاف ایک رد عمل کا اظہار کرتا ہے۔ لہٰذا وہ معیار کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے معیار کے خلاف باتوں پر تنقید کرتا اور معیار کو قائم رکھنے کے لئے کچھ تعمیری اشارے کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اصحاب فکر کی رائے کے مطابق معیار مطلق نہ ہو، اضافی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ دوامی نہ ہو، متبدل ہو، لیکن وہ ہوتا ہر حال ہے۔ ویسے جہاں تک انسانیت کی بنیادی قدروں کا تعلق ہے وہ مستقل اور غیر مبدل ہوتی ہیں۔ مثلاً راستی، انصاف، ہمدردی ایمانداری اور دلیری کے اوصاف اپنے مفہوم اور اثر کے لحاظ سے بالکل آفاقی اور ابدی ہیں۔ خواہ ان پر عمل جس طرح بھی ہوتا ہو، فکری طور پر ان کا حوالہ ہر زمان و مکان میں ایک ہی طرح دیا جاتا ہے۔

اس طرح ادب میں مقصد کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ مقصد مثبت اور تعمیری ہو اس لئے کہ منفی و تخریبی مقصد کسی اصولی معیار سے وابستہ نہیں ہوتا۔ یہ بالکل ایک شخصی مفاد پر مبنی ہوتا ہے اور مفاد مقصد سے بہت چھوٹی اور سطحی سی بات ہے اس میں نہ سنجیدگی ہوتی ہے نہ بلندی۔ لہٰذا مقصد کی حیثیت سے اس پر گفتگو عبث ہے۔ بات یہ ہے کہ مقصد کا تعلق زندگی کی بہتری سے ہے۔ جس چیز کو حسن و جمال کہتے ہیں یا جسے لطافت و ثقافت کا نام دیا جاتا ہے وہ اس سے کم کوئی بات نہیں ہوتی کہ ایک ادیب حیات کی تزئین کا خواب دیکھتا ہے وہ چاہتا ہے کہ کائنات کی ساری خوبصورتی اپنے ادب پارے میں جذب کرے۔ یہاں تک کہ بھدی چیزوں کے بھی خوبصورت پہلوؤں کو اجاگر کرے۔ یہ خوبصورتی کوئی بری چیز تو نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ یقیناً ایک اچھی ہی چیز ہوگی۔ کیٹس کا یہ قول صحیح نہیں کہ "صداقت حسن ہے اور حسن صداقت" اس قول میں حسن اور صداقت کو ایک دوسرے کا مترادف کر دیا گیا ہے اور یہ وضاحت

آواز

آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام

جلد ۵۲ | شمارہ ۶

۱۶ مارچ ۱۹۸۷ء مطابق ۲۵ پھاگن ۱۹۰۸ شاکا

چیف ایڈیٹر ایس کے سندر — ٹیلی فون ۳۸۲۲۳۹

ادارت
سراج احمد — ۳۸۲۲۵۴
ہرمہندر سنگھ وج

اسسٹنٹ بزنس منیجر: جگدیش پرساد — ۳۸۲۳۵۱

اس شمارے میں

ادب کا تعمیری مقصد	ڈاکٹر عبدالمغنی	۳
شیشے کا گھر	مخمور سعیدی	۴
جوش ملیح آبادی کی شاعری میں ہندوستانیت	ڈاکٹر نریش	۶
کامیابی	شاغل ادیب	۷
کتب بینی کی ضرورت	ڈاکٹر ارشد جمال	۸
پریم چند کے کردار	قمر رئیس	۹
گاندھی جی	جمیل اختر	۱۱
ایلن ہیوم	امیر حسن	۱۲
ہمارے دشمن، ہمارے دوست	صفیہ نسیم	۱۴
ماحول پر کیڑے مارنے والی دواؤں کے مضر اثرات	فیروز حمید	۱۵
سورج کیا ہے ؟	محمد اسحاق صدیقی	۱۷
بچھلانے گنگا اشنان کیا	ہاشم عظیم آبادی	۱۸
فلمی چہرے	محمد نور خاں اعظمی	۲۰
دیوار (ریڈیو ناٹک)	ڈاکٹر شمیم حنفی	۲۲
سانپ کے دانت	غیاث احمد گدی	۲۶
گڑیا	قاسم خورشید	۲۸
میں کہاں جاؤں	ظفر حبیب	۲۹
گناہ کی شہادت	خورشید عالم	۳۱

غزلیات

طاہر فراز	۴	رؤف رضا	۲۵
جہانگیر جوہر	۱۸	شفق شاہ چشتی	۲۷
عمر قریشی	۲۱	پورن سنگھ ہنر	۳۰
بلراج حیرت	۲۳		

قیمت

فی کاپی ——— ایک روپیہ
سالانہ ——— ۲۲ روپے
دو سال ——— ۴۲ روپے

ادائیگی بذریعہ چیک / پوسٹل آرڈر / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، بنام: چیف ایڈیٹر
آواز شعبہ گروپ آف جرنلز، آل انڈیا ریڈیو، فلور پی ٹی آئی بلڈنگ، سنسد مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Telegram: 'LISTENER' New Delhi

(ایک سال سے کم کا چندہ قابل قبول نہیں ہوگا)

اندرون ملک ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

بھی نہیں کی گئی ہے کہ یہاں روحانی حسن بھی مراد ہے یا صرف جسمانی۔ لہٰذا اس قول میں جسمانی حسن کو بھی صداقت کا مطلقاً حامل تصور کر لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے، اس لئے کہ مثال کے طور پر طوائف کا حسن صداقت کا متحمل نہیں ہو سکتا یا صداقت طوائف کے حسن کو متحمل نہیں ہو سکتی۔ سوا اس کے کہ کوئی شخص حقیقت پسندی کے نام پر عریانی اور فحاشی کو بھی ایک مظہر حسن قرار دے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کوئی تعمیری بات نہ ہوگی۔ بلکہ سراسر تخریبی چیز ہوگی۔ اس معاملے میں اقبال کا یہ بیان درست ہے۔

حسن آئینۂ حق، دل آئینۂ حسن

یہاں حسن اور حق کو ایک دوسرے کا مترادف نہیں قرار دیا گیا ہے، حق حق ہے اور مطلقاً صداقت ہے، جبکہ حسن کو اسی حالت میں حسن تصور کیا گیا ہے۔ جب وہ اضافی طور پر آئینۂ حق بھی ہو۔ چنانچہ اگر حسن صداقت سے خالی ہو تو وہ حسن نہیں ہے، اور صداقت میں صالحیت مضمر ہے، برائی میں کوئی سچ نہیں ہے اور سچائی میں جھوٹ کے ساتھ ساتھ برائی بھی نہیں ہوتی، صرف اچھائی ہوتی ہے یہاں تک کہ سچ بعض وقت تلخ بھی ہو تو بھلائی سے خالی نہیں ہوتا۔

ادب میں تعمیری مقصد کا اظہار ہمیشہ کسی مثالی نیکی کی تصویر پیش کر کے نہیں کیا جاتا اگرچہ نیکی کی تصویر یقیناً ادب میں تعمیری مقصد کا ایک مثالی اظہار ہے۔ بہر حال بعض اوقات مجسم بدی کی تصویر بھی اس طرح پیش کی جا سکتی اور پیش کی جاتی ہے کہ اسے دیکھ کر کسی کو بھی عبرت ہو سکتی ہے۔ یہ گویا بدی کا ایک تنقیدی مرقع ہوا۔ خواہ اس میں تنقید کا عنصر پوشیدہ ہو یا ظاہر۔ اس تنقیدی انداز کا مطلب یہ ہوا کہ فن کار کے سامنے نیکی کا کوئی نصب العین کسی نہ کسی شکل میں ہے۔ جس کے حوالے سے وہ بدی کے کسی پہلو کی تصویر اتار کر اسے سامان عبرت بنا دیتا ہے تاکہ دیکھنے والا ردعمل کے طور پر نیکی کی طرف مائل ہو اس طرح ادیب بالکل ادبی اسلوب سے ایک تعمیری مقصد کا اظہار کرتا ہے۔ اس سلسلے میں جس چیز کا لحاظ کیا جائے گا وہ ادب پارے کا عام تاثر ہوگا۔ یہ تاثر اگر سبق آموز ہے تو ادیب کامیاب ہے۔ ورنہ ناکام۔

ادب اور مقصد کی بحث کا بنیادی نکتہ جمالیات اور اخلاقیات کا رشتہ ہے۔ ماضی قریب میں جمالیات پر اس مبالغے کے ساتھ زور دیا گیا ہے کہ اخلاقیات کو اس سے الگ ایک قدر تصور کر لیا گیا ہے، حالاں کہ بات وہی حسن اور حق کی ہے۔ جس طرح حسن حق سے الگ ہو کر حسن نہیں رہ سکتا اس طرح جمالیات اخلاقیات سے جدا ہو کر جمالیات نہیں ہو سکتی۔ زیبائی و رعنائی کا جو بھی عنصر جمالیات میں ہوتا ہے وہ بداخلاقی اور بدکرداری کے ذریعے ظاہر نہیں ہو سکتا اور بداخلاقی و بدکرداری کو زیبا و رعنا اور حسین و جمیل کوئی بہت بڑا بداخلاق اور بدکردار ہی قرار دے سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بدکرداری تو پوری زندگی کے حسن کو غارت کر کے انسان کو حیوان کی سطح پر لے آتی ہے۔ لہٰذا اس کی موجودگی میں کسی قدر جمال کے ابھرنے کا کوئی امکان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمالیات کے اصول موضوع میں اخلاقیات داخل ہے۔ اچھی صورت کو اچھا بھی ہونا چاہیئے اور اچھائی ایک بدصورت کو بھی قدر دانوں کی نگاہ میں خوب صورت بنا دیتی ہے۔ اس طرح خوب صورتی کا خوشگوار ہونا اس کی اخلاقی قدر پر منحصر ہے۔ چنانچہ ادب میں جمالیات اور اخلاقیات کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے، جبکہ اس کی ہیئت و اسلوب میں جمالیات کا پہلو غالب ہوتا ہے خواہ وہ فنی سانچے کی تنظیم میں ہو یا الفاظ و علایم میں۔

اس سلسلے میں آخری بات ادب اور زندگی کے رشتے کی ہے۔ ادب ایک مہمل سانحہ ہے اور زندگی کی تمام قدروں سے ادیب کی عدم وابستگی کا تصور بے معنی ہے۔ دنیا کی زندگی میں جو زندہ ادب تخلیق کیا جائے گا وہ یقیناً زندگی کے لئے ہوگا، ورنہ وہ ادب نہیں، بکواس ہوگا۔ اس طرح ایک ادیب بھی بہر حال کسی سماج کا فرد ہوتا ہے اور فطرتاً اس سماج کی قدروں سے اس کی کچھ ذہنی وابستگی ہوتی ہے، بلکہ یہی وابستگی اسے تخلیق ادب پر ابھارتی ہے اور سماجی قدروں کے اثبات ہی کے لئے کوئی باشعور ادیب اظہار خیال کرتا ہے۔ لہٰذا ادب زندگی کی قدروں کا ترجمان ہوتا ہے اور جب زندگی کی قدروں کی ترجمانی ہوگی تو مقصد اپنے آپ واضح ہو جائے گا، اس لئے کہ مقصد کے بغیر اقدار حیات کی ترجمانی ممکن نہیں، بلکہ مقصد ہی وہ زاویہ نظر تشکیل دیتا ہے جس سے اقدار کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ اور جب مقصد ہوگا تو وہ لازماً ایک سنجیدہ و اعلیٰ مقصد ہوگا یعنی دوسرے لفظوں میں تعمیری مقصد ہوگا اس تجزیئے سے ادب کا تعمیری مقصد ایک صداقت بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ (پٹنہ سے نشر)

طاہر فراز

آپنے جو یہ سُرخ پرندہ پالا ہے
کیا یہ مرے مستقبل کا رکھوالا ہے
آہٹ سی محسوس ہوئی ہے آنکھوں کو
شاید کوئی آنسو آنے والا ہے
چاند کو جب سے الجھایا ہے شاخوں نے
پیڑ کے نیچے بے ترتیب اُجالا ہے
بھیگی پلکیں، بکھری زلفیں، کانپتے ہونٹ
آپنے مجھ کو کس الجھن میں ڈالا ہے
سانسوں کی رفتار بتاتی ہے طاہر
جانے والا لمحہ آنے والا ہے

(رامپور سے نشر)

شیشے کا گھر

شاعری کے بارے میں متعدد لوگوں نے مختلف رائیں ظاہر کی ہیں۔ میرے لیے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ سبھی رائیں ایماندارانہ ہوں گی لیکن ان کا باہمی اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ میری شاعری کسی نہ کسی حد تک اس تہہ داری کی حامل ہے جس کی گونا گوں پرتوں تک رسائی بقدر توفیق ہی ممکن ہوا کرتی ہے۔

بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ میری شاعری کلاسیکی روایات کو آگے بڑھاتی نظر آتی ہے۔ ایک بار ایک ناقد نے یہ رائے دی تھی کہ میں اپنے ہم سفروں میں ترقی پسند اسلوب کا نمائندہ ہوں لیکن زیادہ تر لوگوں کا کہنا ہے کہ میری جگہ ان جدید شاعروں کی صف میں ہے جنھوں نے موضوع مواد اور ہیئت کے طے شدہ دائروں کے پیدا کئے ہوئے جمود کو توڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

میں اپنے بارے میں ظاہر کیے جانے والے بظاہر ان متضاد اور متخالف خیالات پر کبھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اب بھی میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن کچھ باتیں ہیں کہ جی چاہتا ہے آج کی صحبت میں کہی جائیں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کے لیے اپنی شعری روایت سے مکمل انقطاع ممکن نہیں اور اگر ایسا ہوا تو نتیجہ شاعر کی ناکامی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ شعری اور ادبی روایات صدیوں کے تہذیبی تسلسل کا حاصل ہوا کرتی ہیں۔ سفر کے کسی موڑ پر یہ تسلسل ٹوٹ بھی سکتا ہے لیکن اس کے آثار باقی رہتے ہیں اور پھر یہی ایک نئے فکری عمل کا سرچشمہ بنتے ہیں ——— زندگی کے طور طریقے بدلیں گے تو فکر و فن کے پرانے سانچے بھی بکھر کر ایک نئی شکل اختیار کرنا چاہیں گے لیکن جس طرح زندگی کے تسلسل کو رد نہیں کیا جا سکتا اسی طرح فکری اور فنی وراثت یک قلم مسترد نہیں ہو سکتی۔

مخمور سعیدی

ترقی پسند شاعری کا واضح سیاسی کردار اور کوئی نظریاتی موقف ہمارے ادبی رویوں سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں رکھتا تھا اور بالآخر قابلِ استرداد ٹھہرا لیکن ترقی پسند شاعروں نے ہیئت اور اسلوب کے جو تجربے انجام دیئے وہ ہماری ارتقاء پذیر شعری روایت کے ایک توسیعی مرحلے کا قدرتی اظہار تھے اور انھیں ہمارے اجتماعی ادبی شعور نے بخوشی قبول کیا۔ واضح رہے کہ ہیئت و اسلوب کی ان تجرباتی صورتوں کو استحکام و اعتبار بخشنے کے لیے نظیر سے لیکر اقبال تک اور قریبی پیش رو شاعروں میں جوش ملیح آبادی اور اختر شیرانی کی فکری کاوشیں موجود تھیں۔

یہاں دھیان خود بخود میراجی کی طرف جاتا ہے جو احساس و اظہار دونوں سطحوں پر الگ تھلگ کھڑے اور شاعری میں اپنی یکتائی کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ انفرادیت اپنی جگہ مسلم لیکن ان کی شاعری جس فنی جمالیات اور ان کا لہجہ جس صوتی غنائیت کا حامل ہے وہ اپنے ادبی ماضی کے مخفی ترین گوشوں تک رسائی کے بغیر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔

شاعری کی تخلیقی انفرادیت ہی اس کی پہچان ہوا کرتی ہے لیکن اس انفرادیت کی تشکیل میں اس کی وہ فنی بصیرت بھی کارفرما رہتی ہے جو اسے اپنے پیش رووں سے ملتی ہے ـــــ میرا تجربہ یہی ہے۔

جدیدیت ترقی پسندی کی طرح کوئی منظم تحریک نہیں تھی۔ یہ ایک خود رو رجحان تھا جس نے ایک خاص فکری اور جذباتی ماحول میں جنم لیا۔ ہمارے ہاں اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ جو لکھنے والوں کی تخلیقی آزادی کی فطری خواہش سے تعلق رکھتا تھا۔ ترقی پسند نظریہ شاعر کو ایک صراطِ مستقیم کا پابند بناتا تھا۔ جدید شاعروں نے اس پابندی کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنی شاعری کو اپنے تہہ در تہہ، پیچ در پیچ احساس کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جدیدیت کے فروغ کے ساتھ ہی اردو شاعری کے افق پر تنوع اور تازگی کے وہ رنگ پھر نکھرنے لگے جن پر یکسانیت کی گرد غالب آتی جا رہی تھی ـــــ غور کیا جائے تو تخلیقی آزادی کی یہ بحالی ایک نئی سطح پر ان ادبی قدروں کی بازیافت تھی جو ہمارے شاعروں کو ہمیشہ عزیز رہی ہیں۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنے پر راشد اور میراجی جیسے شاعر، جنھوں نے شدید نظریاتی جبر کے دور میں بھی اپنی انا اور بصیرت کا پرچم اونچا رکھا تھا۔ اپنے بعد آنے والے اس تازہ دم قافلے کی ہمت بندھاتے نظر آتے تھے جس میں شامل ہر مسافر راہ و منزل کا ایک جداگانہ تصور رکھتا تھا مگر دوسروں کا ہم قدم بھی تھا۔

جیسا کہ میں نے کہا، جدیدیت کے رجحان کے پیچھے کچھ ماحولی اثرات بھی کارفرما تھے۔ لیکن یہ صرف پس منظر بناتے تھے۔ پس منظر سے جو منظر ابھرتا تھا وہ فکری تنوع اور تازگی کی ایک نئی دنیا پیش کرتا تھا۔

پھر ایک نئی قسم کے نظریہ طراز سامنے آئے اور انھوں نے جدیدیت کو اس کے ماحولی پس منظر کا اتنا تابع بنانا چاہا کہ جدیدیت بھی ایک فارمولا بننے لگی ـــــ جدید موضوعات بھی گنائے جانے لگے اور جدید ٹکسالی زبان کی نشاندہی بھی کی جانے لگی ان کوششوں سے جدید شاعری کا افق سکڑا اور تخلیقی اظہار کے آزادانہ عمل کو ضعف پہنچا ـــــ اسی لیے اس کے باوجود کہ ان کوششوں کے ساتھ کچھ ایسے لوگ بھی تھے، جن کا احترام مجھے ملحوظ تھا، میں نے انکی مخالفت کی اور کم سے کم اپنی شاعری پر ان کا کوئی پرچھاواں نہ پڑنے دیا۔ بشیر بدر لکھتے ہیں:

" . . . . (مخمور سعیدی) نے اپنے فطری امتیاز کی حفاظت زبردست فنی ریاضت، خود اعتمادی اور سلامت روی سے کی ہے۔ وہ کسی ماحول میں رہے ہوں لیکن اپنے تخلیقی لمحوں میں وہ صرف اپنے ماحول میں رہے ہیں ہمارے عہد میں اچھے اچھے باصلاحیت خوبصورت لہجوں کے شاعر غلط تنقید سے متاثر ہو کر ناشاعری کے مزاجیہ تماشوں میں کم یا زیادہ شریک ہوئے ہیں۔ میں خود بھی پشیمان ہوں۔ مخمور سعیدی کا دامن اس آلودگی سے پاک ہے . . . ."

مگر وہ ماحول کیا ہے جسے بشیر بدر میرا اپنا ماحول کہہ رہے ہیں؟ 'میرے تخلیقی لمحوں' کے پیچھے جو جذباتی اور ذہنی محرکات کارفرما ہیں، وہ کیا ہیں؟

وقت کا تیزی سے گھومتا ہوا پہیہ ـــــ شاید اپنی ہر گردش کے ساتھ ہماری حیاتِ اجتماعی کو حسن و خیر کی نئی نئی منزلوں سے ہمکنار کرتا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر نیا موسم کرۂ ارض پر انسانی زندگی کے لئے کچھ نئی برکتوں کا سوغات اپنے دامن میں لئے آتا ہے اور جسمانی اور روحانی ظفرمندیوں کے نئے نئے در انسان پر وا کرتا ہے۔

لیکن وقت کے برق رفتار پہیئے کی سی گردش انسان کی انفرادی زندگی کی تازگی اور توانائی کو پامال کرتے رہنے پر بھی بضد ہے اور ایک جیتے جاگتے وجود کو بالآخر موت کی تیرہ و تار وادی میں دھکیل دینا اس کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔

وقت کی نیرنگیاں اور موت کی چیرہ دستیاں یہ کچھ لفظ ایسے ہیں جنکی معنویت تک رسائی کی کوشش میں اپنی جان میں نے بہت ہلکان کی ہے ـــــ اس عجز ارادی کوشش میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھا کر گرا ہوں اور زخمی ہوا ہوں۔ کبھی کبھی ان زخموں سے رستا ہوا خون میرے قلم کی نوک پر روشنائی بن کر چمک اٹھا ہے اور میری بےمصرف زندگی کے شب و روز میں جب جب یہ لمحے آئے ہیں۔ مجھے زندگی کا حاصل سمجھا گئے ہیں۔

اداسی ایک جگمگ جگمگ سی پر اثر اداسی جو ذات کی حدوں سے نکل کر کائنات کی لامحدود وسعتوں تک پھیل جاتی ہے۔ اس اداسی کی کچھ ابھرتی ڈوبتی کرنیں اگر آپ کو ان لفظوں میں نظر آ سکیں جو میری شاعری کا اثاثہ ہیں تو میں خود کو تسلی دے سکتا ہوں کہ اس بھری پری دنیا میں میں اکیلا نہیں ہوں۔

آخر میں ایک نظم سنا کر آپ سے رخصت طلب کرتا ہوں۔ یہ نظم بھی ایک آئینہ ہے جس میں میرے محرکاتِ شعری کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "سیہ بر سفید" اور یہ شیخ سعدی کی اس مشہور بیت سے مستعار ہے۔

نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

نظم ملاحظہ ہو:-

دیدنی تھی جو دیکھتا کوئی
رنگ سارے نکل گئے آخر
زندگی جنوں کی نیرنگی
رفتہ رفتہ فنا کی بےرنگی

اک سیاہی مگر چمکتی ہے
لوحِ قرطاس کی سفیدی پر
وہ جو میرے قلم سے ٹپکی تھی
موجۂ رنگ بن کے لپکی تھی

روشنی اب بھی اس سیاہی کی
آب و تاب ان تمام رنگوں کی
دل و جاں میں جو پھیل جاتی ہے
دفعتاً جیسے لوٹ آتی ہے

آب و تاب ان تمام رنگوں کی
زندگی کا شعور بن بن کر
جو مری روح میں در آئے تھے
ظلمتِ جاں میں جگمگائے تھے

رنگ سب مٹ چکے مگر شاید
یہ امانت ہے روحِ فردا کی
یہ سیاہی فنا نہیں ہوگی
یہ اجل آشنا نہیں ہوگی

(اردو سروس سے)

جوش ملیح آبادی

کی شاعری میں ہندوستانیت

ڈاکٹر نریش

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ فنکار اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی زمین سے، اپنی آب وہوا سے، اپنے معاشرے سے اثر قبول کر کے اپنی قوتِ تخلیہ کی آمیزش سے اپنے فن میں حسن پیدا کرتا ہے اور پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی دور میں، بالخصوص دکن کے شعراء کے یہاں ہندوستانیت اپنے پورے رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے لیکن فارسی شاعری کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ ساتھ اردو شاعری بالخصوص اردو غزل کی آب وہوا ایرانی ہوتی چلی گئی اور اپنی دھرتی پر اردو شعراء کی پکڑ کمزور پڑنے لگی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی نے ہمارے معاشرے میں ایک زبردست تغیر برپا کیا اور ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑ ڈالا تو اردو شاعری میں پہلی مرتبہ اپنی مٹی کا درد اور اپنے وطن کی غلامی کا قلق سنائی دینے لگا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے قبل ہمارے ہاں وطنیت کا وہ تصور موجود نہیں تھا جو پورے ملک کو ایک جغرافیائی اکائی کی صورت عطا کرنے میں معاون ثابت ہوتا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کی اردو شاعری میں ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی مکمل تاریخ بکھری پڑی ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اردو شاعری نے نہ صرف قدم قدم پر مجاہدینِ آزادیٔ ہند کا ساتھ دیا بلکہ مادرِ وطن کو غلامی سے آزاد کرانے میں اپنے فرائض کو بخوبی سرانجام بھی دیا ہے۔ تحریکِ آزادی سے متعلق نظمیں کہنے والے متعدد باکمال شعراء کی آوازوں میں ایک آواز خاصی منفرد اور باغیانہ آواز تھی جس کی شناخت میں ہم اسی آواز کی بازگشت سے مدد لے سکتے ہیں کہ ؎

کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
نعرہ میرا انقلاب انقلاب و انقلاب

یہ آواز تھی شبیر حسین خاں جوشؔ ملیح آبادی کی آواز جسے اردو دنیا شاعرِ انقلاب کے نام سے یاد کرتی ہے بعنوانِ

شباب ہی میں جوش کے دل و ذہن میں مادرِ وطن کی غلامی کا داغ سلگنے لگا تھا اور انہیں نہ صرف بدیسی حکمرانوں سے ہی شدید نفرت ہو گئی تھی بلکہ وہ اس جاگیردارانہ نظامِ معاشرہ سے بھی سخت متنفر ہو گئے تھے جس سے انگریزی سامراج کو تقویت مل رہی تھی۔ یہی وہ جذبہ تھا جس کے تحت جوشؔ نے باغیانہ انداز میں گورنر بٹلر کی پیش کردہ اس ڈپٹی کلکٹری کو ٹھوکر مار دی تھی۔ جسے حاصل کرنے کے لئے ہندوستانی امُراء و روساء اپنا ایمان تک بیچ ڈالنے کو تیار رہتے تھے۔

اپنے اوّلین مجموعۂ کلام 'روحِ ادب' سے ہی جوشؔ نے ان خدوخال کی نمائش شروع کر دی تھی۔ جن پر بعد کو ان کی انقلابی شاعری کا قصر تعمیر ہوا تھا۔ 'روحِ ادب' سے لے کر 'نقش و نگار' کی تدوین تک جوشؔ اگرچہ مجموعی طور پر شاعرِ شباب، شاعرِ فطرت، شاعرِ منظر نگار، یا شاعرِ خمریات کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن ان کے کلام میں اظہار کی بے تکلفی اور فکر و نظر کی وہ آزادی نمایاں ہے جو بعد میں ان کی شاعری کا خاصہ بنتی ہے۔ اپنی شاعری کے اس سولہ سالہ سفر میں بھی جوشؔ کا تحت الشعور اپنی مٹی سے جڑا ہوا ہے۔ ان شعراء کے برعکس جن کے تخیل میں ایران کے معشوقوں کی نرگسی آنکھیں اور انکی ساقی گری کارفرما رہتی تھی، جوشؔ کے کلام میں کہیں جمنا کے کنارے گردوں کی جبیں دمک اٹھتی ہے تو کہیں گنگا کے گھاٹ پر نہاتی ہوئی ایک ہندوستانی دوشیزہ اپنے لاجواب حسن سے شاعر کو اپنا پجاری بنا ڈالتی ہے۔ اپنی دھرتی کی محبت میں بندھا ہوا یہ شاعر کبھی باغ سے اٹھلاتی ہوئی آ رہی مالن کے حسن کی تعریف میں اپنا قلم تھامتا ہے تو کبھی دونوں ہاتھوں سے بیروں کی ٹوکری سنبھالتی ہوئی جامن والیوں کے شباب پر نعرۂ تحسین بلند کر اٹھتا ہے کبھی اسے کوہستانِ دکن کی عورتوں کا حسن فریفتہ ہونے کی دعوت دینے لگتا ہے تو کبھی کسی مہترانی کی جوانی اس کے کلام میں گنگنانے لگ جاتی ہے۔

اگرچہ ۱۹۳۶ء کے بعد جوش کی شاعری کا دھارا اپنا رخ بدل لیتا ہے اور شاعرِ شباب شاعرِ انقلاب بن جاتا ہے لیکن ہندوستان کی مٹی کی سوندھی باس، یہاں کے کھیت کھلیان، یہاں کے زمین و آسمان، یہاں کے دریا اور پہاڑ، یہاں کے دن تیوہار، یہاں کے رسم و رواج یہاں کا تہذیب و تمدن جوشؔ کے فکر و نظر میں ہمیشہ جلوہ گر رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کبھی ذی حیات مناظر میں انہیں بیاباں سے دبے پاؤں آتی ہوئی ہوا میں بانسری کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ کبھی فاختہ کی آواز میں میکے کی گھاتیں یاد کرتی ہوئی کسی خاتون کا سسرال دکھائی پڑنے لگتا ہے۔ کبھی البیلی صبح میں کوئی نئی نویلی دلہن اپنی جبیں سے افشاں چھڑانے میں محو دکھائی دیتی ہے اور کبھی 'شام کا ایک منظر' میں دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی ایک سرور بھرنے لگتی ہے۔ کبھی برسات کی پہلی گھٹا، میں کا فر پپیہے کی صدا ان کے کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے تو کبھی جاڑا اور انگیٹھی، میں کوئلوں کی کلیوں کے چٹکنے کی آواز ان کا من موہ لیتی ہے۔ کبھی گرمی اور دیہاتی بازار، میں وہ ماؤوں کے کاندھے پر گردنیں ڈالے ہوئے بچوں کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں تو کبھی بہار کی ایک دوپہر میں ان کی نگاہ کھیتوں میں گیت گاتی ہوئی لڑکیوں کا طواف کرنے لگتی ہے۔

یہی وہ جذبہ ہے جسے میں ہندوستانیت کا نام دیتا ہوں۔ اپنی مٹی کی بو باس میں بسا ہوا شاعر کا مشاہدہ جب اپنے ماحول اور اپنے گرد و پیش کے حسن سے اپنے کلام کو سجاتا سنوارتا ہے تو اس کی آواز قاری کے دل میں گہرے اترتی چلی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنے قاری کو کسی اجنبی، ان دیکھی دنیا کا تصور کر کے پرائی تہذیب سے لطف اندوز ہونے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ ان تمام مناظر کے حسن میں وہ جادو بھر دیتا ہے جسے آج تک اس کی نظر دیکھ کر بھی نہیں دیکھتی رہی تھی جوشؔ کی وطنی شاعری کا یہ پس منظر ان کی شاعری کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے جو قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ ستائش بھی۔

۱۹۳۹ء کے بعد جوشؔ کا ذہن مکمل طور پر آزادیٔ ہند کی تحریک کے ساتھ وابستگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہیں سے ان کے کلام میں تلخی اور ترشی کا لہجہ شروع ہوتا ہے جو بعد میں جوشؔ کی شاعری کا وصف بن کر ہمارے سامنے آتا ہے صبحِ آزادی کی آمد کو التوا میں ڈالنے والی انگریز کی ہر سیاہ چال کو جوشؔ پہلی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور ہر قدم پر نہ صرف ہندیوں کو انگریز کے ناپاک ارادوں سے خبردار ہی کرتے ہیں بلکہ ان کی غلامانہ ذہنیت پر پے در پے وار کر کے ان کے ضمیر کو بیدار کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دینے لگتے ہیں۔ سائمن کمیشن عنوان کی نظم میں جوشؔ کا اندازِ تکلم انتباہ تک محدود رہے کہ ؎

کہیں ہے دھوپ سے نادان بدتر
غلامی کی گھٹا کا شامیانہ

لیکن "شکستِ زنداں کا خواب" میں ان کے ہاں آنے والے انقلاب کی گونج صاف سنائی دینے لگتی ہے کہ

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہوئے ہیں شاید قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں

یا پھر آثارِ انقلاب میں کہ ۔

اُٹھو چونکو بڑھو منہ ہاتھ دھو آنکھ کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو

انقلاب کا یہ دھارا عوامی بیداری کے روپ میں جلوہ گر ہونے لگتا ہے ۔ تو جوشؔ کا کلام اس کی روانی کو تیز کرنے کی دھن میں "زوالِ جہاں بانی" کا اعلان کر کے ہندوستانی کاشتکاروں کو جگاتے جھنجھوڑتے ہوئے "نظمِ نو" کی تشکیل پر آمادہ کرنے لگتا ہے ۔

ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا

سول نافرمانی کی تحریک میں شریک ہوتے ہوئے جوشؔ ہندوستانی عوام کو "وفاق" کی دعوت دیتے ہوئے انہیں انڈیا ایکٹ کے پردے میں چھپی تازہ بلاؤں سے خبردار کرتے ہیں ۔

ہشیار اہلِ ہند کہ پھر اس زمین پر!
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے

اور پھر بے باکانہ انداز میں شہنشاہِ ہندستان یعنی جارج سے مخاطب ہو کر اسے آگاہ کرتے ہیں کہ ۔

چونکیئے جلدی ہوائے تند و گرم آنے کو ہے
ذرہ ذرہ آگ میں تبدیل ہو جانے کو ہے

جوشؔ کے انداز کی تلخی اور ان کے کلام کی چابک دستی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" میں کھل کھیلتی ہے ۔ اس نظم میں جوشؔ نے جس بے خوبی و بے باکی کے ساتھ انگریزوں کو جلی کٹی سنائی ہیں اور جس بے رحمی سے ان کی سیاسی ریاکاریوں کا پردہ فاش کیا ہے ، اس سے جوشؔ کی وطنی شاعری ایک نئے افق کو چھو کر عظیم تر ہو جاتی ہے ، طنز کے ساتھ ملی جلی ان کے انداز کی تلخی ملاحظہ ہو ۔

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لئے کہتے نہیں

جوشؔ کی اس نظم کی اثر انگیزی سے سراسیمہ انگریزی حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا اور جوشؔ کے گھر کی تلاشی ہوئی ۔ جوشؔ کی نظم تلاشی اسی تلاشی کے ردِ عمل میں کہی گئی ہے ۔

۱۹۴۵ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا ۔ جوشؔ نے اسی بے باکی سے "وزارتی وفد کا فریب" عنوان سے ایک نظم کہی اور ہندوستانی عوام کے دلوں کی دھڑکنوں کو زبان دی ۔

ملک کی آزادی کو پسِ پشت ڈالنے کے لئے انگریزوں نے ایک اور چال چلی ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ نفرت کا بیج بو کر انگریزوں نے مسلم لیگ کی پشت پناہی کے ذریعے اس کی آبیاری کی اور بالآخر یہ بیج ایک تناور درخت کی صورت میں رونما ہوا اور اس ملک کے ٹکڑے کر گیا ۔ جوشؔ ابتدا ہی سے انگریزوں کی اس چال سے باخبر تھے اور وہ بار بار اپنی نظموں کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو سمجھاتے رہے اور اپنے دل میں یہ عزم پالتے رہے کہ ۔

ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرح نو اجمیر اور پریاگ میں
جھونک دوں گا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں

اخوت کا یہی جذبہ تھا جس کے تحت جوشؔ زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کرتے رہے اور یہی وہ جذبہ حب الوطنی تھا جس کے طفیل جوشؔ کی شاعری ، کلامِ شاعرِ انقلاب ، کے عنوان سے پہچانی گئی ۔

(آکاشوانی جالندھر سے نشر)

کامیابی

شاغل ادیب

کامیابی انسان کا مقصدِ عظیم ہے ۔ انسانی زندگی کامیابی سے منسوب ہوتی ہے ۔ انسان کو کامیابی اور ناکامی کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھتے رہنا چاہیئے ۔ امریکی صدر ابراہم لنکن کو لیجئے ۔ اسے پہلی بار الیکشن میں ناکامی ہوئی ۔ اس کی پہلی محبوبہ کا انتقال ہو گیا اور بعد میں اس نے جس عورت سے شادی کر لی اس نے اسے عمر بھر ستایا ۔ لیکن ابراہم لنکن نے ہمت نہیں ہاری ۔ انسان کو اس کی ناکامیابیاں ، کامیابی کا راز بتاتی ہیں ۔ اسے فتح و ظفر کا سبق سکھاتی ہیں ۔

انسان اپنی کامیابی اور ناکامی کو خوش قسمتی اور بدقسمتی کا نام دیتا ہے ۔ لیکن یہ غلط ہے شیکسپیئر کہتا ہے ۔ "اپنی خوش قسمتی اور بدقسمتی کا ذمہ دار انسان خود ہی ہوتا ہے" ۔ خوش قسمتی انسان کے اعمال و کردار کا آئینہ ہوتی ہے ۔

انسان کو کامیابی یوں ہی نہیں ملتی ۔ اس کے لئے اسے زندگی کی تمام تر مشکلات اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انگریزی کے نامور شاعر لانگ فیلو نے کہا ہے کہ جو لوگ کامیاب ہو کر بلند مقام حاصل کرتے ہیں ۔ بلند مرتبہ پاتے ہیں اور نمایاں شخصیت کے حامل بن جاتے ہیں ۔ انہیں یہ مقام یہ رتبہ یہ شخصیت یوں ہی نہیں ملتی ۔ انہیں ان خصوصیات کو پانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے ۔ ان لوگوں کی یہ کامیابی صرف انہیں ہی نہیں بلکہ ان کے مصیبت زدہ دوستوں کو بھی فائدہ پہونچاتی ہے ۔

انسانی زندگی ناکامیوں ، مشکلات اور الجھنوں سے پُر ہے ۔ لیکن انسان کو ناکامیوں ، مشکلات اور الجھنوں کا اپنے عزمِ مستحکم اور دمِ محکم سے ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیئے ۔ انسانی نفسیات کے عظیم مفکر سویٹ مارڈن کا قول ہے "مشکلات اور الجھنوں پر فتح پانے والا ارتقار کی جانب رواں دواں رہتا ہے" ۔

ہندی ساہتیہ کے لیکھک شری لکمن لال جین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انسان کو اپنی ناکامی سے ناامید و مایوس نہیں ہونا چاہیئے ۔ اس کی اپنی ناکامی اس کی اپنی ہی پیدا کردہ مشکلات اور الجھنوں کی دین ہوتی ہے ۔ اسے ان مشکلات اور الجھنوں کا حل ڈھونڈ نکالنا چاہیئے ۔ اس ضمن میں ہندی کے ایک اور مصنف شری نرسمہارام شکل بھی لکھتے ہیں "امید پر دنیا قائم ہے اگر انسان ناامیدی کا شکار ہو جائے تو انسانی سماج برباد و مسمار ہو جائے گا ۔

انسان کو اپنی ناکامی پر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیئے ۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا ہے کہ دنیا کی بری خصلتوں میں دو خصلتیں سب سے زیادہ بری ہیں ۔ ۔ پہلی انتہائی بخالت اور دوسری انتہائی بزدلی ۔

لہٰذا کامیابی انسان کا مقصدِ عظیم ہے ۔ کسی نے کہا ہے کہ مقصد کے حصول کی سچی لگن انسان کو مشکلات میں ناامید و مایوس نہیں ہونے دیتی ۔ جارج ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے "ناامیدی کے بھنور میں گھر کر انسان کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا" انسان کو ناکامی کا مقابلہ ہمت اور امید افزا دل سے کرنا چاہیئے ۔ بقولِ شخصے خوف انسانی زندگی کو ہلاک کرتا ہے ۔ اور اس کے لئے کامیابی کا دروازہ بند کر دیتا ہے "انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے سخت محنت اور صالح عمل سے کام لینا چاہیئے ۔ شدتِ محنت اور صالح عمل کی پختگی انسان کو کسی ناکامی اور اس کی تکالیف سے متاثر نہیں ہونے دیتیں ۔ کسی محنت اور عمل کے بغیر کامیابی کا تصور ببول کے پیڑ سے آم کی توقع غلط کے مصداق ہے ۔

(حیدرآباد سے نشر)

کتب بینی کی ضرورت

ڈاکٹر ارشد جمال

مخرج حلق سے خارج ہونے والی مختلف آوازوں نے لفظوں کی صورت اختیار کی۔ لفظوں کے بامعنی مجموعے جملوں کی شکل میں ظاہر ہوئے جو آگے چل کر بولی بنے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں بہ یک وقت مختلف انسانی گروہوں نے متعدد بولیوں کو جنم دیا اور جب ان "معقولات" نے "محسوسات" کی شکل اختیار کی یعنی الفاظ کی روحوں نے جب جسمانی روپ اختیار کیا یا تحریری شکل میں نمودار ہوئیں تو زبان کے نام سے موسوم ہوئیں یہی زبانیں ترقی کی منزلوں میں آگے کی طرف قدم رکھ کر کتابوں کی شکل میں صورت پذیر ہوئیں۔ کتابوں کی طباعت اور اشاعت زمانۂ قدیم میں آسان نہیں تھی۔ برسوں مخطوطات کا دور رہا۔ چھاپہ خانوں کی ایجاد نے طباعت کا کام آسان کیا۔ زمانۂ قدیم میں آج کی طرح طباعت واشاعت کا کام آسان نہ تھا۔ طباعت کی سہولیات نے علوم کے خزانوں میں کتابوں کے ذخیرے جمع کرنے شروع کئے اور یہ کتابیں نہ صرف علم وادب کا خزانہ بنیں بلکہ کل انسانی معاشرے کی تہذیب وترتیب اور تراش وخراش میں معاون ہوئیں۔ آج اگر ہمارے پاس کتابیں نہ ہوتیں تو نہ ہمیں زمانہ قدیم سے آشنائی ہوتی، نہ ہمارے اجداد کی فراست، ذہانت وذکاوت کی وراثت ہم تک منتقل ہوتی۔ نہ انسانی معاشرہ ترقی کی موجودہ منزلوں کی جانب قدم زد ہوتا۔

ابتدائی دور میں چوں کہ کتابوں کی طباعت واشاعت بڑا مشکل کام تھا۔ لہٰذا کتابوں کی حفاظت کا بے حد خیال رکھا جاتا تھا۔ کامیاب کتابوں کے مطالعے میں بھی از حد دلچسپی لی جاتی تھی۔ ایک ہی کتاب کو بار بار پڑھا جاتا تھا۔ آدمی کے پاس وقت بہت تھا اور دفع الوقتی کے ذرائع بہت کم تھے۔ کتب بینی ہی ایک واحد منفعت بخش، ذہن کو جلا بخشنے والا اور روح کو تازگی عطا کرنے والا مشغلہ تھا۔ دوسرے صاحبِ علم حضرات کی تعداد بھی انگلیوں پر شمار کی جاسکتی تھی۔ پھر ان میں کتب بینی کے شوقین حضرات کی تعداد تو اور بھی کم تھی۔ مگر ان تمام دقتوں کے باوجود اس دور میں بھی کتب بینی ضروری تھی۔ اور آج بھی جب کہ حالات بدل چکے ہیں اور مصروف زندگی میں سے مطالعے کے لئے فرصت کے لمحات چرا لینا ناممکن ہے۔ کتب بینی کی ضرورت باقی ہے۔ اس لئے کہ کتب بینی سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اور علم میں اضافے سے ذہن کو کشادگی ملتی ہے۔ زمین پر کھڑے ہو کر قرب وجوار میں نظر دوڑائی جائے تو زمین کا بہت مختصر سا حصہ نظارے کی گرفت میں آئے گا۔ دو منزلہ عمارت پر کھڑے ہو کر اطراف کا مشاہدہ کریں تو زمین کا وسیع تر قطعہ نظر کے سامنے ہوگا لیکن کسی پہاڑ کی بلندی سے زمین پر نظر ڈالیں تو قوت نظارہ میں کس قدر وسعت وپہنائی آجاتی ہے۔ دور دور تک کی چیزیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ہاں! جو چیزیں نیچے سے بہت بڑی نظر آتی تھیں۔ وہ بلندی سے بہت چھوٹی نظر آئیں گی مگر نظروں کو جو دور بینی کی خصوصیت اور وسعت بلندی پر چڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دماغ کو وہی کشادگی، وہی گہرائی وگیرائی مطالعہ کتب سے حاصل ہوتی ہے۔ کتب بینی کی کثرت کے باعث ذہن کو کشادگی وپہنائی ملتی ہے عقل وفراست میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسرار قدرت منکشف ہوتے ہیں فطرت کے سربستہ رازوں سے دل ودماغ آشنا ہوتے ہیں کتابیں اس لئے ہی ہوتی ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ ان میں پوشیدہ اسرار کے اجالوں سے اپنے ذہنوں کے تاریک نہاں خانوں کو منور کیا جائے۔ موجودہ مصروف زندگی میں جب کہ ریڈیو، ٹی وی اور سنیما جیسے طاقت ور تضیع اوقات کے واسطوں نے ہمارے ذہن پر قبضہ کرلیا ہے، اگر ہم بھرپور، خوش حال اور صحت مند زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو کتب بینی کا عادی ہونا ہمارے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ کتب بینی ہی ایک ایسا مشغلہ ہے جو خود ارادی ہے۔ ورنہ مذکورہ بالا ذرائع سے لطف اندوز ہونے کے لئے ناشر کے دیے ہوئے وقت کی پابندی ضروری ہے۔ مسٹر بی رل Berrill لکھتے ہیں کہ میرا مشورہ ہے کہ "نہ صرف کتب بینی کا ذوق پیدا کیجئے بلکہ ہمیشہ اس شوق کو زندہ رکھیے" مشہور مقالہ نگار بیکن Bacon کہتا ہے کہ "مطالعہ آدمی کو مکمل بناتا ہے" اسی لئے وہ مشورہ دیتا ہے کہ "مطالعہ مخالفت یا موافقت کی غرض سے کیجئے نہ موضوعِ گفتگو کی تلاش کے لیے بلکہ موضوع کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے کتب بینی کی جائے" لیکن اس سے یہ بھی مراد نہیں ہے کہ ہر کتاب کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسی لیے وہ آگے چل کر کہتا ہے کہ "کچھ کتابیں محض سرسری مطالعے کے لئے ہوتی ہیں، کچھ صرف ناظرے کے لیے، لیکن چند منتخب کتب ایسی ہوتی ہیں جن کا مطالعہ بغور کرنا چاہیے تاکہ ان کے نفسِ موضوع پر مکمل گرفت کی جاسکے"۔

آج پڑھنے کے لئے موضوعات کی کمی نہیں ہے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں دست یاب ہیں مثلاً ڈرامے، ناولیں اور افسانے، مضامین اور مقالے، سوانح عمریاں، سفرنامے، تقریریں، سائنسی موضوعات پر مختلف علوم کی کتابیں، تاریخ، جغرافیہ، سیاست عمرانیات اور معاشیات پر کتابیں، تنقیدی اور مذہبی مسائل پر کتابیں، شاعری، حکمت، فلسفہ وغیرہ غرض کہ بے شمار موضوعات ہیں، جن پر کتابیں دستیاب ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور قسم کی کتابیں بازاروں میں ملتی ہیں، جن کے پڑھنے اور باتصویر رسائل کے دیکھنے کا شوق جنوں کی حد تک لوگوں میں پھیلتا جارہا ہے اور ہیں مخش کتابیں اور فحش ادب۔ کتب بینی جس قدر مفید مشغلہ ہے اتنا ہی نقصان دہ بھی ہے۔ یہ وہ دو دھاری تلوار ہے جو خود قابض کو بھی زخمی کرسکتی ہے۔ مخرب اخلاق کتابوں کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے اتنا ہی خطرناک اور تباہ کن ہوسکتا ہے جتنا منشیات کا استعمال چنانچہ جہاں کتب بینی ضروری شے ہے وہاں اس بات کا دھیان رکھنا بھی ضروری ہے کہ کس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "نہ صرف آنکھیں کھول کر بلکہ جاگتے ذہن کے ساتھ مطالعہ کیا جائے" اور کھلے ہوئے ذہن اور کشادہ آنکھوں کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قاری ان چند سوالوں کو ذہن میں رکھ کر کتب بینی کرے۔ (ا) مصنف کس موضوع پر لکھ رہا ہے۔ (ب) اس کا مرکزی خیال کیا ہے (ج) اس نے موضوع کے متعلق بحث کس وسعت وجامعیت سے کی ہے۔ (د) وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے یعنی ہماری توجہ کس حد تک اپنی طرف مبذول کراسکا ہے یا پھر اس کی باتوں سے ہمیں کس حد تک اختلاف ہے اور آخر میں (ہ) کلتیاً وہ تحریر ہمارے لئے کیا کشش رکھتی ہے۔

جب تک مطالعے میں استغراق کی کیفیت نہ پیدا ہو، مطالعے کا صحیح ذوق پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ علمائے سلف میں شوق کتب بینی اس قدر تھا کہ اگر اس کی چند مثالیں پیش کی جائیں تو آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ جائیں گی،

مثلاً اٹھارویں صدی میں لیٹز نامی جرمن فلاسفر اپنے کتبخانے سے کبھی باہر نہ نکلتا تھا۔ بے پناہ شوق کتب بینی رکھنے والے عالم بسکل اور خزانہ علم کے جویا امام مسلم نے تو اسی مشغلے میں اپنی جانیں تک قربان کردیں۔ انگریزی کے شاعر ملٹن کے اندھے ہونے کا ایک سبب کثرت مطالعہ تھا۔

کتب بینی کے سلسلے میں قدما کا یہ حال تھا کہ ایک ایک کتاب کو سینکڑوں بار پڑھ کر بھی انھیں سیری حاصل نہ ہوئی تھی۔ قید خانوں کی تاریکیوں میں بھی علمی شغل کے بغیر چین نہ آتا تھا۔ ایک ایک مسئلے کے حل کے لئے سینکڑوں میل پاپیادہ طے کرتے تھے۔ ایک ایک کتاب کے مطالعے میں چالیس چالیس پچاس پچاس برس صرف کردیتے تھے۔ چنانچہ ابونصر فارابی نے ارسطو کی کتاب "النفس" کا سو مرتبہ مطالعہ کیا تھا۔ ابن رشد کو کتب بینی کا اس قدر شوق تھا کہ تمام عمر میں تین راتوں کے سوا کبھی اس سے یہ فریضہ ترک نہ ہوا۔ ابن سینا کے متعلق مشہور ہے کہ ایام طالب علمی میں انھوں نے ایک شب بھی کامل خواب کا لطف نہیں اٹھایا۔ ایک ایک کتاب کئی کئی مرتبہ پڑھتے خود ان کا بیان ہے کہ "میں نے فارابی کی کتاب 'مابعد الطبیعات' کا چالیس مرتبہ مطالعہ کیا تھا۔ امام شافعی کے ایک شاگرد کا بیان ہے، "میں امام شافعی کی ایک کتاب کا مطالعہ متواتر پچاس سال سے کر رہا ہوں

علامہ مسعودی نے کتاب کی کس قدر فصیح، جامع اور صحیح تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ، اے میری کتابو! تم میری جلیس اور انیس ہو۔ تمہارے ظریفانہ کلام سے نشاط اور تمہاری ناصحانہ باتوں سے تفکر پیدا ہوتا ہے تم پچھلوں اور پہلوں کو ایک عالم میں جمع کردیتی ہو۔ تمہارے منہ میں زبان نہیں لیکن تم زندوں اور مردوں دونوں کے افسانے سناتی ہو تم ہم سایہ ہو لیکن ظلم نہیں کرتیں، عزیز ہو لیکن غیبت نہیں کرتیں، دوست ہو لیکن مصیبت میں ساتھ نہیں چھوڑتیں" ظاہر ہے جن کتابوں میں اس قدر خوبیاں ہوں، ان کا مطالعہ کیسا کچھ منفعت بخش نہ ہوگا۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف دنیاوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ بلکہ روحانی استفادہ بھی ہوتا ہے۔ نہ صرف دور بینی میسر آتی ہے، ذہن کشادہ ہوتا ہے۔ دل مسرور ہوتا ہے، بلکہ روح بھی بالیدہ ہوتی ہے۔ نہ صرف ذہنی سکون میسر آتا ہے بلکہ روحانی تسکین بھی ملتی ہے۔ کتب بینی کی ضرورت کے لئے اس سے بھی بڑھ کر ایک بات اور کہی جاسکتی ہے۔ اور وہ ایک انگریز مفکر کا قول ہے کہ

"جس نے کل تعلیم کی اعلیٰ سند حاصل کی ہے اگر آج مطالعہ ترک کردے تو وہ کل پھر سے غیر تعلیم یافتہ ہوجائے گا۔"

اسی لئے کتب بینی ضروری ہے اور مجھے یہ کہنے میں چنداں تامل نہیں کہ آج کے دور میں کوئی بھی شخص کتب بینی کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

(آکاش وانی ناگپور سے نشر)

۱۶ مارچ ۱۹۸۷ء

پریم چند کے کردار

قمر رئیس

لوکاج کے قول کے مطابق کسی **گیورگی** بڑے ناول نگار کی شناخت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے کردار نہ صرف اپنی ذات میں منفرد ہوتے ہیں بلکہ ان کے تعمیری عمل میں اس عہد کے بنیادی مسائل بھی سموئے ہوتے ہیں یعنی ناول کے کامیاب، دلکش اور جاندار کردار وہی ہوتے ہیں جو ایک طرف ایک فرد یا انسان کی حیثیت سے اپنی علیحدہ شناخت قائم کریں اور دوسری جانب اپنے عہد کے قومی یا سماجی مسائل کی نمائندگی بھی کریں۔ ایک باکمال تخلیق کار کی بڑائی اسی میں ہوتی ہے کہ وہ کردار کی ذاتی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں توازن قائم کرے اور دونوں کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنے کرداروں کو جاندار اور لافانی قالب عطا کرے۔

پریم چند اردو کے ایسے ناول نگار ہیں جنھوں نے انسان کی ذات اور اس کے معاشرہ دونوں کی باہمی اثر پذیری کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنے کرداروں کو ان کے نفسیاتی اور سماجی مناظرات کے آئینہ میں دیکھیں۔ ان کے بالکل ابتدائی دور کے ناولوں میں بھی اس صورت حال کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے ناول 'ہم خرما وہم ثواب' اور 'جلوۂ ایثار' ۱۹۱۲ء سے پہلے کے ناول ہیں۔ انکے ہیرو امرت رائے اور پرتاپ چندر وطن پرست جوشیلے نوجوان ہیں۔ وہ دو لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے سماج کو دقیانوسی اور انسان دشمن رسم و رواج میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کا دل دکھ سے نڈھال ہوجاتا ہے۔ اور وہ سماجی اصلاح کے کاموں میں تن من سے لگ جاتے ہیں اس طرح انکی محبت کا انفرادی جذبہ ارتقائی عمل سے گزر کر ایک بڑے نصب العین کے حصول کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ پرتاپ چندر کو یقین ہے کہ جب تک ہندوستانی معاشرہ ذات پات چھوت چھات اور دوسرے گھناونے رسم و رواج سے پاک نہیں ہوگا سیاسی غلامی کے خلاف جدوجہد بے معنی ہوگی۔

پریم چند کے یہ ابتدائی ناول اگرچہ فنی اعتبار سے کمزور ہیں لیکن ان کے مطالعہ سے انکی کردار نگاری کے ارتقائی مرحلوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے اس دور کے کردار سیدھے سادے اصلاح پسند کردار ہیں انکی سیرت کے صرف چند گوشے ہی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب وہ اپنے ناول بازار حسن میں سمن کا کردار تخلیق کرتے ہیں تو اس میں زیادہ تہہ داری پیدا ہوجاتی ہے۔ اس کے کردار کو تراشنے اور سنوارنے میں انسانی نفسیات کا نسبتاً زیادہ گہرا شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ اوسط گھرانہ کی ایک شوخ چنچل اور معصوم لڑکی سمن کیونکر کوٹھے کی زینت بن کر ایک تجربہ کار طوائف کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ پریم چند اس کے کردار کی تبدیلیوں کے نفسیاتی اور سماجی اسباب کا تجزیہ تخلیقی مہارت سے کرتے ہیں۔ جہیز نہ ہونے کی بنا پر وہ ایک عزیب، تنگ نظر جاہل اور لٹکی شوہر سے بیاہ دی جاتی ہے۔ باوجود ناپسندیدگی کے وہ اپنے شوہر کے ساتھ نباہ کرنے اور گھر بسانے کی پوری کوشش کرتی ہے۔ شوہر کے ظلم و ستم اور طعنے برداشت کرتی ہے۔ لیکن اس کا شوہر جب اس پاکباز اور غیرت مند لڑکی پر بدچلنی کا الزام لگاتا اور گھر سے نکال دیتا ہے تو وہ اسکی خوشامد کرکے اپنی صنفی خودداری اور انسانی وقار کو مجروح نہیں کرتی وہ کہتی ہے۔ کیا تم میرے ان داتا ہو۔ جہاں مزدوری کروں گی وہاں پیٹ پال لوں گی۔ اس کے بعد پریم چند دکھاتے ہیں کہ وہ معصوم لڑکی مردوں کے ظالمانہ سماج میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے۔ سب اس کو ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہیں۔ آخر مجبور ہوکر مردوں سے انتقام لینے کے لئے وہ کوٹھے کی زینت بن جاتی ہے۔

اس کے بعد کے ناول "چوگان ہستی" کی ہیروئن صوفیہ بھی اپنے عقائد کی آزادی اور صنفی وقار کو قائم رکھنے کی خاطر اپنے ماں باپ اور سماج سے بغاوت کرتی ہے۔ وہ سمن کی طرح سماج کے کسی گرے ہوئے ادارہ یا آشرم میں پناہ نہیں لیتی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس فرار سے سماج کے پرانے ناسوروں کا علاج ممکن نہیں صوفیہ سیاسی غلامی کو سماجی پستی کا ذمہ دار قرار دیتی ہے اور اس کے خلاف جنگ کرتی ہے۔ اس جدوجہد میں اس کا کردار نکھرتا ہی نہیں زیادہ پیچیدہ بھی ہو جاتا ہے۔ ونے سنگھ سے اپنی محبت کی ناکامی سے وہ کام لیتی ہے۔ اس کا ارتفاع اسے ملک و قوم کے لئے ہر طرح کی قربانیوں کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ پریم چند کے بعض دوسرے نسوانی کرداروں سکھدا، نینا اور سکینہ میں بھی ایثار و قربانی کے اسی جذبہ کی فراوانی ہے۔ وہ اپنی نجی خواہشات اور خوابوں کو بڑے قومی آدرشوں کے لئے آسانی سے قربان کر دیتی ہیں۔ بظاہر یہ صورت حال کچھ غیر فطری سی لگتی ہے لیکن اگر ہم یہ نہ بھولیں کہ جنگ آزادی میں ہزاروں مردوں اور عورتوں نے کس طرح اپنا سب کچھ قربان کر دیا تو کردار نگاری کا یہ انداز حقیقت نگاری کے اصول سے انحراف معلوم نہیں ہوگا۔ دوسری طرف پریم چند نے نرملا، جھنیا، سلیا اور دھنیا جیسے کردار بھی تخلیق کئے ہیں جو طبقاتی سماج کے مظالم کا شکار ہیں۔ جو ذات پات کے سفاک امتیازات اور افلاس کے دکھ جھیلتے ہیں۔ دھنیا بلاشبہ اردو افسانوی ادب کا غیر فانی کردار ہے۔ گاؤں کی یہ باغی عورت ایک غریب کسان کی بیوی ہے۔ پریم چند نے گئودان میں اس کی انفرادی سیرت اور طبقاتی حیثیت کے ہر رخ کو پیش کیا ہے۔ ایک عورت ماں اور بیوی کی حیثیت سے اس کا دل اتاہ محبت سے معمور ہے لیکن وہ دیکھتی ہے کہ گاؤں کا ہر کسان زمیندار، مہاجن، برہمن اور سرکاری عمال کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ کا شکار ہے۔ سب کسانوں کے خون پسینہ کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں تو وہ استحصالی سماج سے باغی ہو جاتی ہے۔ وہ ہوری کی طرح ظلم و بیداد کو صبر و شکر سے سہنے کے بجائے صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔ ہوری سر عام اسے مارتا ہے۔ وہ فاقے کرتی ہے چیتھڑے پہنتی ہے لیکن اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے وہ رحم دل ہے حساس ہے۔ جھنیا اور سلیا جیسی سماج کی مظلوم عورتوں کو وہ اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ الغرض اس کا کردار ایک پیچیدہ کردار ہے۔ اسی طرح ناول کے شہری کرداروں میں پریم چند نے مس مالتی کا کردار پیش کیا ہے جو سماج میں عورت کے حقوق اور آزادی کی نمائندہ ہے۔ وہ ڈاکٹر ہے اور اپنے شہر کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ وہ مردوں کے مقابلہ میں کسی احساس کمتری کا شکار نہیں۔ اس کا عقیدہ ہے کہ عورت اسی وقت سماج میں مردوں کے مساوی حقوق حاصل کر سکتی ہے جب وہ معاشی اعتبار سے اپنے پیروں پر کھڑی ہو۔ وہ مسٹر مہتا سے محبت کرتی ہے لیکن ان کے حاکمانہ مزاج کی وجہ سے شادی نہیں کرتی کہ اس طرح وہ اپنی شناخت سے محروم ہو جائے گی۔ ہندوستانی سماج میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کی تحریک جیسے جیسے بڑھ رہی تھی۔ پریم چند کے خیالات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی جا رہی تھیں اور عورت کے تعلق سے جس آدرشی نقطۂ نگاہ کو وہ لیکر چلے تھے وہ حقیقت پسندانہ روپ اختیار کرتا جا رہا تھا۔ انکی آخری دور کی کہانیوں مثلاً "نئی بیوی" اور "دو بہنیں" کے کردار بھی اس کا ثبوت ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کا قافلہ جن راستوں اور مرحلوں سے گزرا ہے اس کے نقوش بھی پریم چند کے کرداروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے کئی کردار مہاتما گاندھی کی ستیہ گرہ اور اہنسا کے خیالات میں رنگے ہوئے ہیں جو ایک زمانہ تک جنگ آزادی کے کارگر حربے تھے۔ مثال کے طور پر ان کے ضخیم ناول "چوگان ہستی" کے اہم ترین کردار سور داس اور ونے سنگھ دونوں ستیہ گرہ اور کانگریس کے تعمیری پروگرام کو اپنا فلسفۂ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ سور داس ایک اندھا فقیر ہے لیکن وہ بڑی مضبوط قوت آزادی کا مالک ہے۔ وہ جسے سچائی اور حق سمجھتا ہے اس کے لئے جان بھی دے سکتا ہے۔ وہ ایک تاجر جان سیوک کے ہاتھ اپنا قطعۂ زمین صرف اس لئے فروخت نہیں کرتا کہ اس پر کارخانہ بنے گا۔ وہاں غنڈے جمع ہونگے شراب پی جائے گی اور بداخلاقی پھیلے گی جان سیوک جب حکومت کی مدد سے وہ زمین حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ ستیہ گرہ کر دیتا ہے اور آخر کار وہیں شہید ہو جاتا ہے۔ سور داس عام زندگی میں بھی ستیہ گرہ اور اہنسا کے اصولوں پر عمل کرتا ہے اسی ناول کا ایک دوسرا کردار ونے سنگھ گاندھی جی کے تعمیری پروگرام کو اپناتا ہے اور اپنی دن رات کی تگ و دو سے ایک گاؤں کو مثالی گاؤں بنا دیتا ہے۔ سماجی اور سیاسی اعتبار سے جہاں یہ کردار ایک آدرش کا روپ ہیں انکی ذاتی اور جذباتی زندگی میں کئی کمزوریاں بھی ہیں ونے سنگھ صوفیہ کے عشق میں دیوانہ ہو کر اپنے اصولوں اور اپنی وطن پرست ماں کی ہدایات سے غافل ہو جاتا ہے وہ جذباتیت کا شکار ہے اس لئے سیاسی قیادت کے میدان میں ناکام رہتا ہے۔

پریم چند کا عقیدہ تھا کہ عام ہندوستانی، کچھ علاقائی اور تمدنی اختلاف کے باوجود متحدہ ہندوستانی قومیت سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان کے بنیادی مسائل ایک جیسے ہیں اور وہ ایک ہی تہذیب کے ماننے والے ہیں۔ لیکن مفاد پرست طاقتیں ان کے اتحاد اور یکجہتی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ دوسری طرف پریم چند چھوت چھات اور ذات پات کی ظالمانہ تفریق کو ملک کی ترقی اور آزادی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اسی لئے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں انھوں نے ایسے کردار تخلیق کئے ہیں جو فرقہ پرستی اور ذات پات کی تفریق کے خلاف بھرپور جہاد کرتے ہیں۔ پردۂ مجاز میں چکر دھر جب اگرہ جاتا ہے تو وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو رہا ہے۔ وہ اس آگ میں کود پڑتا ہے، اور اپنی قربانی سے نفرت کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے، مسلمانوں کے ایک رہنما خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ دونوں فرقوں میں کچھ ہی لوگ ہیں جو اپنے مفاد اور اپنی فلاح کی خاطر دونوں فرقوں کے درمیان تناؤ بنائے رکھنا چاہتے ہیں چکر دھر ایک ایسی لڑکی اہلیہ سے شادی کر لیتا ہے جسے فسادی مسلمان اغوا کر لے جاتے ہیں۔ اپنی ان قربانیوں سے وہ عام لوگوں کی نظروں میں بہت بلند درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہ وشال سنگھ کی اسٹیٹ کا منیجر ہو جاتا ہے تو طاقت کے نشہ میں وہ اپنے آدرشوں سے گر جاتا ہے اور عوام سے دور ہو جاتا ہے۔ حق اور انصاف کے لئے انسان کی جدوجہد سے دوری اس کے زوال کا باعث ہوتی ہے دوسری طرف 'میدان عمل' کا ہیرو امرکانت عیش و نشاط کی زندگی تج کر ہندوستانی عوام کی اجتماعی جدوجہد کے میدان میں کود پڑتا ہے۔ وہ گاؤں کے بے بس خوفزدہ اور مظلوم کسانوں کو زمیندار اور حکومت کے جبر و تشدد کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرتا ہے ان میں قوت اور اعتماد کی روح پھونکتا ہے سکینہ اور منی کا پیارا اسے اس جدوجہد میں نیا حوصلہ بخشتا ہے۔ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ امرکانت کے کردار میں پریم چند نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی زندگی ان کے خیالات اور عملی جدوجہد کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

الغرض پریم چند کے ناولوں میں اس نئے انسان کی تابناک شکل نظر آتی ہے۔ جس نے بیسویں صدی کے نصف اول میں مختلف اصلاحی سیاسی اور ذہنی تحریکوں کے زیر اثر پرورش پائی۔ جو اپنے عہد کے تضادات کا آئینہ دار ہے۔ پریم چند کے کردار اپنے طبقاتی رابطوں سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ ہندوستانی گاؤں کے کسانوں، کھیت مزدوروں اور دبے کچلے ہر تبقوں کو اپنے ناولوں اور کہانیوں میں ہیرو کے درجہ پر فائز کرنا تھا۔ وہ جو حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے تھے پریم چند نے انسان کی حیثیت سے ان کے مسائل کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی اسی لئے پریم چند کی حقیقت نگاری کے اسلوب کو اردو افسانوی ادب کی بنیادی روایت کا درجہ حاصل ہوا۔

(اردو سروس سے نشر)

گاندھی جی

قومی یکجہتی کی علامت

جمیل اختر

دنیا کے ان چند بڑے آدمیوں میں **گاندھی جی** ایک ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں گذار دی۔ ملک و قوم اور سماج کی اصلاح منضبط اور منظم خطوط پر اس کی تعمیر و تشکیل میں اپنی پوری عمر کھپا دی۔ ان کی پوری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے ان کا ہر عمل حب الوطنی کا آئینہ دار اور ان کا ہر قول صداقت کا شاہکار خلوت و جلوت میں ایک ہی بات ایک ہی فکر ملک و قوم کی اصلاح اور اس کی تعمیر و ترقی، آنسو چھلکے تو ملک و قوم کے غم میں، مسکرائے تو ہندوستان کی ہندوستانیت پر سوئے تو دیس کی آزادی کا خواب لئے ہوئے، جاگے تو حصولِ تعبیر کا خیال سمیٹے ہوئے، غرض کہ رگ و پے میں جذبۂ حریت کا بہاؤ خون کی گردش بن گیا تھا مسئلہ صرف زنجیر غلامی کاٹنے کا نہیں تھا اصل مسئلہ تو یہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات کے تحت ایک مربوط نظام زندگی کا تھا —— پسماندگی، غریبی و جہالت کے خلاف ایک مضبوط محاذ کا تھا صدیوں سے استحصال کا شکار طبقوں کے باوقار ڈھنگ سے جینے کا تھا اور جمہوری خطوط پر ملک کو چلانے کا تھا یہ بہت مشکل کام تھا۔

گاندھی جی نے جن حالات میں آنکھ کھولی اور جس ماحول میں پرورش پائی وہ زمانہ ہندوستان کی غلامی کا زمانہ تھا۔ سامراج ہندوستان میں اپنی جڑیں جما چکا تھا ملکی معیشت تباہ و برباد ہو چکی تھی، ۱۸۵۷ء کے نقوش دھندلے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور رہی سہی معیشت بھی جنگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔ انگریزوں نے ہندو مسلم اتحاد کے شیرازے کو بکھیر دیا۔ وحدت و یکتائی کی یہ فضا دوئی میں تبدیل ہو گئی ہزاروں برس سے ایک ساتھ رہنے والے لوگ قومیت کے دو دھاروں میں بٹ گئے اور فرقہ پرستی کا یہ زہر ہندوستانی سیاست میں بھی حلول کر گیا۔ دوسری طرف سامراجیت کی ظلم و زیادتیاں بھی بڑھنے لگیں۔ ہندوستانیوں کے ساتھ ہر طرح کا استحصال کیا جانے لگا۔ اعلیٰ عہدے تو دور کی بات معمولی ملازمتیں بھی انھیں نہیں دی جاتی تھی۔ انھیں اپنے ہی ملک میں ذلیل و خوار کیا جا رہا تھا۔ ملازمتوں میں امتیاز کی وجہ سے انکی معاشی حالت بیحد خراب ہو گئی تھی۔ اور یہ لوگ ہر طرح کی پستی میں مبتلا تھے۔ ان ہی حالات میں گاندھی جی نے شعور سنبھالا۔ انھیں اپنے قوم کے لوگوں کی یہ حالت دیکھ کر بیحد دکھ ہوا اور ان کے دل میں انکی اصلاح اور انھیں پستی سے نکال کر عزت و وقار کی زندگی عطا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ملک کو غلامی کے پھندے سے آزاد کرانے کا جذبہ پیدا ہوا۔ تب گاندھی جی نے ملک و قوم کی اصلاح اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے چند اصول وضع کئے اور ان ہی خطوط پر چل کر ملک تمام طبقوں کو اوپر اٹھانے کا عہد کیا اور یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔

دنیا میں سب سے بڑے آدمی ایک سے نہیں ہوتے بعض کی بڑائی کا راز تو یہ ہوتا ہے کہ ان کا ماحول انکی تشکیل کر کے ان پر اپنی مہر لگا دیتا ہے اور وہ اس کی علامت بن جاتے ہیں۔ مگر بعض ٹھیک اس کی ضد ہوتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے ماحول سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور جو چیز اس ماحول میں نہیں ہوتی انکی ذات میں مجسم ہو کر چمک اٹھتی ہے۔ اس طرح بعض اپنے زمانے کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور بعض اسے اپنے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، جو شخص زمانے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے اس کے پاس زمانے کی فلاح و بہبود کے لیے ایک مسلک ایک نظریہ اور ایک نظام حیات ہوتا ہے جسے لغت کی زبان میں ازم بھی کہتے ہیں۔ گاندھی جی بھی ان بڑے لوگوں میں ایک ہیں جنھوں نے اپنے مسلک اور نظریہ کے ذریعہ زمانے کو بدلنے کی کوشش کی۔

گاندھی جی کے نظریے کی بنیاد سچائی، محبت اخلاق، گرام سدھار، چھوت چھات کا خاتمہ، خود کفالت ہندو مسلم اتحاد، عدم تشدد، ستیاگرہ، عورتوں کی بہتر سماجی حیثیت اور آزادی پر ہے۔ گاندھی جی کے سارے تصور زندگی کا مرکز مذہب ہے جو محض تقلیدی نہیں بلکہ عرفان ذات اور واردات قلب پر مبنی ہے۔ انھوں نے تمام چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر کسا، عمل میں جانچا، ذاتی واردات قلب کی روشنی میں اس کی نئی تعبیر کی اور اسے نئے زمانے کے تقاضے کے مطابق بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی مذہبی مبلغ زیادہ اور سیاسی کم ہیں۔ انھوں نے زندگی کے تمام معاملات کو مذہب کی عینک سے دیکھا اور اس کا حل بھی اسی روشنی میں نکالا۔ ان کے پورے فلسفے کی بنیاد خالص مذہب پر ہے۔ وہ اکثر ہندوؤں کی طرح اپنے آبائی وشنو دھرم کے پابند تھے لیکن روشن خیال ہونے کیوجہ سے انھوں نے دوسرے مذاہب کی اچھی باتوں کو بھی قبول کیا۔

گاندھی جی نے ہمیشہ مذہب کی اہمیت پر زور دیا وہ جانتے تھے کہ ہر مذہب بنیادی طور پر آفاقی قدروں کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ضابطے انسان کو پیار، محبت برابری، نیکی اور سچائی کا پیکر بناتے ہیں وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ لامذہبیت بے راہ روی اور بے ضابطگی کا پیش خیمہ ہوتی ہے فرماتے ہیں:-

"فرد و سماج مذہب سے زندہ رہتے ہیں لامذہبیت سے فنا ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو مذہب زندگی کی ہر سانس کے ساتھ عمل میں لانے کی چیز ہے"

اور گاندھی جی نے اپنے اس قول پر عمل کیا۔ مذہب کو زندگی کی ہر سانس کے ساتھ لے کر چلے اور اس سے قوم کی اصلاح کا وہ کارنمایاں انجام دیا جو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا [illegible] ہے۔ اور آئندہ بھی دیکھا جائے گا گاندھی جی کی اسی عظمت نے انھیں میر کارواں اور بابائے قوم بنایا۔

میر قافلہ جنگ آزادی کی حیثیت سے جو مثبت کردار باپو نے ادا کیا وہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس زمانے میں جب کہ کیسے کیسے عقیل و غیور عالم و مجاہد، پرجوش و باہوش اور زمانہ شناس افراد کا مجمع تھا اس کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انکی نگاہ بصیرت افروز کے اثر سے بڑے بڑے سرکش اپنا سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ ان کی روحانی قوت کے آگے اچھے اچھے سپر ڈال دیتے تھے۔ باپو نے اپنی اخلاقی و روحانی قوتوں اور اپنے عزم راسخ کی بدولت ہندوستان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے سبب یہاں کے سبھی رہنے والے ایک عجیب شان افتخار محسوس کرتے ہیں۔

یوں تو گاندھی جی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد سے کیا لیکن ہندوستان کے سیاسی افق پر ۱۹۱۵ء کے بعد نمودار ہوئے۔ اس وقت تک لوگ گاندھی جی کے کارناموں سے واقف ہو چکے تھے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے لئے ان کی بہادرانہ سرگرمیوں کا حال سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ ان کے عجیب و غریب سیاسی حربے ستیہ گرہ کے اچھے نتائج سامنے آ چکے تھے اور کانگریس کے بڑے بڑے رہنما ان کے کردار اور تنظیمی صلاحیتوں کے متعلق اچھی رائے قائم کر چکے تھے۔ ان کی تکلفات سے پاک

عادتیں اور سادھو سنتوں کی سی خوبیاں، انکا انگریزی کے مقابلے میں ہندوستانی زبانیں استعمال کرنے پر اصرار اور تقریروں میں مذہبی کتابوں کے حوالے ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے انھوں نے جلد لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔

گاندھی جی نے ہر طرح کی ظلم و زیادتی کے خلاف اور اپنے حقوق کے حصول کے لئے پر امن طریقوں کو اپنانے کا مشورہ دیا اور خود اس پر چل کر دکھایا جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد کے دوران انھوں نے عملی ستیاگرہ کے فلسفے کی تشکیل کی تھی، سچائی اور عدم تشدد اس کے دو اہم عناصر تھے اسے وہ پیار کی طاقت کہا کرتے تھے۔ ایسی طاقت جسے سچائی اور عدم تشدد جنم دیتے ہیں۔ ستیہ گرہی لاکھ اشتعال کے باوجود نہ کبھی امن پسندی کا دامن ہاتھ سے چھوڑے گا اور نہ ہی کبھی کوئی غلط قدم اٹھانے پر تیار ہوگا، بلکہ صبر و ضبط اور صلح پسندی سے کام لے گا۔ گاندھی جی کی نظروں میں ستیہ گرہ کمزوروں اور بزدلوں کا حربہ نہیں بلکہ قوی اور بہادروں کا حربہ تھا۔

عدم تشدد گاندھی جی کا سب سے اہم فلسفہ ہے انھوں نے اس فلسفے کی مدد سے لوگوں کے اندر نظم و ضبط اور تعمیر کا جذبہ پیدا کیا، تخریب اور اشتعال انگیزی سے لوگوں کو بچایا اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے عدم تشدد کا وہ باوقار طریقہ ایجاد کیا جس نے دنیا کی سب سے بڑی طاقت برطانوی سامراج کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ پر امن طریقے سے حقوق کی بازیابی کے اس فلسفے نے اشتعال انگیز اور تخریب کار حوصلوں کو پسپا کر دیا۔

جنوبی افریقہ میں ستیہ گرہ کی کامیابی نے گاندھی جی کے حوصلے کو جلا بخشا اور انھوں نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں اس کا استعمال کیا۔ جس کے بہت کامیاب "نتائج" دیکھنے کو ملے۔ جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ستیہ گرہ کا سب سے پہلا تجربہ ۱۹۱۷ء میں بہار کے ضلع چمپارن میں کیا گیا جو نیل کی کاشت کرنے والے کسانوں پر شدید مظالم کے خلاف تھا۔ یہ پہلا تجربہ تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ اس کے بعد احمد آباد اور کھیرا میں اس کے تجربے کیے اور لوگوں کو ان کے حقوق دلانے میں کامیاب ہوئے۔ یہاں تک تو ستیہ گرہ محدود لوگوں کے درمیان تھا اور اسے ایک مقامی حیثیت حاصل تھی لیکن رولٹ ایکٹ نے اس کو وسعت بخش دی اور گاندھی جی نے کالے قانون کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ستیہ گرہ سبھا قائم اور ظالمانہ قوانین کی پابندی نہ کرنے کا ایک عہد نامہ تیار کیا۔ ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ایک ملک گیر ہڑتال کا اعلان کیا گیا جو بے حد کامیاب رہی۔ عدم تشدد کا زبردست مظاہرہ ہمیں جلیان والا باغ میں دیکھنے کو ملتا ہے جہاں ہزاروں جانیں دینے کے بعد بھی کوئی تشدد پر آمادہ نہ ہوا خلافت اور ترک موالات میں بھی یہ چیزیں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سول نافرمانی کی تحریک ہو یا عدم تعاون ہر جگہ عدم تشدد نے اپنا رول ادا کیا اور لوگوں نے پر امن مظاہرے، جلوس اور گرفتاریوں کی شکل میں اس پر عمل کیا۔

دوسری سول نافرمانی کی تحریک جس میں ڈانڈی مارچ شامل ہے یہ بھی عدم تشدد پر ہی مبنی تھی جس میں قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دو سو میل کی مسافت طے کر کے نمک بنایا گیا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہندوستانی قوم برطانوی قوانین کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس موقع پر بھی گاندھی جی نے کہا تھا کہ "ہماری یہ جنگ عدم تشدد کی جنگ ہے اور بغاوت کرنا میرا مذہب ہے اور غلامی کے داغ کو دھو ڈالنا میرا مقصد بن گیا ہے"۔

اس طرح عدم تشدد نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں چھوٹے سے بڑے واقعے تک میں بہت اہم رول ادا کیا۔ اس نے عوام کے اندر بے خوفی، نڈر پن قوت ارادی، عزائم میں استحکام، حوصلے کی بلندی، خیالات میں پختگی اور اعتماد پیدا کیا، جس پر عمل پیرا ہو کر جدوجہد آزادی کی تمام تحریکوں میں فاتحانہ شان سے گذرنے کے بعد سب سے بڑی فتح آزادی حاصل ہوئی۔

گاندھی جی کے فلسفۂ زندگی نے نہ صرف ہندوستان کی آزادی بلکہ نئے ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں بھی اہم رول ادا کیا۔ گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات کا خاتمہ اور عورتوں کی بہتر سماجی حیثیت پر کافی زور دیا۔ یہ تین باتیں انھیں دل و جان سے عزیز تھیں۔ انھوں نے نچلے طبقے کو اوپر اٹھانے اور گرام سدھار کے سلسلے میں بھی عملی جدوجہد کیا جس کے دور رس نتائج سامنے آئے ملکی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے بھی کئی کام کیے۔

گاندھی جی ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جہاں اونچ نیچ، چھوت چھات، امیر غریب کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہو اور تمام فرقے آپس میں مل جل کر رہیں جہاں عورتوں کی بھی ایک بہتر سماجی حیثیت ہو اور اس کو بھی وہ تمام مراعات حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔

گاندھی جی کے اس ہندوستان کی تعمیر اسی وقت ممکن ہے جب ہم باپو کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ باپو کا خواب اس وقت شرمندۂ تعبیر ہوگا جب یہاں کے سارے رہنے والے وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر ہم رنگ ہو جائیں۔ مذاہب جداگانہ سہی، معاشرہ میں فرق سہی، لباس الگ الگ سہی، زبانیں مختلف سہی لیکن ایک لہر ملک کے ہر گوشے میں یکساں ہونا چاہیئے ہم سب ایک ہیں، ہم سب انسان ہیں۔ ہم سب ہندوستانی ہیں۔ ہم نے اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کے سارے جھمیلے ختم کر دیئے ہیں۔ ہم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہیں۔

(اردو سروس سے نئی نسل نئی روشنی میں نشر)

ایلن ہیوم

انڈین نیشنل کانگریس اپنی عمر کے ۱۰۰ سال پورے کر چکی ہے آیئے آج ہم اس کے بانی ایلن آکٹیوین ہیوم کی بھی یاد تازہ کریں۔ یہ وہی ہیوم ہیں جنھوں نے کانگریس جیسی عظیم تنظیم کو جنم دیا جس نے نہ صرف برطانی سامراج سے برسرپیکار رہ کر ہندوستان کو آزاد کرایا بلکہ آزادی کے بعد بھی اکثر و بیشتر حکمراں سیاسی جماعت کی حیثیت سے اس ملک کی سیاسی اور اقتصادی زندگی میں اہم رول ادا کرتی رہی ہے۔

آزادی کے بعد بھی ہم نے بابائے کانگریس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ ایک طرف تو ہم نے ان کی کوئی یادگار قائم کرنے کی کوشش نہیں کی دوسری طرف ان کے قائم کردہ اداروں سے ان کا نام بغیر جھجک کے مٹا دیا۔ مثال کے طور پر اتر پردیش کے اٹاوہ ضلع میں اس تعلیمی ادارہ سے ان کا نام حذف کر دیا گیا جسکو ہیوم نے خود قائم کیا تھا اور جس کی عمارت کو انھوں نے اپنے ذاتی سرمایہ اور چندہ کی رقم سے تعمیر کرایا تھا۔

ایلن ہیوم ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ انکے والد جوزف ہیوم کچھ عرصہ تک ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بحیثیت مترجم ملازم تھے بعد میں وہ برطانی پارلیامنٹ کے ممبر ہو گئے جہاں وہ ہندوستان کی وکالت کے لئے مشہور ہو گئے تھے۔

اسی طرح ایلن کو بچپن سے ہی ہندوستان سے جذباتی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ گو کہ ایلن نے برطانی شاہی بحریہ میں ملازمت کی تھی اور طبابت اور سرجری کی تعلیم بھی حاصل کی مگر آخر کار انھوں نے ہندوستان میں ہی سول سروس کرنا پسند کیا۔

ایلن ہیوم ۱۸۴۹ء میں بنگال سول سروس میں داخل ہوئے اور ان کی پہلی تعیناتی اٹاوہ میں ہوئی۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران وہ اٹاوہ میں ہی جوائنٹ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کے فرائض انجام دے

انڈین نیشنل کانگریس کا بانی

امیر حسن

رہے تھے۔ اس کے بعد وہیں پر وہ کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوگئے اور ۱۸۶۷ء تک وہ اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ہیوم نے اٹاوہ کے عوام کی بہبودی کے بہت سے کام کیے۔ انھوں نے فروری ۱۸۵۶ء سے مفت تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اخراجات کے لئے انھوں نے زمینداروں سے ایک رضاکارانہ ٹیکس وصول کرنے کا انتظام کیا۔ اس طرح انھوں نے سات تحصیل اور ۲۵۰ گاؤں کی سطح کے مدارس قائم کیے۔ اٹاوہ قصبہ میں ایک مرکزی اسکول شروع کیا جو بعد میں ہیوم ہائی اسکول کے نام سے مشہور ہوا۔ اور آج بھی دھرم سماج کالج کے نام سے موجود ہے۔

۱۸۸۱ء میں انھوں نے اپنی جیب سے ۲۰۰۰ روپیہ بطور امانت اٹاوہ کلکٹریٹ میں اپنی مقصد سے جمع کئے کہ اس رقم کے سود سے ۴ ممتاز طلبا کو چار روپیہ ماہانہ کے حساب سے وظیفے دیئے جائیں۔ وظیفے تو جاری رہے مگر مستفید ہونے والے طلبا کو پتہ نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے ہیوم کے مرہون منت ہیں ۸۴-۱۹۸۳ء میں جب اٹاوہ میں کلکٹر تھا تو میں نے جستجو کرکے ہیوم کے دستاویز کو ضلع پریشد کے دفتر سے حاصل کیا اور ۱۵ ہزار روپے چندہ سے حاصل کرکے وظیفوں کی رقم ۴ روپیہ سے بڑھا کر ۳۰ روپیہ ماہانہ کردی۔

انگریزی حکومت نے ہیوم کے غیر مذہبی تعلیم کے پروگرام کو سخت ناپسند کیا اور کھولے گئے اسکولوں کو بند کرنے کے احکام صادر کئے مگر ہیوم نے ان اسکولوں کو بند نہیں کیا بلکہ ان احکام کے خلاف پر زور احتجاج کیا۔

ہیوم نشہ بندی کے حامی تھے۔ وہ آب کاری کی آمدنی کو گناہ کی کمائی سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اگر آب کاری سے حکومت کو ایک روپیہ کی آمدنی ہوتی ہے تو شراب نوشی کی وجہ سے جو جرائم ہوتے ہیں انکی وجہ سے ۲ روپیہ کا نقصان ہوتا ہے۔ ہیوم کے ان خیالات کی افادیت آج بھی قائم ہے۔

ہیوم کو تعمیرات سے بہت دلچسپی تھی اٹاوہ میں ہیوم ہائی اسکول کی عمارت کے علاوہ انھوں نے تحصیل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی عمارتیں اسی شکل کی تعمیر کرائیں جو کہ ان کے نام کے حروف H.U.M.E سے مناسبت رکھتی تھیں۔ جیسے سابق ہیوم ہائی اسکول کی عمارت H شکل کی ہے اور تحصیل کی عمارت U سے ملتی ہے۔ ہیوم نے زیادہ، اوریا اور پھپھوند میں غلہ کی منڈیاں قائم کیں جو کہ آج بھی ہوم گنج کے نام سے مشہور ہے۔ ہوم ہیوم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

۱۸۶۷ء میں ہیوم ترقی پاکر صوبہ جات متحدہ آگرہ، اودھ کے کسٹم کمشنر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۸۷۱ء میں دوبارہ ترقی پاکر مرکزی حکومت میں محکمۂ مال تجارت وزراعت کے سکریٹری مقرر ہوئے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد انھیں مرکز سے واپس بھیج کر الہ آباد میں بورڈ آف ریونیو کا ممبر بنا کر تعینات کر دیا گیا۔

ہیوم کی تنزلی کی غالباً یہ وجہ تھی کہ وہ افسرانِ بالا کے خیالات اور ان کی خواہشات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ کسی بات کو غلط یا نامناسب سمجھتے تھے تو کھلے الفاظ میں اس کا اظہار کرنے میں گریز نہیں کرتے تھے۔

آخر میں تنگ آکر ہیوم نے ۱۸۸۳ء میں جبکہ ان کی عمر صرف ۵۴ سال کی تھی۔ ملازمت سے استعفاء دیا اور اس کے بعد سے انھوں نے اپنی زندگی کو پورے طور سے ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لئے وقف کردیا۔

سبک دوشی کے چند ماہ کے اندر ہی ہیوم نے کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹس ______ کو ایک گشتی خط کے ذریعہ ہندوستان کی اخلاقی اور سیاسی بقا کے لئے ۵۰ بانیوں کی ایک جماعت تشکیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس تجویز کا پرزور خیر مقدم ہوا اور نتیجہ کے طور پر انڈین نیشنل یونین کا قیام وجود میں آیا۔ یونین کا پہلا اجلاس گوگل داس تیج پال سنسکرت کالج، بمبئی میں ۲۷ دسمبر ۱۸۸۵ء سے شروع ہوا۔ اس کے صدر ڈبلیو سی۔ بنرجی تھے۔ اسی اجلاس میں ادارہ کا نام بدل کر انڈین نیشنل کانگریس کردیا گیا۔

ہیوم کے سوانح نگار کے مطابق ہیوم نے نہ صرف اس زمانے کے وائسرائے لارڈ ڈفرن سے صلاح مشورہ کیا تھا بلکہ گمان یہ ہے کہ خود لارڈ ڈفرن نے ہیوم کو ایسی جماعت بنانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ حکومت کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی رائے معلوم ہوتی رہے۔

مگر برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کا اشتراک زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ جب ہیوم نے دیکھا کہ انگریز حکومت اظہار ہمدردی کے کھوکھلے الفاظ کے علاوہ ہندوستانیوں کو کچھ اور دینے کا ارادہ نہیں رکھتی تو انھوں نے کانگریس کی پالیسی کو ایک نیا موڑ دیا۔ انھوں نے ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں پروپاگینڈہ کی ایک زبردست مہم چلائی۔ ایک قلیل عرصہ میں ہندوستان میں ایک ہزار سے زیادہ جلسے ہوئے اور ۱۲ زبانوں میں ۵ لاکھ سے زیادہ کتابچے تقسیم کئے گئے۔ انگلستان میں تیس کانگریس کی رپورٹ، رہنماؤں کی تقاریر وغیرہ دس ہزار کی تعداد میں چھپوا کر بانٹی گئیں۔ وہاں بھی جلسے کیے گئے جن میں دادا بھائی نوروجی، ڈبلو سی بنرجی اور انگریز ایم۔پی۔ چارلس براڈلاف وغیرہ نے حصہ لیا۔

گو کہ دادا بھائی نوروجی نے ۱۸۸۷ء میں کانگریس کی ایک برائے نام ایجنسی لندن میں قائم کی تھی، ایک باقاعدہ ایجنسی کا قیام مسٹر ڈبلو ڈگ بی W. DIGHBY سی۔ آئی۔ ای کے زیر اہتمام ایک سال بعد وجود میں آیا۔ ساتھ ہی ساتھ کانگریس کی ایک برطانی کمیٹی بھی قائم کی گئی جس میں ہندوستان میں اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے ہیوم دو سال بعد یعنی ۱۸۹۰ء میں شامل ہو سکے اسی وقت سے لندن سے ایک جریدہ انڈیا شائع ہونا شروع ہوا جس کا خاص مقصد انگریز رائے عامہ کو ہندوستان کی موافقت میں ہموار کرنا تھا ۱۸۹۳ء میں برطانی کمیٹی نے ایک ہندوستانی پارلیامنٹری کمیٹی قائم کی جس کے ۱۹۰۶ء تک تقریباً ۲۰۰ ہندوستان دوست ایم۔پی رکن بن چکے تھے۔ یہ حضرات برٹش پارلیامنٹ میں ہندوستانی نقطۂ نظر کو سمجھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

۱۸۸۳ء میں سرکاری ملازمت سے الگ ہونے کے بعد ہیوم نے ۱۲ سال تک ہندوستان میں رہ کر عوام کی خدمت کی۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے ہندوستان کو خیرباد کہا اور لندن کے نواحی علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ انگلستان میں بھی وہ ہندوستانی مفاد کے لئے مستقل جدوجہد کرتے رہے اور خط و کتابت کے ذریعہ ہندوستان سے تعلق قائم رکھا۔

ہیوم نے ۳۱ جولائی ۱۹۱۲ء کو تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔

گو کہ ہیوم نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی مگر انھوں نے سول سروس کے پیشہ کو اختیار کیا۔ سول سرونٹ کی حیثیت سے انھوں نے سماجی کام زراعت اور تعمیرات میں خصوصی دلچسپی لی۔ بعد میں انھوں نے پرندوں کے بارے میں اہم تحقیقی کام کئے اور سی۔ بی۔ ٹی۔ مارشل کے تعاون سے ایک خوبصورت باتصویر کتاب برڈس آف انڈیا Birds of India تین جلدوں میں شائع کی۔ انگلستان میں سکونت پذیر ہونے کے بعد انھوں نے باغبانی اور علم نباتات میں حیرت انگیز واقفیت حاصل کی۔ اور ۱۹۱۰ء میں ایک مشہور ادارہ ساؤتھ لندن بوٹینیکل انسٹی ٹیوٹ South London Botanical Inst. اپنے ذاتی سرمایہ سے قائم کیا۔

ہمارے دشمن، ہمارے دوست

صفیہ نسیم

یہ ان دشمنوں کا ذکر نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں ہم سے لڑتے ہیں بلکہ ان جراثیم کا ذکر ہے جو بیماری پھیلاتے ہیں اور اس طرح اپنی دشمنی کا ثبوت دیتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ہر ممکن بچاؤ کی کوشش کرتے ہیں جہاں یہ جراثیم بہت سی خطرناک بیماریوں کا سبب ہیں وہاں ان سے بہت سی مفید دوائیں اور مختلف قسم کی کیمیاوی اجزا بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ روزآنہ کی زندگی میں جراثیم کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے جس کی بہترین مثال سرکہ، دہی اور اچار ہیں جو ہم سب ہی اپنے گھروں میں بناتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔

جراثیم جسکو انگریزی میں Micro-Organism کہتے ہیں ان سے بہت ہی اہم اور مفید دوائیں جو ہمیں موت کے منہ سے نکالتی ہیں تیار کی جاتی ہیں۔ ان دواؤں کو ہم اینٹی بایوٹک کہتے ہیں۔ یہ ایسے کیمیاوی اجزاء ہیں جو انھیں جراثیم سے بنتے ہیں اور بہت ہی کم مقدار میں ایسے جراثیم پر اپنا عمل کرتے ہیں جن سے مختلف قسم کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ جیسے نمونیا، میعادی بخار، ٹی۔ بی وغیرہ۔ جس طرح یہ جراثیم ان دواؤں کو اینٹی بایوٹک بناتے ہیں۔ اسکو Fermentation کہتے ہیں جس طرح ایک انسان جب دوسرے انسان پر حملہ کرتا ہے تو وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے یا ناخوشگوار حالات میں زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے بالکل اسی طرح یہ جراثیم بھی زندہ رہنے اور اپنے دشمنوں سے بچنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں اور کم و بیش ان حالات میں اینٹی بایوٹک بناتے ہیں۔

آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جراثیم اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ انکو آنکھ سے دیکھا نہیں جاسکتا بلکہ خوردبین یا مائیکرسکوپ کی مدد سے دیکھا جاتا ہے اسی لئے انکو مائیکرو آرگینزم کہتے ہیں۔ یہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں جیسے:-

بیکٹریا: یہ اپنی جسامت میں سب سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں صرف ایک خانہ یا Cell ہوتا ہے اس لیے ان کو Unicellular Organism کہتے ہیں۔ انکی بناوٹ بھی سب سے آسان ہوتی ہے۔ روزانہ کی زندگی میں دہی اور سرکہ انھیں سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان سے اینٹی بایوٹک بھی بنتے ہیں۔ بیسی ٹریس اور پولی مکسن جو پھوڑے پھنسی نمونیا، فلو اور متعدد بیماریوں میں استعمال ہوتے ہیں جو جراثیم سے پھیلتی ہیں، اس کے علاوہ بیکٹریا سے وٹامن اور پروٹین میں پائے جانے والے چھوٹے اجزاء جنکو Aminoacid کہتے ہیں۔ وہ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ بیکٹریا عموماً مٹی میں پائے جاتے ہیں اور زیادہ تر اسی سے نکالے جاتے ہیں۔ مٹی میں بھی ان کا ایک کام ہے اور وہ ہے مٹی کی زرخیزی کو بڑھانا یعنی کھاد کا کام کرتے ہیں جسکو انگریزی میں Nitrogen— Fixation کہتے ہیں۔ ایک جراثیم یا بیکٹریا کی ایک قسم جسکا نام Bacillus thuringiensis ہے ایک ایسا زہر بنتا ہے جس کی پروٹین، ملیریا اور فلیریا پھیلانے والے جراثیم پر اپنا اثر کرتی ہے اور اس طرح اس بیماری کا سدِ باب بنتی ہے۔

جراثیم کی دوسری قسم کچھ پھپھوند سے مشابہت رکھتی ہے جسے انگریزی میں Actinomycetes کہتے ہیں۔ یہ بیکٹریا سے جسامت میں بڑے ہوتے ہیں۔ یہ بھی مٹی میں پائے جاتے ہیں۔ ابھی تک جتنے بھی اینٹی بایوٹک ایجاد ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ تر انھیں سے نکالے گئے ہیں۔ ان میں سے چند عام استعمال ہونے والے۔ جیسے ٹیرا مائسن اسپٹرامائیسن اور کلورومائیسن ہیں ان کا دائرۂ عمل بہت وسیع ہوتا ہے اسی لئے ان کو Broad Spectrum Antibiotics بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بیکٹریا کی بھی کئی قسموں پر عمل کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ ان سے بھی بہت سے مفید کیمیاوی اجزاء تیار کئے جاتے ہیں۔

جراثیم کی تیسری قسم جس کو عرفِ عام میں پھپھوند کہتے ہیں یہ اپنی جسامت میں بیکٹریا اور Actinomycetes سے بڑے ہوتے ہیں کیونکہ ان میں کئی خانے ہوتے ہیں۔ اکثر جب کسی کھانے کی چیز پر پھپھوند لگ جاتی ہے تو اس کو بیکار سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں الیگزینڈر فلیمنگ نے اسی طرح کی ایک بظاہر بیکار سی پھپھوند سے ایک اینٹی بایوٹک نکالا جو ایک اتفاقاً حادثہ تھا۔ جب انھوں نے اپنے مشاہدہ کے دوران یہ دیکھا کہ ایک پھپھوند دوسرے بیکٹریا کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ اس مشاہدہ نے انکے اشتیاق کو بڑھایا اور اس طرح سب سے پہلا اینٹی بایوٹک ایجاد ہوا جسے دنیا آج پنسلن کے نام سے جانتی ہے اور اس کا سب سے پہلا استعمال ۴۲-۱۹۴۱ء میں شروع ہوا اور نمونیا اور جراثیم سے پھیلنے والی متعدد بیماریوں کو اس کے ذریعہ روکا گیا۔ پنسلن کی ایجاد نے سائنس کی دنیا میں ایک ایسا تہلکہ مچایا کہ اس کے بعد اینٹی بایوٹک پر بہت زور شور سے کام شروع ہوا۔ ابھی تک ہزاروں کی تعداد میں اینٹی بایوٹک ایجاد ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف چند ہی انسانی استعمال کے قابل ہیں۔ کیونکہ ان میں سے متعدد تو ایسے بھی ہیں جو جسم کے بیشتر حصوں پر زہریلے اثرات چھوڑتے ہیں۔ اسی لئے ان کا استعمال ناممکن ہے۔ پہلے چھوٹے موٹے جانوروں پھر بڑے جانوروں پر تجربے کرنے کے بعد یہ انسانی استعمال کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔

کیونکہ جراثیم کے سیل اور انسانی سیل کی بناوٹ مختلف ہوتی ہے اس لئے یہ جراثیم کے سیل پر تو اثر کرتے ہیں۔ مگر انسانی سیل پر انکا اثر نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے کیونکہ ان کا دائرۂ عمل جراثیم پر ہی ایک حد تک محدود ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ جراثیم کو تو ختم کر دیتے ہیں۔ مگر انسان انکے اس زہریلے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔ جس طریقہ سے یہ جراثیم بڑھتے ہیں بیشتر اینٹی بایوٹک اس طریقہ میں رکاوٹ پیدا کرکے اس کو اور بڑھنے سے روک دیتے ہیں اور اس طرح اس جراثیم سے پیدا ہونے والی بیماری بھی ختم ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ عام حالات میں جراثیم اینٹی بایوٹک نہیں بناتے بلکہ ناموافق حالات میں بناتے ہیں اور کم مقدار میں بناتے ہیں۔ اس لئے جب اینٹی بایوٹک بنانا ہوتے ہیں، یا انکی مقدار بڑھانا ہوتی ہے تو ایسے حالات یا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ جس سے کہ یہ زیادہ سے زیادہ اینٹی بایوٹک بنا سکیں۔ موجودہ دور میں کیمیاوی طریقہ سے ان بایوٹک کی بناوٹ میں

تبدیلیاں لاکر انکو زیادہ سے زیادہ پراثر بنایا جارہا ہے۔ کیونکہ جراثیم بھی ہماری طرح سمجھدار ہوتے ہیں کہ اینٹی بائیوٹک کا زہر خود انہیں پراثر انداز نہ ہونے پائے اسی لئے اینٹی بائیوٹک کو ہر طرح سے پراثر بنانے کی کوشش جاری ہے۔ ہندوستان میں پونا کے قریب پیمپری اور رشی کیش کے قریب ویر بھدرا میں اینٹی بائیوٹک بنانے کی بہت بڑی فیکٹریاں ہیں جہاں یہ زیادہ تعداد میں تیار کئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ پھپھوند سے بہت سے ایسے تیزاب بھی تیار کئے جاتے ہیں جنکی تیزابیت بہت کم ہوتی ہے اور یہ کھانسی کے شربت اور بہت سے پینے والے مشروب میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کو انگریزی میں Organic Acid کہتے ہیں۔ اسکی مثال Citric Acid ہے Yeast کا نام تو ہم سب ہی جانتے ہیں۔ ڈبل روٹی کا خمیر اور تیزاب اسی سے تیار کی جاتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا Fungus ہوتا ہے۔ ایسٹ کا استعمال صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ یہ جراثیم بڑے کیمیاوی اجزار کو توڑ کر ان سے چھوٹے کیمیاوی اجزار تیار کرتے ہیں جیسے انگور اور گنے کے رس سے شراب، گنے کے ہی رس سے سرکہ، دودھ سے دہی، پروٹین سے امینو ایسڈ وغیرہ

اس کے علاوہ یہ جراثیم کانوں میں پائے جانے والے بیشتر معدنیات کو بھی صاف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ندیوں کا پانی اکثر فیکٹریوں سے نکالے گئے بعض کیمیاوی اجزار سے خراب ہو جاتا ہے تو یہی جراثیم اسکو صاف کرکے پینے کے قابل بناتے ہیں۔

یوں تو ان جراثیم کے سینکڑوں اور بھی فائدے جن میں سے صرف چند ہی بتائے گئے ہیں مگر اینٹی بائیوٹک کی پیداوار سب سے بڑا فائدہ ہے کیونکہ اب لوگ نہ تو ٹی۔ بی سے مرتے ہیں اور نہ ہی میعادی بخار یا نمونیہ سے اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ صرف دشمن ہی نہیں بلکہ ہمارے بہترین دوست بھی تو ہیں۔ تو کیوں نہ ہم انکی دوستی سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور دشمنی سے دور رہیں۔

(آکاشوانی لکھنؤ سے نشر)

بقیہ : ایلن ہیوم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایلن آکٹوین ہیوم کوئی عام یا معمولی انسان نہیں تھے۔ وہ ایک رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے، بلا کے ذہین تھے۔ ہندوستانیوں کے سچے ہمدرد اور دوست تھے۔ اس بات کی مطلق پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ ان کے اکثر ہم وطن ان کی ہندوستان دوستی کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں اور بعد میں انگلستان میں ہندوستانیوں کی خدمت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ مگر افسوس ہے کہ ایسے عظیم انسان کے لئے ابھی تک اس کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم نہیں کرسکے۔ (آکاشوانی لکھنؤ سے)

ماحول پر کیڑے مارنے والی دواؤں کے مضر اثرات

فیروز حمید

یوں تو دنیا میں حیات کش ادویات اور کیمیائی مرکبوں سے ۴۰ء۴ فی صد حادثات ہوتے ہیں مگر ان میں محض ۹۵ فی صد تک لوگ خودکشی کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ حالیہ بھوپال میں ہوئے سانحہ سے تقریباً ۳ ہزار اموات واقع ہوئیں اور ۳ لاکھ لوگ متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے ریاست کیرل میں ۵۳ء میں ایک واقعہ رونما ہوا۔ بازار سے خریدی گئی گندم کے آٹا کے استعمال سے ۱۰۲ لوگ مر گئے کیونکہ اس گندم میں "فولی ڈول" نامی کیڑا مار دوا ملا ہوا تھا اسی طرح یوپی کے کئی گاؤں اور شہروں کے لوگ بھی گندم میں ملے بی ایچ سی کی وجہ کر متاثر ہوئے۔ درحقیقت ۵۰ء سے ہی ان مضر دواؤں کے اثرات کی خبریں ملنی شروع ہوگئی تھیں۔ بارہا انواع واقسام کے حیوانات چڑیوں اور مچھلیوں کے تلف ہونے کی خبروں نے لوگوں کو چونکا کر دیا اور بعد میں کی گئی کیمیائی تحقیقات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ اموات ان دواؤں کی وجہ کر ہی ظہور پذیر ہوئیں تھیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کیڑے مار دواؤں کا استعمال بند کر دیا جائے۔ ہندوستان اور اس جیسے بہت سے ممالک جہاں زرعی پیداوار میں اضافہ ہونا لازمی ہے۔ ان دواؤں کا زراعت اور صحت عام میں استعمال ناگزیر ہے۔ کیونکہ ملیریا، فائیلیریا، ڈنگو بخار، انسفلائٹس جیسی مہلک بیماریاں ان کیڑوں کے ذریعہ ہی پھیلتی ہیں جنہیں مارنے کے لئے زہریلی کیڑے مار دوائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح زراعت میں ضرر رساں کیڑوں سے فصلوں کو اور گودام میں اناج کو بچانے کے لئے وافر مقدار میں ان دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نقصان دہ کیڑے سالانہ ۵۲ سو کروڑ روپے سے زیادہ تک کا اناج برباد کردیں۔ ہندوستان کے پنج سالہ پلانوں میں اسی وجہ کر کیڑے مار دواؤں کے لئے مناسب انتظام کیا گیا ہے۔ ۵۵-۵۴ء میں بھارت میں کیڑے مار دوائیں محض ۲ء۳ گرام فی ہیکٹر کے حساب سے ڈالی جاتی تھی، جو ۷۲ء میں بڑھ کر ۸۰۰ گرام تک پہنچ گئی۔ آج ان دواؤں کی کھپت تقریباً ۵۰۰ گرام فی ہیکٹر ہو گئی ہے جبکہ جرمنی، جاپان، امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ممالک میں یہ دوائیں ہزاروں گرام فی ہیکٹر کے حساب سے ڈالی جاتی ہیں۔

کیڑے مار دوائیں وہ کیمیائی مرکبات ہیں جو یا تو بہت زہریلی ہوتی ہیں۔ یا اپنا زہریلا اثر کچھ عرصہ بعد دکھائی ہیں۔ جب انہیں فصلوں پر چھڑکا جاتا ہے تو ان کا کچھ حصہ پودھوں کے بالائی سطحوں پر رہ جاتا ہے اور جو پانی میں محلول ہوتا ہے پودھوں کے اندر پہنچ جاتا ہے اس طرح پھولوں، پھلوں اور پتوں میں بہت عرصہ تک اپنی اصلی شکل میں برقرار رہ جاتا ہے۔ کچھ کیڑے مار دوائیں دیرپا اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ اور ان کے ذرات مٹی اور ماحول کے دوسری اکائیوں میں برسہا برس تک اپنی اصلی شکل میں برقرار رہ جاتے ہیں۔ بازاروں میں یہ کیڑے مار دوائیں رقیق یا پاؤڈر یا دانے دار شکلوں میں دستیاب ہیں۔ کھیتوں میں اور فصلوں پر ان دواؤں کو کبھی پانی کے ساتھ کبھی براہ راست استعمال کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے ان تمام اقسام کی دواؤں کے حیاتیاتی خصوصیات الگ الگ ہوتے ہیں اور اپنا الگ الگ زہریلا اثر الگ الگ قوتوں میں مرتب کرتے ہیں۔

اگر ان دواؤں کے استعمال سے براہ راست کیڑے مر جائیں اور باقی سب ضائع ہو جائیں پھر ہمیں متفکر ہونے کی گنجائش نہیں رہ جاتی، لیکن ہوتا اس کے برعکس ہے

جتنی دوا کیڑے مارنے کے لئے صحت عامہ کے کاموں یا زراعت میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا عشر عشیر حصہ ہی کیڑوں کے مارنے میں استعمال ہوتا ہے، باقی ساری دوائیں ماحول میں بکھر جاتی ہیں اور پھر مہلک اور دور رس نتائج کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ مثلاً گاؤں میں یا کھیتوں کے ماحول مٹی، پانی، دریا، تالاب، فضا پر ان زہریلی دواؤں کے ذرات کے ذریعہ آلودہ ہو جاتے ہیں۔ چراگاہوں سے ان کے ذرات مویشی کے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور ان کے دودھ کے ذریعہ بچوں کے جسم میں منتقل ہو کر بول و براز سے دوبارہ کھیتوں اور چراگاہوں تک جا پہنچتے ہیں۔ گویا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ ڈی ڈی ٹی اور بی ایچ سی جیسی کیڑے مار دواؤں کے ذرات کا اس طرح کے سلسلہ میں پایا جانا ایک غور طلب مسئلہ بن چکا ہے۔ ماں کے دودھ میں یا خون میں ان کی موجودگی جسم کے مختلف نظام کو متاثر کرتے ہیں۔ بچے ان سے زیادہ اثر لیتے ہیں انہیں دماغی کمزوری اور دوسری بیماریاں لاحق ہو سکتی ہیں دیر پا کیڑے مار دوائیں سبزیوں اور پھلوں کے مقابلہ میں گوشت اور چربی دار غذاؤں میں جلد پہنچتی ہیں اور زیادہ مہلک ثابت ہو سکتی ہیں۔

جو کسان یا وہ لوگ جو ان زہریلی کیڑے مار دواؤں کو چھڑکا کرتے ہیں یا استعمال کرتے ہیں وہ براہ راست ان دواؤں کے زہریلے اثر کی زد میں آتے ہیں۔ ان دواؤں کے براہ راست پیٹ میں چلے جانے سے زیادہ خطرہ ان دواؤں کا جسم میں جلد کے ذریعہ داخل ہو جانے سے ہوتا ہے۔ مصر کیڑے مار دواؤں کے ذرات تلہن، دلہن، سبزیاں، پھلوں، دودھ اور دودھ سے بنی چیزوں گوشت، مچھلی اور انڈوں میں پائے گئے ہیں۔ مٹی میں ملائی جانے والی کیڑے مار دواؤں کے ذرات شکر قند، مولی، گاجر اور شلجم میں پائے گئے ہیں۔

ریاست کرناٹک کے شموگہ اور چکمنگلور کے لوگ عموماً کیکڑے کھاتے ہیں اور یہ کیکڑے کیڑے مار دواؤں سے آلودہ ندیوں میں رہتے ہیں جس کی بدولت کیڑے مار دواؤں کے ذرات کیکڑوں کے ذریعہ وہاں کے لوگوں کے جسم میں منتقل ہوتے ہیں اور اس طرح ان کے جسم کے جوڑوں میں گٹھیا کا عارضہ ہونے لگا۔ وہاں کے لوگ اس درجہ اس عارضہ سے متاثر ہوئے ہیں کہ ان میں اب یہ مرض تقریباً پیدائشی مرض میں گنا جانے لگا ہے۔ ان مضر کیڑے مار دواؤں کے اثرات ان کے ہاتھوں اور پیروں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے جسم کی مناسب افزائش نہیں ہوتی جو لوگ ان دواؤں کے براہ راست لمس میں آتے ہیں انہیں سانس کی تکلیف، بصارت میں کمی، آنکھ کے دوسرے عارضات میں مبتلا ہونا، گلٹیوں کا بڑھنا، یہاں تک کہ لقوہ جیسی بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں۔

کیڑے مار دواؤں سے گاؤں کا آبی ماحول جلد آلودہ ہوتا ہے۔ مچھلی مینڈھک، گھونگھوں، جھینگے وغیرہ آبی جانوروں پر تو ان کا براہ راست اثر ہوتا ہی ہے، بہت زہریلی دواؤں کے اثر سے یہ جاندار مر جاتے ہیں اور جو کم زہریلی دوائیں ہوئی ہیں۔ وہ دوسرے طریقے سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ مچھلیوں کے نظام تولید پر نقصان دہ اثرات، مچھلیوں کے انڈوں کے باہری پرت کا پتلا ہو جانا، جسم کا بدشکل ہو جانا، پانی میں اگنے والے نباتات جس سے دوسرے بہت سے جاندار اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ کا تباہ ہو جانا، اور کچھ آبی جاندار اگر براہ راست ان دواؤں کی زد میں نہیں آتے مگر کیڑے مار دواؤں کے ذرات ان کے جسم میں اکٹھا ہوتے رہتے ہیں جو بعد میں انہیں متاثر کرتے ہیں۔ دلی کے پانی اور جمنا ندی میں ڈی ڈی ٹی کے ذرات کی وجہ کر کافی آلودہ ہو چکے ہیں۔

مٹی میں کیڑے مار دواؤں کے استعمال سے نہ صرف یہ کہ ان کے ذرات ہواؤں کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں بلکہ مٹی کے اندرونی ماحول کو آلودہ کرتے ہیں، اور کئی فائدہ مند بیکٹیریا، کیچوئے اور دوسرے جانداروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

کیڑے مار دواؤں کے ذرات اکثر ان فائدہ مند جانداروں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ ان میں بالخصوص وہ شکاری کیڑے یا طفیلی کیڑے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو ان نقصان دہ کیڑوں کی تعداد کو محدود رکھنے میں بیحد معاون ہوئے ہیں۔ اگر ماحول ان فائدہ مند جانداروں سے خالی ہو جائے تو ہمارے آس پاس نقصان دہ کیڑوں کی بہتات ہو جائے اور ہماری زندگی دوبھر ہو جائے۔

ان خطرات کے پیش نظر اور بالخصوص اخراجات کو کم کرنے کے لئے کئی بار لوگ کیڑے مار دواؤں کی سفارش شدہ مقدار سے کم مقدار کو ہی استعمال کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے بادی النظر میں کئی ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پہلی بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ نقصان دہ کیڑوں کی نہ صرف عمر طویل ہو جاتی ہے، بلکہ ان کے انڈے دینے کی طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ان کی آئندہ نسلوں میں ان دواؤں کے لئے مزاحمت کی وافر صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ مچھر مار دوائیں اب مچھروں کے لئے نقصان دہ نہیں رہ گئی ہیں۔ ان مزاحمی صلاحیت کی وجہ کر فائدہ مند شکاری اور طفیلی کیڑوں کی تعداد بھی متاثر ہوتی رہتی ہے۔

کیڑے مار دواؤں کے اثرات نہ صرف نقصان دہ کیڑوں تک ہی محدود رہتے ہیں بلکہ پودوں پر بھی ان کے خاطر خواہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جن پودوں پر دوائیں نہیں چھڑکی جاتی ہیں ان میں اکثر پودے لمبے ہو جاتے ہیں، ان میں بالیاں زیادہ لگتی ہیں۔ پتے خوش رنگ و پرکشش ہو جانے کے بدولت نقصان دہ کیڑے ان کے آس پاس زیادہ منڈلاتے ہیں۔ ان کے پناہ گینے اور انڈے دینے کے لئے ایسے پودے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔

ان دواؤں کے زہر پاشی کی بدولت اکثر پھول بانجھ ہو جاتے ہیں اور پھل نہیں لاتے۔ پتوں میں غذا بننے کے نوری ترکیب کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور بعض کیمیائی دوائیں پودھوں میں دوسری بیماریاں اور کیڑوں وغیرہ کو بھی جنم دیتے ہیں۔ زہر آلود پتیوں اور پودھوں سے خوراک حاصل کرنے والے نقصان دہ کیڑے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے جسم میں ایسی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے ان کے عادات و اطوار، نظام تولید بدل جاتے ہیں۔ بعض کیڑوں میں انڈا دینے کی صلاحیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

مذکورہ بالا باتوں کا بہر حال یہ مطلب نہیں کہ ہمیں ان زہریلی دواؤں کا استعمال بالکل بند کر دینا چاہئے۔ موجودہ سائنسی دور میں بہت سی چیزیں بنی نوع انسان کو بہت نقصان پہنچاتی ہیں۔ بجلی کا ایک ہی جھٹکا ہماری جان لے لیتا ہے۔ ہوائی جہاز اور ریل موٹر گاڑیاں وغیرہ سے آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں پھر بھی ہم ان کا استعمال کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کے لئے یہ سبھی ضروری حصے بن گئے ہیں۔ خطرات سے گھرے اس دور میں ہم پھر بھی انہیں نہیں چھوڑتے بین الاقوامی ترقیاتی اور تحقیقاتی ادارہ، اوٹاوہ، کنیڈا کے اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً ۱۰ ہزار لوگ ان حیات کش دواؤں سے مرتے ہیں۔ اور یہ سارے اموات صرف ترقی پذیر ممالک میں ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان زہریلی دواؤں کے بارے میں لوگوں کو صحیح علم نہیں ہوتا، انہیں بالخصوص یہ نہیں بتایا جاتا کہ ان زہریلے کیڑے مار دواؤں کے استعمال کا محفوظ ترین طریقہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترقی پذیر ممالک میں ترقی یافتہ ممالک کے مقابلہ ان دواؤں کی کھپت نہ صرف بہت کم ہے بلکہ فصلوں کی پیداواری صلاحیت بھی بہت کم ہے۔

اگر ہم ان زہریلے کیمیائی مادوں اور دواؤں کے استعمال کا صحیح اور محفوظ ترین طریقہ جان لیں تو نہ صرف یہ کہ یہ ہمارے غذائی اجناس کی حفاظت کرنے میں معاون ہوں گے، ضرر رساں کیڑوں سے پھیلائی گئی بیماریوں سے ہم محفوظ رہ سکیں گے بلکہ ہمارے ماحول بھی صاف ستھرے، آلودگیوں سے پاک رہیں گے اور ہم اور ہمارا ملک بھی طاقتور سے طاقتور ترین ہوتا جائے گا۔

(پٹنہ سے نشر)

سورج کیا ہے؟

محمد اسحاق صدیقی

سورج کیوجہ سے دیگر ستاروں کے مقابلے دراصل ایک ستارا ہے جو قریب ہونے بڑا نظر آتا ہے اور ستارے بھی بڑے بڑے سورج ہیں لیکن دور ہونے کیوجہ سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔

سورج کا زمین سے اوسط فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ اس کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں تقریباً ۸ منٹ لگتے ہیں۔ جبکہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ سورج کے بعد جو ستارا ہم سے سب سے قریب ہے اس کی روشنی کو زمین تک پہونچنے میں تقریباً چار سال لگتے ہیں۔

سورج جو ہمیں تھالی کی طرح گول نظر آتا ہے دراصل گیند کی طرح گول ہے۔ اس کا قطر یعنی آر پار کا ناپ ۸ لاکھ ۶۵ ہزار میل ہے۔ اگر زمین کے ایسے ۱۰۹ گولے ایک قطار میں رکھے جائیں تب کہیں جا کر وہ سورج کے قطر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ سورج کا جسم اتنا زیادہ ہے کہ اگر وہ کھوکھلا ہوتا تو اس میں ہماری زمین جیسے ۱۳ لاکھ گولے سما جاتے۔

دوسرے ستاروں کی طرح سورج بھی گیسوں کا بنا ہوا ایک گولا ہے۔ یہ گیسیں نہایت گرم اور گھنی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ سورج کا ۷۱ فیصد حصّہ ہائیڈروجن گیس ہے۔ ۲۷ فیصد ہیلیم گیس اور باقی ۲ فیصد میں دوسرے عناصر پائے جاتے ہیں جیسے آکسیجن، نائٹروجن المونیم، کاربن لوہا، سونا وغیرہ۔

سورج کی سطح کا درجہ حرارت چھ ہزار سینٹی گریڈ ہے۔ یہ گرمی باہر سے اندر کی طرف یعنی گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ سورج کے مرکزی حصے یعنی بیچوں بیچ میں درجہ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ درجہ سینٹی گریڈ تک پہونچ جاتا ہے۔

گرمی کی طرح گیسوں کا دباؤ بھی گہرائی کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ جتنا ہے اس کا ایک ارب گنا دباؤ سورج کے درمیانی حصہ میں پایا جاتا ہے۔

مادے کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس جیسے برف سیال جیسے پانی، گیس جیسے بھاپ سورج کے مرکزی حصّہ میں مادے کی ایک چوتھی صورت پائی جاتی ہے جسے پلازما کہتے ہیں۔ پلازما بنتا ہے جب گیسوں کی بے حد گرمی اور دباؤ سے ان کے ایٹم ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہاں ایٹم کے بارے میں چند بنیادی باتیں جاننا ضروری ہے کیونکہ بغیر ایٹم کی بناوٹ کو سمجھے ہوئے یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ سورج اور ستارے روشنی کیسے پیدا کرتے ہیں؟

پرانے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ دنیا کی سب چیزیں چار چیزوں سے مل کر بنی ہیں یعنی مٹی، پانی آگ اور ہوا انھیں وہ عناصر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں سائنس دانوں نے معلوم کیا کہ عناصر چار نہیں ہیں بلکہ سو ہیں اور خود ہر عنصر بے شمار لیکن ایک ہی طرح کے ایٹموں کے ملنے سے بنا ہے۔ ایٹم باریک سے باریک ذرے سے چھوٹا ہوتا ہے، اتنا چھوٹا کہ اسے انتہائی طاقت ور خوردبین سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔ ایٹم دنیا کی سب سے چھوٹی چیز ہے اور ستارا سب سے بڑی۔ لیکن ایٹم کے بھی حصے ہوتے ہیں۔

ایٹم کی بناوٹ نظام شمسی سے ملتی جلتی ہے جس طرح سورج کے گرد ستارے گردش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر ایٹم کے بیچ میں سورج کی جگہ مثبت بجلی کا ایک یا کئی ذرے ہوتے ہیں جنھیں پروٹان کہتے ہیں۔ الیکٹران ہلکے ہوتے ہیں اور پروٹان بھاری۔ الیکٹران پروٹان کے گرد نہایت تیزی سے برابر گھومتے رہتے ہیں۔ ہر عنصر کے ایٹم میں الیکٹران اور پروٹان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ ہر ایٹم میں جتنے پروٹان ہوتے ہیں اتنے ہی الیکٹران ہوتے ہیں۔ جب تک ایٹم ٹوٹتے نہیں ان کی بجلی کا اثر ظاہر نہیں ہوتا لیکن جب کوئی ایٹم ٹوٹ جاتا ہے تب اس کی بجلی روشنی اور گرمی کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔ سورج اور ستارے جن گیسوں کے بنے ہیں ان کے ایٹم برابر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کے ٹوٹنے سے روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے وہ چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایٹم کے ٹوٹنے سے جو گرمی پیدا ہوتی ہے وہ حیرت انگیز ہے مثال کے طور پر اگر ایک پونڈ ہائیڈروجن کے ایٹموں کو توڑا جائے تو اتنی گرمی پیدا ہوگی جتنی دس ہزار ٹن کوئلہ جلانے سے۔

سورج اور ستاروں میں دو گیس سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں ہائیڈروجن اور ہیلم۔ ہائیڈروجن گیس سب سے ہلکا عنصر ہے۔ ان کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ایٹموں میں الیکٹران اور پروٹان کی تعداد سب سے کم ہوتی ہے۔ یعنی ایک الیکٹران اور ایک پروٹان۔ ہیلم کے ایٹم میں دو پروٹان اور دو الیکٹران ہوتے ہیں۔

سورج اور ستاروں کے اندر گیسوں کے بیحد دباؤ اور گرمی سے ہائیڈروجن کے ایٹم برابر ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کے الیکٹران اور پروٹان الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ جب یہ الیکٹران اور پروٹان ایک خاص ترکیب سے جڑتے ہیں تو ہیلم کے ایٹم بن جاتے ہیں۔ ایٹموں کے ٹوٹنے اور جڑنے کا یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ اسی لئے سورج اور ستارے برابر روشنی اور گرمی پیدا کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ ستارے ہم سے بہت دور ہیں اس لیے ہم تک ان کی روشنی ہی پہونچتی ہے اور ان کی گرمی کا ہمیں احساس نہیں ہوتا۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے سورج میں ہر سکنڈ ۵۶ کروڑ چالیس لاکھ ٹن ہائیڈروجن کے ایٹم ٹوٹ کر ۵۶ کروڑ ٹن ہیلم میں بدل جاتے ہیں۔ باقی ۴۰ لاکھ ٹن مادہ روشنی اور گرمی میں بدل جاتا ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ سورج کے وزن میں ہر سکنڈ چالیس لاکھ ٹن کمی ہو جاتی ہے۔ اس حساب سے ہمارا سورج تقریباً پانچ ہزار سال سے اپنی روشنی اور گرمی لٹا رہا ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ موجودہ رفتار سے وہ تقریباً اتنی ہی مدت تک اور روشنی اور گرمی دیتا رہے گا پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اس کی ساری روشنی اور گرمی ختم ہو جائے گی اور تب وہ ایک ٹھوس اور ٹھنڈے گولے کی شکل میں خلا میں چکر کاٹتا رہے گا۔

سورج سے ہر وقت جتنی روشنی نکلتی ہے اس کا صرف دو ارب واں حصہ زمین تک پہونچتا ہے اس روشنی کو زمین تک آنے میں تقریباً آٹھ منٹ

لگتے ہیں لیکن یہ روشنی سورج کی سطح پر نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس کے مرکزی حصّہ میں پیدا ہوتی ہے جسے کور ( ) کہتے ہیں۔ سورج کا یہ حصّہ ایک گولے کی صورت میں ہے۔ اس کا مادہ سیسے سے ۱۲ گنا بھاری ہے کیونکہ اس حصّے پر گیسوں کا دباؤ بہت زیادہ ہے یہاں ایٹموں کے ٹوٹنے سے جو روشنی اور گرمی پیدا ہوتی ہے اسے سورج کی سطح تک پہونچنے میں تقریباً دس لاکھ سال لگتے ہیں۔ گویا جو روشنی ہم تک پہونچتی ہے وہ اب سے تقریباً دس لاکھ سال پہلے پیدا ہوئی تھی اور آج جو روشنی پیدا ہوئی ہے وہ اب سے دس لاکھ سال بعد زمین تک پہونچے گی۔ لیکن شاید اس زمانے تک انسان اسے دیکھنے کے لیے اس زمین پر موجود نہ رہے۔

بناوٹ کے لحاظ سے سورج کے کئی حصے ہیں سورج کی سطح کی سطح کو Photosphere کہتے ہیں۔ اس کی گہرائی سو میل سے دو سو میل تک ہے۔ یہ حصّہ ہائڈروجن اور ہیلیم گیس کے بادلوں کا بنا ہے۔ ان بادلوں کی صورت برابر بدلتی رہتی ہے۔

فوٹو اسفیر کے نیچے تقریباً نو ہزار میل کی گہرائی تک جو حصّہ ہے اسے Chromosphere کہتے ہیں یہ سورج کی اندرونی فضا ہے۔ سورج کی بیرونی فضا کو CORONA کہتے ہیں، جو تقریباً ساڑھے ۱۲ لاکھ میل تک پھیلی ہوئی ہے سورج کی چمک کی وجہ سے ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، لیکن پورے سورج گہن کے موقع پر جب چاند سورج کی سطح کو چھپا لیتا ہے تو کارونا نظر آتا ہے۔

سورج کی سطح پر اکثر شعلے نما بادل لہراتے نظر آتے ہیں۔ جنہیں Prominences کہتے ہیں۔ یہ ہزاروں یا لاکھوں میل لمبے ہو سکتے ہیں۔ ۴ جون ۱۹۴۶ کو اس کی سطح پر ایک ایسا شعلے نما بادل نظر آیا جس کی بلندی ۲ لاکھ میل تھی۔ وہ سورج کو محراب کی صورت میں گھیرے ہوئے تھا۔

اکثر سورج کی سطح پر داغ نظر آتے ہیں، جنھیں Sunspots کہتے ہیں۔ یہ داغ دراصل گرم گیس کے بھنور ہوتے ہیں جو اندر سے چکر کھاتے ہوئے باہر آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ان کے ارد گرد کی سطح ان سے زیادہ گرم ہوتی ہے۔ تبھی یہ داغ کالے نظر آتے ہیں، ان کا درجۂ حرارت ۴ ہزار سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ اکثر یہ داغ اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ انھیں ننگی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض کا قطر ہزاروں اور بعض کا لاکھوں میل ہوتا ہے سب سے بڑا داغ ۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو نظر آیا جس کا رقبہ تقریباً ۷۰ لاکھ مربع میل تھا یہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سو زمینیں سما سکتی تھیں۔ ان داغوں کی عمر بیس دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس کے بعد وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ سورج کے داغ عام طور سے تنہا کم نظر آتے ہیں زیادہ تر دو یا گچھوں کی صورت میں ہوتے ہیں داغ کے درمیانی حصّہ کا رنگ زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس حصّے کو Umbra کہتے ہیں۔ اس کے چاروں طرف کا حصّہ کم گہرے رنگ کا ہوتا ہے اسے پین Penumbra کہتے ہیں۔

سورج کے یہ داغ اس کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی طرح سورج بھی اپنے محور پر گھومتا ہے اور ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ اسے خط استواء پر اپنی کیل پر ایک بار گھومنے میں ۲۵ دن لگتے ہیں۔ خط استوا سے فاصلا بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار سست ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی پر وہ ۳۳ دن میں ایک بار اپنی کیل پر گھومتا ہے۔

سورج کے داغوں کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے ہر گیارہویں سال ان کی تعداد انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ پھر وہ گھٹنے لگتی ہیں سات سال تک ان کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اور پھر چار سال تک بڑھتی رہتی ہے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ سورج کی چمک اتنی زیادہ ہے کہ اسے ذرا دیر بھی دیکھنے والا اندھا ہو سکتا ہے۔ ہماری آنکھ کا اندرونی پردہ جس پر ہر چیز کی تصویر بنتی ہے سورج کی روشنی سے اس طرح جل سکتا ہے جیسے موٹے شیشے کی مدد سے سورج کی روشنی کو ایک نقطے پر جمع کرنے سے کاغذ جل اٹھتا ہے۔ اسی لیے سورج کو کبھی بھی اور کسی طرح بھی دیکھنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے۔

(آکاش وانی لکھنؤ سے نشر)

جہانگیر جوہر

جو اپنے عزم سے خود کارواں بناتے ہیں
غبارِ راہ کو منزل نشاں بنائے ہیں
جہاں قفس تھا وہیں آشیاں بناتے ہیں
ہم اس زمین کو اب آسماں بناتے ہیں
جنہیں خبر بھی نہیں خار کیا ہیں گل کیا ہیں
غضب ہے لوگ انھیں باغباں بناتے ہیں
ذرا تو دیکھ کہ سجدے یہ کس کے سجدے ہیں
جو آستاں کو ترے آستاں بناتے ہیں
رہا ہے حسنِ عمل شیوہ دردمندوں کا
وہ آپ کی طرح باتیں کہاں بناتے ہیں
وہ حادثاتِ جہاں سے ڈریں گے کیا جوہر
قدم قدم پہ جو تازہ جہاں بناتے ہیں

(ناگپور سے نشر)

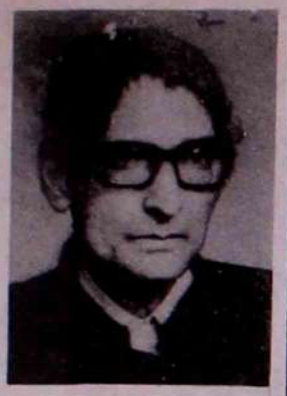

چچا نے

حسب معمول صبح سویرے طوطی کو "بنی جی بھیجو" چچا کا سبق پڑھا کر بیٹھک کی طرف جانے والے ہی تھے کہ چچی نے آواز دی: "ذرا دو منٹ کے لیے سنیئے گا نبو کے ابا۔"

چچا لپکتے ہوئے باورچی خانہ میں داخل ہوئے اور ایک پیڑھا گھسیٹ کر چچی کے قریب بیٹھ کر بولے: "واللہ! آج پہلی مرتبہ تم نے ایسی سریلی اور میٹھی آواز سے مجھے پکارا ہے کہ طبیعت خوش ہو گئی میری اور ساتھ ہی ایک بار پھر وہی مدھر آواز سننے کی تمنا ہے اس خاکسار کو۔"

چچی بھنا کر بولیں ——— "میں نے کتنی مرتبہ کہا ہوگا کہ بھونڈا مذاق مجھے پسند نہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ باز نہیں آتے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ بہو گھر میں نہیں۔ ورنہ دل میں کیا کہتی وہ۔"

"کہتی کیا" ——— چچا مسکراتے ہوئے بولے۔ "کیا بہو کو اتنی بھی عقل نہ ہوگی کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

مگر جب تم کہتی ہو تو کان پکڑتا ہوں اب کبھی جو ایسی ویسی بات اپنی زبان پر بھی لاؤں۔"

"خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔" چچی سنجیدہ ہو کر بولیں: "بات یہ ہے کہ کئی دنوں سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ ——— کلن اور چھٹن کے علاوہ اور کون کون سے لوگ بھی بیٹھک میں آنے لگے ہیں۔"

"ارے وہ" چچا چچی کے آنچل سے کھیلتے ہوئے بولے: "تم گنگا رام اور جمنا رام کے بارے میں پوچھ رہی ہو شاید۔ یہ دونوں حال ہی میں اس محلہ میں آئے ہیں ان سے میرا تعارف شبّن خاں نے کرایا تھا۔ دونوں شطرنج کھیلنے کے بہت شوقین ہیں۔ اسی لیے روز چلے آتے ہیں۔"

"یہ تو سمجھی۔" چچی بولیں: "لیکن گنگا اشنان کے بارے میں کیا باتیں ہوتی رہتی ہیں ان سے۔ کل بھی دروازے

گنگا اشنان کیا

ہاشم عظیم آبادی

کے پاس کھڑی سن رہی تھیں۔ کہیں وہ دونوں آپ کو بھی گنگا میں نہانے کے لئے بہکاتے رہتے ہیں کیا۔

"ارے وہ بہکا ئیں گے کیا مجھے۔" چچا بولے۔ "ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میری گرتی ہوئی صحت دیکھ کر وہ ازراہ ہمدردی گنگا اشنان کرنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صبح سویرے گنگا میں اشنان کرنا صحت کے لیے بہت مفید ہے . . . تو وہی میں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ اس کا تجربہ کرنے میں کیا نقصان ہے۔"

دوسرے روز طلوع آفتاب کے قبل ہی جبکہ چچی چبوترے پر بیٹھی وضو بنا رہی تھیں کہ چچا لنگی، تولیہ اور صابون لیے ہوئے چچی کے قریب آکر بولے۔ "ذرا دروازہ بند کر لیجیو۔ میں گنگا اشنان کرنے جا رہا ہوں۔"

چچی نے صبح کی نماز پڑھ کر سلام ہی پھیرا تھا کہ چچا بھنبھناتے ہوئے آتے دکھائی دیئے۔ ان کا سلیم شاہی جوتا غلاظت سے بھرا تھا۔ اندر آتے ہی منہ بسور کر بولے: "پتہ نہیں کس منحوس کی صورت دیکھ کر اٹھا تھا کہ گنگا کنارے پہونچتے ہی میرا ایک پیر غلاظت پر پڑ گیا ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا تو دوسرا پیر بھی غلاظت سے لدپھد ہو گیا . . . یہ دیکھو میرے سلیم شاہی جوتے کی کیا گت بنی ہے۔ ہائے کس حوصلے سے خریدا تھا اسے۔ اور جب غلاظت کی وجہ سے طبیعت مالش کرنے لگی تو جی میں آیا کہ گنگا میں اتر کر پیر دھو ڈالوں۔ لیکن میری حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ مقدس اور قابل احترام گنگا میں اپنے پاؤں میں لگی ہوئی غلاظت ڈالوں . . . تو وہی بہ ہزار خرابی گرتے پڑتے چلا آ رہا ہوں . . . . بدھوا کدھر ہے۔ اس کو کہو کہ میرا سلیم شاہی جوتا اتار کر نالے میں ڈال دے۔ اور تم خدا کے لیے جلدی سے میرے نہلنے کا انتظام کرو۔"

چچا نہا دھو کر چسکی لگانے بیٹھے ہی تھے۔ کہ گنگا رام اور جمنا رام آ گئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی چچا بولے۔ "بھائی تم دونوں نے تو خوب مٹی پلید کی میری۔ تمہارے کہنے پر گنگا اشنان کے لیے جانا بہت مہنگا پڑا مجھے۔"

"میر صاحب،" گنگا رام بولے۔ "یہ تو اتفاق کی بات تھی۔ کہ آپ کو اس قدر پریشانی ہوئی۔ اگر ذرا احتیاط سے کام لیتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔ گنگا کنارے اب تو غلاظت کی بھرمار کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے کہ جس کا رونا رویا جائے ہم لوگ بھی اس گندگی سے اکثر دوچار ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی بچ بچ کر چلتے ہیں۔ جب گنگا میں اشنان کرنا ہی ہے تو تھوڑی تکلیف بھی ہو تو برداشت کرنی ہی ہوگی۔"

"لیکن میں تو۔" چچا بولے۔ "اس تلخ تجربہ کے بعد گنگا اشنان کرنے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ لیکن چونکہ بقول تمہارے گنگا میں اشنان کرنا صحت کے لیے مفید ہے اس لئے اپنی صحت کی خاطر کچھ دن گنگا اشنان کر کے دیکھوں گا۔"

"کچھ دن کیا میر صاحب۔" جمنا رام بولے۔ "چند ہی روز میں آپ کو اتنا فائدہ نظر آئے گا کہ گھر پر اشنان کرنا ہی بھول جائیں گے۔"

دوسرے روز چچا اپنے دوست کلن اور چھٹن کے ساتھ گنگا کنارے پہونچے۔ جمنا رام اور گنگا رام پہلے سے موجود تھے۔ چچا زندگی میں پہلی مرتبہ گنگا میں اترے۔ اور صابون لگا کر خوب مل مل کر نہانے کے دوران گنگناتے بھی جا رہے تھے ؂

اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

غسل سے فراغت کے بعد کپڑے بدلتے ہوئے چچا نے کہا: "واقعی صاحب۔ گنگا میں اشنان کر کے طبیعت خوش ہو گئی میری۔ بڑی فرحت محسوس کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ جمنا رام اور گنگا رام کے لیے جنھوں نے ایسا مفید اور کار آمد مشورہ دیا کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔"

غسل کے بعد چچا نے اپنی لنگی اور گنجی دھو کر کندھے پر ڈالا اور زیر لب گنگناتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے ؂

لبوں پہ کھیل رہا ہے اثر نہانے کا!
گمان ہوتا ہے ہر بار مسکرانے کا

اپنی بھیگی لنگی اور گنجی چچی کے حوالہ کر کے چچا بولے۔ "دیکھ رہی ہو جی۔ ایک ہی دن کے گنگا اشنان میں میرے چہرے پر کیسی بحالی آ گئی ایسا لگتا ہے کہ گئی ہوئی جوانی لوٹ آئی ہے۔ اور اب تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ پردے کے اہتمام کے ساتھ تمہیں بھی گنگا اشنان کرا دیا کروں گا۔ کیونکہ تم کو بھی تو اکثر اپنے صحت کی خرابی کی شکایت رہتی ہے۔"

ناشتہ تیار تھا۔ چچا دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ لیکن صورت حال یہ تھی کہ ایک ہاتھ سے نوالہ منھ تک پہونچا رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے بدن نوچے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر چچی سے نہ رہا گیا۔ بولیں ——— "یہ بھی ناشتہ کرنے کا کوئی طریقہ ہے کہ بدن نوچے جا رہے ہیں۔ اگر ایسی ہی نوچنی ہو رہی ہے تو ناشتہ کے بعد اطمینان سے بیٹھ کر بدن کھکھوڑیئے گا۔"

"اجی کیا بتاؤں،" چچا رونی صورت بنا کر بولے۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے کہ گنگا اشنان کے بعد ہی سے نوچنی محسوس ہونے لگی تھی۔ اور اب تو یہ نوچنی ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کیا نہ کروں . . . . ناشتہ ہٹا ہی لو۔ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا . . . . اچھا ذرا جلدی سے بدن میں کڑوا تیل تو مالش کر دو . . . ." لیکن کڑوا تیل مالش کرنے کے بعد بھی وہی کیفیت رہی۔ رات بھر چچا سو نہ سکے۔ چچا کی بےچینی کی وجہ سے چچی نے بھی ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح ہوتے ہی حکیم صاحب بلوائے گئے۔ حکیم صاحب نے چچا کی نبض دیکھ کر معدے کی خرابی تجویز کی اور جلاب کا نسخہ لکھ کر رخصت ہوئے۔ جلاب کی دوا کھانے کے دو گھنٹے کے اندر ہی چچا کو دست جو آنے لگے تو اللہ دے اور بندہ لے۔ بس چچا بیت الخلا جا رہے ہیں اور آ رہے ہیں۔ ابھی بیت الخلا سے آکر بیٹھے بھی نہیں کہ پھر لوٹا لے کر دوڑے۔ اس ان گنت دست کی وجہ سے نقاہت کا یہ عالم ہو گیا کہ بدن نوچنے کی بھی سکت نہ رہی۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر پر آنکھیں بھی چھت سے لگ جاتیں۔ چچا کے دوست پاس ہی بیٹھے ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے۔ اور ادھر چچی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں چچا کی حالت غیر دیکھ کر جلدی سے ایک ڈاکٹر کو بلوایا ڈاکٹر صاحب نے چچا کا خون جانچ کر کے یہ انکشاف کیا کہ ان کی یہ کیفیت زہریلے جراثیم کے زد میں آ جانے کی وجہ سے ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ مریض ان جراثیم کی زد میں کیسے اور کب آئے۔ ڈاکٹر نے اسی وقت چچا کو انجکشن لگایا جس کے بعد ہی سے نوچنی میں کمی ہونے لگی۔ اور دو تین روز کے اندر یہ کیفیت جاتی رہی۔ لیکن نقاہت کے دور ہونے میں مہینوں لگ گئے۔

ڈاکٹر صاحب تو یہ پتا نہ لگا سکے تھے کہ مریض جراثیم کی زد میں کیسے آیا۔ لیکن چچا تو سمجھ رہے تھے کہ یہ مصیبت گنگا اشنان کے بعد ہی آئی ہے۔ ایک روز بیٹھک میں جمنا رام اور گنگا رام سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے چچا نے کہا۔ "دیکھئے برا نہ مانیئے گا۔ میں کئی دنوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ جس گنگا کے تقدس اور پاکیزگی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اور جسے احتراماً گنگا مائی کہا جاتا ہے اس میں امراض کے جراثیم کہاں آ گئے۔ آپ یقین کریں کہ آج سے بیس پچیس سال پہلے کی بات ہے کہ میرے نانا اور دادا خاص گنگا کنارے جا کر وضو کرتے تھے۔ اور میری دادی جان گنگا کا پانی روزمرہ کے استعمال کے لیے بہنگی پر منگوایا کرتی تھیں۔ آج بھی گنگا کا تقدس اور احترام اپنی جگہ پر ہے لیکن گنگا کے پانی میں جراثیم؟ یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔"

"میر صاحب"، جمنا رام بولے: "بات کہنے کی نہیں پھر بھی کہنا ہی پڑتا ہے کہ دنوں دن بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ کل۔ کارخانے۔ فیکٹری اور اسپتالوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان سے نکلنے والی ساری گندگیاں اور کچرے سیدھے جاتے ہیں گنگا میں۔ اس پر نہ ہمارا کوئی کنٹرول ہے اور نہ جنتا ہی کو اس کا احساس ہے۔ اس کے علاوہ گنگا جی میں گندگی کے داخلہ کے اور بھی بہت سارے راستے ہیں جن کے بارے میں کبھی اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ لیکن اتنا کہے دیتا ہوں میر صاحب کہ اگر گنگا جی میں اسی طرح گندگیوں کا اضافہ ہوتا رہا تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ گنگا کا پانی جو امرت ہے وہ جراثیم کے انتہائی کثرت سے زہر ہلاہل بن جائے تو کیا تعجب"۔

زہر ہلاہل کی بات سن کر چچا کی رگِ تمسخر بھڑکی۔ مسکراتے ہوئے بولے: "تب تو گنگا رام جی یہ گھر والیاں اپنے شوہر سے ناراض ہونے پر دھمکی دیا کریں گی کہ اگر غصہ آگیا تو گنگا جل پی کر سو رہوں گی"۔

چچا کے اس مذاق سے جمنا رام اور گنگا رام کو بیساختہ ہنسی آئی۔ جب ان کی ہنسی کا طوفان تھما تو جمنا رام بولے گنگا جل کے دوشت ہوتے رہنے کی ایک نہایت معمولی وجہ بھی ہے جس کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اور وہ ہے لاکھوں سالبون کے پھین کا ہر روز گنگا کے پانی میں ملنا۔ حالانکہ سالبون میں کچھ ایسے اجزاء بھی ہوتے ہیں جن کی کثرت سے مچھلیاں اثر انداز ہو کر زہر آلودہ ہو سکتی ہیں"۔

"باپ رے باپ"! چچا چیخ اٹھے: "یہ تو بری خبر سنائی تم نے۔ تب تو مچھلیاں کھانے کو ترس جاؤں گا میں"۔

"لیکن میر صاحب"، گنگا رام بولے: "ابھی آپ اطمینان سے مچھلیاں کھاتے رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ دن آپ کو نہیں آپ کی اولاد کو دیکھنا پڑے اگر گنگا کے پانی کے دوشت ہونے کی یہی رفتار رہی"۔

"تو بھائی گنگا رام اور جمنا رام"، چچا ایک عزم جواں کے ساتھ بولے: "کیوں نہ ہم لوگ ہر گھاٹ پر کیمپ کر کے جنتا کو بتائیں کہ کس طرح گنگا کا پانی دنوں دن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ کیا صورتیں اختیار کی جائیں کہ کارخانوں فیکٹریوں اور اسپتالوں سے نکلنے والے کچرے گنگا میں نہ ڈالے جائیں۔ اور کس طرح ہر روز کے استعمال شدہ لاکھوں سالبون کے پھین سے گنگا کو محفوظ رکھا جائے۔ انھیں یہ بھی بتائیں کہ مہلک امراض میں مبتلا مریض کے نہانے اور کپڑے دھونے کا الگ سے کیا انتظام ممکن ہو سکتا ہے تاکہ ان کے جراثیم کا اثر دوسروں پر نہ ہونے پائے اور وہ تندرست اور صحت مند رہ کر دیش کی زیادہ سے زیادہ سیوا کر سکیں۔

.... اور ....

چچا کچھ اور بھی کہنے والے تھے کہ گنگا رام اور جمنا رام چچا کو لپٹاتے ہوئے بولے ——— واہ میر صاحب واہ آپ نے تو ایسی اچھی تجویز پیش کی ہے کہ۔ جی چاہتا ہے کہ ابھی سے اس پر عمل کرنے لگ جائیں۔

تو ٹھیک ہے۔ چچا بولے ——— "آج ہی سے ہم لوگ اس کارِ خیر میں لگ جائیں۔ ع

در کارِ خیر حاجت استخارہ نیست

ہاشم عظیم آبادی
محلہ شیر پور
مہندرو ——— پٹنہ ۶

قلمی چہرے

محمد نور خاں اعظمی

آج کی نشست میں رفقائے سراج العلوم سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔ مگر اس ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے نہ اس میں سچ کا شائبہ ہے اور نہ اس کا جھوٹ سے کچھ علاقہ۔

راقم الحروف ہر طرح کی ذمہ داری سے بری ہے، اچھا اب کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ہم آپ کو مدرسہ سراج العلوم لے چلتے ہیں۔ اس درسگاہ کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی ایک صاحب، کسرتی جسم، لمبا کرتا اور لنگی پہنے ہوئے، سر پر چوگوشیہ ٹوپی لگائے ایک بڑے تخت پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان کے پہلو میں ایک موٹی سی سرخ رنگ کی چھڑی رکھی ہوتی ہے۔ جس کے دستے پر چاندی کا خول چڑھا ہوتا ہے ——— ان کو دیکھتے ہی میر انیس کا یہ مصرع ذہن میں آجاتا ہے

ع ضیغم ڈکارتا ہوا نکلا کچھار سے" ——— یہ حضرت اپنے ڈیل ڈول، تن و توش اور طول و عرض کے اعتبار سے استاد کم اور پہلوان زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔

آپ اپنا سلسلۂ نسب ان مغلوں سے جوڑتے ہیں جو عہد بابری میں غزنی سے ہندوستان آئے اور جو بقول مولوی صاحب فن شمشیر زنی میں یکتائے زمانہ تھے۔ لیکن اب ہمارے مولوی صاحب کے پاس نہ شمشیر ہے، نہ نیزہ، البتہ ایک پرانی چھڑی ہمہ وقت ان کے پاس رہتی ہے، جسے مولوی صاحب اپنا خاندانی "ٹریڈ مارک" سمجھتے ہیں اور اسے اپنے اسلاف کی عظمت رفتہ کا نشان بتاتے ہیں۔ حالانکہ اس چھڑی کے بے محابا استعمال نے مولوی صاحب کی نیک نامی کو کافی مجروح کیا ہے، جس کی وجہ سے ارکان مدرسہ نے اس کے استعمال پر خاصی پابندیاں عاید کر دی ہیں ——— تاہم اس کی فتنہ گری ہنوز جاری ہے چنانچہ اس سلسلے کی تازہ خبر یہ ہے کہ اس چھڑی کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر طلبا کے ایک جانباز گروہ "کمانڈوز" نے اسے نذر آتش کرنے کا منصوبہ بنایا ہے ——— خود ہم نے مولوی صاحب کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ اس نایاب اور قدیم اسلحہ کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دیں۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اچھا اب آگے بڑھئے اور ادارے کے دوسرے حضرات سے ملاقات کیجئے۔

آگے بڑھنے پر درجہ ابتدائی کے ایک استاد سے ملاقات ہوتی ہے جو اپنی وضع قطع اور جامہ و لباس کے اعتبار سے نہایت خوش پوشاک اور نستعلیق معلوم ہوتے ہیں۔ اوقات مدرسہ کے علاوہ آپ انھیں ہمہ وقت کسی نہ کسی چائے خانے میں اخبار پڑھتے یا لوگوں سے حالات حاضرہ پر گفتگو کرتے ہوئے پائیں گے۔ عجب رنگا رنگ طبیعت ہے۔ کبھی اشتراکیوں کے درمیان نظر آتے ہیں اور نہایت شد و مد سے ان کی وکالت کرتے ہیں، اس وقت ان کے انداز بیان اور جوشِ خطابت کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ لینن اور مارکس نے خرقہ و کلاہ ان کو دے کر ہند کی ولایت ان کے سپرد کی ہے۔ جب کانگریسیوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس وقت سابرمتی آشرم سے لے کر آنند بھون تک کی تمام سیاسی تحریکات کا تذکرہ اس طور پر کرتے ہیں گویا خود کبھی کسی نہ کسی حیثیت سے اس میں شریک رہے ہوں، حالانکہ اس قسم کی غلطیوں سے

آپ کا دامن بالکل پاک رہا ہے ــــــ جب مسلم لیگیوں کے حلقے میں ہوتے ہیں اس وقت کا جوش و خروش قابل دید ہوتا ہے ــــــ معلوم ہوتا ہے کہ بھارت میں قائد اعظم کے جانشیں یہی ہیں ــــــ اور جمعیۃ العلماء والوں کا ساتھ ہوتا ہے تو فدائے ملت کی شان میں سب سے اچھا قصیدہ ان ہی کا ہوتا ہے۔

غرض عجب ہمہ رنگ طبیعت ہے۔ ایک طرف جامعہ عربیہ کے شیوخ سے روابط ہیں تو دوسری جانب ہپی کٹ کمیونسٹوں سے بھی آپ کی یاد اللہ ہے۔ فارسی کے اس شعر سے ان کی ہمہ رنگ طبیعت کی پوری ترجمانی ہوتی ہے ؎

معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس جدا طریق
با من شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

جب آپ یہاں سے آگے بڑھیں گے تو ایک چھوٹا سا کمرہ آپ کو ملے گا اس کمرے میں اس جامعہ عربیہ کے شیخ مقیم ہیں جو سب کے مقتدا اور پیشوا ہیں۔ ان کے فضائل علمی اور کمالات باطنی کا بیان بھلا مجھ کج مج کی زبان سے کیا ہو سکتا ہے، البتہ خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر آپ نے کچھ رفاہی خدمتیں اپنے ذمے لے رکھی ہیں، جن کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ منجملہ ان خدمات کے ــــــ پان کھانا اور کھلانا۔ بغیر دودھ کی چائے پلانا اور آسیب زدہ لوگوں کے لئے تعویذ و نقش لکھنا شامل ہے۔ اگر آپ کو پان کھانے کی عادت ہے تو آپ مولانا کے کمرے میں جائیے۔ آپ کو لگاتار پان ملتے رہیں گے۔ حضرت مولانا خود جس اسپیڈ سے پان کھاتے ہیں۔ اسی پر دوسروں کو قیاس فرما کر برابر گلوریاں بڑھاتے رہیں گے۔ اب یہ آپ کی مہارت اور تیزی پر منحصر ہے کہ آپ کتنی تیز جگالی کرتے ہیں اور فضلہ خالی کر کے اپنے منہ میں نئی گلوریوں کے لئے جگہ بناتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں اگر کوتاہی اور تاخیر ہوئی تو آپ مولانا کی نظر اعتبار سے گر جائیں گے اور آئندہ آپ پر اس فیض کا دروازہ بند ہو جائے گا، اگر آپ حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے کبھی رات کو مولانا کے کمرے میں شب باش ہوئے تو صبح سویرے آپ کو نمکین مالیدہ اور بغیر دودھ کی چائے دی جائے گی۔

مولانا پرانے آدمی ہیں ان کی کفایت شعار طبیعت نے سالہا سال سے کبھی اس معمول میں فرق نہیں آنے دیا ــــــ خود راقم الحروف کو بھی یہ سعادت برابر نصیب ہوئی ہے۔ حضرت کا تیسرا فیض جاریہ جس کا دائرہ کار کافی وسیع ہے، لوگوں کو دفع آسیب و بلیات کے لئے تعویذ اور نقش دینا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس تیسری خدمت کے لئے مولانا نے کچھ بندشیں عاید کر دی ہیں پس ہر صاحب ابتلا سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ آسیب امن پسند اور صلح جو قسم کا ہے یا سرکش و متمرد ــــــ مؤخر الذکر صورت میں مولانا "مبتلا"، کو کسی جنگجو عامل کے پاس بھیج دیتے ہیں اور خود اس سے نبرد آزما نہیں ہوتے۔

واللہ اعلم بالصواب

صاحبو! ہمارا معاملہ مولانا کے ساتھ صرف چائے و پان تک محدود ہے۔ ہم نے کبھی بھی حضرت کو دفع بلا اور نجات آسیب کے لئے زحمت نہیں دی۔ الحمد للہ ہم ان بلاؤں سے محفوظ و مامون ہیں ــــــ البتہ ایام جوانی سے ہی ہمارے اوپر بابو کی اماں کا سایہ ہو گیا ہے، جس کا آج تک کوئی توڑ نہ سکا۔ ان کے غیظ و غضب اور قہر و جلال سے بچنے کے لئے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی اور کس کس سے رجوع نہیں کیا۔ مگر نتیجہ صفر رہا۔ ــــــ کبھی حضرت باچھا شہید کے مزار پر گئے منتیں مانیں، دیئے جلائے، عرضیاں لٹکائیں، مجاوروں کو نذرانے دیئے ــــــ کبھی بابا کمبل پوش کی درگاہ میں گئے، کبھی بلاقی شاہ کے مقبرے پر گئے ــــــ کہیں سے فلیتے لائے، کہیں سے نقش اور دم کیا ہوا پانی۔ مگر بیگم کے جور مسلسل سے پناہ نہ ملی، آج بھی حالت یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ گھر میں کوئی بچہ بیمار ہو جائے تو جوابدہ ہمیں ہی ہونا پڑتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی امتحان میں فیل ہو جائے تو اس کی باز پرس بھی ہمیں سے ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر دودھ والا کسی دن دودھ لانے میں دیر کر دے تو اس کے لئے بھی بیگم کے سامنے ہماری پیشی ضرور ہوتی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت اس دن ہوتی ہے جس دن بیگم اپنی پڑوسن کے مقابلہ، محاذ جنگ پر ہوتی ہیں اگرچہ شبراتن جو بیگم کی چہیتی خادمہ ہے، تنہا اس طرح کے معرکوں کو سر کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے، تاہم بیگم کسی نہ کسی نہج سے گھیر گھار کر ہمیں بھی اس جنگ میں شامل کر لیتی ہیں، حالانکہ اس میدان میں ہماری نااہلی کا بار بار مشاہدہ بھی ہو چکا ہے۔ غرض بیگم کے جور و استبداد کی کہانی لمبی ہے۔ اس کے لئے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ یہ تو ضمنی طور پر چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں۔ ہاں اتنا اور عرض کر دوں کہ باوجود ان تمام نوازشات اور کرم فرمائیوں کے ہمارا بیگم کے ساتھ یہ معاملہ ہے ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

حضرات! آج کی نشست مخصوص ہے رفقائے سراج العلوم کی ملاقات کے لئے، لہٰذا ہم ان گھریلو جھگڑوں کو چھوڑ کر اپنا سفر دوبارہ شروع کرتے ہیں۔ اور حضرت شیخ کے کمرے سے آگے بڑھ کر مدرسہ کے بڑے ہال تک پہونچتے ہیں، یہاں جو کلاس چل رہی ہے اس کا نقشہ تمام کلاسوں سے مختلف ہے۔

ایک بزرگ استاد ــــــ نہایت نحیف و نزار ہاتھ میں چھڑی اٹھائے مصروف درس ہیں۔ اس کلاس میں جو ہما ہمی، گہما گہمی اور چہل پہل ہے وہ کسی دوسری کلاس میں نہیں۔ اس کلاس کو دیکھ کر ہمیں استاد جما خاں اور ان کا اکھاڑہ یاد آگیا۔ ــــــ وہی پینترے وہی داؤ گھات، وہی کاٹ چھانٹ وہی اکھاڑ پچھاڑ۔! استاد جما خاں کا یہ انداز یہ تھا کہ اپنا گدا لے کر شاگرد پر جھپٹتے اور یوں للکارتے، بیٹا سر بچا۔ شاگرد سر بچانے کی کوشش کرتا تو استاد کمر پر ہاتھ جھاڑ کر بجلی کی طرح پیچھے ہٹ جاتے۔ پلٹ کر پھر دھاڑتے، لے شانہ خالی ہے، جب شاگرد شانہ کی حفاظت کرتا تو استاد پہلو پر ایک ضرب لگا کر نیا پینترا لے لیتے، کبھی جھوٹا اور مصنوعی وار کر کے شاگرد کو جھکائی دیتے اور پورا ہاتھ پیٹھ پر رسید کر دیتے۔ غرض پے در پے حملوں سے شاگرد کو نڈھال اور خستہ کر دیتے۔ لیکن آج اگر استاد جما خاں زندہ ہوتے تو ہمارے ماسٹر صاحب کے کرتب و کمال اور مہارت کو دیکھ کر عش عش کر جاتے۔ جو کام استاد اپنے "گدا" سے لے لیتے تھے، وہ سارا کام ماسٹر صاحب کی چھڑی کرتی ہے۔ چھڑی کیا ہے۔ ذوالفقار حیدری ہے۔ ادھر چمکی، ادھر گری، ادھر کاٹا، ادھر نکلی، جیسے ہی ماسٹر صاحب کی چھڑی فضا میں لہراتی ہے۔ لڑکے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی حفاظت میں مشغول ہو جاتے ہیں، مگر واہ رے مہارت اور کہنہ مشقی کہ وار بھرپور ہے۔ ایک صاحب نیم بسمل ہو گئے، دوسرے صاحب درد و کرب سے دہرے ہوئے جا رہے ہیں، تیسرے کی کلاہ ہوا میں اڑ گئی، غرض تمام شاگردوں کو بہ حصہ مساوی یہ فیض پہونچتا رہتا ہے اور جب گھنٹہ بجتا ہے، کلاس ختم ہوتی ہے تو سب لڑکے بہ زبان حال یہ شعر پڑھتے ہوئے کمرے سے باہر آجاتے ہیں ؎

سب قتل ہو کے ان کے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

(گورکھپور سے نشر)

عمر قریشی:

پاؤں میں میرے ڈال دے زنجیر ڈھونڈ لا
اے جذبۂ جنوں مری تقدیر ڈھونڈ لا
میں چھو رہا تھا چاند، مری آنکھ کھل گئی
اے دوست میرے خواب کی تعبیر ڈھونڈ لا
آئینہ دیکھ کر میں بہت ہی اداس ہوں
ماضی! مرے شباب کی تصویر ڈھونڈ لا
ناز و نیاز شوق کا ادراک ہے محال
آیات حسن و عشق کی تفسیر ڈھونڈ لا
کچھ تو جواز قتل ہیں تو پیش کر سکے
دل کی خطا، نگاہ کی تقصیر ڈھونڈ لا
تنہا رہ غزل کو نہ طے کر سکے گا تو
غالب کو کر تلاش، کوئی میر ڈھونڈ لا
تو گردش حیات کا شکوہ نہ کر عمر
تقدیر جو بدل دے، وہ تدبیر ڈھونڈ لا

(گورکھپور سے)

دیوار

ڈاکٹر شمیم حنفی

(ابتدائی موسیقی راگ مالکوس کے اونچے سُروں میں ایک گیت) فیڈ آؤٹ)

(فیڈ ان)

رات کا سناٹا ہوا کا شور۔ طوفان۔ لگتا ہے بیچ بیچ میں سیٹیاں سی بجتی ہیں۔ دور کہیں کھڑکی کے پٹ اچانک کھلتے ہیں۔ اڑتے ہوئے کاغذوں کی پھڑ پھڑ پھڑاہٹ۔ کانچ کے ٹوٹنے کی آواز۔

ایک آواز (دور سے آتی ہوئی گونجیلی اور بھاری)

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

ہوا کا شور

(فیڈ آؤٹ)

قریب آتی ہوئی قدموں کی آواز

دروازے پر دستک

چمپا : مالکن۔ مالکن۔ (دروازہ کھلتا ہے)

شانتی : کون؟ چمپا؟ کیا بات ہے؟

چمپا : (گھبرایا ہوا لہجہ) جھکڑ چل رہے ہیں مالکن۔ ابھی ابھی اچانک کیسی آواز آئی تھی، کہیں کوئی دیوار گری ہے۔

شانتی : دیوار؟ (رک کر) نہیں۔ جاؤ۔ تم سو جاؤ۔ میری چنتا مت کرو (دروازہ بند کر لیتی ہے) (موسیقی کی ایک لہر ہوا کا شور)

شانتی : (ہانپتے ہوئے) پاگل پریشان ہوا۔ یہ کیسے ڈھونڈ رہی ہے؟ دور تک پھیلا ہوا ہے گھنا گمبھیر اندھرا موت کے پیروں کی پھڑ پھڑاہٹ۔ اوف۔ اوف یہ کیسی بے کلی ہے؟ اور۔ اور ایسا کیوں ہوتا ہے کہ دیواروں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی ایک لہر سب کچھ بکھیر دیتی ہے۔

ہوا میں پھڑ پھڑاتے ہوئے کاغذ۔ دور سے آتی ہوئی ایک دیوانہ وار قہقہے کی گونج۔

شانتی : (ہانپتے ہوئے) یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں اچانک بکھرتی کیوں جا رہی ہوں؟ یہ کیسی الجھن ہے؟ سانسوں میں رچی ہوئی یہ کیسی مہک ہے بیتے دنوں کی (اچانک کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔ (فیڈ آؤٹ)

(وقفہ)

صبح صبح کا تاثر۔ پرندوں کے چہچہے۔

شانتی : تم کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو راج؟

راج : (چونک کر) اوہ! مادام شانتی لتا؟ تو تم۔ دوسروں کی سوچ کے بارے میں بھی پریشان ہو سکتی ہو؟ کیوں۔

شانتی : بکو مت ——— میں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو یاد بھی نہیں کہ کبھی میں پریشان تھی۔ اور ہوتی بھی تو کیوں؟

راج : دیکھئے مادام اپنے آپ کو دھوکا دیتے رہنا۔ مانا کہ اچھی عادت ہے مگر اس سے ملتا کیا ہے؟

شانتی : (بگڑ کر) دیکھو راج۔ یہ سائیکو انالیس کا چکر چھوڑ دو سچائی جو کچھ بھی ہوتی ہے دکھائی دیتی ہے ——— دیکھو میں کتنی سکھی۔ کتنی شانت دکھائی دیتی ہوں۔ ہے کہ نہیں؟ (ہنستی ہے)

راج : (رک کر) دیکھو بھابی ——— وہ بھکاری۔ دھنی رام ——— جو ہر شام الفریڈ پارک کے گیٹ پر کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کا نام دھنی رام ہے اور وہ بھکاری ہے۔ سمجھیں؟ ٹھیک ہے۔ تم شانتی لتا۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی مگر یہ شانتی صرف تمہارے نام میں ہے ہے کہ نہیں؟

شانتی : تو کیا۔ سچ مچ میں تمہیں اشانت اور بے چین دکھائی دیتی ہوں؟

راج : ہاں کہ میں اس دیوار کو توڑنا نہیں چاہتا جو تم نے اپنی آتما کے چاروں اور چن رکھی ہے۔

شانتی : (تنبیہ کے انداز میں) راج۔

راج : (دھیمے لہجہ میں) سن رہا ہوں ——— اور تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوا ہوں۔

شانتی : (بڑبڑاتے ہوئے) دیوار . . . . . دیوار . . . دیوار (ہوا کا شور دور ایک قہقہے کی گونج جو دھیرے دھیرے ڈوب جاتی ہے)

[مندر میں بجتی ہوئی گھنٹیاں ——— شنکھ دور سے آتی ہوئی کیرتن کی دھیمی دھیمی آواز]

(دھیمے چلتے قدموں کی چاپ)

شانتی : دیکھو۔ ادھیڑ عمر کی وہ عورت۔ وہ سفید ساڑی میں ——— اس کا نام سندھیا ہے۔ کیرتن منڈلیوں کے ساتھ پچھلے پچیس برسوں سے وہ اسی طرح منجیرہ بجاتی رہتی ہے۔ اور ——— اور ——— راج تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ہم دونوں ایک ہی بستی میں جنمے تھے۔ دس بارہ برس کی عمر تک ہم ساتھ کھیلتے تھے۔ بنوں اور کھیتوں میں۔ پھر اس کا بیاہ ہو گیا تھا۔ اور اس کا پتی مر گیا تھا۔ سانپ نے کاٹ لیا تھا اسے۔ پھر اسے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا ——— پھر وہ اپنے مائکے بھی نہیں آئی تھی۔ کیونکہ اس کے پتا کا دیہانت ہو چکا تھا۔ اور گھر والے اسے سویکار کرنے پر تیار نہیں تھے (ہانپنے لگتی ہے)

راج : (پکارتے ہوئے)۔ بھابی ——— بھابی ——— (گھبرا کر) بھابی ———

شانتی : پھر ——— وہ پریاگ چلی آئی تھی۔ اور جب سے اب تک وہ اسی مندر میں کیرتن منڈلیوں کے ساتھ اسی طرح بیٹھی منجیرہ بجاتی رہتی ہے ——— اس نے مجھے ابھی دیکھا تھا۔ مگر پہچانا نہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ وہ مجھے پہچاننے سے ڈرتی ہے ——— اور میں ——— میں بھی اسے پہچاننے سے ڈرتی ہوں ——— تم تم یہی سوچ رہے ہو نہ! کیوں؟

راج : یہ تم ——— اچانک تم کیسی باتیں کرنے لگیں؟

شانتی : (کھلکھلا کر ہنستی ہے) میں نے تمہارے من کا چور پکڑ لیا نا؟ مگر ——— مسٹر راج ونش ایک بات گرہ میں اچھی طرح باندھ لو ——— میں اسے پہچاننے سے ڈرتی نہیں۔ یہ اور یہ بات ہے کہ میں اسے پہچاننا نہیں چاہتی۔

راج : کیوں؟

شانتی : اس لئے کہ اسے پہچاننے کا مطلب ان بھولے بسرے دنوں کو یاد کرنا ہے جو میرے لئے اب کوئی بھاؤ کوئی ارتھ نہیں رکھتے۔ جس روز تمہارے بھیا فرنٹ پر مارے گئے ——— اسی دن۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا تھا کہ مجھے سندھیا یا شکنتلا یا پاروتی یا رجنی نہیں بننا ہے۔ یہ نام ان لڑکیوں

کے ہیں۔ جو متھرا۔ پریاگ۔ وارانسی اور اجودھیا کے مندروں میں ایسی ہی کیرتن منڈلیوں کے ساتھ بیٹھی۔ منجیرہ بجا رہی ہوں گی۔ یا بے جان مورتیوں کو پنکھا جھل رہی ہوں گی ـــــ یا ـــــ یا پھر۔

راج : تم رک کیوں گئیں ـــــ؟ آگے کیا کہنا چاہتی تھیں تم؟

شانتی : یا پھر کسی ریڈ لائٹ ایریا میں ـــــ جاگ رہی ہوں گی رات گئے ـــــ بدبودار پسینے میں نہائے ہوئے کسی اجنبی کے ساتھ ـــــ کسی فائیو اسٹار تک تو پہنچنے سے رہیں۔

(ہنستی ہے) وقفہ۔

ہوا کا شور ـــــ اسی کے ساتھ حزنیہ موسیقی کی ایک لہر۔ دھیرے دھیرے ڈوبتی ہوئی۔

(بھاری قدموں کی گونج)

رائے صاحب : (نرم لہجہ) شانتی! بیٹی شانتی لتا۔

شانتی : جی بابو جی۔

رائے صاحب : تم کب سے اسی طرح بیٹھی ہو۔ کب تک یونہی بیٹھی رہو گی؟

(شانتی کی سسکیاں)

رائے صاحب : ارے پگلی! تم تو رونے لگیں۔ رونا تو مجھے بھی چاہیئے تھا تمہارے ساتھ ـــــ تم سمجھتی ہو کہ تم اکیلی ہو گئی ہو سبھاش کے دیہانت کے بعد ـــــ کیوں؟ مگر ـــــ میں بھی تو ادھورا ہو گیا ہوں ـــــ بیٹی ـــــ وہ میرا بڑا بیٹا تھا نا۔ (آواز بھرا جاتی ہے)۔

(پاس آتے ہوئے قدموں کی چاپ)

راج : بابو جی! بابو جی!

رائے صاحب : (چونک کر) کون؟ راج! کیا ہے بیٹے؟

راج : آپ رو رہے ہیں بابو جی!

رائے صاحب : نن ـــــ نہیں تو ـــــ میں رو تو نہیں رہا ہوں۔ (مصنوعی ہنسی) دیکھو راج ایسا کرو۔ تم شانتی کو ذرا محنت سے پڑھاؤ۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی نا اور سبھاش بھی تو یہی چاہتا تھا (وقفہ) سبھاش بھی یہی چاہتا تھا نا۔

راج : (دھیرے سے) ہاں۔

ہوا کا شور۔ فیڈ آؤٹ۔

شانتی : پڑھتے ہوئے۔

We do not know much of the future except that from generation of generation, the same things happen again and again, man learn little from others experience but in the life of one man never the same time returns.

کتاب بند کر دیتی ہے (آواز کے ساتھ) ماچس جلانے کی آواز)

شانتی : (اپنے آپ سے) بکواس۔ سب بکواس ہے۔

گیتا : (جمائی لے کر) او شانتی ـــــ شانتی ـــــ اب لائٹ آف کر دو اور سو جاؤ۔ تمہیں پتہ ہے رات کے کتنے بجے ہیں۔

شانتی : رات سونے سے چھوٹی تو نہیں ہو جاتی گیتا۔ کیوں؟

گیتا : ہو جاتی ہے میری جان! ہو جاتی ہے چھوٹی۔ آزما کر دیکھ لو ـــــ اور ـــــ یہ کیا تم نے پھر سگریٹ سلگا لیا۔ گندی بات! چھوڑ دو یہ لت۔ نہیں تو لوگ کہیں گے رائے صاحب کی بہو ولایت جا کر ایک دم میم بن گئی (چمکارتے ہوئے) سو جاؤ اب۔ آؤ۔ آؤ۔ مجھ سے لپٹ کر سو جاؤ۔ دھیرے سے آ جاؤ . . . . .

(سوئچ آف کرنے کی آواز) حزنیہ موسیقی کی ایک لہر۔

شانتی : میں نے کہا نا کہ میں سندھیا۔ یا شکنتلا۔ یا پاروتی یا رجنی بننا چاہتی تھی۔ مجھے بھجن کیرتن سے زیادہ دلچسپی یلیٹ اور سارتر اور کامیو سے تھی۔ میں بھول جانا چاہتی تھی۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی

راج : بھیا کو بھی۔

شانتی : ہاں! موت ہم سے جس کو چھینتی ہے اسے مٹا بھی دیتی ہے۔ اسے یاد کرنا اپنے آپ کو کشٹ دینا ہے۔ اور انھیں بھی کشٹ دینا ہے جو ہمیں سکھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں میرا اپنا سوارتھ بھی رہا ہو گا۔ پر۔ سچ مانو راج مجھے اپنے آپ سے زیادہ بابو جی کی چنتا تھی۔

جس روز میں انگلینڈ سے واپس آئی اور بابو جی نے مجھے دیکھا تو ان کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔

(سڑک کا شور۔ ٹریفک۔ موٹر کا ہارن اچانک بریک لگتے ہیں۔)

رائے صاحب : راج بیٹے۔ ذرا دیکھ بھال کر موٹر چلاؤ۔

راج : سوری بابو جی۔

رائے صاحب : (ہنس کر) مجھے اپنا نہیں۔ شانتی کا خیال ہے۔ ابھی ابھی تو وہ ولایت سے لوٹی ہے کہے گی کہ ہم گنوار لوگوں کو گاڑی چلانی بھی نہیں آتی۔

(گاڑی رکتی ہے۔ سب گاڑی سے اترتے ہیں دروازہ بند ہونے کی آواز)

سانیال صاحب : اوہ۔ رائے صاحب۔ بہو کو لے کر آ گئے ایئرپورٹ سے۔

رائے صاحب : تم! سانیال۔ لیکن جا کہاں رہے ہو۔ چلو اندر چلو۔

سانیال : چلتا ہوں۔ میں تو یہ سوچ کر واپس جا رہا تھا کہ تم پتہ نہیں کب واپس آؤ۔

(وقفہ) ملے جلے قدموں کی آواز سب بیٹھ جاتے ہیں۔

سانیال صاحب : کیسا رہا تمہارا سفر۔

شانتی : بہت اچھا اور ایکسائٹنگ

رائے صاحب : شانتی۔ اوہ اب تو ڈاکٹر شانتی لتا کہنا چاہیئے۔ (ہنستے ہیں)

شانتی : جی بابو جی۔

رائے صاحب : ایسا ہے کہ تم جا کر تھوڑا آرام کر لو۔ راج۔ سامان رکھوا دیا سب ٹھیک ہے۔

راج : ہاں۔

رائے صاحب : تو جاؤ شانتی کو لے جاؤ۔ اس کمرہ میں جو تمہاری سورگیہ ماں کا کمرہ تھا۔ شانتی اسی کمرہ میں رہے گی۔ (جاتے ہوئے قدموں کی چاپ)

سانیال صاحب : تم کس سوچ میں ڈوب گئے رائے صاحب۔

رائے صاحب : نہیں سانیال۔ (ایک گہرا سانس لیتے ہوئے) سوچ کر بھلا کیا ملتا ہے۔ سبھاش گیا۔ پھر اس کی ماں۔ ونودنی اپنی سسرال میں مگن ہے۔ راج نے سارا بزنس سنبھال لیا ہے۔ کیوں؟ اب مجھے کوئی چنتا نہیں۔

سانیال : ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔ تمہارا فیصلہ ٹھیک تھا۔

رائے صاحب : ہاں! (رک کر) ٹھیک ہی تھا۔ اصل میں شانتی کا گریجویشن ہوتے ہی یہ الجھن سامنے آ گئی تھی کہ اب کیا ہو؟ وہ سبھاش کو پہلے سے زیادہ یاد کرنے لگی تھی۔ اس لیئے تو میں نے یہ طے کیا کہ اپنا ایم۔ اے پورا کرنے کے بعد وہ دو چار برس کے لئے باہر چلی جائے۔

(موسیقی کی لہر)

راج : (قریب آتے ہوئے) ہیلو بھابی۔

بلراج حیرت

حساس دل تھا شرم سے نمدیدہ ہو گیا — ناحق میں اس کی بات پہ رنجیدہ ہو گیا
تجھ سے مفارقت کا نہیں غم تو اس کا ہے — میں خود بھی اپنے واسطے نادیدہ ہو گیا
ساغر اچھلتے دیکھ کے کیوں رو پڑی گھٹا — ماحول دفعتاً بڑا سنجیدہ ہو گیا
بوڑھی ہوا نے پیار سے پھیرا تھا سر پہ ہاتھ — پتہ عجیب خوف سے لرزیدہ ہو گیا

حیرت کسی کا اپنے مقدر پہ بس نہیں
پروانہ خود ہی شمع کا گرویدہ ہو گیا

(اردو سروس سے)

شانتی: ہیلو راج۔
راج: یہ کتاب بند کرد —— اور —— اور —— مجھ سے باتیں کرو ——!
شانتی: (مضمحل ہنسی کے ساتھ) تم میرے چپ رہنے سے ڈرتے ہو شاید۔
راج: ہاں! ڈرتا ہوں۔
شانتی: کایر کہیں کے۔ (ہنستی ہے)
وقفہ
راج: تمہیں WEST پسند آیا۔
شانتی: ہاں! (ماچس جلا کر سگریٹ سلگاتی ہے)
راج: یہ لت تم نے کیوں لگا لی۔
شانتی: یہ بھی ایک سادھن ہے جینے کا۔ اسے لت کہنا ٹھیک نہیں۔ جس طرح ہم شاپنگ کرتے ہیں۔ اور پارٹیوں میں جاتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور ریڈیو سنتے ہیں اور فلمیں دیکھتے ہیں
راج: یہ سب اپنے شونیہ کو، من کے خالی پن کو، سونے پن کو بھرنے کا ایک بہانہ ہے۔
شانتی: اکیڈمک باتیں کرو گے تو مجھے ہنسی آجائے گی۔
راج: تو کیا میں غلط کہہ رہا تھا۔
شانتی: ہاں تم بکواس کر رہے تھے۔ رئیلی ایسی باتوں کا کوئی بھاؤ نہیں ہوتا۔
راج: تم اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو بھابی۔
شانتی: دھوکا دینا، سندھیا یا شکنتلا یا رجنی بننا ہے۔ بھجن، کیرتن، گیتا پاٹھ، مندر دیوداسیاں برت تھل۔ میں اس سب سے بچنا چاہتی تھی۔ میں اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتی تھی ——
راج: پھر تم بھلا چاہتی کیا تھیں؟
شانتی: (ہنستی ہے) بتاؤں۔ (پھر ہنستی ہے)
راج: (پر خیال انداز میں) ہوں۔ بتاؤ
شانتی: (سنجیدگی کے ساتھ) میں ماں بننا چاہتی تھی۔ —— مگر۔ . . . تمہارے بھیا (رک کر) یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ —— اور راج! سچ پوچھو تو اس کامنا میں بھی ایک سوارتھ چھپا ہوا تھا —— ماں بننا —— یہی ایک اکیلا سادھن ہے عورت کے لئے اپنی پہچان کا اور اپنے ادھورے پن کے احساس سے بچنے کا۔ ماں۔ پوری عورت ہوتی ہے۔ سمجھے . . . .
راج: (پر خیال انداز میں) ہوں۔
شانتی: (اداسی سے) اس حویلی میں سب کچھ ہے۔ تم نے بزنس سنبھال رکھا ہے۔ میں کالج میں پڑھاتی ہوں میں نے دنیا دیکھی ہے۔ دھن۔ دولت۔ نوکر چاکر مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ تمہاری بھی نہیں بابو جی سب کچھ اس طرح بنا گئے تھے کہ ان کے بعد بھی کہیں بکھراؤ یا ٹوٹ پھوٹ نہیں ہو گی۔ سارے سکھ ہیں میرے پاس۔
راج: تم یہ نہیں سوچتیں بھابی کہ تمہیں اس سارے سکھ کا کتنا بڑا مول چکانا پڑا ہے۔ چکانا پڑ رہا ہے۔
شانتی: (ہنستے ہوئے) پھر وہی انٹلکچول باتیں۔
راج: (خفا ہو کر) وہ گھنے جنگل۔ جن کے دامن میں چھپی ہوئی بستی کی دھول تمہارا بچپن ہے۔ ندی کا وہ کنارا۔ جہاں تم سندھیا اور پاروتی اور رجنی اور شکنتلا کے ساتھ گھومتی پھرتی تھیں۔ ہوا کی ایک آزاد۔ منچلی اور شکتی وان لہر کی طرح —— تم بھول گئیں وہ سب!
شانتی: (تیز لہجہ میں) ہاں!
راج: تمہیں یاد نہیں آتا اپنا وہ نشچھل اور نربھے روپ!
شانتی: (ہانپتے ہوئے) نہیں۔
راج: تم یہ نہیں سوچتیں کہ تم نے اپنے چاروں اور دیواریں چن رکھی ہیں۔
شانتی: (ہانپتے ہوئے) نہیں۔
راج: اور تم آپ اپنے وچاروں کی بندی بن کر رہ گئی ہو۔
شانتی: (روہانسی ہو کر) نہیں . . . نہیں . . . نہیں!
راج: ٹھیک ہے! ایک بار آدمی اپنی آتما کا سودا کرلے تو پھر —— وہ سدا کے لئے چنتا مکت ہو جاتا ہے۔ تمہارے سونے پن کی لپٹیں مجھ تک پہونچتی ہیں۔ مگر تم۔ تم اسے سویکار نہیں کرنا چاہتیں۔
شانتی: (چیخ کر) راج۔
(پس منظر سے لرزہ خیز موسیقی کی ایک لہر۔ فیڈ آؤٹ۔)
(وقفہ)۔ فیڈ ان
[شام کا تاثر دور مندروں کے گھنٹے بجتے ہوئے۔ ہوا کا دھیما شور۔ اس شور کے ساتھ کبھی مندر میں کیرتن منڈلی کے گائن کی کوئی لہر ابھرتی ہے۔ اسی پس منظر میں شانتی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ خود کلامی کے انداز میں پڑھتے ہوئے]
شانتی: یہ دھوپ کنارا —— شام ڈھلے۔

ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن۔ جو آج نہ کل
پل بھر کو امر۔ پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہنوں کی جھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کروں۔ کیوں دوش دھروں
کس کارن جھوٹی بات کرو ——

گیتا: (تالیاں بجاتے ہوئے) واہ۔ واہ۔ واہ۔ (چونک کر) ارے تم رک کیوں گئیں۔؟
شانتی: اتنا بہت ہے گیتا۔
گیتا: یہ تم اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھیں کہ کچھ پڑھ رہی تھیں ——
شانتی: فیض کی ایک کویتا —— اسے پڑھ رہی تھی۔ اور اسی کے مادھیم سے
گیتا: اوہ شانتی —— تم پھر چپ ہو گئیں۔
شانتی: اس کے مادھیم سے شاید باتیں بھی کر رہی تھی اپنے آپ سے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔
گیتا: کیا ہوتا ہے؟
شانتی: کہ ہم دوسرے کے لکھے میں اپنے آپ کو پڑھتے ہیں۔
گیتا: زیادہ فلاسیفیکل مت ہو۔ چلو۔ باہر چلتے ہیں۔
شانتی: باہر؟
گیتا: ہاں آندھی کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ آسمان صاف ہے اور شام ہونے والی ہے۔ مندر میں پروہت پریکرما کر رہے ہونگے۔ چلو باہر چلیں۔
شانتی: نہیں —— میں ابھی ابھی تو لوٹ کر آئی ہوں باہر سے ——
گیتا: (ہنس کر) ٹرولی فلاسفیکل۔ تم تو یہیں بیٹھی ہو دوپہر کے بعد سے ——
شانتی: ایک جاترا بیٹھے بیٹھے بھی کی جاتی ہے۔
گیتا: اوہ۔ (منہ بنا کر) میٹافزکس۔
شانتی: آتما نرا کار نہیں ہوتی۔ فزکس اور میٹافزکس میں اتنی دوری نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہے۔
گیتا: اوہ۔ ونڈرفل (مذاق کے انداز میں) تو تم باہر کہاں کہاں ہو آئیں۔؟
شانتی: لمبی کہانی —— پھر سنائیں گے۔
گیتا: کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟
شانتی: میں نے بچپن میں ایک گیت سنا تھا۔ گاؤں کی سہاگنوں کو گاتے ہوئے۔
گیتا: (پر خیال انداز میں) ہوں۔
شانتی: مجھے اس گیت کے بول یاد نہیں۔ بہت کچھ بھول چکی ہوں ان دنوں کی اور مڑ کر دیکھتی ہوں تو بیچ میں —— اتنا گہرا —— دھند کی ایک دیوار سی آجاتی ہے۔
گیتا: تمہیں اس گیت کا خیال کیسے آیا؟
شانتی: ہر خیال کسی نہ کسی دوسرے خیال سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک سلسلہ ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سلسلے کی سب کڑیاں ملتی جائیں . . . . کہیں کہیں —— یہ سلسلہ پکڑ میں نہیں آتا۔
گیتا: وہ گیت؟

شانتی : ہاں اس کے بول یاد نہیں آ رہے ہیں اس سے مگر بھاؤ یاد ہیں۔
گیتا : کیا ——؟
شانتی : یہ برہن کا گیت ہے جو انگنائی میں لگے ہار سنگھار کی اور دیکھتی ہے۔ پھر کہتی ہے۔ ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں۔ مگر میں سونی ہوں۔ میرے بدن پر پھول کھل اٹھے مگر میں سونی ہوں میری آتما میں پرندوں کے چہچہے گونج رہے ہیں مگر میں سونی ہوں۔
گیتا : (بھرائی ہوئی آواز میں) اور ؟ اور؟ اور؟
شانتی : اس سونے پن کو بھرنے کے لئے . . . میں کب سے بے چین ہوں . . تم آتے کیوں نہیں؟ آؤ۔ ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں۔ میرے بدن کی ٹہنی تمہیں پکار رہی ہے۔ آؤ ان پھولوں کو چن لو۔ میری آتما میں چہچہاتے پرندوں کی پکار سنو! ان کے کنٹھ پیاسے ہیں۔ بہتے پانی کی اٹوٹ دھارا نہ سہی تم اوس کی کچھ بوندیں ہی لے کر آجاؤ —— آجاؤ۔
گیتا : (اپنے آپ سے) آجاؤ —— آجاؤ۔
شانتی : تم بہت پیاسی ہو گیتا! تمہاری آتما!
گیتا : آتما کیا شریر سے الگ ہے شانتی ——
شانتی : ایسی باتیں کہی نہیں جاتیں —— پوچھی بھی نہیں جاتیں۔
گیتا : پھر؟
شانتی : بس سمجھ لی جاتی ہیں۔
گیتا : (پر خیال انداز میں) ہوں۔
[پس منظر سے موسیقی کی ایک نرم دھیمی لہر]
شانتی : ایک روز راج سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ ایسی ہی ایک شام تھی۔ اس روز بڑے زوروں کی آندھی آئی تھی۔ گل مہر کی ٹہنیاں ٹوٹ رہی تھیں اور پھول سارے لان میں بکھر گئے تھے۔
ہوا کا شور۔ جھکڑ۔ طوفان۔
راج : (دور سے) بھابی۔ بھابی۔
شانتی : کیا ہے راج۔ (ہانپتے ہوئے) کیا ہے؟
(قدموں کی چاپ)
راج : ارے! تم تو ہانپ رہی ہو۔ دیکھو۔ باہر کتنا بھینکر طوفان ہے۔
شانتی : ہاں۔
راج : اور اندر بھی . . .
شانتی : یہ تم کیا کہہ رہے ہو —— اوہ۔ میں سمجھی۔ یہ دیوار پر لٹکا ہوا کلینڈر ہل رہا ہے۔ ایسا کرو کہ وہ سامنے والی کھڑکی بند کر دو پلیز۔
راج : طوفان تمہارے کمرے میں ہیں۔
شانتی : پہیلیاں مت بجھاؤ راج۔
راج : طوفان تمہارے اندر ہے۔
شانتی : (سختی سے) بکو مت۔
راج : دیکھو بھابی —— میں جو کہہ رہا ہوں اسے سمجھنے کی کوشش کرو!
شانتی : تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ (سختی سے) کہو۔
راج : پانی میں ابال آجائے تو دیگچی کا ڈھکنا تھوڑا اٹھا دینا چاہیئے۔ نہیں تو۔
شانتی : نہیں تو کیا؟
راج : نہیں تو —— نہیں تو سب کچھ بھک سے اڑ جائے گا۔
[دور سے آتی ہوئی ایک لمبی چیخ۔ ہوا کا شور۔ لرزہ خیز موسیقی] فیڈ آؤٹ۔
شانتی : میں نے اسی شام گھر چھوڑ دیا۔ میں ورکنگ ویمنز ہوسٹل میں چلی گئی۔ وہاں بڑی مشکل سے میں نے دس دن کاٹے۔ وہاں مجھے ایسا لگا کہ ایک ساتھ بہت سی دیگچیاں چولہے پر چڑھی ہوئی ہیں اور اندر سارے کا سارا پانی بھاپ بن چکا ہے۔ میں نے اس ساری گھٹن سے تنگ آکر گھبرا کر ہوسٹل بھی چھوڑ دیا۔
گیتا : اور اب —— تم پھر انہیں دنوں کو یاد کر رہی ہو! کیوں؟
شانتی : ہاں۔ مگر بھلانے کے لئے۔ کس کو بھلانے کے لئے۔ کوئی دیکھتی ہو یا وستو یا سمے کا کوئی پل۔ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ یاد کرنا پڑتا ہے۔ بھلانے سے پہلے۔
گیتا : بھول جاؤ۔ بھول جاؤ۔ شانتی اور دکھ مت اٹھاؤ۔
شانتی : (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں مجھے یادوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آئی ہیٹ دیم یہ سب بھولنے ہی کے تو سادھن ہیں۔
میں نے سارے بزنس کا بٹوارہ کر لیا۔ اپنا SHARE الگ کر کے میں نے بیچ دیا۔ راج ہی کے ہاتھوں۔ پھر میں نے یہ کوٹھی خریدی۔ یہ جگہ پہلے بہت اچھی تھی۔ آس پاس سناٹا تھا سامنے بہتا ہوا دریا!
(پس منظر سے مندر کی گھنٹیاں)
شانتی : یہ مندر تو ابھی حال میں بنا ہے۔ دو برس پہلے۔ ایک شام میں ٹہلتی ہوئی ادھر جا نکلی کیرتن ہو رہا تھا۔ اور اجاڑ چہرے۔ سونی آنکھوں مٹ میلے بالوں والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت منجیرہ بجا رہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔
گیتا : کون تھی وہ؟
شانتی : سندھیا۔ (سپاٹ لہجہ میں) مگر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں نہ تو سندھیا بننا چاہتی ہوں۔ نا پاروتی۔ نہ رجنی نہ شکنتلا۔
گیتا : تم چاہتی کیا ہو؟
شانتی : کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ اپنا آپ سنبھالے رکھوں۔ وہی بنی رہوں جو کچھ کہ ہوں۔ شانتی۔
گیتا : تم سمجھتی ہو کہ اپنے آپ میں سمپورن ہو؟
شانتی : (ہانپتے ہوئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں) نہیں۔
گیتا : تم اپنے آپ میں شانت ہو؟
شانتی : (اسی لہجہ میں) نہیں۔
گیتا : دوسرے کا سہارا چاہتی ہو۔؟
شانتی : (چیخ کر) نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ میں صرف ماں بننا چاہتی تھی۔ بس اور کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔
سسکیاں۔ ہیجان خیز موسیقی کی ایک لہر۔
فیڈ آؤٹ (اردو سروس سے)

رؤف رضا

ایک جزیرہ صدیوں سے ہے ننھی منی کلیوں کا
خوشبو آنکھیں خوشبو باتیں زشتہ ناتا ولیوں کا

سبز اجالا گھل سا گیا ہے لفظوں میں اب لہجوں کا
ہم نے راہیں آساں کر دیں توڑ کے زشتہ قرنوں کا

اب سے پہلے کے موسم میں سارے سمندر گہرے تھے
روشن سورج بیچنے والا باسی ہے اب گلیوں کا

میں نے چاند کی چھت پر جا کر گھر کا منظر دیکھا تھا
دھوپ کے نیلے پھولوں جیسا منظر تھا کچھ بچوں کا

رات کے آنسو کس نے پونچھے وہ تو ابھی بیوہ ہے
صبح کی خوشیاں لانے والا پیاسا ہے کچھ اشکوں کا

رات طلسمی آوازیں تھیں شہر کی خستہ بستی میں
شوریدہ سا عالم تھا بوڑھے برگد کے پتوں کا

(اردو سروس سے نشر)

سانپ کے دانت

غیاث احمد گدی

جانے سے پہلے تم نے میری طرف دیکھا تھا جن میں آنسو نہیں تھے، دور دور تک کالی دھول اڑتی دکھائی دے رہی تھی، لیکن جن میں گلاب کی نازک پنکھڑیاں بھی بولاتی پھر رہی تھیں۔

مانی ذرا بادل کو انڈر لینے دو۔ گھٹاؤں کو اچھی طرح برس لینے دو تاکہ دھول بیٹھ جائے۔ تب ہم ملکر بیٹھتے ہیں آپس میں باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔ پھر کوئی نہ کوئی راہ سوچتے ہیں۔۔۔۔

میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا یہ دھول، یہ کالی دھول کا بگولہ تمہیں کہیں اتنی دور اڑا کر نہ لے جائے کہ میں تو میں تم اپنے رنگوں کی پیالیوں اور کینوس تک پہونچنا چاہو بھی تو نہیں پہونچ سکو ——— مانی ڈارلنگ ذرا سنبھلو، ذرا دھیرج رکھو۔۔۔۔

"دھیرج ہی دھیرج ہے۔۔۔۔" تم نے آہستہ سے، لیکن ٹھہراؤ سے کہا تھا۔ "میں یا کوئی بھی لہولہان نہیں ہوا جارہا ہے؟"

تمہارا سوال بظاہر معمولی تھا لیکن ذرا ٹھہر کر ذرا اتر دیکھو تو پتہ چلے یہ سوال اپنے اندر معنی کی کتنی گہری کھائی چھپائے ہوئے ہے کہ جس کی طرف ایک نظر دیکھتے ہی دل سہم کر رہ جاتا ہے۔

پھر ذرا دیر بعد تم نے کسی دانا آدمی کی طرح یہ بھی کہا تھا ہم تو افتراق و امتیازات کے مارے ہوئے انسان ہیں جنھیں محبت بھی آنکھیں کھول اور رنگوں کو پہچان کر کرنی پڑتی ہے۔۔۔۔ کیوں؟

"کیوں میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

جانے کیا سوال تھا تمہاری باتوں میں کہ مجھے جواب سوجھنے کی بجائے، یکایک تمہاری بنائی ہوئی ایک تصویر یاد آگئی جس میں کھولتے، چنگھاڑتے ہوئے تیز و تند پانیوں کے بیچوں بیچ گلاب کی ایک ننھی سی کلی مسکراتے جارہی تھی۔۔۔۔ اور جیسے ہی یہ تصویر یاد آئی میرا دل دھڑک اٹھا اور میں نے تمہارے اس اجنبی اجنبی سے سوال کا جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کرلیں۔۔۔۔

عین اسی وقت ہمارے چہروں کی طرف ایک بےحد کالا سانپ، لہراتا ہوا جھومتا ہوا آگے بڑھتا آرہا تھا اور تبھی تمہارے منہ سے چیخ نکل گئی اور تم نے مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میں دور جا گرا تھا جہاں وہ کالا زہریلا سانپ پہونچ نہیں سکتا تھا۔ اور جب سانپ بل کھاتا ہوا ایک طرف کو جھاڑیوں میں گھس کر اوجھل ہوگیا تو میں نے دیکھا مانی تم بالکل میرے کلیجے سے لگی، تھر تھر کانپ رہی ہو۔۔۔۔ بالکل تمہارے پاؤں کے پاس تھا۔" تم نے ہانپتے ہوئے کہا تھا۔

مگر مجھے نہیں کاٹتا۔۔۔۔"

کیوں؟ کیوں نہیں کاٹتا؟" تم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"کیونکہ جہاں ہمارے پاس رنگوں کا زہر ہے وہاں جذبوں کا تریاق بھی ہے۔۔۔۔"

اور تب میں نے دیکھا کہ تمہاری آنکھوں میں جذبہ ہی جذبہ تھا۔ بھاونا ہی بھاونا، رشتہ ہی رشتہ، رنگ ہی رنگ نور ہی نور اور کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔۔ تم وان کا گاگ کی طرح جلتی ہوئی شمع پر ہتھیلی نہ رکھ سکیں تو پال گاگیں کی طرح سارے رشتے ناطے توڑ کر کسی سنسان جزیرے کی طرف بھی بھاگ نہیں سکیں۔

چنانچہ مانی، جب ماں نے تمہیں نئے ملک میں جاکر پرانے رشتوں کو بھلا دینے کا الزام لگایا تو ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دینے کی شدید خواہش ہونے کے باوجود میں ایسا نہیں کرسکا۔ اور انھیں اسی طرح بولنے دیا۔ صرف انکی آنکھوں کے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

لیکن ماں نے جب آہستہ سے یہ بھی کہا کہ "عورتیں سب ایسی ہوتی ہیں"، تو میں چپ نہ رہ سکا۔

مگر ماں تم بھی تو۔۔۔۔"

جبھی وہ سپیرا آپہونچا جس کی بہنگی کے دونوں جانب تلے اوپر رنگ برنگی پٹاریاں ہوتی ہیں اور جن میں طرح طرح کے سانپ پڑے ہوئے ہیں۔

حسب دستور سپیرا میرے آنگن میں بیٹھ جاتا ہے کوئی ایک پٹاری کھولتا ہے، سوکھے لبوں پر زبان پھیر کر بین بجانے لگتا ہے، اس کے بعد پٹاری میں سے سانپ پھنکارتا ہوا سر اٹھاتا اور بین کی آواز پر وہ، اس کے جسم کا ذرہ ذرہ جھومنے لگتا ہے۔ جب تک بین بجتی رہتی ہے وہ بدمست جھومتا رہتا ہے۔ اور میں نے دیکھا بین کی لے جیسے ہی ٹوٹتی ہے سانپ پھنکارتا سپیرے پر ہی حملہ کر بیٹھتا ہے۔ جسے سپیرا اپنے داہنے ہاتھ کی پشت پر سہہ لیتا ہے۔

ماں کہتی ہے، ہو نہ ہو یہ ناگن ہوگی۔۔۔۔

جواب میں میں کہتا ہوں کہ "یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ناگ نہیں ہوگا؟"

نہیں ہوگا بس۔۔۔۔" وہ ذرا ٹھہرتی ہیں اور میری آنکھوں میں میرے سوال کو جوں کا توں دیکھتی ہیں تو پھر کہتی ہیں۔

"اس لئے کہ سپیرا اسے دودھ پلاتا ہے اور یہ اسی کو ڈسنے کو دوڑتی ہے۔۔۔۔ ناگ ہوتا تو۔۔۔۔ ناگ ہوگا۔" ماں ذرا دیر کو رکتی ہیں تو میں کہتا ہوں۔

پتہ نہیں ماں کو ہر عورت میں بے وفائی اور مرد میں وفا ہی وفا کیوں دکھائی دیتی ہے جب کہ ماں کو عین جوانی میں چھوڑ کر جانے والا بھی ایک مرد تھا۔

"لیکن جو اولاد بڑی ہوکر میری بکھری ہوئی زندگی کے تار تار کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹے نہیں تھکتی وہ بھی تو مرد ہی ہے نا؟"

پھر ماں وضاحت کرتی ہیں کہ اگر مرد ذات بے وفا ہوتی تو، تو کبھی کا مجھے چھوڑ کر اس کے پاس چلا گیا ہوتا۔ تمہیں چھوڑ کر جس کے پاس نہیں گیا وہ بھی تو ایک عورت ہے۔ وہ کیا سوچتی ہوگی؟

ماں میرے اس سوال کا جواب نہیں دے پائیں۔

مانی، یہ تو تمہیں بھی یاد ہوگا کہ جب لاکھ اصرار کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ جانے کے لئے آمادہ نہیں ہوا تو اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ میں اپنا ملک چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ ہمارا ملک تو دھرتی کا ہر وہ خطہ ہے جہاں کی مٹی، اناج کا ایک بھی دانا پیدا کرنے کی اہل ہو۔ وطنیت کا تصور تو ہمارے نزدیک کبھی اتنا محدود تھا۔

میرے لئے رکاوٹ میری ماں تھیں۔ جنھیں ۲۵ برس پہلے ایک مرد نے پہلے انھیں ساری دنیا سے الگ کرکے اپنی بانہوں میں سمیٹا۔ پھر خود بھی انھیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ایسی عورت کو میں اکیلا چھوڑ کر کیسے چلا جاتا؟

ماں کو تنہا چھوڑ کر تمہارے ساتھ جانے سے انکار کیا تھا تو خلاف توقع سب سے زیادہ دکھ بھی ماں کو ہوا تھا۔ خوشی تو ہوئی تھی ایک بیٹا اپنی ممتاج اور

مجبور ماں کو اکیلا چھوڑ کر جانے پر تیار نہیں ہوا۔
لیکن ایک مرد چاہنے والی عورت کی بے پایاں محبت کو ٹھکرا دے ۔ ۔ ۔ ۔ کیا یہ کسی عورت کے لئے کم دکھ کی بات ہو سکتی ہے؟
میں نے کہا، ماں، سپیرے کی پٹاری میں جو سانپ بند ہے وہ نر بھی ہو سکتا ہے۔"
اس بار ماں نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اداسی سے میرے چہرے کی طرف ٹکر ٹکر یوں دیکھتی رہیں۔ گویا وہاں کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ پھر ذرا دیر بعد وہ ماں نہیں رہیں۔ صرف عورت بن گئیں اور گردن جھکا کر دھیرے سے بولیں۔
"اس نے بھی تو چاہت کی دنیا میں کتنی نئی اور عجیب شرط رکھی تھی، چاہتی تو یہیں ٹھہر سکتی تھی"
"ہاں، اور چاہتی تو تمہیں اپنے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔
"نہیں"، ماں میری بات کاٹتی ہیں" میں اس کے گھر کیوں جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ بدا ہو کر بہو کی بجائے ساس بہو کے میکے جائے اور وہاں رس بس جائے"میرے پاس ماں کی اس بات کا جواب نہیں۔ ماں روایتوں پر اعتماد رکھتی ہے۔ وہ اس سے آگے نہیں سوچ سکتیں۔
"کیا اس کو ایسا کرنا چاہیئے تھا؟" ماں نے کہا۔
"ہاں۔ اس کو مٹی نے پکارا تھا" میں بے اختیار ہو کر اور شاید چڑھ کر کہہ گیا۔
"کون سی مٹی؟ کیا مٹی پر بھی کسی کا نام لکھا ہوتا ہے؟
ماں نے دانش وروں کی طرح کتنے سوال کر ڈالے۔
جب بہت دیر تک ماں کو میری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو پھر خود ہی اس نے کہا۔" اور اگر مٹی پر کسی کا نام ہوتا ہے تو تم دیکھنا یہاں کی ہی مٹی پر اس کا نام ہوگا۔ اور مٹی مٹی میں واقعی فرق ہے تو یہاں کی مٹی وہاں کی مٹی میں جلدی ہل بھی نہیں سکتی۔"
مگر مانی میں نے ماں کو یہ بات نہیں بتائی کہ جاتے وقت تم چپکے سے میری گود میں ایک سنپولیہ بھی چھوڑ گئی تھیں جسے اگرچہ میں نے آج تک دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں پلایا ہے۔ شاید اسی لیے یہ مجھے ڈس نہیں پاتا، لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ بے بضاعت سے سنپولئے کہ آج تک میں ایک دم سے مار بھی نہیں پایا ہوں۔
پھر اس کے بعد تو یہ دعوئی بھی کتنا جھوٹا پڑ جاتا ہے کہ میں صرف مٹی سے پیار کرتا ہوں۔ اس مٹی سے جو بانجھ نہ ہو جس میں اناج کو جنم دینے کی شکتی ہو۔
جس مٹی میں اناج پیدا کرنیکی شکتی ہوتی ہے وہ مٹی اپنے سینے میں زہریلے سانپ بھی پالا کرتی ہے۔
اس سے کیا فرق پڑتا ہے، مٹی تو سانپوں کے زہر کو پیتی ہی رہتی ہے اور اس کی کوکھ سے پھوٹا ہوا اناج کا دانا زندگی فروغ دیتا ہے۔
اناج کا دانا تو اس کے بعد بھی اسی طرح زندگی بخش ہوتا ہے، سانپ اناج کے اس دانے کو کہاں ڈس پاتا ہے۔
یہ سنپولیہ بھی مجھے ڈس نہیں پاتا۔ شاید یہ سانپ ہی ایسا ہے کہ جس کے منہ میں کوئی زہریلا دانت نہیں۔
چنانچہ میں ایک دن سپیرے سے پوچھتا ہوں یوں سانپ جو تم پر حملہ کر بیٹھتا ہے کسی دن چوک ہو گئی اور اس کے دانت تمہارے ہاتھ میں ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ان کے دانت نہیں ہیں"، سپیرے نے اپنی بتیسی دکھاتے ہوئے کہا" سارے زہریلے دانت میں نے توڑ دیئے ہیں بابو ۔ ۔ ۔ ۔
"پھر تو سانپ نر ہو یا مادہ کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بظاہر سپیرے سے کہا" نہیں بابو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا"
"پھر کیوں پالتے ہو، جب سانپ میں زہر نہیں تو پالنے سے فائدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"
"میں کہاں پالتا ہوں انہیں"، ذرا دیر تک وہ سپیرا کسی فلسفی کی طرح سوچ میں گم رہنے کے بعد لمبی سانس کھینچتا ہے، پھر کہتا ہے" یہی پالتے ہیں مجھے اور میرے تین بچوں کو ۔ ۔ ۔ ۔"
"جنھیں کبھی شوق کے ہاتھوں پالا تھا، برا وقت آیا تو اس لئے سارے زہریلے دانت توڑ کر بازار میں لے آیا ہوں۔ شوق کو روزگار بنا لیا بابو ۔ ۔ ۔ ۔"
سپیرے نے ذرا دیر بعد میرے قریب آکر سرگوشی میں کہا۔ آپ بھی بابو جی ایسی کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔!
میں نے پوچھا"کیا کروں؟"
"یا تو سانپ پالنے کی لعنت ہی چھوڑ دیجئے۔ یا اگر اتنا ہی ضروری بن گیا ہے اس کا پالنا تو اس کے سارے زہریلے دانت توڑ ڈالئے۔"
لیکن میں سپیرے کے اس سجھاؤ پر عمل نہیں کر پایا۔ سانپ کے زہریلے دانت توڑ دیئے جائیں تو پھر وہ سانپ کہاں رہ جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر مجھے کوئی سانپوں کا تماشہ دکھانا تھوڑا ہی ہے جو ایسا کروں۔ مجھے تو مٹی کی طرح اس کے زہر کو پینا ہے پیتے رہنا ہے۔
مگر مانی، یادوں کی پٹاری میں اتنے بہت سے سانپ جو ہم نے پال رکھے ہیں تو سچ پوچھو تو یہ پینے کو دودھ مانگتے ہیں۔ اور اگر انھیں دودھ نہ پلاؤ تو اپنے سارے زہریلے دانتوں سمیت ایک نہ ایک دن مر جائیں گے۔
نہ رنگ نہ نور، نہ مانی نہ بہزاد، نہ کہیں دان گاگ دکھتا ہے نہ پال گا گین ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔
وقت کی اس پتھریلی دنیا میں جہاں پینے کے لئے زہر کی ایک بوند بھی آسانی سے دستیاب نہیں۔ اتنے بہت سے سانپوں کے لئے دودھ کہاں سے آئے گا؟
یہ الزام بھی کتنا بے بنیاد ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔
جواب میں ماں کہتی ہیں، تب یہ الزام بھی صحیح نہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ بے وفائی ہی بے وفائی ہے۔ پھر میں ماں سے کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ مرد جس نے تمہیں ۔ ۔ ۔ ۔
اس کی بات چھوڑو، وہ غریب تو زہر کے ایک قطرہ کے لئے تڑپ۔ تڑپ کر مر گیا۔
لیکن رانی کے لئے زہر بھی ہے اور دودھ کی نہر بھی۔ ماں کہتی ہیں۔ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن تمہیں معلوم کر کے دکھ ہوگا کہ نہ صرف وہ زندہ ہے، بلکہ رنگوں اور برش کینواس اور ایزل سے دور کہیں آسودگیوں کی گود میں بہت خوش ہے۔
اور وہ سارے سانپ جن کے بارے میں تم بولتے رہتے ہو وہ اس کے پاس ہیں اور وہ زندہ بھی ہیں، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔
"لیکن کیا ماں؟"، جب ماں یہاں آکر رک جاتی ہیں تو میں استفسار کرتا ہوں۔
لیکن یہی کہ اس نے ان تمام سانپوں کے زہریلے دانت توڑ پھینکے ہیں اور یوں ہی شوق کے ہاتھوں مجبور بے ضرر سانپوں کو لے کر جہاں تہاں بیٹھ جاتی ہے۔ بے خود ہو کر بین بجاتی ہے اور اپنے ارد گرد بھیڑ لگائے رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔
مانی! یہ سب ماں تمہارے بارے میں کہتی ہیں، لیکن میں تو خود ڈرتا ہوں کہ اگر میں اپنے سانپوں کے منہ کھولوں اور ان میں سے ایک کے منہ میں ایک بھی دانت نہ رہ گیا ہو تو؟ ۔ ۔ ۔ ؟؟
تب ۔ ۔ ۔ ۔ تب؟؟
زندگی کے بازار میں آج کتنی ہی رنگ برنگ پٹاریاں رکھی ہوئی ہیں جن میں ایک سے ایک زہریلے سانپ بند ہیں، پہلے کوئی ان کے دانت توڑ سکے ۔ ۔ ۔ ۔ جب نا۔

(پٹنہ سے نشر)

شفق ۔ ۔ ۔ چشتی

کچھ ہوش بھی بنام جنوں رہ گزر میں ہے
دل ہی نہیں، شعورِ نظر بھی سفر میں ہے

گھبرا نہ چشمِ نم ـــ کہ ترا اک اک گہر
دیکھا ہے میں نے ـــ دامنِ شام و سحر میں ہے

جلوے قدم قدم ہیں تو پردے نفس نفس
اب دیکھنا ہے کتنی جسارت بشر میں ہے

دل کی بساط کیا ہے مگر نا قدرانِ شوق
سب کچھ اسی صنم کدۂ مختصر میں ہے

آخر یہ کہہ کے اس نے پلٹ دی نقابِ رُخ
دیکھیں تو کتنی تابِ نظارہ نظر میں ہے

چھن چھن کے آرہی ہے کہاں سے یہ روشنی
اک نورِ بے حجاب۔ ہر اک بام و در میں ہے

لو ہو چلا وہ پھول سا چہرہ دھواں دھواں
اب شرحِ غم ضرور حدودِ اثر میں ہے

رشتے کی تیرگی کا کوئی غم نہیں شفق
وہ صبحِ زندگی" نگہ معتبر میں ہے

([illegible])

گڑیا

قاسم خورشید

گڑیا بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ——

اب میں اس گھر میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔ دفتر سے جب اس جگہ لوٹتا ہوں تو چاروں طرف سے ایک عجیب تنہائی مجھ کو جکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ کچھ دیر تک اپنے آپ کو بہلانے کے بعد دھیرے سے بغیر کسی مقصد کے مختلف راہوں سے گزرنے لگتا ہوں۔ کبھی جھیل کی بانہوں میں —— کبھی پہاڑوں کے دامن میں —— اور پھر شہر کی مصروف ترین شاہراہ پر —— ان مقامات سے گزرنے کے بعد رات —— گہری رات ہو جاتی ہے، مجھے گھر کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی چاروں طرف اندھیرے کی حکومت ہوتی ہے۔ روشنی — ہلکی سی روشنی میری کسی انگلی کی جنبش سے پھوٹتی ہے —— اور پھر کچھ دیر بعد وہی تاریکی —— گڑیا ننھے ننھے پاؤں کے سہارے میرے پاس آتی ہے اور وہی سوال —؟

"پاپا —! ممی شاہد انکل کے پاس کیوں رہتی ہیں؟ وہ تو میری ممی ہیں نا ——؟"

"اچھی بیٹی کم بولتی ہے۔ چلو اب سو جاؤ۔ رات کافی ہو گئی ہے۔"

ان سے کرایا گیا تو کلرک ہونے کا قصہ بھی لوگوں کو بتایا گیا۔ یہ درست ہے کہ شاہد نہیں ہوتا تو شاید میں معمولی کلرک بھی نہیں ہو پاتا۔ گڑیا کی سالگرہ پر ثروت نے ایک قیمتی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اتنی قیمتی جسے میں اپنے مہینے بھر کی تنخواہ سے بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ شاہد نے وہ فارن ساڑی اسی تقریب کیلئے منگوائی تھی۔ میں اشارتاً جب اس سے کہتا کہ تم شاہد کے تحفے لینا بند کر دو تو وہ ایک بار پھر میری کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتی۔ مجھے جذباتی باتوں میں الجھا کر اپنے چہرے پر کرب و ملال کی ہلکی سی چادر تان لیتی۔ میں اس چادر کو دھیرے دھیرے ہٹاتا اور پھر ماحول پہلے ہی جیسا ہونے لگتا۔

اسی بیچ اچانک میرا ٹرانسفر ہو گیا۔ نئی جگہ ایسی ملی جہاں ثروت اور گڑیا کو فوراً نہیں بلایا جا سکتا تھا، میں اس کوشش میں لگا رہا کہ اگر کسی اچھے محلے میں کرائے پر کوئی مکان مل گیا تو ان دونوں کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔ میں کسی طرح ایک چھوٹے سے کمرے میں گزر کر رہا تھا۔ کرائے کا مکان تلاش کرتے ہوئے چھ ماہ گزر گئے۔ ثروت ہمیں خط لکھتی رہی میں اسے جواب اور منی آرڈر بھیجتا رہا۔ بعد میں اس نے اپنا خرچ بڑھا دیا اور کم از کم دو سو روپے اور طلب کرنے لگی۔ میں اپنی آمدنی کو دیکھتے ہوئے اس کی تمام خواہشیں پوری نہیں کر سکتا تھا۔ سوچا کہ خود جا کر اسے سمجھانا پڑے گا۔ ایک بار جب اس نے منی آرڈر واپس کر دیا تو مجھے بہت تکلیف پہنچی۔ اور جب گھر پہنچا تو وہ زبردستی مجھ سے طلاق چاہنے لگی۔ اس کی خواہش پوری ہوئی۔ مقدمے کے بعد گڑیا میرے حصے میں آئی —— طلاق کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی جب تقریباً چھ مہینے بعد شاہد کی دوسری بیوی کی شکل میں ثروت نے اس کی زندگی میں قدم رکھا۔

مجھے اس بات کا افسوس ضرور تھا کہ ثروت نے ان گہرائیوں میں ڈوبنے کی کوشش نہیں کی جہاں زندگی کی جائز اور صحیح خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ میں اپنی کسی الجھن میں اسے شامل نہیں کرتا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ ہر وقت سطحی خوشیوں کے بارے میں ہی سوچا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کسی جگہ میں غلط ثابت ہوا۔ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں ساری زندگی اپنی شخصیت کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹ سکا تھا جبکہ زندگی میں رنگ جمانے کے لیے ایک ہی شخص کو کئی چہروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب شاہد ہمارے گھر نہیں آتا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کلرکی سے استعفیٰ دے دیا تھا اور ایک دکان میں سیلز مین ہو گیا تھا۔ گڑیا اپنے پرانے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھر ایسا وقت آیا جب میری ننھی گڑیا ہی میرے لیے سب کچھ ہو گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے اس کی آواز آج بھی سنتا ہوں۔ اب بھی سن رہا ہوں ——

"پاپا، میرے سب کھلونے ٹوٹ گئے ہیں —— نہیں نہیں تم اداس مت ہو۔ میں ضد نہیں کروں گی۔ اب تو بڑی ہوتی جا رہی ہوں —— ممی ایک بار آ کر سکھا جاتی کہ کیسے کھانا بنایا جاتا ہے۔ کس طرح کپڑے صاف کرتے ہیں۔ لیکن نہیں —— ممی تو بہت بری ہے وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی —— شاہد انکل کے پاس بڑا بنگلہ ہے۔ سچ مچ کی موٹر بھی ہے۔ پاپا، ممی تو موٹر میں گھومتی ہو گی ——؟"

میں جان بوجھ کر اپنی آنکھیں اس طرح بند کر لیا کرتا تھا کہ وہ یہ سمجھ لے میں سو چکا ہوں۔ میرے پتھر جیسے سینے پر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے زور سے مجھے جگانے کی کوشش کرتی اور جب میں اس کے لیے جگ جاتا تو پریوں یا راجاؤں کے دیس کی کوئی کہانی سنانے لگتا:۔

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے پاس صرف ایک بیٹی تھی۔ شہزادی بچپن میں بہت عقلمند تھی۔ لوگ اسے بہت پیار کرتے تھے لیکن جب وہ بڑی ہوئی تو اس نے تمام بری عادتوں کو اپنا لیا۔ چونکہ ماں نہیں تھی اسے بھرپور پیار کون دیتا، بادشاہ کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ شہزادی کی خود بھی دیکھ بھال کرتا۔ بڑی ہو کر وہ کافی ضدی اور بد دماغ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی حرکتوں سے بادشاہ کو بدنام کرنا شروع کر دیا اور ..... "

"پاپا —! آپ کیوں روتے ہیں۔ میں ممی کو منا کر لے آؤں گی۔ وہ روٹھ گئی ہیں نا ——؟"

میں گڑیا کو تھپکیاں دینے لگتا ہوں۔ وہ اپنے آپ نہ جانے کیا کیا بول جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی باتوں پر دھیان دیئے بغیر ہامی بھر دیتا ہوں۔ وہ سو جاتی ہے میں اسے دیکھنے لگتا ہوں۔ بالکل اپنی ممی کی طرح ہے —— لیکن —— کیا یہ بھی اسی کی طرح ہو گی؟ نہیں۔ اس سے پہلے کہ ثروت کا ناپاک سایہ پڑے میں اسے —— لیکن اس ننھی سی جان کا کیا قصور —— شکل سے انسان پہچانا نہیں جا سکتا —— ثروت بھی دیکھنے میں بھولی بھالی تھی۔ ہمیشہ اس طرح پیش آتی جیسے کہ اپنا سب کچھ اس نے صرف مجھ پر ہی قربان کیا ہو۔ پیار کے تمام قیمتی جواہر وہ میری پلکوں میں سجائی رہتی تھی۔ اکثر میری آنکھوں کو چوم کر اس نے حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ جب کبھی بغور جائزہ لینے لگتا تو وہ اپنی پلکیں جھکا لیتی یا پھر میری آنکھوں کو چوم کر پلکوں کو بند ہونے پر مجبور کر دیتی۔ لیکن اسے کیا پتہ کہ ایک دریچہ ہوتا ہے تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ اس کے سامنے اپنی قسمت پر رشک کرنے

आकाशवाणी पत्रिका विक्रेता

उत्तरी क्षेत्र

मै. बालकराम सहगल, न्यूज पेपर एजेन्ट, (हाल गेट के बाहर) **अमृतसर.**

राम अभिलाष दूबे 26, महात्मा गांधी मार्ग, **इलाहाबाद 211001.**

शमा बुक स्टाल, चौक क्लाक टावर, सब्जी मंडी, **इलाहाबाद 3.**

एजुकेशनल बुक हाऊस, मुस्लिम युनिवर्सिटी मार्केट, अलीगढ़ 202001.

अनवर बुक डिपो, एम. यू. मार्केट, **अलीगढ़** (उ. प्र.)

सिंघल न्यूज एजेन्सी, अलीगढ (उ. प्र.)

रमेश सैवानीवाल, न्यूज पेपर एजेन्ट, गली चन्दुहेदा, **लोहादबाजार, भिवानी 125021.**

कमालिया बुक डिपो, तातारपुर, **भागलपुर 812002**

किताब मंजिल, तातारपुर चौक, **भाग पुर 812002**

अग्रवाल न्यूज पेपर एजेन्सी, हरिहर रोड, हरपालपुर, **छत्तरपुर 471111.**

कश्यप न्यूज पेपर एजेन्सी एण्ड नावेल स्टोर, एच- 504, मंगोलपुरी, **दिल्ली 110083.**

सैयद आबिद अनीस, दिल्ली न्यूज डिस्ट्रीब्यूटर्स, 3649 नेताजी सुभाष मार्ग, **नई दिल्ली.**

सेन्ट्रल न्यूज एजेन्सी, 4 ई/15, झन्डेवालान, **नई दिल्ली.**

गजेन्द्र कुमार, ई- 129, किदवई नगर (पूर्व), **नई दिल्ली 110023.**

नफीस बुक हाऊस, जामा मस्जिद, **देवरिया 274001**

हाजी मो. हसन एन्ड सन्स, जनरल मर्चेंट, चौक बाजार, **देवबन्द 247554.**

आर. के. अग्रवाल, राजू फैन्सी कार्नर, चौक बाजार, पो. आ. दरीवाला, **देहरादून 248140**

गालिब लाइब्रेरी, मो. बागिया, **फिरोजाबाद 283203**

अर्पित बुक स्टाल, जी. टी. रोड, गुरसहाय गंज, **फरुखाबाद** (उ. प्र.)

नावल्टी बुक सेन्टर, न्यूज पेपर एंड मैगजीन, शराफ बाजार, लश्कर, **ग्वालियर 1.**

एजूकेशन बुक सेन्टर, हथवा बाजार, हथवा, **गोपालगंज 841436** (बिहार)

एन. एच. खान, स्टूडेन्टस कार्नर, गोलघर, **गोरखपुर** (उ. प्र.)

नरेश एजेन्सीज, न्यूज पेपर एजेन्ट, गुरुद्वारा के सामने (आनन्द सिनेमा) **जोधपुर 342001**

किताबघर, न्यूज एजेन्टस, (सोजाती गेट के बाहर) **जोधपुर 342001**

द्वारकादास राठी, राठी बुक हाउस, **जोधपुर 342001**

मिस्कीन बुक डिपो, मोती डोगरी रोड, **जयपुर 302004**

शर्मा जनरल स्टोर्स, न्यूज पेपर एजेन्ट, पो. ओ. बिरोला, रेलवे स्टेशन, नवलगढ़, बाया-झुनझुन, **झुन्झनू (राजस्थान)**

राजेश मनीष एजेन्सीज, अनाजमंडी, जौहरी बाजार, **जयपुर 302003.**

रवि चन्द्र जोशी, न्यूज एन नालेज, 76, हरीगंज, **खण्डवा 450001**

संजय बुक पैलेस, पुस्तक विक्रेता एवं जनरल मर्चेन्ट, नया बस स्टैण्ड, **शाजापुर 465001**

राजू उपन्यास, पोरसा रोड, अम्बा, **जि. मुरैना 476111**

भगवान गुप्ता, पत्रकार, न्यूज पेपर एजेन्ट, हाथी गडढा मार्ग, **अम्बा-मुरैना 476111.**

मालाराम, द्वारा दुर्गा क्लाथ हाउस, निकट मोहन सिनेमा, **कुरुक्षेत्र**

एस. के. बुक स्टाल, 72/3, सुतरखाना, **कानपुर 208001**

प्रीमियर न्यूज एजेन्सी, क्लाथ टावर, जी. टी. रोड, **लुधियाना**

नुसरत पब्लिशर्स, हैदरी मार्केट, अमीनाबाद पार्क, **लखनऊ 226001.**

गोयल मैगजीन सेन्टर, निकट गांधी चौक, **मलोट (पंजाब)**

रमेश चन्द्र गोयल, न्यूज पेपर एजेन्ट, विश्वनाथ प्र. अग्रवाल मार्ग, **मिर्जापुर (उ. प्र.)**

हवादिस बुक डिपो, 59, मकबरा आबू, **मेरठ 250002.**

आफताब बुक डिपो, सब्जी बाग, **पटना 800004**

अब्दुलरजाक बुक सेलर, सब्जी बाग, **पटना 800004.**

बुक एम्पोरियम, सब्जी बाग, **पटना 800004**

जनता बुक डिपो, मेन रोड, **रांची 834001**

नानक न्यूज एजेन्सी एंड प्रापर्टी डीलर्स, रेलवे स्टेशन के सामने, **श्रीगंगानगर 335001.**

जमीर बुक डिपो, कुतुब शेर, **सहारनपुर** (उ. प्र.)

रेशमा बुक डिपो, वाहिद अख्तर अकेला, रेलवे क्वा. 48, ई. दक्षिण कालोनी, **साहिबगंज.**

अमर चन्द नाठिया, न्यूज पेपर एजेन्ट, नीम का थाना, **सिकर 332713.**

सतानी न्यूज एजेन्सी, कटरा बाजार मेहर, **सतना (म. प्र.)**

मानसिंह तवंर, बी. टी. न्यूज एजेन्सी, विलेज एंड पो. दीपावास, तहसील नीम का थाना, **जिला सिकर (राज)**

रजा इन्टरप्राइजेज, डिस्को मार्केट, कसरावली चौक, **सिवान (बिहार) 841226**

अभिनय अनिल सैनी, 64, प्रेस मार्ग, **सूरतगढ़ 335804**

रिजवी बुक डिपो, मदार दरवाजा, (पच्छिमी क्षेत्र) **ससाराम (बिहार)**

पश्चिमी क्षेत्र

रहमानी बुक एजेन्सी, 1565/ए, पुराना कुम्भरवाड, मुन्डा दरवाजा, जमालपुर, **अहमदाबाद 380001**

कलीम बुक डिपो, करनाज पुलिस स्टेशन के सामने, घास बाजार, **अहमदाबाद 1**

खुर्शीद जहॉन, 36 मो. दविस चाल राखैल रोड, **अहमदाबाद**

सरदेसाई एनड सन्स, न्यूज पेपर एजेन्ट, भाऊसिंहजी रोड, **कोल्हापुर 416002**

हनीफ बुक डिपो, मोमिनपुरा, **नागपुर 18**

सलिहा बुक ट्रेडर्स, एनड स्टेशनर्स, मो. अली रोड, मोमिनपुरा, **नागपुर 18.**

आर. पी. लिमये, न्यूज पेपर एजेन्ट, आदर्श एजेन्सी, विश्रामबाग, सांगली 416415

अतफाल बुक डिपो, 44, मो. अली रोड, **मालेगांव 423203 (नासिक)**

दक्षिणी क्षेत्र

के. उन्नीकृष्णनन, न्यूज एजेन्ट, कूर्कान्चेरी, **त्रिचुर 680007**

एस. थार्नुपिल्लै, टी. सी. 30/625/2, कैथामुक्कु, **त्रिवेन्द्रम 695024**

मेहर न्यूज एजेन्सी, न्यूज एंड एडवर्टाइजिंग एजेन्टस, (रेलवे होस्पिटल के पास), सत्यनारायनपुरम, **विजयवाडा 520011**

कमल्स बुक कारनर, 9–6–15A, मन्दिर मार्ग, **श्रीकाकुलम 532001**

एस. मुनीत्नम, न्यूज पेपर एजेन्ट, 4–2–14 कलेक्टर आफिसर रोड, ब्रिआम्सपेर, **चित्तूर 517002**

वी. एम. उतारकर बुक एंड न्यूज पेपर स्टाल, के. एस. आर. टि. सी. सेन्ट्रल बस स्टेशन, **धारवाड 580001**

के. श्रीनिवासराव, न्यूज एजेन्ट, शीषागिरी राव, डी. न. 4–3–22, नूका लामा स्ट्रीट, रामकृष्णरावपेटा, **काकीनदा 533001**

एम. विसलान्धा, बुक सेलर्स एंड न्यूज एजेन्टस, मेन रोड, **मछलीपत्तनम 531001**

श्रीवानी न्यूज एजेन्सीस 5/425, ए. उस्मान-साहेबपेट, **नेल्लूर 524002**

पूर्वी क्षेत्र

अनिल कुमार चौधरी, 32-पी-गोराचन्द बोस रोड, **कलकत्ता 700006**

स्वपन शाहा 99, प्रेम चन्द्र बोराल स्ट्रीट, **कलकत्ता 700012**

मन्टू शाहा, 1/4, प्रेमचन्द्र बोराल स्ट्रीट, **कलकत्ता 700012**

दिनकर राय "अन्जाना", जिंगलम टी. ई. पी. नो. गाले, रांगली-रागलीपेट, **दार्जिलिंग 734101**

पी. सी. जैन एन्ड कं., न्यूज एजेन्टस, **इम्फाल (मनीपुर)**

VANI

AND DOORDARSHAN PROGRAMMES

शुक्र FRI	शनि SAT	रवि SUN	सोम MON	मंगल TUE	बुध WED	बृह THU	शुक्र FRI	शनि SAT
9 30	10 31	11	12	13	14	15	16	17
13	14	15	16	17	18	19	20	21
13	14	15	16	17	18	19	20	21
10	11	12	13	14	15	16	17	18
8 29	9 30	10 31	11	12	13	14	15	16
12	13	14	15	16	17	18	19	20
10 31	11	12	13	14	15	16	17	18
7 28	8 29	9 30	10 31	11	12	13	14	15
11	12	13	14	15	16	17	18	19
9 30	10 31	11	12	13	14	15	16	17
13	14	15	16	17	18	19	20	21
11	12	13	14	15	16	17	18	19

live to Co-existence is Co-destruction – Jawaharlal Nehru

Gazetted Holidays

Republic Day	January 26
Holi	March 16
Ramnavami	April 7
Mahavir Jayanti	April 12
Good Friday	April 17
Buddha Purnima	May 13
Idul Fitr*	May 29
Idu'z Zuha* (Bakrid)	August 6
Independence Day	August 15
Muharram*	September 5
Dussehra (*Maha Ashtami*)	September 30
Dussehra (*Vijaya Dashami*)	October 2
Mahatma Gandhi's Birthday	October 2
Diwali (*Dipavali*)	October 22
Guru Nanak's Birthday	November 5
Christmas Day	December 25

* Subject to change depending on appearance of the Moon.

Restricted Holidays

New Year's Day	January 1
Guru Gobind Singh's Birthday	January 6
Makara Sankranti	January 14
Pongal	January 15
Vasant Panchami/ Sri Panchami	February 2
Guru Ravi Das Birthday	February 13
Maha Shivratri	February 26
Hazrat Ali's Birthday	March 14
Holi (*Holika Dahana*)	March 15
Chaitra Sukladi/ Ugadi/Gudi Padava/ Cheti Chand	March 30
Vaisakhi	April 14
Vishu	April 15
Jamat-ul-Vida	May 22
Rath Yatra	June 28
Raksha Bandhan	August 9
Janamashthami	August 16
Ganesh Chaturthi/ Vinayak Chaturthi	August 28
Onam	September 5
Dussehra (*Maha Navami*)	October 1
Maharshi Valmiki's Birthday	October 7
Deepavali (*South India*)	October 21
Govardhan Puja	October 23
Bhai Duj	October 24
Milad-un-Nabi or Id-e-Millad	November 5
Guru Teg Bahadur's Martyrdom Day	November 25
Guru Gobind Singh's Birthday	December 26

आकाशवाणी

AKAS

FORTNIGHTLY JOURNAL OF ALL INDIA

	रवि SUN	सोम MON	मंगल TUE	बुध WED	बृह THU	शुक्र FRI	शनि SAT	रवि SUN	सोम MON	मंगल TUE	बुध WED
जनवरी JANUARY	18	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28
फ़रवरी FEBRUARY	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8	9	10	11
मार्च MARCH	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29	9 30	10 31	11
अप्रैल APRIL	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29
मई MAY	17	18	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27
जून JUNE	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29	9 30	10
जुलाई JULY	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29
अगस्त AUGUST	16	17	18	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26
सितम्बर SEPTEMBER	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29	9 30
अक्तूबर OCTOBER	18	19	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28
नवम्बर NOVEMBER	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29	9 30	10	11
दिसम्बर DECEMBER	20	21	1 22	2 23	3 24	4 25	5 26	6 27	7 28	8 29	9 30

सह-अस्तित्व का विकल्प सह-विनाश ही हो सकता है। — जवाहरलाल नेहरू The only a

विज्ञापन दाताओं के लिए आकर्षण

विज्ञापन दरें

मूलभूत दर		आकाशवाणी (अंग्रेजी) रुपए.	आकाशवाणी (हिंदी) रुपए.	आवाज (उर्दू) रुपए.
कार्यक्रम पृष्ठ (सामान्य)				
पूर्ण पृष्ठ	(आकस्मिक)	920.00	550.00	460.00
	(अनुबंधित)	800.00	530.00	430.00
अर्ध पृष्ठ	(आकस्मिक)	460.00	275.00	230.00
	(अनुबंधित)	400.00	265.00	215.00
द्वितीय तथा तृतीय आवरण पृष्ठ (सामान्य)				
पूर्ण पृष्ठ	(आकस्मिक)	1000.00	880.00	750.00
	(अनुबंधित)	825.00	760.00	620.00
अर्ध पृष्ठ	(आकस्मिक)	500.00	440.00	380.00
	(अनुबंधित)	415.00	380.00	310.00
चतुर्थ आवरण पृष्ठ (सामान्य)				
पूर्ण पृष्ठ	(आकस्मिक)	1025.00	790.00	690.00
	(अनुबंधित)	850.00	660.00	570.00
अर्ध पृष्ठ	(आकस्मिक)	515.00	400.00	350.00
	(अनुबंधित)	430.00	330.00	290.00

आवश्यक सूचना:

(1) कम से कम 6 माह तथा एक वर्ष में 12 या उससे अधिक विज्ञापन देने पर अनुबंधित दर लागू होंगे।

(2) पठन सामग्री पृष्ठों पर विज्ञापन देने से दर मूलभूत से 25 प्रतिशत ज्यादा होगी।

(3) पठन सामग्री वाले प्रथम पृष्ठ पर विज्ञापन दर मूलभूत दर से 100 प्रतिशत ज्यादा होगी।

(4) 3 से. मी. 1 कालम से कम आकार वाले किसी भी विज्ञापन को स्वीकृत नहीं किया जाएगा।

(5) रंगीन विज्ञापन भी स्वीकार किये जाते हैं।

(6) विज्ञापन दाताओं से निवेदन है कि वे प्रकाशनार्थ आर्ट पुल, फोटोग्राफ, प्रिंटिड मैटर तथा आर्ट वर्क आदि ही भेजें।

(7) अधिक जानकारी हेतु प्रधान सम्पादक से सम्पर्क करें।

हमारी पत्रिकाओं की चंदे की दरें इस प्रकार हैं

पत्रिका	एक वर्ष	दो वर्ष
आकाशवाणी (अंग्रेजी/हिंदी पाक्षिक)	रु. 22/-	रु. 42/-
आवाज -(उर्दू पाक्षिक)	रु. 22/-	रु. 42/-

एक प्रति का मूल्य केवल एक रुपया।

अग्रिम भुगतान: नगद/डिमांड ड्राफ्ट/पोस्टल आर्डर/मनीआर्डर द्वारा।
नोट: पत्रिकाएं वी.पी. द्वारा नहीं भेजी जाएंगी।

सभी भुगतान, सहायक व्यापार व्यवस्थापक, आकाशवाणी पत्रिका समुदाय, पी. टी. आई बिल्डिंग, संसद मार्ग, नई दिल्ली-110001 के नाम पर किए जाने चाहिए।

گڑیا اس دوران سوچکی تھی۔ میں کہانی کہنے کے بعد اکثر دیر تک اس کی اچھی بُری باتوں تو سوچتا رہتا ــــ اس کہانی میں بادشاہ نے ایک سخت جرم کے الزام میں شہزادی کو شہر بدر کر دیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے گڑیا سات سال کی ہوگئی۔ لیکن اس میں ایک زبردست تبدیلی آگئی کہ وہ بالکل خاموش رہنے لگی۔ لاکھ بہلانے پر بھی کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔ ایک دن جب وہ اسکول سے واپس آئی تو میں گھر ہی میں تھا۔ اس نے کئی بار مجھ سے سر درد کی شکایت کی تھی میں نے اس روز سوچا کیوں نہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلیں جب وہ ڈاکٹر کے یہاں جانے کیلئے تیار ہوکر آئی تو اس روز بالکل ثروت کی طرح لگ رہی تھی۔ میرے دل میں نفرت کا جذبہ ابھرا، پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا ــــ رفتہ رفتہ وہ زیادہ بیمار رہنے لگی۔ جب بھی اسے دوا دینے جاتا تو اس کے چہرے کے ہزار ادیے سے ثروت کی جھلک ملتی۔ اور میں کسی طرح دوا دے کر اپنے کمرے میں آجاتا۔ نہ جانے کیوں اب گڑیا سے دور رہنے میں ہی سکون محسوس ہونے لگا تھا۔ اب وہ میرے سینے پہ سر رکھ کر سونے کو میرے کمرے میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ زیادہ بیمار رہنے لگی۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط برتنے کو کہا اور ہر وقت مجھے اس کے قریب رہنے کی ہدایت دی۔ رات کو دوائیں دیکر کبھی کبھار اسی کے پاس سوجاتا ــــ گڑیا کی خاموشی، بڑھتی گئی ــــ وہ اکثر نیند میں اپنی ماں کو پکارتی اور پھر سسکنے لگتی ــــ کئی ماہ گزر گئے ــــ یہی سلسلہ چلتا رہا ــــ میں اپنی بیٹی گڑیا کی زندگی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ لیکن ان دنوں جب اس کے چہرے کو دیکھتا تو ثروت کا کردار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور میں گڑیا سے بھی دور ہونے لگتا ــــ رات کے دو بجے اسے دوا دینی ضروری تھی۔ میں تیار بھی ہوا جب اس کے قریب پہنچا تو وہ سوئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جگا کر دوا دینے کو کہا تھا ــــ جیسے ہی اس کے چہرے کو چھونا چاہا مجھے ایسا لگا کہ اب کوئی گناہ سرزد ہونے والا ہے ــــ میری گڑیا سوئی تھی لیکن ثروت ذہن کے نہاں خانوں میں لگاتار دستک دے رہی تھی ــــ میرے ہاتھ سے دوا کی شیشی چھوٹ گئی۔ شیشے فرش پر بکھر گئے۔

صبح میں جگ گیا لیکن گڑیا نہیں جگ سکی۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ چکی تھی ــــ اسے دیکھ کر پل بھر کے لیے ایسا بھی لگا کہ آج میں نے اپنے تصور کی گڑیا کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے اور ثروت سے نجات حاصل ہوگئی ہے۔ گڑیا تو صرف دیکھنے کی چیز ہے اس پر کسے پیار نہیں آتا ــــ؟

پھر آنکھیں کھولیں۔ اب بھی اندھیرا تھا۔ جانے کب صبح ہوگی ــــ؟

(پٹنہ سے نشر)

قاسم خورشید
ایجوکیشنل ٹیلی ویژن، ایس۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، مہندرو پٹنہ

میں کہاں جاؤں

ظفر حبیب

میری بیوی جو کچھ دیر سے کرسی پر کھڑی ہو کر دیوار کے روزن سے سڑک کا تماشہ دیکھ رہی تھی اچانک ایک چیخ مار کر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ــــ وہ کئی دنوں سے بے حد الجھی الجھی اور مضمحل مضمحل سی تھی۔ رات بھر اسے سکون کی نیند نہیں آتی تھی۔ اور میں ہر وقت اس کا یہ تماشہ دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں وہ کرسی پر سے بیہوش ہوکر گر نہ پڑے۔ میں اپنی چارپائی پر سے ہڑبڑا کر اٹھا ــــ پہلا قدم اٹھانے سے قبل ہی میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا سر جو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں تھا چھوڑ دیا اور کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے سمجھا چلیے آج بھی بات آئی گئی ہوگئی ــــ اور پھر چارپائی پر دراز ہوکر وہ مضمون پڑھنے لگا جس کا عنوان تھا "دنیا میں قیام امن کا مسئلہ" مضمون ذرا طویل تھا اور میں اسی کے مطالعہ میں غرق تھا کہ اسی درمیان یہ ذرا سی مداخلت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ ذہن کی رو جو ایک ڈھنگ سے چل رہی تھی۔ ذرا سی دیر کے لئے ڈسٹرب ہوئی تھی۔ اس لئے میں خیال کے تانے بانے کو پھر سے سلجھا کر اس مضمون کی دنیا میں گم ہو جانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ لیکن بیوی کے بعد بچوں نے فکر کی رو کے درمیان رکاوٹ کھڑی کرنی شروع کر دی تھی۔ دراصل ان لوگوں نے اپنی ماں کی چیخ سنی تھی۔ سر پکڑ کر انہیں بیٹھتے دیکھا تھا اور وہ لوگ یکے بعد دیگرے ان کے ارد گرد جمع ہوکر ان پر سوالوں کی بوچھار کر رہے تھے کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟

مجھے بچوں کا یہ ڈسٹرب کرنا گراں گذر رہا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ میری بیوی اس جگہ سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ چلی جائے کہ ان کی مزاج پرسی کرنے والوں کا قافلہ ان کے ساتھ میرے سامنے سے چلا جائے اور میں نامکمل مضمون کو مکمل کر سکوں ــــ اس کے لئے میں کبھی بچوں کو ڈانٹنا چاہ رہا تھا۔ اور کبھی بیوی کو ہدایت دینا چاہ رہا تھا ــــ لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ سبھوں کو دم دلاسہ دیا جائے اور ہمت باندھ رکھنے کی تلقین کی جائے۔

میرا مکان شہر کی مشہور سڑک "دین دیال اپادھیائے روڈ" کے بالکل کنارے پر واقع ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جس کا پرانا نام جامع مسجد روڈ تھا۔ آزادی کے بیس برس بعد جامع مسجد کے یہاں واقع ہونے کے باوجود اس کا نام بدل دیا گیا تھا ــــ یہ سوال اپنی جگہ تھا کہ مسجد روڈ کا نام بدلنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اور نام کی یہ تبدیلی کس ذہنی اور تاریخی شعور کی تبدیلی کا پتہ دیتی ہے؟ اس سڑک کے دونوں کناروں پر کئی ذات، نسل اور فرقہ کے لوگ برسوں سے آباد ہیں۔ یہ سڑک اتر سے دکن کی سمت جاتی ہے جس کے پچھمی کنارے پر مسجد واقع ہے اور مسجد کے آس پاس مسجد والوں کی آبادی ہے۔ اسی آبادی میں ایک گھر میرا بھی ہے۔ نام کی تبدیلی کے چند ماہ بعد ہی سڑک کے پوربی کنارے پر کچھ سکھ گھرانے بھی آبسے تھے۔ یہاں بسنے کا یہ فیصلہ شاید اسی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ یہاں کے لوگ امن پسند ہیں اور ناموں کی تبدیلی پر یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں ہوا تھا ــــ

ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف اوقات میں بہت ساری نوعیت کے بہت سارے ہنگامے بہت بار ہو چکے تھے۔ لیکن کبھی یہ گرم اور ناموافق ہوا ہمارے دیار میں داخل نہیں ہو سکی تھی ــــ یہ بات کہ پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے لوگ ایک دوسرے سے مقابلہ کا مزاج تو رکھتے ہیں لیکن متصادم نہیں ہو سکتے۔ یہاں صحیح معلوم ہوتی تھی۔ یہ محلہ دراصل اس شہر کی "پاش کالونی" ہے یہاں رہنے بسنے والے سب کے سب لوگ کسی نہ کسی دفتر یا ادارہ میں قیمتی کرسیوں پر بیٹھنے والے لوگ ہیں یا پھر اچھے تجار ہیں ــــ یہاں کی عورتیں ساڑی کی ڈیزائنوں، ٹی وی کی سائزوں، کاروں اور اسکوٹروں کے رنگوں، عمارت کی سجاوٹ اور فرنیچر کی نادلٹی کے موضوع پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا کرتی تھیں اور اپنے اپنے شوہروں سے اسی موضوع پر بحثیں پھر دوران بحث فرمائش کرتے جانا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ بچوں کا رنگ بھی عام رنگ سے

جداگانہ تھا۔ صبح ٹیوشن کی میز، شام سڑکوں پر چہل قدمی جدید فیشن پر گفتگو، سنڈے کو پکچر اور فرصت کے دنوں میں پکنک یا سیر سپاٹا۔

یہ ہوا جو سمت غیب سے چلی اور جس نے سرور کا سارا چمن جلا دیا یہ اس محلہ والوں کے لئے عام طور پر اور میری بیوی کے لئے خاص طور پر عجیب حادثہ تھا۔ وہ مجھ سے مصر تھیں کہ کرفیو میں جیسے ہی ڈھیل دی جائے ہم لوگ یہاں سے نکل چلیں ـــــ جب کہ آج کرفیو کا چوتھا دن تھا صبح سے شام اور شام سے صبح لگاتار کرفیو ہر طرف سکوت اور گہرا سناٹا۔ دن بھی رات کی طرح بھیانک۔ بیچ بیچ میں آذان کی آواز یا پھر فائرنگ اور دھماکہ۔ یہی مختلف النوع آوازیں چار دنوں سے ہمدم و جلیس بنی ہوتی تھیں ـــــ اور انہیں آوازوں کے درمیان وقفہ میں بیوی کا یہ اصرار کہ ہم لوگ بھی محلہ چھوڑ چلیں ـــــ میں انہیں لگاتار سمجھا رہا تھا کہ یہ ہوا تمہارے خلاف تو نہیں ؛ لیکن وہ میری یہ منطق تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ ہوا ان کے خلاف نہیں ـــــ وہ ہمیشہ بس یہی کہے چلی جاتیں کہ جو ہوا ایک بار چل چکی وہ اب بار بار چل سکتی ہے۔ کبھی اس کی زد میں دوسروں کا نشیمن ہے تو کبھی اس کی زد میں ہمارا نشیمن بھی آسکتا ہے۔ میں ان سے پوچھتا کہ آخر وہ کون سی جگہ ہے کہ جہاں پہونچکر سکون پا جائیں ؟ یہ پوری دھرتی اس وقت دہشت انگیزی کی گرفت میں ہے اسباب جدا جدا سہی نوعیت یکساں ہے عصر حاضر کی زبان اسلحہ ہے، اس کی آواز دھماکہ ہے اور اس کے ساز سے ہر لمحہ اجل کا نغمہ پھوٹ رہا ہے پوری انسان آبادی اس عفریت کے دائرۂ اختیار میں داخل ہوتی چلی جارہی ہے ـــــ وہ کہتیں کہ جن لوگوں کے نشیمن آج اجاڑے جارہے ہیں۔ کل تک وہ بھی تو یہی سوچ رہے ہوں گے۔ لیکن آج کیا ان کی فکر نے دوسرا رخ اختیار نہیں کیا ہوگا ـــــ اور میں انہیں یہ سمجھانا چاہتا کہ پناہ کی جگہ اب کوئی نہیں۔ یہ معاملہ جگہ کی تبدیلی سے حل ہونے والا نہیں۔ اس کا حل ذہن کی تبدیلی ہے جو ذہن "مسجد روڈ" سے "اپادھیائے روڈ" کا سفر کرسکتا ہے وہ پھر مراجعت بھی اختیار کرسکتا ہے کیوں نہیں ان متصادم لوگوں کو "مسجد روڈ" کی پاکیزگی بتائی جائے ؛ لیکن میری اس طرح کی بات انہیں اچھی نہیں لگتی اور وہ کہتیں ـــــ آپ عمر بھر ذہن کی تبدیلی کی بات کرتے رہیں گے اور آگ کبھی ایک کے گھر اور کبھی دوسرے کے گھر میں لگائی جاتی رہیں گی۔ ان کے جواب کی سچائی کو قبول کرنے کے باوجود اپنی فکر کے انداز کو میں بدلنے میں ناکام ہو رہا تھا کہ ذہن کی تبدیلی میں سارے مسائل کا حل ہے۔ ذہن کے اندر صالحیت اور انسانی دوستی جس دن پیدا ہو جائے گی سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا ـــــ امن دراصل انسانی ضرورت ہے۔ جنگ طول نہیں پکڑ سکتی جب کہ امن کو قیام و ثبات حاصل ہو سکتا ہے ـــــ

کئی دنوں سے چلنے والی ان باتوں کا یہ ایک نیا موڑ تھا۔ ایک نئی چیخ تھی جس نے میرے گھر کے ہر فرد کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ میرے سارے چھوٹے چھوٹے بچے سہمے سہمے سے تھے اور ماں سے لگاتار پوچھ رہے تھے کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا ـــــ ؟ اور میں "دنیا میں قیام امن کا مسئلہ" پڑھنے کی کوشش میں دوسری بار لگ چکا تھا کہ یہی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے ـــــ یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اس مضمون کو ختم کرکے ماہنامہ "گاندھی مارگ" کا مطالعہ شروع کروں جس کا تازہ شمارہ سرہانے دھرا ہے جب تک یہ مضمون میں خود نہیں پڑھ لیتا۔ اس وقت تک یہ ممکن نہیں کہ امن کی اہمیت کسی کے ذہن نشیں کرا سکوں اور خود گھر کا امن جو درہم برہم ہو رہا ہے اسے معمول پر لا سکوں۔ اس لئے اخبار میں چھپا ہوا یہ مضمون میرے لئے بہت اہم تھا۔

لیکن دوسری طرف بیوی نہ اپنی جگہ سے ہٹ رہی تھی اور نہ کچھ بول رہی تھی۔ مجبور ہو کر میں اٹھا اور جا کر اسی سے پوچھا کہ آخر کیا ہوا ؟ تم نے روزن سے کیا دیکھا میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ وہ لوگ جو سامنے کے مکان میں رہتے ہیں ان کے پڑوسی ان کے گھر کی کواڑ توڑ کر اندر گھس گئے۔ ان کی چودہ سال کی بچی کو گھسیٹ کر باہر لایا اور اس کی جانگھوں کے درمیان سنگین بھونک دی گئی ـــــ مجھے لگا کہ ان ساری باتوں میں تضاد ہے ـــــ اس لئے میں نے پھر بیوی سے تفتیش کی ـــــ کہ بالوں کی درازی سے تو کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا۔ آخر وہ دونوں تو ایک ہی قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا رہن سہن ایک ہے ان کی برش ایک ہے ان کی گہری دوستی ہے اور وہ بچی تو ہمیشہ انہیں انکل کہا کرتی تھی ـــــ یہ ضرور تمہاری نگاہ کی خطا ہے ـــــ لیکن بیوی نے اپنی ساری بات دوہراتے ہوئے اپنی نگاہ پر پورے اعتماد کا اظہار کیا ـــــ پھر بھی میں نے ایک اور سوال کیا کہ سنگین تھی یا کوئی دوسرا ہتھیار ؟ اس نے دوبارا پر اعتماد انداز میں کہا کہ وہ کوئی دوسرا ہتھیار نہیں سنگین تھی ـــــ سنگین ـــــ اور انہیں لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی موجودگی کو آپ وجہ امن سمجھ رہے ہیں۔ اور جن کی وجہ سے خود کو مکمل طور پر محفوظ سمجھتے ہیں۔

دیکھتے دیکھتے کئی گاڑیاں وہاں آکر رک گئیں مختلف رنگ کی وردیوں کے لوگ گاڑیوں سے اترے۔ سامنے کے مکان میں داخل ہوئے۔ کھینچ کھینچ کر گھر سے لاشیں نکالنے اور سڑک کے کنارے جمع کرنے لگے۔ پھر پڑوس کے ان لوگوں کا جن کے بارے میں میری بیوی نے بتایا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور ان سے کچھ پوچھ گچھ شروع کروں ـــــ میں اپنی دیوار کے روزن سے یہ سارا تماشہ جو بے حد اندوہناک تھا کھڑا دیکھ رہا تھا ـــــ میں نے دیکھا کہ وہ لوگ میرے گھر کی طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں کہ اچانک میری کنڈیاں ہلائی جانے لگیں۔ میں باہر نکلا تو وردی والے سارے لوگ مجھے گھیر کر میرے دامن پر خون کے چھینٹے تلاش کرنے لگے ـــــ کچھ لوگ میرے گھر کے اندر گھس گئے۔ میں لرز گیا اور اپنا گھر خدا کے سپرد کیا۔ لیکن جلد ہی سارے لوگ خالی ہاتھ واپس آکر میرے گرد جمع ہو گئے۔

سامنے کے وہ لوگ جن کے بچوں کے ساتھ میرے بچے اسکول جایا کرتے ہیں اور جن کی بیویوں سے میری بیوی کے گہرے مراسم تھے بیک زبان وردی والوں کو خون کا دھبہ میرے دامن پر ڈھونڈنے کا اشارہ کرنے لگے ـــــ میں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں معلم پیشہ ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں اور اس وقت بھی میں محو مطالعہ تھا جب سائرن نہیں بجا تھا اور سارے لوگ پر سکون تھے۔ لیکن میری جانب اٹھنے والی انگلیاں لگاتار اٹھ رہی تھیں ـــــ میں عنقریب گرفت میں لیا جانے والا تھا۔ وردی والوں کی آواز میں کرختگی پیدا ہونے لگی تھی کہ اچانک اس بے حد خوبصورت لڑکی کی لاش میں جنبش ہوئی ـــــ وردی والوں نے اسے دیکھا۔ سہارا دے کر بٹھایا اور پانی پلایا ـــــ ابھی چند قطرے اس کے حلق کو تر کر سکے ہوں گے کہ اس کی زبان میں لرزش ہوئی۔ اور اس نے کہا کہ میرا پورا گھر ان پڑوسیوں کے ذریعہ تہہ تیغ کیا گیا ہے۔ جو اس وقت دوسری طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں ـــــ وہ بیچارے تو امن پسند لوگ ہیں اور مجھے خود سنگین والوں نے ہلاک کیا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ اور کچھ کہے میں اس بچی سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا کہ اس کے لئے اس جگہ رونے والا میرے سوا کوئی نہیں تھا ـــــ ایسا لگا جیسے یہ میری بیٹی ہے جو درندگی کا شکار ہو گئی ہے اور جسے اگر میں نے مارا نہیں تو زندگی بھی نہیں دے سکا۔ پھر اس بچی کا سر میری گود میں ڈھلک گیا اور میں سوچنے لگا کہ کیا "پاش کالونی" بھی اب محفوظ نہیں رہی۔ (پٹنہ سے نشر)

پورن سنگھ ہنر

سامری جس پہ کرے ناز وہ جادو ہم ہیں
غم عالم میں جو گرتے ہیں وہ آنسو ہم ہیں

اک ہمیں سے ہے معطر تری بزم امکاں
پُر جو خوشبو سے ہے وہ نافۂ آہو ہم ہیں

ہم سمجھتے ہیں غم اپنا ہی پرائے غم کو
دوشِ غم پر جو بکھرتے ہیں وہ گیسو ہم ہیں

ہم سے قائم ہے زمانے میں وقارِ انساں
اہلِ پنجاب ہیں ہم، ہند کا بازو ہم ہیں

گلشنِ دہر میں رنگیں ہیں بہاریں ہم سے
گلِ نرگس، گلِ سوسن، گلِ شبو ہم ہیں

ہے چلن اپنا زمانے کے لیے راہِ عمل
رام ہوتے ہیں بشر جس سے وہ جادو ہم ہیں

اہلِ عالم میں ہے جو فتنہ و شر کا باعث
خیر اندیش ہیں اُن کے بھی وہ خوش خو ہم ہیں

اے ہنرؔ غیرتِ فردوس ہے آغوشِ وطن
جس سے زینت ہو گلستاں کی وہ گل رُو ہم ہیں

(جالندھر سے نشر)

گناہ کی شہادت

خورشید عالم

وہاں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ سامنے سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ میں چونک پڑا ——— ارے! یہ تو وہی لڑکی ہے۔ یہ لڑکی کتنے دنوں سے کسی مرض کی طرح مجھ سے چپکی ہوئی ہے۔ گلی میں، بازار میں، بس اسٹینڈ پر ——— کہیں بھی اس سے نگاہیں مل جاتیں۔ مل کیا جاتیں، چھو جاتیں۔ لڑکی نگاہوں کو ملنے نہیں صرف چھونے دیتی اور چھو کر جھٹک دیتی۔ میں اس کے اس جھٹکے کو برداشت نہیں کر پاتا ہوں۔

لڑکی کے چلے جانے کے بعد دیر تک اندر ہی اندر کھولتا رہتا۔ سوچتا ——— کچھ بھی ہو، اس معاملے کو صاف کرنا ہی ہوگا۔ اب کی بار ملاقات ہوئی تو اس سے صاف صاف پوچھ لوں گا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟

پریشانی یہ نہیں کہ میں اسے چاہتا ہوں۔ یا اس کے ذریعہ چاہا جانا چاہتا ہوں۔ پریشانی صرف یہ ہے میں اصلیت کا پتہ لگانا چاہتا ہوں۔ اگر لڑکی مجھے پیار کرتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ ایسا ہے تو وہ کھلتی کیوں نہیں؟ جب لڑکی ہی نہیں کھلتی تو میں ہی کیا کر سکتا ہوں۔ آخر میں ایک ذمہ دار آدمی ہوں۔ یونہی کسی سے کیسے الجھ سکتا ہوں؟ اور مان لیں کہ یہ سب میرا وہم ہے۔ لڑکی واقعی مجھے نہیں چاہتی تو وہ صاف کنارہ کیوں نہیں کر جاتی ہے؟ بار بار جھٹکے کیوں دیتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں اس بے وقوف لڑکی کو قطعی لفٹ نہیں دوں گا۔ اب کی بار اگر وہ مجھے ملی تو میں خود ہی اسے جھٹک دوں گا

دوسرے ہی دن لڑکی پھر مجھے مل گئی۔ اس نے اپنی مخمور رنگا ہوں سے دیکھا اور میں چاہ کر بھی اسے جھٹک نہیں سکا۔ پھر لڑکی ہی مجھے جھٹک کر چلی گئی۔ یہ لڑکی کئی دنوں تک کہیں میرے اندر پھانس کی طرح اٹکی رہی۔

مجھے یہاں بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک لڑکی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا ——— آج وہ ہلکے گلابی رنگ میں ہے۔ اس رنگ میں وہ ایک دم نشیلی سی لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ ہرے سبز یا کسی اور ایسے رنگ کی ٹکیہ کھا لیتی ہے جو کہ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجھے پریشان کرنے میں اسے مزہ آتا ہے۔

لڑکی کا نیم برہنہ گلابی جسم دہک رہا ہے قدرے متناسب اور کسا ہوا جسم۔ جسم کا ایک ایک حصہ جیسے فاؤنڈری میں ڈھالا گیا ہو۔ میری نگاہیں اس کی چکنی جلد سے پھسلتی ہیں۔ جوان مؤنث خون کی بو میرے نتھنوں میں سما گئی۔ اف! ایسے جسم کے لئے میری پوری جوانی ترستی رہی ہے، لیکن آج اسے اس روپ میں پا کر میں حیران ہوں۔

سو چا بات کی جائے۔ اگر انکار کر گئی تو؟

اگر آج بھی چھوڑ دیا تو پھر کب؟

تو کروں بات؟ میں فیصلہ کر کے بھی نہیں کر سکا۔

لڑکی میرے ٹھیک سامنے جم کر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔

"تم میرا ساتھ دینا پسند کرو گے؟"

"تم ..... تم ....." میں بہک گیا "یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں! میں .....!"

"تم وہی ہو نا؟"

"ہاں! میں وہی ہوں۔ لیکن وہ نہیں نہیں ہوتی تھی۔"

"تو تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"یہی بے کار سوال میں تم سے پوچھتی ہوں ——— تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

میں ہاں نہیں کہہ سکا۔

پھر لڑکی ہی بولی "تمہاری محبت کا جو مطلب ہے وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں!"

"تم محبت کا سہارا لے کر میرا جسم پانا چاہتے ہو! چاہتے ہو نا؟"

"جب تم اچھی طرح جانتی ہو تو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔ بولو! تم میرے جسم کو پانا نہیں چاہتے؟"

"چاہتا ہوں لیکن یکطرفہ کاروائی تو نہیں ہے۔ میں کسی کے جسم کو پاتا ہوں تو ساتھ ہی ساتھ اپنا جسم بھی اسے دیتا ہوں اس آپسی لین دین میں کسی کو بھی احسان جتانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں تو تمہارے جسم کو چاہتا ہوں۔ لیکن تم .....؟"

"چاہتی میں بھی ہوں۔ لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

"شرط؟"

"ہاں!"

"بولو!"

"پانے سے پہلے میں تمہیں جاننا چاہتی ہوں۔"

"مجھے جاننا چاہتی ہو؟" مجھے ہنسی آ گئی۔ "بہت مشکل ہے۔ کسی کے بارے میں جو کچھ جان پاتے ہیں اس کے بارے میں اور کچھ جاننے کی خواہش بڑھتی ہی رہتی ہے۔ یہ جاننے کا عمل ہی تو محبت کی بنیاد ہے۔"

"پھر محبت!" لڑکی برہم ہو گئی "مجھے اس لفظ سے نفرت ہے!"

"نفرت ہے تو پھر جاننا کیا چاہتی ہو؟"

جاننا چاہتی ہوں اس شخص کو، اور تمہاری یہ محبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتی، اسے کچھ اور بنا دیتی ہے۔"

"جو ایسا کرتا ہے وہ محبت تو نہیں ہے!"

"تو محبت کیا ہے؟"

"اس شخص کے بارے میں کافی گہرائی تک جاننا!"

"تمہیں! تم جھوٹ بولتے ہو۔ محبت اور کچھ نہیں، ایک دوسرے کے جسم کو پانا۔" "ایک سہارا ہے میں کہتی ہوں، اس ڈرامے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"دو جسموں کو بغیر کسی بھومیکا کے ایمانداری کے ساتھ ایک دوسرے کو نہیں سونپا جا سکتا؟"

"کیوں نہیں؟ روز سونپا جاتا ہے۔"

"تمہیں یہ سب پسند ہے؟"

"یہ سب ..... میں کہہ نہیں سکتی!"

"تم نہیں کہہ سکتی لیکن تمہاری آنکھیں تو کہہ رہی ہیں!" لڑکی نے نگاہیں اوپر کی۔ اس کی بڑی آنکھوں میں گھٹے انگوروں کی سی ترشی تھی۔ میں نے ان آنکھوں میں چھلانگ لگا دی دھیرے دھیرے لڑکی کا چہرہ غائب ہونے لگا اور اس کی جگہ ایک اور چہرہ ابھرنے لگا، میری بیوی کا چہرہ ٹھیک ایسے ہی تو دیکھتی ہے وہ بھی۔ ان عورتوں کے پاس نہ جانے ایک جوڑی آنکھیں۔"

"کیا سوچنے لگے؟" لڑکی نے سوال کا اژدھا سامنے بڑھایا۔

میں واپس لوٹ آیا۔ "کچھ نہیں ذرا گھر کا خیال آ گیا تھا!"

"گھر ———؟" اژدھے نے پھن اٹھایا "تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں! ہے اور رہے گا!" میں نے پھن کچل دیا۔

لڑکی نے مجھے ایسا دیکھا جیسے آج پہلی بار دیکھ رہی ہو وہ بغیر کچھ کہے اٹھی اور چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے اوپر تھوک گئی ہو۔ تب تک میری آنکھیں ہی کھل گئیں۔ دیکھا میری بیوی مجھے جھنجھوڑ رہی ہے اور پوچھ رہی ہے "آپ کس سے باتیں کر رہے تھے؟"

(گورکھپور سے)

دور درشن

دہلی
چینل ۴ تصویر 62.25 MHz
بینڈ ۱ آواز 67.75 MHz

مسوری
چینل ۱۰ تصویر 210.25 MHz
بینڈ ۳ آواز 215.75 MHz

روزانہ ٹیلی کاسٹ ہونیوالے پروگرام

صبح کی خصوصی نشریات

صبح ۷-۳۰ وندے ماترم: سوپربھات
۷-۳۵ سماچار (ہندی خبریں)
۷-۴۵ دس قدم
(جسمانی چستی کے لیے رہنما پروگرام
۸-۰۰ لوک گیت
۸-۰۵ نیوز (انگریزی خبریں)

شام
۶-۰۰ افتتاحی اعلانات (سوائے اتوار)
۶-۵۵ پروگراموں کا خلاصہ اور گمشدہ افراد سے متعلق اعلانات (سوائے ہفتہ)
۷-۰۰ کرشی درشن (پیر، منگل، بدھ اور جمعہ)

نیشنل پروگرام

رات
۸-۴۰ سماچار (ہندی خبریں)
۹-۳۰ دی نیوز (انگریزی خبریں)
۱۱-۴۵ نیوز ہیڈلائنز (ہفتہ کو ۱۲-۲۰ پر)

اسکول ٹیلی کاسٹ

پیر
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ سائنس (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۱۰-۱۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

منگل
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ کیمسٹری (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

بدھ
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ حساب (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ بائیولوجی (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور شام ۴-۴۵ سائنس (ساتویں جماعت)

جمعرات
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ جغرافیہ (دسویں جماعت)
۱۰-۵۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ سائنس (چھٹی جماعت)

جمعہ
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ فزکس (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ انگریزی کا سبق (چھٹی جماعت)

یو جی سی پروگرام

دوپہر ۱۲-۴۵ اور شام ۴-۴۰
اعلیٰ تعلیمی پروگرام (روزانہ سوائے اتوار و تعطیلات)

دہلی I

اتوار
صبح
۹-۳۰ سرب سانجھی گوربانی/پربھاتی
۹-۴۵ یوگ اور سواستھ
۱۰-۰۰ اپّو اور پپّو (ہندی سیریل)
۱۰-۳۰ رامائن (ہندی سیریل)
۱۱-۱۵ دیٹ از کرکٹ (انگریزی سیریل)
۱۱-۳۰ اولڈ فاکس (انگریزی سیریل)
۱۲-۳۰ زندگی زندگی (ہندی سیریل)
۱-۳۰ علاقائی زبان کی انعام یافتہ فیچر فلم (I اتوار)
علاقائی زبان کی فیچر فلم II، III اور V
۴-۰۰ ورلڈ آف اسپورٹ
شام
۵-۴۵ اور ۷-۴۵ ہندی فیچر فلم
۷-۳۰ سنرکشن ابھوگتا کا / اندھی گلیاں
۹-۰۰ کونٹیکٹ: کوئیز (انگریزی)
۹-۵۰ فوکس: حالات حاضرہ پر انگریزی پروگرام
۱۰-۲۰ فوک لور اینڈ ٹریڈیشنل آرٹ (اتوار I)
سُنیے (اتوار II)
کوی سمیلن (اتوار III)

پیر
شام
۶-۰۰ کھیلاؤں کے لیے
۶-۱۵ بچوں کے لیے انگریزی فلم (سلسلے وار)
۶-۳۵ جان ہے جہان ہے (صحت سے متعلق)
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ ہندی ناٹک
۹-۰۰ ہندی سیریل
۹-۵۰ سچ کی پرچھائیں
I اور III
چترمالا II اور IV
شام غزل V
۱۰-۲۰ کھوج (ہندی سیریل)
۱۰-۴۵ رقص کا نیشنل پروگرام/ I، II، III، V
بیلے (IV)
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

منگل
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ کھیل کھلاڑی
۶-۳۵ ہمارے کامگار، ہمارے ادیوگ
(II اور IV)
ہمارے ادھیکار اور کرتویہ
(I، III، V)
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ یوتھ فورم I، III اور V
یووامنچ II اور IV
۸-۱۰ بزم (اردو ادبی میگزین)
۹-۰۰ بنیاد (ہندی سیریل)
۹-۵۰ جن وانی I، III
بیانڈ ٹوموارو II اور IV
۱۰-۲۰ انگریزی میں ڈاکومنٹری فلم
۱۰-۵۰ ٹیلی فلم
ٹوورڈس پروگریس/
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

بدھ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ آنگن واڑی
۶-۳۵ وکاس کی اور
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ آپ اور ہم
(ناظرین کے خطوں کے جواب)
۸-۰۰ چترہار (ہندی فلموں سے رقص و گیت)
۹-۰۰ صبح (ہندی سیریل)
۹-۵۰ رونگ آئی I، III
حالات حاضرہ پر پروگرام
پرادکشنا
اے جرنی ڈاؤن دی گنگا (اتوار II)
اے سورس ٹولائف IV
۱۰-۲۰ پورنیما: ہندی سیریل
۱۰-۴۵ پریمیر انسٹی ٹیوشنز آف انڈیا
(I، III اور V)
گریٹ ماسٹرز (II اور IV)
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعرات
شام
۶-۰۰ دیہی بچوں/ دیہی نوجوانوں کے لیے
۶-۱۵ گھریلو نسخے
۶-۳۵ قانونی صلاح
۷-۰۰ رقص
۷-۱۵ وشو درشن
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ پتریکا (ہندی ادبی میگزین)
۸-۰۰ باتوں باتوں میں
۸-۲۵ اکناکس میڈیاریزی: انگریزی سیریل
۹-۰۰ سوئم سدھا: ہندی سیریل
۹-۵۰ پرشن منچ I
کیوسٹ سائنس کوئیز II
اسپورٹس کیوز III
واٹ از دی گڈ ورڈ IV
ہیلتھ کوئیز V
۱۰-۲۰ ٹوورڈز برائٹ فیوچر/ پورٹریٹ/ ٹورسٹ اسپاٹ (انگریزی پروگرام)
۱۰-۴۵ موسیقی کا نیشنل پروگرام
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعہ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (انگریزی)
۶-۱۵ آپ کا پریوار
۶-۳۵ سگم سنگیت/ اُپ شاستریہ سنگیت
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ گیان دیپ
۸-۰۰ چترہار
۹-۰۰ ایک کہانی (ہندی سیریل)
۹-۵۰ ہندی سیریل
۱۰-۲۰ لانگ اسپورٹس ایونٹس III
اسٹیٹس آف دی یونین II اور V
سپر ٹیمپرا انسٹی ٹیوشن آف انڈیا I

ہفتہ
دوپہر
۱-۴۵ گھرباہر
۲-۱۵ یوتھ ٹائم/ یوتھ فورم
۲-۴۵ اعلان کے مطابق

(اوپر) آکاشوانی احمد آباد سے نشر
سور بھاشا کوی سمیلن میں لیلا کانت منشرا
اپنا کلام پیش کرتے ہوئے ۔

(اوپر دائیں) نئے سال کے موقع پر
آکاشوانی نجیب آباد سے نشر ایک شعری نشست کے
شرکا شعرا۔ (بائیں سے) جلیس نجیب آبادی
اثر، شمیم وارثی، ایچ این نورنگ، نشتر خانقاہی
مرغوب علی، مہیش سانکھیہ دھر اور معراج بانو ۔

(دائیں) 'تنہائی' کے زیر عنوان
آکاشوانی بمبئی سے نشر، ناٹک کے فنکار
(بائیں سے) لوکیندر شرما، کشور کپور
پشپا سکسینہ اور چندر پرکاش گپتا ۔

(نیچے) آکاشوانی لکھنؤ کی جانب سے
سیتاپور میں منعقد کوی سمیلن میں
شرکا شعرا اور مدعو سامعین ۔

(اوپر) آکاشوانی لکھنؤ کی جانب سے منعقدہ ڈاکٹر راجندر پرساد میموریل لکچر زمیں
چپکو آندولن کے نیتا سندر لال بہوگنا اور نامور ہندی ادیب امرت لال ناگر ۔
(اوپر دائیں) 'یہ آکاشوانی ہے' کے زیر عنوان آکاشوانی گنگٹوک
سے نشر نیپالی ناٹیکہ کے شرکا فنکار (دائیں سے) وانگڑی یولما
دیویکا موکتان، ایس بی سنواس اور کے ایس رنپا ہسلی ۔
(دائیں) آکاشوانی ریوا کی جانب سے منعقد سگم سنگیت کی محفل کا
ایک منظر ۔ (نیچے) آکاشوانی اودے پور کی جانب سے منعقدہ بھجن سندھیا،
پروگرام میں مادھوری شرما اور موتی لال بوہرہ وساتھی ۔

Published by the Director General, All India Radio, at the Office of the Chief Editor, Akashvani Group of Journals, PTI Building, II floor, Sansad Marg, New Delhi-110001.
Printed by the Manager, Govt. of India Photo Litho Press, Faridabad.

یکم سے ۱۵ر اپریل ۱۹۸۷ء
۱۰ر سے ۲۵ر چیترا ۱۹۰۹ شاکا

آواز

اشاعت کا ۵۲ واں سال
قیمت ایک روپیہ

آل انڈیا ریڈیو و دور درشن کے پروگرام، معلوماتی مضامین، دل چسپ افسانے و منظومات

اس بار نجیب آباد سے غزلیں

ایچ - این نورنگ

زندگی جینا پڑے گا لازمی
زہر یہ پینا پڑے گا لازمی
جسم ٹوٹا ہو کٹی باہیں مگر
بوجھ تو ڈھونا پڑے گا لازمی
فصلِ سُکھ کی چاہتے ہو تم اگر
بیج تو بونا پڑے گا لازمی
اس لیے کہ نسل اپنی بُرج ہوں
نیوٗ تو ہونا پڑے گا لازمی
چاہتے ہیں آپ کندن سی دمک
آگ میں سونا پڑے گا لازمی

مرغوب علی

کون نگر ہے کون دِشا رُت بدل گئی
وہ آنکھوں سے دور ہوا رُت بدل گئی
اپنے دیس کے جنگل میں تھا سکھ ہی سکھ
پنچھی جب پردیس گیا رت بدل گئی
میں چپ کے گہرے موسم میں جیتا تھا
جس دن سے تو مجھے ملا رت بدل گئی
چاروں اور سے صحرا امنڈا آتا تھا
ڈالی پر اک پھول کھلا رت بدل گئی
پھر آنکھوں میں سپنوں کے جگنو چمکے
پھر جیون میں رنگ اُڑا رت بدل گئی

جلیس نجیب آبادی

جانے والا میٹھے، میٹھے، درد کے رشتے چھوڑ گیا
بستر پر جگمگ جگمگ چوڑی کے ریزے چھوڑ گیا
یہ اس کی مجبوری تھی یا پاگل پن، یا خود داری
جو گھر کا اسباب برستی چھت کے نیچے چھوڑ گیا
تیز ہوا کے جھونکے اسکی نا سمجھی پر ہنستے ہیں
تنہا گھر میں دیپ جلا کر کھلے دریچے چھوڑ گیا
ریشم، گہنے، خوشبو، افشاں، مہندی، بیل، شہنائی
پردیسی جھوٹے وعدوں کے کھوٹے سکے چھوڑ گیا
حال بتانے والے فرزیں، فیل، پیادے تو ہی سنبھال
میں یہ جیتی بازی شہ دینے سے پہلے چھوڑ گیا
جانے والا سال ذرا سفاک بھی تھا مجبور بھی تھا
کچھ سہمی، سہمی امیدیں کچھ اندیشے چھوڑ گیا

نشتر خانقاہی

پھول جو کھلنے تھے مجھ میں سب قیاسی ہو گئے
اب یہاں پت جھڑ کے موسم بارہ ماسی ہو گئے
ناز تھا نام و نسب پر آج تک جن کو وہ سب
اس مہانگری میں نذرِ ناشناسی ہو گئے
رات تک تھا جن کو اپنی تازہ کاری کا گھمنڈ
صبح کا سورج جو نکلا لوگ باسی ہو گئے
اس برس پھاگن میں ایسی برف برسی ہے کہ بس
آتمائیں سُن ہوئیں چہرے کپاسی ہو گئے
گھر سے بے گھر کر گیا کتنوں کو جبرِ روزگار
سب پرانے ہم سبق پردیس واسی ہو گئے
صرف باقی رہ گیا بے لوث رشتوں کا فریب
کچھ منافق تم ہوئے کچھ ہم سیاسی ہو گئے
جنتری بدلی ہے لیکن رات دن بدلے نہیں
گو صدی کے سال گنتی میں چھیاسی ہو گئے

اشرف شمیم وارثی

دیارِ کرب میں اشکوں کے بیج بو آیا
تمام شہر میں یادوں کے بیج بو آیا
نوائے حرف میں سوچوں کے بیج بو آیا
کتابِ درد میں غزالوں کے بیج بو آیا
کہیں یہ مہر کہیں ماہ مسکرائیں گے
میں گہری جھیل میں تاروں کے بیج بو آیا
کہیں تو شاخِ بدن پر کھلیں گے پیار کے پھول
میں اس کے جسم پہ بوسوں کے بیج بو آیا
شمیمؔ شوقِ اذیت سکوں نہ پایا تو
سکوتِ بحر میں زخموں کے بیج بو آیا

معراج بانو

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
اقبال دے گئے ہیں اُپدیش کیسے پیارے
ہندو ہوں یا مسلماں عیسائی ہوں کہ سکھ ہوں
منزل ہے ایک سب کی رستے ہیں نیارے نیارے
جیون کے راستے پر مل کر قدم بڑھاؤ
بہتے ہیں جیسے مل کر گنگ و جمن کے دھارے
خدمت میں ہی چھپا ہے عظمت کا راز تو مو
آؤ مدد کو فوراً کوئی اگر پکارے
دکھ درد میں ہمیشہ لوگوں کے کام آؤ
مجبور و بے کسوں کو دیتے چلو سہارے
پیغام دو ہر اک کو امن اور شانتی کا
جس طرح دے گئے ہیں باپو کبھی ہمارے
ظلم و ستم کی ٹہنی پھلتی کبھی نہ دیکھی
کاغذ کی ناؤ "باقو" لگتی نہیں کنارے

آواز

آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام

جلد ۵۲	شمارہ ۷

یکم اپریل ۱۹۸۷ء بمطابق ۱۱ر چیتر ۱۹۰۹ شاکا

چیف ایڈیٹر ایس کے سندر — ٹیلی فون ۳۸۲۲۴۹

ادارت
سراج احمد — ۳۸۲۲۵۴
ہرمہندر سنگھ وج

اسسٹنٹ بزنس منیجر : جگدیش پرساد — ۳۸۲۳۵۱

اس شمارے میں

علاقائی تہذیبیں اور قومی وحدت — شمیم حنفی — ۳
ایکا کی ایکا کے وچ — انوار رضوی — ۵
حیدر آباد کی کہانی — مصطفےٰ شروانی ۶
عدل و انصاف سیرت نبوی کی روشنی میں — مولانا حکیم محمد زماں حسینی ۸
پسماندہ طبقے کے لیے روزگار کے مواقع — سید شمس الحق — ۹
منٹو کی شخصیت تحریروں کے آئینے میں — ذکاالدین شایاں ۱۰
آغا حشر اور اصلاح معاشرہ — ڈاکٹر حنیف نقوی ۱۱
بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا — محمد اسداللہ — ۱۳
کیا کیا گل کھلاتا ہے یہ حُسن — س۔ش۔ عالم ۱۴
مدعی سست گواہ چست — ابو نواب خاں روہوی ۱۶
انتظار — سلمیٰ جبیں — ۱۷
انو بھابی — معین شاہد — ۱۸
درد منت کش دوا نہ ہوا — حسن منصور — ۲۰
تاریک رات — محمد نظام شمیم — ۲۲
صلیب — نوید ہاشمی — ۲۳

غزلیات

انور حسین انور — ۴
ڈاکٹر مظفر حنفی — ۶
عاجز ہنگھن گھاٹی — ۷

قیمت
فی کاپی — ایک روپیہ
سالانہ — ۲۲ روپے
دو سال — ۴۲ روپے

ادائیگی بذریعہ چیک / پوسٹل آرڈر / منی آرڈر / بینک ڈرافٹ، بنام چیف ایڈیٹر آواز شمالی گروپ آف جرنلز آل انڈیا ریڈیو فلور پی ٹی آئی بلڈنگ سنسد مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

Telegram: 'LISTENER' New Delhi

(ایک سال سے کم کا چندہ قابل قبول نہیں ہوگا)

اندرون ملک ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

علاقائی تہذیبیں اور قومی وحدت

شمیم حنفی

ایک پرانی کہانی میں ایسی نگری کا بیان ملتا ہے جس کی تمام گلیاں اور محلے ایک سے تھے۔ محلوں میں آباد گھر، ان کے دیوار و در ایک جیسے۔ ایک سے بازار، ایک سے جانور۔ اس نگری کے سارے دن ایک جیسے، راتیں ایک جیسی۔ سارے تماشے ایک جیسے۔ ساری راتیں ایک جیسی۔ حد تو یہ ہے کہ سب کی صورتیں بھی ایک جیسی۔ کوئی اجنبی، چاہے جتنا سیانا ہو اس نگری میں آتا تو راستہ بھول جاتا۔ گم ہونے کے بہانے ہزاروں، بچ نکلنے کا راستہ بس ایک کہ اپنی کوئی نہ کوئی ایسی پہچان یاد رہے جو اپنے آپ کو دوسروں سے الگ کر سکے۔

اب ذرا دیکھئے، پرانی کہانیوں کے اس دیس کو۔ یہاں ایک ساتھ کتنے رنگ اور موسم اور منظر بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک ساتھ کتنی بھاشائیں بولی جاتی ہیں۔ ہر علاقے کی رسمیں الگ رواج الگ۔ لباس الگ الگ۔ کھانا پینا بھی ایک دوسرے سے مختلف۔ کہیں سردی کہیں گرمی، کہیں جفاکشی اور محنت طلبی، کہیں تن آسانی اور طبیعتوں میں نرمی۔ آدمی تو آدمی، پیڑ پودے بھی الگ الگ۔ ایک طرف کشمیر، تو دوسری طرف کنیا کماری۔ ادھر پنجاب تو ادھر بنگال اور آسام۔ کہیں پانی ہی پانی، کہیں دور دور تک سب ریگزار۔ ایک علاقہ لنڈ منڈ، تو دوسرے میں سال کے بارہ مہینے بہار ہی بہار۔

مگر اس دیس کی ہزاروں سال پرانی تہذیبی تاریخ پر نظر ڈالیے تو ایک حقیقت صاف روشن دکھائی دیتی ہے۔ اپنی کتاب قومی تہذیب کا مسئلہ میں ڈاکٹر عابد حسین نے اس حقیقت کو کثرتوں کے بیچ وحدت کو ایک باریک رشتے کا نام دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ رشتہ "ارباب قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے۔ فلسفیوں کی فکر سے زاہدوں کی ریاضت سے اور فن کاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی سادھن ہیں جن کے ذریعے اسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔"

یہاں سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ کسی قوم کی تہذیبی وحدت کا تعین بھلا کن باتوں کی بنیاد پر ہوتا ہے؟ ہمارے دیس کے سلسلے میں تو یہ سوال اور بھی اہم ہو جاتا ہے کہ یہاں ظاہری اختلافات اور رنگا رنگی کے بہت سامان بکھرے پڑے ہیں۔ نہ تمام ہندوستانیوں کا مذہب ایک، نہ زبان ایک نہ رسوم و روایات ایک نہ لباس اور غذائی عادات ایک۔ ہر علاقہ بظاہر اپنے آپ میں ایک الگ دنیا ہے اس دیس کی کئی ریاستیں اچھے بھلے ملکوں سے بھی بڑی ہیں۔ پھر بھی سب کے سب، ایک ڈور میں بندھے ہوتے ہیں۔ سب کا مقدر ایک ہے اور سب کے سب ایک مشترکہ مستقبل کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں۔ لسانی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی اور طبعی امتیازات کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود مختلف قوموں کے عقیدے اور ذہنی مسلک بھی جدا جدا ہیں۔ ان میں اشتراک اور وحدت کے آثار بھی بہت نمایاں ہیں۔ اب سے آگے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تہذیبی وحدت کا اصل الاصول ایک تو جغرافیائی وحدت ہے، دوسرے یہ کہ سب کی نسل ایک ہو اور مذہب ایک ہو۔ زبان ایک ہو اور تہذیب ایک ہو۔ بعض اہل یورپ تو اس قصے کو یہاں تک لے گئے کہ تہذیبی وحدت کے لئے پوری قوم کا سیاسی اور معاشی نظام بھی ایک ہونا چاہیئے۔

لیکن اور تو اور خود یورپ کی مختلف اقوام کے حال احوال پر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس خطہ ارض میں کئی نسلیں خلط ملط ہو گئی ہیں۔ پھر عقائد بھی ایک ہی قوم میں ایک ساتھ الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ کئی قوموں میں ایک ساتھ ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہیں، اور رسموں اور روایتوں کے اختلاف کی تو کوئی حد نہیں۔ اس کے باوجود سیاسی اور معاشی

سطح پران میں مکمل ہم آہنگی کی صورتیں پیدا ہوگئی ہیں اور اب وہ بلا تکلف اپنے آپ کو ایک قوم کہتے ہیں۔ گویا کہ مذہبی، نسلی، لسانی اور تاریخی اتحاد کے بغیر بھی تہذیبی وحدت کی تشکیل ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔

ہمارے دیش میں جس اختلاف کو باہر والے، اور بہت سے ہندوستانی بھی، سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ ہے نسلوں اور مذاہب اور زبان کا فرق۔ پرانے زمانوں میں نسل کو یقیناً ایک معیار سمجھا جا سکتا تھا مگر تاریخ کی ضرب نے کئی نسلوں کے حدود ایک دوسرے میں گڈمڈ کر دیئے جیسے جیسے انسان زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ہوتا گیا یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آتی گئی کہ اخلاقی اور ذہنی قدروں کا اشتراک ہڈی اور خون کے رشتوں سے کم مضبوط نہیں ہوتا۔

اسی طرح مذاہب کی اصل، عقائد سے زیادہ، دراصل روحانی واردات ہیں۔ اشوک کے ایک کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے کہ "جو شخص اپنے دھرم کی تعظیم کرے اور عقیدت کے جوش میں اپنے دھرم کو دوسرے دھرموں سے اونچا ثابت کرنے کے لئے، دوسرے دھرموں کی تحقیر کرے، وہ اپنے دھرموں کو نقصان پہونچاتا ہے، اصل میں جو چیز پسندیدہ ہے وہ ہے مختلف دھرموں کی ہم آہنگی۔

مذہب نام ہے دراصل ایک روحانی شعور کا —— اور یہ شعور عقائد کی رنگا رنگی کے باوجود مختلف قوموں اور نسلوں میں یکساں ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اس شعور کی دریافت کے راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں، مگر سب کا حاصل اور سب کی منزل ایک ہے۔ اسی نظر نے مذہبی تصورات کی عالم گیری اور وحدت ادیان کے تصور کو جنم دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رمز ان افراد کی سمجھ سے بالا تر ہے جو مذہب کو بھی ایک سیاسی آرگن کے طور پر استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

اسی طرح اگر یہ مان لیا جائے کہ تہذیب کی اساس اقدار کے ایک تصور پر قائم ہوتی ہے، اور تہذیب اپنے بلند ترین مفہوم میں؟ اقدار کے اس شعور کا نام ہے جس کے مطابق کوئی قوم اپنے لائحہ عمل کو ترتیب دینا چاہتی ہے تو اس میں اختلافات آپ ہی آپ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ تہذیب کا عینی تصور ہے یا اس کی مجموعی سائکی۔ اس کے مادی اظہارات اور مناسبات الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ تاہم انکی حقیقت ایک ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں موسیقی، مصوری، فن تعمیر، ادبیات، رقص اور علوم کی الگ الگ روایات۔ ان میں کس قیادت کی بوقلمونی اور کثرت دکھائی دیتی ہے؟ بھیس الگ الگ مگر بھید بھی ایک اور بھاؤ بھی ایک۔ جب ہم ہندوستانی سنگیت ہندوستانی کلا اور ہندوستانی فلسفے کی بات کرتے ہیں تو یہ تمام کثرتیں خود بخود ایک وحدت میں حل ہوتی جاتی ہیں۔

اب آیئے زبان کے مسئلے کی طرف۔ زبان تہذیبی وحدت کی ایک بہت بڑی پہچان پہلے بھی سمجھی جاتی تھی، آج بھی سمجھی جاتی ہے، مگر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مختلف معاشروں نے اس پیچیدہ چیز کو مختلف طریقوں سے سہارنے کے جتن کئے ہیں شروع شروع میں برطانوی قوم اور جرمن قوم کے افراد ایک ساتھ کئی کئی زبانیں بولتے تھے۔ دھیرے دھیرے اینگلو سیکسن لاطینی اور دوسرے عناصر کی آمیزش کا نتیجہ ان کی قومی زبانوں یعنی انگریزی اور جرمن کی صورت سامنے آیا۔ اس معاملے میں زور زبردستی سے کام لیا جاتا تو ضد پیدا ہوتی اور اختلاف کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا جاتا۔ تاریخی اور تہذیبی قوموں کے فطری عمل نے رفتہ رفتہ خود کار طریقے سے ایک مشترک زبان کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا اور آج اس کا حاصل ہمارے سامنے ہے۔ تعصبات ذرا مشکل سے ٹوٹتے ہیں اور ترجیحات کو ترک کرنا عام لوگوں کے لئے آسان نہیں ہوتا مگر اس حقیقت سے انکار بھی محال ہے کہ ہمارے دیس میں صدیوں کے میل جول نے ایک مشترک زبان پیدا کی ہے جسے جبراً عاید کئے بغیر بھی دھیرے دھیرے ملک بھر میں عام کیا جا سکتا ہے۔ رسم الخط اور قومی زبان اور علاقائی زبانوں کے تعلق سے جڑے ہوئے مسئلے جیسے جیسے حل ہوتے جائیں گے یہ مشترکہ زبان بھی مختلف علاقوں میں اپنے قدم جماتی جائے گی۔ اقلیتوں کی زبان اور ان کے انفرادی کلچر یا عقاید کی حفاظت کے ذریعے ہی وہ فضا پیدا ہو سکتی ہے جہاں کثرت اور وحدت کے مابین ضرورت کا احساس ختم ہو جائے۔

منجملہ اور اوصاف کے، ہندوستانی تہذیب کا ایک بہت بڑا اوصاف یہ بھی رہا ہے کہ اس کی تاریخ میں رواداری اور باہمی اشتراک کے عناصر ہر زمانے میں نمایاں رہے ہیں مسلمانوں کی آمد کے بعد یہاں دونوں مذاہب کے ماننے والوں میں ایسے اصحاب بھی پیدا ہوئے جنھوں نے دونوں مذاہب کے عقائد کو ملا کر ایک تیسری مسلک کی بناء ڈالی۔ بھگتی اور تصوف کی پوری روایت انہی کوششوں کا انعام ہے۔

پھر سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ الگ الگ علاقوں اور ریاستوں کی اپنی اپنی تاریخ کے باوجود ہر دیس کی ایک اجتماعی تاریخ بھی رہی ہے۔ ہر اجتماعی تاریخ نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور قوموں میں یگانگت اور یک جہتی کے جذبات اب سے آگے بھی پیدا کئے۔ آئندہ بھی انکی حفاظت کرے گی۔ مغربی سامراج کے تسلط نے قومی آزادی کی ایک مشترکہ جدوجہد کو فروغ دیا۔ ریاستیں بٹی ہوئی تھیں۔ مگر دل ایک تھے۔ چنانچہ آزادی آئی تو سب کے لئے ایک نئے مستقبل کی نوید لائی۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے مستقبل بنانے کے لئے جو راہ اختیار کی جائے۔ وہ سمتوں کے اختلاف کے باوجود اجتماعی، ذہنی، اخلاقی اور جذباتی سطح پر ایک ہی حقیقت کے عرفان سے مربوط ہو —— یہ حقیقت ہے ہندوستانیت، یعنی وہ وحدت جس نے کثرتوں کی نفی کے بجائے ان کے دماغ کو، ان کے انتشار کے بجائے ان کے اتحاد اور یک جہائی کو اپنا مقصود جانا۔ تین طرف سے اس دیس کو پربتوں نے گھیر رکھا ہے، دو طرف سمندر ہیں۔ اس طرح فطرت نے خود بخود ایک اکائی بنائی ہے۔ معاشی آزادی اور مساوات قومی وحدت کی تشکیل و تعمیر کا شاید سب سے موثر ذریعہ ہوتے ہیں، خاص طور سے ایک ایسے معاشرے میں جس پر فطرت کی طرف سے یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہو کہ وہ ایک ساتھ اپنی کثرتوں اور رنگا رنگیوں کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی تہذیب کے مشترکہ مقاصد کی بھی۔

کہانیوں کی اس نگری میں سب کچھ ایک جیسا تھا ایسے مسافر راستہ بھول جاتے تھے۔ اس دیس کی دھرتی کے ہزار رنگ ہیں، لیکن روپ ایک ہے۔ اس روپ کی تہہ میں چھپی ہوئی اجتماعی روح بھی ایک ہے۔۔ جبھی تو دور دیس کے آنے والے اجنبی بھی اس کی کثرتوں میں ایک ہی وحدت کا سراغ پاتے ہیں۔ اور راستہ بھول جاتے ہیں —— انھیں یاد رہتا ہے تو بس یہ کہ کشمیر سے کیرالا تک، پنجاب سے اڑیسہ تک، راجستھان اور گجرات سے اروناچل پردیش اور میزورم تک چھوٹی بڑی کئی دنیا سے ملی جلی بس ایک ہی دنیا ہے، جس کا ماضی بھی ایک ہے۔ حال اور مستقبل بھی ایک۔

(اردو سروس سے)

انور حسین انور

کسی کے سر سے کسی کے لہو سے نکلا تھا　　دلوں کا بغض بڑی جستجو سے نکلا تھا
ترے شعور کو جس نے کہ قتل کر ڈالا　　وہ سارا زہر تری گفتگو سے نکلا تھا
اُسی کے سایہ نے شادابیاں دیں لوگوں کو　　وہی شجر جو مصیبت کی بو سے نکلا تھا
کسی نے شاخ سے کر تو دیا جُدا لیکن　　وفا کا پھول کہاں رنگ و بو سے نکلا تھا
اکیلا گھر کا وہ چشم و چراغ تھا لیکن　　اندھیرا گھر کا اُسی کے لہو سے نکلا تھا
جناب و آپ میں وسعت تو تھی بہت انور
مگر خلوص کا مفہوم تو سے نکلا تھا

(اردو مجلس دہلی سے)

ایکاکی ایکاکے وچ

انوار رضوی

کی ایکاکے وچ روس کے عظیم فکشن نگار نکولائی گوگول کی تخلیق ہے۔ گوگول نے مختصر عمر پائی ایکا گوگول ۴۳ برس کی عمر میں سن ۱۸۵۲ عیسوی میں انتقال کر گیا اس کو زندگی نے زیادہ مہلت نہیں دی مگر اس قلیل مدت میں ہی اس نے اپنے ناول ڈرامہ اور کہانیوں سے عالمی ادب پر ایسے نقش بنائے جن کی چمک آج تک ماند نہیں ہوئی۔ گوگول کے فکشن میں اس کی طویل کہانی یا ناولٹ اوورکوٹ اور اس کہانی کے مرکزی کردار ایکاکی ایکاکے وچ کی خاص اہمیت ہے یہ کردار خاص طور پر اپنے عہد کا اہم ترین کردار ہے اور آج بھی اسی طرح بامعنی ہے اوورکوٹ روسی کلاسیکی ادب کا اہم سنگ میل ہے اوورکوٹ نے عالمی ادب پر کبھی نہ مٹنے والا نقش چھوڑا ہے۔ چے خف کا کہنا ہے کہ ہم سب گوگول کے اوورکوٹ سے نکلے ہیں۔

گوگول نے ایکاکی ایکاکے وچ کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ متاثر کرنے والا نہیں ہے۔ وہ پستہ قد اور چیچک رو ہے سر پر گنجے پن کے آثار اور چہرے پر جھریاں ہیں۔ وہ ایک سرکاری دفتر میں معمولی نقل نویس کلرک کی آسامی پر کام کرتا ہے۔ گوگول اس کو ازلی و ابدی نقل نویس کلرک کے نام سے یاد کرتا ہے۔

دفتر میں کئی ڈائریکٹر آئے اور گئے مگر ایکاکی ایکاکے وچ ایک ہی جگہ پر ایک ہی حیثیت میں گویا منجمد ہو گیا۔ یہ انقلاب روس سے پہلے زار نکولس اول کے روسی معاشرہ کا انجماد ہے جو ایکاکی ایکاکے وچ کے وجود میں مشخص ہو گیا ہے۔

ایکاکی ایکاکے وچ ایماندار، کام کا پکا اور جارحیت سے بالکل عاری شخص ہے۔ وہ اپنا کام یعنی نقل نویسی پوری دلچسپی اور دلجمعی سے کرتا ہے۔ اس کے باوجود دفتر کے ماحول یعنی دفتر میں رتی برابر اس کی عزت نہیں کی جاتی۔ افسران سرد مہری برتتے ہیں۔ دفتر کے ساتھی مذاق اڑاتے ہیں اور استہزا و حقارت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے یہاں تک کہ دفتر کے چپراسی بھی اس کو یکسر نظر انداز کرتے ہیں جیسے وہ آدمی نہ ہوا مچھر مکھی ہو گیا۔ یہ دراصل ایکاکی ایکاکے وچ کی ناکامی نہیں ہے بلکہ معاشرتی نظام کی ناکامی ہے۔ جس نظام میں ایماندار اور محنتی آدمی نشانہ حقارت و مفلسی ہے۔ اس نظام میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایکاکی ایکاکے وچ کے کردار میں جو مضحکہ انگیزی اور سٹرن ہے وہ اس عہد کے معاشرہ اور نظام کی سٹرن ہے گوگول گویا انقلاب روس کے لئے میدان تیار کر رہا تھا۔

ایکاکی ایکاکے وچ اپنے کام میں نہ صرف دلچسپی لیتا ہے بلکہ محو ہو جاتا ہے۔ نقل کرتے وقت وہ مسکراتا ہے بدبداتا ہے۔ اچھے اچھے جملوں پر خوش ہوتا ہے۔ وہ بعض کاغذات کی ایک فاضل نقل اپنے لئے بناتا ہے اور گھر پر لیجا کر شام کے وقت ان کو پھر سے پڑھتا ہے۔ یہی اس کی تفریح بھی ہے رات کو سونے سے پیشتر وہ اس خیال سے مسکرا دیتا ہے کہ دیکھیں تقدیر اس کے لئے کل کیا کاغذ نقل کے لئے بھیجتی ہے۔ قاری بے اختیار ہنس دیتا ہے۔ کیا احمق کردار ہے۔ مگر اس نخردار کا المیہ بھی تو دیکھئے جس کے لئے شاید کسی امید کا وجود ہی نہیں رہا ہے۔ زندگی میں بہتری کا ہر امکان ختم ہو چکا ہے۔ اچھا گھر، نمول، بیوی، بچے عزیز و اقارب ایسا کچھ بھی اس کی زندگی میں نہیں ہے مگر بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کے خواب دیکھنا بھی چھوڑ چکا ہے۔ یا شاید زندگی کی پستی نے خواب دیکھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہی نہ ہونے دی۔ مستقل محرومیوں اور معاشرہ کی بے حسی نے اس کو بے حس پتھر جیسا بنا دیا ہے۔

اس کا لباس ہمیشہ مسلا دسلا ہے۔ جوتا ٹوٹا ہے۔ وہ جب گلی یا بازار سے گزرتا ہے تو کہیں نہ کہیں کوڑے کرکٹ کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کے پینٹ یا کوٹ پر تنکے یا کوڑے کے ٹکڑے پڑے رہتے ہیں۔ ساتھی اس پر فقرے کستے ہیں کاغذ پر زہ پرزہ کر کے اس کے سر پر ڈالتے ہیں تو وہ احتجاج نہیں کرتا انجان بنا رہتا ہے۔ اس کو نشانہ تحقیر بنانے والے ساتھی بھی دراصل بے حس ہی ہیں۔ وہ بلندی سے عاری پست زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی بے حسی میں سفاکی بھی ہے مگر ایکاکی ایکاکے وچ سفاک نہیں ہے۔ اس نے جیسے شو کی طرح زندگی کا سارا زہر خود ہی پی لیا ہے۔ وہ کسی کا دل دکھانے کی شاید صلاحیت ہی نہیں رکھتا مگر اس کا دل پھوڑے کی طرح دکھتا ہے جس کا اس کو شعور نہیں ہے۔

یہ تمام کہانی سینٹ پیٹرس برگ یعنی آج کے ماسکو میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ موسم سرما کی آمد ہے۔ ماسکو کی سردی مشہور ہے۔ جہاں درجہ حرارت صفر سے کافی نیچے تک چلا جاتا ہے۔ سردی کی آہٹ پر ایکاکی ایکاکے وچ اپنا پرانا اوورکوٹ نکال کر دیکھتا ہے۔ کوٹ مرمت طلب ہے۔ درزی پیٹر ووچ دیکھ بھال کر اعلان کرتا ہے کہ پیوندکاری مزید نہیں ہو سکتی چونکہ کپڑا گل چکا ہے کوٹ نیا سلوانا پڑے گا۔

نیا کوٹ سلوانے کے لئے ایکاکی ایکاکے وچ کچھ دنوں آدھے پیٹ کھاتا ہے۔ کچھ تنخواہ کا بقایا جات پاجاتا ہے۔ آخر کار نیا اوورکوٹ سلوانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس کو پہن کر دفتر جاتا ہے۔ دفتر کے ساتھیوں کو نئے اوورکوٹ میں ملبوس ایکاکی ایکاکے وچ اور زیادہ مضحکہ انگیز لگتا ہے۔ وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں جس کو ایکاکی اپنی سادگی میں خیر مقدم پر محمول کرتا ہے۔

اسی شام اس کو ایک پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے پارٹی میں حسب معمول اس کو ہر آدمی نظر انداز کرتا ہے۔ آدھی رات کو جب وہ پارٹی سے فراغت حاصل کر کے اپنے مسکن کیطرف روانہ ہوتا ہے تو اس کو شہر کے نیم روشن اور سنسان علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ خوف کی لہریں اس کے جسم سے گزرتی ہیں اور آخر کار چند غنڈے چاقو کی نوک پر اس کا نیا اوورکوٹ اس سے چھین لیتے ہیں۔ اور وہ بھی ڈیوٹی کانسٹیبل سے تھوڑے ہی فاصلہ پر مگر خوف کے مارے اس کے منہ سے چوں بھی نہیں نکلتی اور وہ کڑکڑاتی سردی میں اوورکوٹ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اب ذرا تصور کیجئے یہ اوورکوٹ محض کوٹ نہیں تھا بلکہ ایکاکی ایکاکے وچ کا پہلا اور آخری خواب تھا جو شرمندہ تعبیر ہوا تھا۔ اس کے حصول کے لئے ایکاکی کئی ماہ بھوکا مرا چھوٹی سے چھوٹی تفریح کو اس نے تیاگ دیا تھا۔ آخر وہ کوٹ چھین لیا گیا۔ ایکاکی ایکاکے وچ اس جنم میں اب نیا کوٹ نہیں پا سکتا اوورکوٹ اس کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔

کوٹ چھن جانے کے بعد شروع ہوتی ہے ایکاکی جدوجہد کوٹ واپس لانے کے لیے۔ قاری جانتا ہے کہ یہ سعی لاحاصل ہے مگر ایکاکی ایکاکے وچ کے لیے یہ جہد لا بقا ہے دراصل یہ زار نکولس کے روس میں عام آدمی کے جہد لا بقا کی داستان ہے جس میں ہار یقینی ہے۔

سب سے پہلے ایکاکی ایکاکے وچ اسی وقت کچھ دوری پر تعینات پولس کانسٹیبل کے پاس اپنی فریاد لے کر جاتا ہے وقوعہ کانسٹیبل کی عین ناک کے نیچے ہوا ہے مگر وہ انجان بن جاتا ہے شاید اس ٹھگی میں اس کا بھی حصہ ہو۔ وہ مشورہ

دیتا ہے کہ دن کے وقت سارجنٹ سے ملو وہ کوٹ واپس دلا دیں گے۔ ایکا کی ایکاکے وچ سردی سے ٹھٹھرتا رنج سے نڈھال ٹھگوں کی دھمکی سے ہراساں واپس اپنے گھر پہونچتا ہے

دوسرے دن وہ اپنی فریاد لے کر پولس انسپکٹر کے دفتر جاتا ہے۔ وہ آدمی جس نے تمام عمر گوشہ عافیت کی تلاش میں نکبت و محرومی میں گزار دی۔ جو روکھا سوکھا مل گیا کھا لیا نہیں ملا تو بھوکا سو گیا آخر کار جدوجہد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تمام عمر کی غلامی اور بزدلی نے اس کی تمام طاقت اور حوصلہ کو ختم کرا دیا ہے۔ وہ ڈوبے ہوئے آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ بجھنے سے پہلے چراغ کی لو کچھ تیز ہو جاتی ہے۔ پولیس انسپکٹر کے دفتر میں وہ زندگی میں پہلی بار اپنی آواز بلند کرتا ہے اور اس کے کلرک سے صاف کہتا ہے کہ اگر اس کو انسپکٹر سے ملنے نہ دیا تو وہ آگے شکایت کرے گا۔ ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر علاوہ ناشنوائی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ نامرادانہ واپس آتا ہے۔

ایکا کی ایکاکے وچ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ فلاں اہم شخصیت سے مل کر حال کہے وہ اس کا کوٹ دلا دے گا۔ ایکا کی ایکاکے وچ سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے وہ افتاں و خیزاں فلاں اہم شخصیت کے دفتر پہونچ جاتا ہے۔ ایک طویل انتظار اور پھر اذن باریابی۔ ایکا کی ایکاکے وچ صحیح سالم تو کبھی بھی نہ تھا مگر کوٹ کے جانے نے اس کو بالکل توڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہاں تک وہ اپنی قوت کی بس آخری قسط کے ساتھ ہی پہونچا ہے۔ وہ اپنا کیس اپنی فریاد نہایت ادب و انکسار کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر یہ ملاقات عجیب ہے اہم شخصیت ڈسپلن کے نام پر جبر کو روا رکھتا ہے دونوں آمنے سامنے ہیں مگر ایک عقاب ہے اور دوسرا چڑیا ایکا کی گڑگڑاتا ہے تو اہم شخصیت دہاڑتا ہے "جانتے ہو تم کس سے بات کر رہے ہو؟ سمجھتے ہو تمہارے سامنے کون کھڑا ہے؟ میں تم ہی سے پوچھ رہا ہوں۔ سنائی دے رہا ہے تم کو؟" اس نقطے پر آ کر اہم شخصیت نے زور سے پاؤں پٹخا۔ اس کی آواز اتنی بلند ہو گئی کہ ایکا کی ایکاکے وچ دفعتاً تھر تھر کانپنے لگا اور لڑکھڑا گیا۔ اگر چپراسی اسے سہارا نہ دیتا تو وہ وہیں ڈھیر ہو جاتا بہر حال گرتا پڑتا ایکا کی ایکاکے وچ گھر پہونچا اور مر گیا۔ اس کی موت پر کوئی آنکھ تر نہیں ہوئی۔

ایکا کی ایکاکے وچ کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی مرنے کے بعد وہ بھوت بن کر سینٹ پیٹرس برگ کے سنسان علاقوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بھوت بن کر بھی کوئی خوفناک دل ہلا دینے والی حرکت نہیں کرتا۔ بس رات کے وقت سنسان راتوں میں راہ گیروں کے اوور کوٹ اتار لیتا ہے۔ ایکا کی ایکاکے وچ بھوت بن جانے سے قاری کو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ وہ کہ جو ظلم اور زیادتی کا نشانہ تمام عمر بنتا رہا۔ حقارت اور استہزا ہی جس کے حصے میں آئے آخر کار پلٹ کر وار کرتا ہے۔ یہ دبے ہوئے اور کچلے ہوئے عوام کا انقلابی روپ ہے۔ آخر کار ایک رات ایک سنسان راستے پر اسی اہم شخصیت کا اوور کوٹ چھین لیا جاتا ہے۔ اس جابر کو تھرتھراتا دیکھ کر شاید ایکا کی کی روح کو سکون آ جاتا ہے اور وہ بھوت ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتا ہے۔

ایکا کی ایکاکے وچ بظاہر ایک مضحکہ انگیز اور مزاحیہ کردار ہے مگر اس کی بنیاد دردناکی پر ہے۔ دردناکی حد سے گزر کر مضحکہ انگیزی میں بدل جاتی ہے ایکا کی ایکاکے وچ کی تمام بے تکی حرکتوں کے باوجود آپ اس سے پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ قاری کے دل کو موہ لیتا ہے اور ذہن میں ہمیشہ کے لیے مرتسم ہو جاتا ہے۔

(اردو سروس سے)

انوار رضوی
اسسٹنٹ ڈائریکٹر ترقی اردو بیورو
آر کے پورم، ویسٹ بلاک ۸، نئی دہلی ۶۶

حیدر آباد کی کہانی

تاریخ ایسا شفاف آئینہ ہے جو وقت کی دیوار پر قائم رہتا ہے صرف نقش بدلتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد کی تاریخ کے بدلتے ہوئے یہ نقوش ہمیں مہابھارت کے پانچ ہزار سال پہلے کے دور کی تصویر دکھاتے ہیں جب ایک کردار کرونا کے تاج کا درمیانی بڑا ہیرا دکن میں گولکنڈہ کے ہیرے کی کان سے برآمد کیا گیا تھا اور جو "کوہ نور" کے نام سے آج بھی ملکہ انگلستان کے تاج کی زینت ہے۔ دکن کی تاریخ کا یہ عجوبہ ہے کہ باوجود اپنی انفرادیت کے یہ شمالی ہند کی حکومتوں اور سلطنتوں کی تاریخ سے مربوط رہی ہے۔

۲۶۱ قبل مسیح میں اشوک اعظم نے شمال سے جنوب تک کی درمیانی سلطنتیں فتح کر کے کلنگ (موجودہ اڑیسہ) کو فتح کرنے کا ارادہ کیا لیکن وہاں کے راجہ نے مقابلہ کیا اور جب وہ علاقہ بھی فتح ہو گیا تو اشوک نے اپنے ایک سنگی فرمان میں لکھا ہے کہ اس علاقہ کو تسخیر کرنے میں ایک لاکھ افراد کی جانیں ضائع ہوئی تھیں ڈیڑھ لاکھ فوجی قید کئے گئے اور بے شمار طاعون اور دوسری وباؤں کا شکار ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ دکن کی سمت پیش قدمی کرنے کے ارادہ پر آئندہ کبھی جنگ نہ کرنے کے عہد نے فتح پائی اور اشوک اعظم نے یہ سمجھ لیا کہ ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے جہاں اتر دکھن میں بھانت بھانت کی بولیاں، طرح طرح کے مذہب اور قسم قسم کے تمدن ملتے ہیں اور ایکتا اور یک جہتی ہی شمال جنوب، مشرق مغرب کو جوڑ سکتی ہے

اشوک اعظم کے بعد کی تاریخیں دکن پر دو سلطنتوں اور پانچ مملکتوں کے قیام کا قرون وسطیٰ میں پتہ دیتی ہیں وجیانگر اور بہمنی سلطنتوں کے علاوہ بیجاپور کے عادل شاہی "احمد نگر" کے نظام شاہی برار کے عماد شاہی بیدر کے برید شاہی گولکنڈہ کے قطب شاہی اور پھر حیدر آباد کے آصفجاہی خاندانوں نے دکن میں حیدر آباد کو جنوبی ہند کا ایک اہم مرکز بنایا۔ قطب شاہی دور میں گولکنڈہ اور بعد

ڈاکٹر مظفر حنفی

شعر ہمارے نشتر جیسے' اپنا فن ہے مرہم رکھنا — کیا غزلوں میں ڈھول بجانا' شانے پر کیوں پرچم رکھنا
یاد کرو کیا فرمایا تھا' بابا نے مرنے سے پہلے — گھوڑے پر تکیہ مت کرنا' ہمت کو تازہ دم رکھنا
ان پیڑوں کے پھل مت کھانا جن کو تم نے ہی بویا ہو — جن پر ہوں احسان تمہارے' ان سے امیدیں کم رکھنا
دائیں ہاتھ میں نیزہ ہو تو بائیں شانے پر مشکیزہ — باہر کیسا ہی بنجر ہو' اندر سے مٹی نم رکھنا
لطف اُسی سے باتوں میں ہے، نور اسی کا راتوں میں ہے — خوشیاں چاہے جتنی بانٹوں گھر میں تھوڑا سا غم رکھنا
تخت بہت اونچا ہوتا ہے درباری بونے لگتے ہیں — تاج بہت بھاری ہوتا ہے' کام اس کا سر کو خم رکھنا

صبح و شام مظفر صاحب ملنے والے آجاتے ہیں
لیکن اپنی مرضی پر ہے محرم یا نامحرم رکھنا

(اردو سروس سے)

مصطفیٰ شروانی

میں شہر حیدر آباد میں بیرونی ممالک اور خود مغلیہ سلطنت دہلی کے سفیر مقیم رہتے تھے ۱۶۰۳ میں ایران کے "شاہ عباس" نے اپنے سفیر کو قطب شاہی دربار میں بھیجا اور یہ ۱۶۰۹ تک حیدر آباد میں مقیم رہے ۱۶۱۷ میں مغلیہ شاہنشاہ جہانگیر نے اپنے دو سفیر میر کی اور منشی بہادر کو قطب شاہی دربار بھیجے تھے اور پھر ۱۶۸۶ میں اب سے پورے ۳۰۰ سال پہلے دہلی کے مغل شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے خود دکن کا رخ کیا اور ۱۶۸۷ میں گولکنڈہ کا محاصرہ ختم ہوا اور آخری قطب شاہی تاجدار ابوالحسن قطب شاہ (جنہیں ابوالحسن تانا شاہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) مغلیہ سلطنت کے زیر نگیں آگئے۔ شہر حیدر آباد پانچویں قطب شاہی حکمراں محمد علی قطب شاہ نے ۱۵۹۱ میں قائم کیا جب قلعہ گولکنڈہ سے ۱۰ کلومیٹر دور ایک ہرے بھرے مقام کو دریائے موسیٰ کے کنارے سلطان نے دیکھا اور وہاں کے سبزہ زار کو قلعہ کے پتھریلے علاقے کے مقابلہ میں ایک نئے شہر کے لئے پسند کیا محمد علی قطب شاہ نے جدید شہر کا نام پہلے بقول ایک فرانسیسی سیاح تھرنوٹ کے "باغ نگر" رکھا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں باغ لی داغ۔ بیل موجودہ حکمراں کے دادا نے رکھی۔ یہاں بادشاہ نے خوبصورت باغ لگوائے، اس مناسبت سے اسکو باغ نگر کہا جاتا ہے۔"

لیکن شہر کے اس نام کو ہمعصر مورخین نے ایک رومانی شکل دیکر اسے "بھاگ نگر" بھی لکھا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے اس نام کو "بھاگ متی" کے نام سے موسوم کیا اور اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے۔ "محمد قلی عنفوان شباب ہی میں صرف ۱۴ برس کی عمر میں بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اس کی خاطر طغیانی رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا" حیدر آباد کے ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر وی۔ وی شاستری نے اپنے ایک مضمون میں بامیٹر کے حوالہ سے "بھاگ متی" کے قصہ کو صحیح بتایا ہے لیکن جناب پروفیسر ہارون خاں نے حاجی غلام حسین خاں کی تصنیف "ماہ نامہ" کے حوالے سے جو ماہ لقا بائی چندا کی ہدایت پر ۱۸۱۰ میں لکھی گئی بھاگ متی کے قصے کو یکسر مسترد کر دیا ہے۔ منعم خاں ہمدانی کی تصنیف "سوانح دکنی" سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر حیدر آباد کا ابتدائی نام "بھاگ نگر" ہی تھا تو قلی قطب شاہ کی والدہ کے لقب بھاگیرتی کے نام سے یہ شہر موسوم کیا گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نام "بھاگینہ نگر" میں ایک لسانی پہلو بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سنسکرت میں "بھاگیہ" قسمت کو کہتے ہیں اس طرح "بھاگینہ نگر" کے لغوی معنی قسمت والوں کا شہر بھی ہو سکتے ہیں بعد کو یہ نام تبدیل کر کے نئے شہر کو سلطان محمد قلی قطب شاہ کی ملکہ حیدر محل کے نام سے موسوم کیا گیا اور "حیدر آباد" کہلایا

محمد قلی قطب شاہ نے سب سے پہلے نئے شہر کے وسط میں ایک مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا ۱۵۹۷ میں مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا اس مسجد میں دس ہزار افراد بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں لیکن تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی محمد علی قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور مسجد ۱۶۸۷ میں اورنگ زیب کی فتح گولکنڈہ کے بعد مکمل ہوئی جب مکہ مسجد کے میناروں کی تکمیل کے متعلق شاہی معمار نے حضرت اورنگ زیب کی اجازت چاہی تو اورنگ زیب نے یہ شعر لکھ کر فائل واپس کر دی تھی۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

سلطان محمد قلی قطب شاہ پنجم نے جب گولکنڈہ سے حیدر آباد اپنا پایہ تخت منتقل کیا تو شہر کے وسط میں ٹھیک شمال، جنوب، مشرق، مغرب کی سمت چار کمانیں تعمیر کیں جن کی ۱۵۹۲ میں تکمیل ہوئی ان میں سے ایک کا نام "کمان شیر دل" (یا سحر باطل) ایک "دولت خانہ عالی ایک "نقار خانہ" اور ایک کالی کمان کے نام سے موسوم ہوئی۔ ان میں سے شمال کمان کو مچھلی کمان بھی کہا جاتا ہے۔ اسی سال چار مینار تعمیر کرایا گیا جو سو فٹ اونچی عمارت اور جس کے چار مینار ۱۸۴ فٹ بلند ہیں پرانا پل جو دریائے موسیٰ پر واقع چار تاریخی پلوں میں سے ایک ہے گولکنڈہ سے حیدر آباد آنے کا سب سے قریب راستہ ہے سلطان قلی قطب شاہ کے تعمیر کردہ اس پل کی ۲۳ کمانیں ہیں پرانا پل ۶۰۰ فٹ

طویل ۳۳ فٹ عریض اور دریا کی سطح سے ۵۴ فٹ بلند ہے

قطب شاہی دور کے بعد جب آصف جاہی دور آیا اس وقت سے حیدر آباد ایک نئی طرز زندگی اور جدید تہذیب کی آماجگاہ بن گیا۔

سرو نگر جی سو فٹ بلند ایک ٹیلے پر موسیو ریمو کا مقبرہ ہے جسے عرف عام میں "موسیٰ رام" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مقبرہ جنرل مائیکل جوشم ریمنڈ کا ہے جو فرانس میں ۲۵ ستمبر ۱۷۵۵ کو پیدا ہوا اور بیس سال کی عمر میں ۱۷۷۵ میں پانڈیچری پہنچا۔ وہاں سے ۱۷۸۰ میں موسیو ریمو میسور گیا اور ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی فوج میں بھرتی ہوا۔ پھر حیدر علی کی ۱۷۸۵ میں وفات کے بعد نظام حیدر آباد کے بھائی شہزادہ بصالت جاہ کے اسٹاف میں ریمو کا تقرر ہوا ۱۷۸۶ میں نواب نظام علی خاں آصفجاہ دوم نے شہر حیدر آباد کے وسط میں اسلحہ سازی کا ایک کارخانہ قائم کیا جو موجودہ آل سینٹ اسکول کے عقب میں واقع تھا اس علاقہ کو آج بھی توپ کا سانچہ کہا جاتا ہے۔ ۱۷۹۸ میں ایک انگریز مورخ میلکم نے لکھا کہ "اس کارخانہ میں بہت عمدہ توپیں اور فوجی اسلحہ تیار ہوتے ہیں" افواج آصفی میں نمایاں خدمات انجام دیکر جنرل ریمو کا ۲۵ مارچ ۱۷۹۸ میں انتقال ہوا اس کے مقبرہ میں ایک پتھر پر آصفجاہی پرچم اور اس کے اوپر صلیب کندہ ہے۔ آصف جاہی دور کے خاتمہ تک ہر سال جنرل ریمو کی برسی کے موقعہ پر گارڈ فوجی سلامی دیکر اپنے ایک کمانڈر کی یاد مناتے تھے۔

توپ کے سانچے سے ذرا آگے موجودہ نظام کالج کی عمارت پہلے رمبولڈ کوٹھی کہلاتی تھی جو حکومت نظام کے افسر سر ولیم رمبولڈ کی رہائش گاہ تھی۔ نظام کالج کی یہ تاریخی عمارت دیکھنے سے سترہویں صدی کے فنی تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے جس میں چاروں طرف راہداری اور درمیان میں دیوان خانہ اور اس کے دائیں بائیں رہائشی کمرے ہوا کرتے تھے۔

حیدر آباد کی قدیم عمارتیں نہ صرف اپنے اندر جاذب نظر کشش رکھتی ہیں بلکہ بعض عمارتوں کا تاریخی پس منظر روایات اور نظریات میں گم ہو گیا ہے۔ اس میں ایک عمارت نوبت پہاڑ پر قطب شاہی اور بعد کے مغلیہ دور میں نقار خانہ یا نوبت خانہ تھی جس کے متعلق بعض مورخین نے لکھا ہے۔ کہ نوبت پہاڑ سے جیسا اس تین سو فٹ بلند پہاڑ کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے پہلے نوبت نقارہ کے ذریعہ شاہی فرامین کا اعلان کیا جاتا ہوگا۔

لیکن حیدر آباد کی تقریباً چار سو سال کی تاریخ کا درخشاں اور تابندہ پہلو یہاں کی باہمی یکجہتی یلانگ اور رواداری اور آپسی میل جول کے وہ انمٹ نقوش ہیں جو ہمیشہ تاریخ دکن کے طالب علم کو متاثر کرتے رہیں گے۔

(حیدر آباد سے نشر)

واپسی

عاجز ہنگن گھاٹی

زندگی کی ایک پھیکی شام کو
بعد برسوں کے ملا بچپن کا دوست
اپنے لمحوں کی اداسی کاٹ کر
ہو لیا میں اس کے ساتھ
اس کی باتیں لے گئیں ماضی کے دھندلے غار میں
اور پھر ایسا ہوا
غیر ارادی طور پر
وہ بھی تنہا ہو گیا
کیوں کہ میری واپسی ممکن نہ تھی

(ناگپور سے)

عدل وانصاف

سیرت نبوی کی روشنی میں

مولانا حکیم محمد زماں حسینی

پیغمبر عدل وانصاف ہے۔ آپ بڑے عادل اور منصف تھے ناانصافی اور ظلم کی پرچھائیں سے بھی آپ کوسوں دور تھے۔ قرآن، جو آپ پر اترا تھا، تاکہ اس کی باتیں آپ تمام لوگوں کو سنائیں اور ان کی حقیقتیں سمجھا کر لوگوں کو سیدھی راہ پر لگائیں، اس کی بھی یہی ہدایت تھی جسے آپ ہی کی زبانی لوگوں نے سنیں: "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" انسانو! عدل وانصاف کرو، حقیقی پرہیزگاری یہی ہے۔ آپ ہی کی معرفت قرآن کریم کے یہ الفاظ بھی کانوں میں پڑے "اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ" اے لوگو! خدا تم سبھوں کو عدل وانصاف کی ہدایت فرماتے ہیں ——— اوروں کو عدل وانصاف کی دعوت دینے والا، بھلا خود کو اس خوبی سے کیونکر دور رکھتا، ——— آپ کی ذات والا صفات تو اس خوبی سے اور خوبیوں کی طرح خوب خوب آراستہ تھی۔ تاکہ اوروں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکے اور خداوند کریم کے اس فرمان کی لوگ تصدیق کر سکیں "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" لوگو! رسول اللہ کی زندگی میں تم لوگوں کی رہبری کے لئے عمدہ اور پورا نمونہ موجود ہے۔

اس موقع پر ضروری سمجھتا ہوں کہ لفظ 'عدل وانصاف' کا مطلب واضح کرتا چلوں تاکہ اس کی صراحت ہو جائے کہ مذہب اسلام میں عدل وانصاف کیا چیز ہے؟

علامہ راغب اصفہانی نے اپنی کتاب "المفردات فی غریب القرآن" میں یوں لکھا ہے "فَالْعَدْلُ هُوَ التَّقْسِيْطُ عَلٰى سَوَاءٍ" ——— برابر حقدار کا حق بانٹ دینا اور اس تک پہونچا دینا عدل ہے۔ یعنی حقدار کا حق مارنا ظلم ہے اور حق ادا کرنا عدل وانصاف ہے۔ یہ کام مذہب اسلام میں اس قدر ضروری اور دور رس ہے کہ آسمان وزمین کا وجود اور نظام عالم کی ہستی وبقا اسی عدل وانصاف پر موقوف ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنا اور ظلم وستم روا رکھنا کائنات عالم کو زیر وزبر کر دینے کے ہم معنی ہے۔ یعنی دنیا تہ وبالا ہو جائے گی۔ چنانچہ رسول کریم کا فرمان ہے "بِالْعَدْلِ قَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" ——— "عدل ہی سے آسمان وزمین کا وجود برپا ہے۔

اس موقع پر رسول کریم کی پاک زندگی کے دو واقعے سناتا ہوں، جن سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو قیام عدل وانصاف کی کیسی فکر دامن گیر رہتی تھی، ملاحظہ ہو۔

ایک دفعہ آپ کی مجلس پاک میں بڑے، بڑے رتبے والے صحابہ کے ساتھ ایک تیرہ سال سے کم عمر بچہ بھی شریک تھا رشتے میں یہ آپ کے چچا حضرت عباس رضؓ کے صاحبزادے اور آپ کے چچیرے بھائی عبداللہ بن عباس رضؓ ہیں مگر لوگوں کے بیٹھنے کی ترتیب ایسی بن گئی تھی کہ یہ رسول کریم کی داہنی طرف ہیں۔ اور آنحضرت کے بائیں سمت حضرت صدیق اکبر، جو اپنی جلالت شان اور علو مرتبہ میں حضرت عبداللہ کے مقابلہ میں بدرجہا بلند تھے۔ اور دوسرے صحابہ کرام اسی ترتیب سے حلقۂ ارادت میں شریک تھے اس مجلس میں دودھ کا ایک پیالہ رسول کریم کی خدمت میں پیش کیا گیا جسے آپ نے کچھ پیا اور بچا ہوا لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہا بہت پہلے سے رسول کریم ہی کی یہ تعلیم رائج تھی کہ چیزوں کی تقسیم کا آغاز داہنے سے کیا جایا کرے۔ اس تعلیم کا تقاضا یہ تھا کہ یہ پیالہ پہلے چھوٹے بچے کے منہ لگے پھر اوروں کا مقدر ——— چنانچہ رسول کریم نے عبداللہ بن عباس کے حق کی رعایت کی جو تقاضائے عدل تھا۔ اور حضرت عبداللہ سے دریافت کیا "تم اجازت دو تو صدیق اکبر کو پہلے دے دوں، جو تم سے بڑے ہیں" حضرت عبداللہ نے کہا کہ "نہیں!" میں اپنا یہ حق استعمال کروں گا تاکہ آپ کا جھوٹا مجھے میسر آجائے" چنانچہ رسول کریم نے پیالہ بچے کو دے دیا اور اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کی، بلکہ "عدل" کو برقرار رکھا۔

دوسرا واقعہ بے حد سبق آموز ہے ——— مدینہ طیبہ میں ایک معزز خاندان کی ایک معزز خاتون تھیں فاطمہ نام کی شومئی بخت کہ ایک چوری کی واردات میں ماخوذ ہو گئیں اور سزا میں ان کا داہنا گٹہ کاٹنا طے ہو گیا کہ چوری کی اسلام میں یہی سزا ہے۔ خاتون کے گھر والے بہت فکرمند ہوئے کہ "فاطمہ" عورت ذات ہے، اس کی بڑی بدنامی ہوگی اور عمر بھر کی بے آبروئی الگ رہی۔ اس فکرمندی میں سارا خاندان مبتلا سوچنے سوچتے اس خیال پر پہونچا کہ مسئلے کا یہ حل ہے کہ رسول کریم کی خدمت میں کوئی موثر سفارش پہونچانی چاہیئے بارے کامیابی ہو، ——— یہ سفارش کس سے کرائی جائے؟ ایسے کسی شخص کو بیچ میں ڈالو جو رسول کریم کا چہیتا اور منظور نظر ہو ——— خاندان والوں کی نظر انتخاب، محبوب رسول حضرت اسامہ بن زید پر گئی جو رسول خدا کو حسن وحسین کے درجے میں عزیز تھے۔ چنانچہ اس نوخیز سادہ دل اسامہؓ کو سفارش کرنے پر آمادہ کرنے میں یہ لوگ کامیاب ہو گئے اور انھوں نے آنحضرت کی خدمت میں زبان سفارش کھول دی بس رسول خدا کے چہرے پر غصے کی سرخی نمودار ہو گئی۔ اور ناراض ہو کر فرمایا کہ "حدود الٰہی جاری کرنے میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے مجھ تک سفارش پہنچائی جاتی ہے؟ لوگو! آگاہ ہو جاؤ اس فاطمہ کی بجائے میری سگی بیٹی فاطمہ بنت محمد نے بھی سرقہ اور چوری کا ارتکاب کیا ہوتا تو میں اس کا بھی ہاتھ قلم کر دیتا اور کوئی رعایت نہ کرتا۔ چنانچہ سزا نافذ کر دی گئی۔

یہ دو مثالیں نمونہ کی ہیں انہیں سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت عدل وانصاف کا کتنا پاس ولحاظ رکھا کرتے تھے تاکہ دنیا کو گہوارۂ ظلم بننے سے روکا جا سکے ورنہ پورا نظام عالم تہ وبالا ہو جائے گا۔ فصلی اللہ علیہ وسلم۔

(کلکتہ سے نشر)

پسماندہ طبقے کے لیے روزگار کے مواقع

سید شمس الحق

اگر ملک کے سامنے بہت سے مسائل درپیش ہیں ان میں سے بے روزگاری کا مسئلہ یقیناً بہت اہم مسئلہ ہے۔ نوکری حاصل کرنے کے لئے لوگ دفتروں کی خاک چھان رہے ہیں ویسے تو سبھی طبقے کے لئے ہی یہ ایک پریشانی کا باعث ہے مگر خاص طور سے سماج کے پسماندہ طبقے کے لئے یہ اور بھی اہم ہے۔ نوکری حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے امیدوار کو روزگار دفتر میں اپنا نام لکھانا پڑتا ہے۔ اس غرض سے دیوریا روزگار دفتر میں نومبر ۱۹۸۶ء کے آخر تک اڑتیس ہزار آٹھ سو چوراسوے لوگ اپنا نام لکھائے ہوئے تھے۔ پسماندہ طبقے میں انوسوچت ذات، انوسوچت جن ذات، پچھڑی ذات، معذور افراد اور عورتیں وغیرہ شامل ہیں۔

ملک کے روزگار دفتروں کے ذریعے اس طبقے کی بے روزگاری دور کرنے کے لئے کئی اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں۔ روزگار دفتروں میں قائم شدہ ویکشنل گائڈنس پروگرام چلایا جا رہا ہے اس اسکیم کا خاص مقصد روزگار سے متعلق مواقع کی جانکاری فراہم کرانا اور خاص طور سے سماج کے پسماندہ لوگوں کو موجودہ روزگار کے مواقع بتلانا مختلف مقابلے کے امتحانوں جیسے پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ اے۔ ایس، بینکنگ سروس، ریلوے سروس، اسٹاف سلیکشن کمیشن، فارسٹ سروس، انکم ٹیکس، کسٹم، اکسائز ڈفنس، ٹیلیکمیونیکیشن وغیرہ امتحانات کی تفصیلات بتلانا ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں امیدواروں کی لیاقت کے مطابق نوکریوں اور وظائف کی اطلاع دینا۔ اس کے علاوہ اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کے سلسلے میں سرکار کی موجودہ اسکیموں کی جانکاری بھی بے روزگار نوجوانوں کو کرائی جاتی ہے۔

روزگار دفتروں میں یہ اسکیم گذشتہ کئی سالوں سے ہے اور ہر دفتر میں اس کے لئے ایک ویکیشنل گائڈنس افسر مقرر ہیں۔ پہلے ہی دن جب ملازمت کے لئے خواہش مند امیدوار روزگار دفتر میں آتے ہیں تو وہاں ان کا رجسٹریشن کرایا جاتا ہے۔ اس وقت عام تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ ہی ساتھ سماج کے کمزور طبقے کے لوگوں کو خصوصی طور پر ان کی تعلیم اور تجربے کے مطابق انھیں روزگار کے مواقع اور مختلف ٹریننگ اسکیموں کے متعلق بتلایا جاتا ہے موزوں روزگار پانے کے سلسلے میں اگر کسی کے کچھ ذاتی مسائل ہیں تو اس کے متعلق ذاتی مشورے دیئے جاتے ہیں، اس کے علاوہ ان مخصوص علاقوں میں جہاں شڈیولڈ کاسٹ اور شڈیولڈ ٹرائبس طبقہ کے لوگ رہتے ہیں وہاں امپلائمنٹ افسر خود جاکر ان کا رجسٹریشن کراتے ہیں اور انھیں معقول مشورے دیتے ہیں۔ اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کے بابت بھی انھیں بتلایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں محکمہ روزگار دفتر دیوریا کے ذریعہ مختلف مقاموں پر خود جاکر کام کیا بھی گیا ہے محکمہ کی موجودہ پالیسی کے تحت تحصیل ہیڈکوارٹر پر بھی خود جاکر اس قسم کی سہولتیں دی جا رہی ہیں۔

ہمارے محکمہ کے ذریعے شڈیولڈ کاسٹ، شڈیولڈ ٹرائبس اور سماجی اور زرعی طور پر پچھڑے طبقے کے امیدواروں کو روزگار دلانے کا اور بھی منصوبہ ہے ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو درجہ تین کی کلرکی اور دیگر خالی جگہوں میں جلد سے جلد نوکری میں لگانے کے مواقع بڑھانے کی غرض سے ہندی شارٹ ہینڈ اور ٹائپ کی ٹریننگ جنرل انگریزی، جنرل ہندی، حساب، سکریٹریل پریکٹس، ٹوٹنگ ڈرافٹنگ کی ٹریننگ کے ذریعہ روزگار فراہم کرنے کے لئے "کوچنگ کم گائڈنس سنٹر فار شڈیولڈ کاسٹ شڈیولڈ ٹرائبس اینڈ بیک ورڈ کلاسیز" بھی کھولے گئے ہیں جہاں چھ ماہ کی ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ یہ سیشن جولائی اور جنوری سے ہر سال شروع ہوتا ہے۔ دیوریا میں اس طرح کے تین سنٹر ایک دیوریا خاص، ایک پڈرونہ اور ایک ہاٹا تحصیل میں چلایا جا رہا ہے۔ ضلع کے تحصیل ہیڈکوارٹر پر ہر ماہ میں کمزور طبقے کے لوگوں کا رجسٹریشن بھی کیا جاتا ہے اور انھیں ملازمت اور اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے معقول مشورے بھی دیئے جاتے ہیں

روزگار دفتروں کے ذریعہ اپنا کاروبار لگانے کے سلسلے میں مدد کی جاتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ آج کل ہمارے سامنے بے کاری کا مسئلہ ایک بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔ چونکہ تنخواہ والی ملازمت سبھی لوگوں کو مل پانا ایک مشکل بات ہے اور اس بات کی گنجائش بھی بہت کم ہے لہذا چھوٹے چھوٹے کل کارخانے لگا کر اور اپنا چھوٹا موٹا کام شروع کرکے اس مسئلے کو بہت کچھ حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے روزگار دفتروں کے ذریعہ اپنا کاروبار لگانے کے لئے مدد دی جاتی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ آج کل ہمارے سامنے بیکاری کا مسئلہ ایک بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔ چونکہ تنخواہ والی ملازمت سبھی لوگوں کو مل پانا ایک مشکل بات ہے اور اس بات کی گنجائش بھی بہت کم ہے لہذا چھوٹے چھوٹے کل کارخانے لگا کر اور اپنا چھوٹا موٹا کام شروع کرکے اس مسئلے کو بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے روزگار دفتروں کے ذریعہ اپنا کاروبار لگانے کے لئے اسکیم چننے اور زرعی مسئلے کو حل کرنے کے بابت تمام باتوں کی جانکاری کرائی جاتی ہے کچھ متعلقہ ایجنٹوں کو قرض لینے کے خواہش مند امیدواروں کی درخواستیں بھجوا کر قرض دلانے کے لئے ان سے برابر رابطہ بھی قائم کیا جاتا ہے اور اور اس سلسلے میں امیدواروں کو سہولت پہونچائی جاتی ہے اس طرح کی سہولت "اتر پردیش وتت نگم" "اتر پردیش راجیہ آدیوگک وکاس نگم" "کھادی گرام ادیوگ بورڈ" "اتر پردیش لگھو آدیوگک نگم" وغیرہ کے ذریعہ مالی امداد دی جاتی ہے۔ "انوسوچت جات وت ابوم وکاس نگم" کے ذریعہ شڈیولڈ کاسٹ اور شڈیولڈ ٹرائبس کے امیدواروں کو چھوٹے چھوٹے کاروبار لگانے کے لئے مخصوص رعایتیں دی جاتی ہیں مشینری اور کچے مال کی خرید اور آسان قسطوں پر قرض کی ادائیگی کا بھی انتظام ہوتا ہے۔

مرکزی اور یوپی سرکار نے ایسے طبقہ کے لئے سرکاری نوکریوں میں عمر میں چھوٹ اور ترجیح بھی دیا ہے۔ مرکزی حکومت کے مطابق شڈیولڈ کاسٹ امیدواروں کے لئے ۱۵ فی صد اور شڈیولڈ ٹرائبس کے لئے ۷½ فیصد ہے ریاستی سرکار میں شڈیولڈ کاسٹ کے لئے ۱۸ فیصد اور شڈیولڈ ٹرائبس کے لئے ۲ فیصد ہے۔ ریاستی سرکار میں

(آگے ص ۱۶ پر)

منٹو کی شخصیت

تحریروں کے آئینے میں

ذکاء الدین شایان

کی کہانیوں اور اس کی تحریروں میں ہم ایک ایسے

منٹو شخص سے متعارف ہوتے ہیں جو بلا کا ذہین بیباک اور حقیقت کے باریک اور پوشیدہ گوشوں کا تماشا دکھانے والا ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۵۵ء میں وفات پا گیا۔ اپنی تینتالیس سالہ زندگی اس نے امرتسر، علی گڈھ، پونا، بمبئی، لاہور اور دہلی میں گذاری۔ منٹو کے افسانوں اور خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو شروع ہی سے مردوں کے مقابل عورتوں کی نفسیات اور ان کی ذہنی اور جنسی آلودگیوں کے مطالعے اور مشاہدے کا شوق رہا تھا۔ چیخوف، موپاساں وغیرہ کے تراجم نے منٹو کے اندر شاید جنس سے متعلق جزویات نگاری کا ذوق بیدار کر دیا تھا۔ طوائفوں دلالوں اور مذہب، سیاست اور سماج کے ٹھیکیداروں کے گرد پھیلے ہوئے شہری معاشرے میں منٹو کو اپنی کہانیوں کا بہت سامان ملا۔ چنانچہ سامنے کی مصنوعی اور مکروہ زندگی کا پردہ چاک کرنے کی غرض سے منٹو نے نشتر آمیز طنزیہ اسلوب بھی اپنایا جو اس کی بہت سی کہانیوں میں جھلکتا ہے۔ تقسیم ہند کے المیے اور فرقہ وارانہ فسادات کی فضا نے منٹو کو انسانیت کے ایسے دکھ درد میں شریک رکھا جو انسان کو صرف اکائی میں دیکھتا ہے اور جسے اس کے مذہب اور ذات برادری سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کے زیر اثر منٹو کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔

بمبئی کے قیام میں منٹو نے اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو بہت سے خط لکھے۔ ان سے منٹو کی شخصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اور اس کے مزاج میں عورت اور جنس کا کیا تصور تھا، اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک خط کا اقتباس ہے۔

"پتی ورتا استریوں اور نیک دل بیویوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اب ایسی داستانیں فضول ہیں۔ کیوں نہ ایسی عورت کا دل کھول کر بتایا جائے جو اپنے پتی کی آغوش سے نکل کر کسی دوسرے مرد کی بغل گرما رہی ہو۔"

ایک خط میں لکھا ہے۔

"میں عشق و محبت کے بارے میں سوچتا ہوں تو صرف شہوانیت ہی نظر آتی ہے۔ عورت کو شہوانیت سے الگ کر کے دیکھتا ہوں تو وہ پتھر کی ایک مورتی رہ جاتی ہے۔ مگر یہ بات ٹھیک نہیں۔ میں جانتا ہوں۔ نہیں میں جاننا چاہتا ہوں کہ پھر آخر کیا ہے؟ کیا ہونا چاہیئے۔ اگر یہ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟"

منٹو نے بمبئی، لاہور اور دہلی میں بسنے اور پیشہ کرنے والی عورتوں کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اسی کے ساتھ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے متوسط طبقے کی ان عورتوں کی تصویر کشی اسے بے حد مرغوب تھی جو نفسیاتی، ذہنی یا جنسی پیچیدگیوں کی اسیر تھیں۔ افسانہ بابو گوپی ناتھ میں منٹو خود بھی ایک کردار ہے۔ اس میں ایک کردار کہتا ہے۔

"زینت بہت اچھی عورت ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بے حد شریف ہے۔ ایسی عورتوں سے جو بیویوں جیسی لگیں مجھ کوئی دلچسپی نہیں۔"

لیکن منٹو کی شخصیت کا دوسرا رخ جو سماجی، سیاسی اور مذہبی طنز سے وابستہ ہے بہت نوکیلا اور اہم ہے اسی زاویے پر منٹو کا فن مکمل ہوتا ہے۔ وہ انسان اور انسانیت کو وحدت کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس کی خباثتوں سے متنفر نہیں۔ سماجی ناانصافیوں سیاسی اور مذہبی ہندشوں کی ظاہری شعبدہ بازیوں پر وہ رہ رہ کر اپنے تیر چلاتا ہے۔ فسادات اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو برداشت نہیں کر پاتا۔ رنگ و نسل اور گورے اور کالے کی تفریق سے نالاں ہے۔ وہ ان سب کی تصویریں دکھا کر ہمارے احساس کو جگاتا ہے۔ اپنی کہانی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں منٹو نے تقسیم ہند کے بعد مہاجرین کے تبادلے کو پاگل پن کی علامت کے ذریعہ "پاگلوں کے تبادلے" سے مثال دی ہے۔ جو اس کی شخصیت کا واضح نمونہ ہے۔

"بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیئے۔ یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں پاکستان پہونچا دیا جائے اور جو ہندو و سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔"

منٹو نظام حکومت اور مذاہب کی ہم آہنگی پر اس طرح طنز کرتا ہے۔ "بابو گوپی ناتھ" میں ایک ہندو کردار کہتا ہے۔

"مجھ سے اس نے کہا، منٹو صاحب وہ خوبصورت جوان اور بڑا لائق آدمی ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے داتا گنج بخش کے حضور چادر چڑھا کر دعا مانگی تھی جو قبول ہوئی۔ بھگوان کرے دونوں خوش رہیں۔"

——— کالی شلوار" کی ہیروئین سلطانہ سوچتی ہے۔

"اس نے یہ بھی سوچا کہ اتنے بڑے شہر میں جہاں لاٹ صاحب رہتے ہیں، اس کا دھندا اور بھی اچھا چلے گا۔ اپنی سہیلیوں سے وہ دلی کی تعریف سن چکی تھی، پھر وہاں نظام الدین اولیاء کی خانقاہ تھی جس کے لئے اس کے دل میں عقیدت تھی۔"

بے انتہا شراب نوشی، بمبئی میں فلمی دنیا کے بکھیڑے عسرت کی زندگی، اپنی کہانیوں کا مسودہ لئے ہوئے ناشروں کے پاس مارے مارے پھرنا، ریڈیو کی مصروفیت، اور پھر اپنی خوددارانہ وضع کو قائم رکھنے کے لئے ضبط و خاموشی ان سب باتوں نے منٹو کی شخصیت میں اس کے ادبی اور فنی کمالات کو مزید مستحکم کر دیا تھا۔

احمد ندیم قاسمی کو ایک خط میں منٹو لکھتا ہے۔

"میری زندگی ایک دیوار ہے، جس کا پلستر میں ناخنوں سے کھرچتا رہتا ہوں۔ کبھی چاہتا ہوں کہ اس کی تمام اینٹیں پراگندہ کر دوں۔ کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ اس ملبے کے ڈھیر پر ایک نئی عمارت کھڑی کر دوں اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ دماغ ہر وقت کام کرنے کے باعث تپتا رہتا ہے"

منٹو کی شخصیت کے یہ عناصر اس کے ادب کو وہ گہرائی اور بلندی عطا کرتے ہیں جن کے مقابل اس کے افسانوں کی عریانی اور جنس زدگی کو گوارا کر لینا چاہیئے۔

(رامپور سے نشر)

قلم کار حضرات!
اپنی تخلیقات ہمیں اشاعت کے لیے ارسال نہ کریں۔
"آواز" میں صرف وہی تخلیقات شائع کی جاتی ہیں جو نشریہ کے بعد ہمیں ریڈیو اسٹیشنوں سے موصول ہوتی ہیں۔

آغا حشر اور اصلاحِ معاشرہ

ڈاکٹر حنیف نقوی

آغا حشر آج سے ٹھیک ایک سو سات برس پہلے ۳ اور ۴ اپریل ۱۸۷۹ء کی درمیانی شب میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۷ء میں جبکہ ان کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی، ان کا پہلا ڈرامہ "آفتاب محبت" جواہر اکسیر پریس بنارس میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس ڈرامے کی اشاعت ایک ایسے ادبی سفر کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی جو کامیابی و مرفہ حالی اور شہرت و ناموری کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے کے بعد ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو سرزمین لاہور پر ختم ہوا۔ اڑتیس سال کا یہ انتہائی مصروف و سرگرم سفر ایک دور دراز اور حساس و باشعور فنکار کا سفرِ حیات تھا جو اس نے گہری سماجی بصیرت اور ماحول کے تقاضوں کی روشنی میں پوری دیدہ وری اور صاحب نظری کے ساتھ طے کیا۔ آغا صاحب نے اس دوران اردو میں تیرہ، ہندی میں بارہ اور بنگالی میں دو ڈرامے تصنیف کیے۔ یہ ڈرامے ملک کے طول و عرض میں مختلف مقامات پر بار بار اسٹیج کیے گئے اور ہر جگہ بے انتہا کامیاب اور مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں کے ذریعے آغا حشر نے عوام کے ذوق کی تسکین کا سامان بھی کیا اور ان کے مذاق کی اصلاح اور تربیت کی بھی کوشش کی۔ کاروباری نقطۂ نظر سے ان کی کامیابی تمامتر عوام کی پسند پر منحصر تھی۔ اس لیے وہ ان کے معیار و مذاق کو بہرصورت ملحوظ رکھنے پر مجبور تھے لیکن اس قسم کی تمام مجبوریوں اور پابندیوں کے باوجود یہ خیال کبھی ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا کہ ان کے تماشائیوں کی اکثریت ایک غلام ملک کے انتہائی غریب اور پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ایک فنکار کی حیثیت سے ان کا فرض یہ ہے کہ وہ انھیں جہالت کی تیرگی، رسم و رواج کی غلامی اور مذموم عادات و خصائل کی قیود سے نجات دلا کر ایک باشعور، متحرک اور خوشحال قوم کی طرح جینے کا سلیقہ سکھائیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ ڈرامے سے سیر و تفریح کے علاوہ اس مقصود کے حصول میں بھی پوری مدد لی جا سکتی ہے۔ "ترکی حور" میں رشیدہ کا یہ مکالمہ ان کے اسی یقین کی ترجمانی کرتا ہے:

> "ناٹک بھی ہوتے ہوئے لوگوں کو جگانے اور گرے ہوؤں کو اٹھانے کا ایک زبردست ذریعہ ہے۔ جو ترقی کا جوش اور اصلاح کا جذبہ سیکڑوں وعظ اور ہزاروں لیکچر سن کر برسوں میں پیدا نہیں ہوتا وہ جوش اور جذبہ انسان کے اندر بہتر ناٹک صرف ایک رات میں پیدا کر دیتا ہے۔"

"ترکی حور" ہی کے ایک اور مکالمے میں انھوں نے ان مسائل کی ایک مجمل فہرست بھی پیش کر دی ہے جو اس زمانے میں سب سے زیادہ توجہ کے محتاج تھے اور جن کا حل تلاش کیے بغیر اہل ملک کو جہالت و ناداری کے قعرِ مذلت سے نکالنا انتہائی دشوار تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھ رہے تھے، اسے رشیدہ کی زبان سے اس طرح ادا کراتے ہیں:

> "ہمارا ملک جو سادہ کھانا، سادہ پہننا اور سادہ طور پر زندگی بسر کرنا پسند کرتا تھا۔ آج نمود و نمائش کا بندہ، فیشن کا غلام اور شراب کے نجس پیپوں کی مکھی بن رہا ہے۔ امیر تو امیر غریب مزدور تک اپنی دن بھر کی کمائی کا ایک حصہ چائے اور سگریٹ پر اور دو حصے شام کے وقت شراب کی دکان پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ فضول خرچی اور شراب خوری کی لہروں میں تندرستی دولت، عزت سب تنکے کی طرح بہا جا رہا ہے۔"

آغا صاحب کے اپنے الفاظ میں "ترکی حور کا اصل موضوع انہی برائیوں کا بیان ہے اور ان برائیوں کی طرف توجہ دلانا اس کا اصل مقصد تصنیف ہے۔" اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے جس طرح اپنا زورِ قلم صرف کیا، معاصر ادب میں اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ان کے متعدد ڈرامے خود غرضی، نا انصافی، جنسی بے راہ روی، شراب نوشی اور قمار بازی جیسی سماجی برائیوں کے خلاف ایک پُرزور اور موثر صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "اسیرِ حرص" ان کا چوتھا ڈرامہ ہے۔ جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا۔ ڈاکٹر انجن آرا کے الفاظ میں اس کا پلاٹ "شاہی ظلم و ستم اور حکومت و اقتدار کی حرص کے اردگرد گھومتا ہے۔" اس میں ایک حریص اور جابر و ظالم حکمراں کے مقابلے میں اس کی انصاف پسند اور شریف النفس بیوی کا کردار پیش کر کے خیر و شر کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ اس کے ایک کردار رستم کا یہ قول کہ "مبارک ہیں وہ انسان جو اوروں کی بھلائی کے لیے اپنا گھر برباد کرتے ہیں، اوروں کا چراغ روشن کرنے کے لیے اپنا چراغ گل کرتے ہیں۔" خود غرضی اور مفاد پرستی کے اندھیروں میں انسانیت و شرافت کے چراغ روشن رکھنے کی ملکوتی خواہش کا والہانہ اظہار ہے۔ "خوبصورت بلا" بھی جو ۱۹۰۹ء کی تصنیف ہے، خیر و شر کی اسی کشمکش کا ایک سبق آموز مرقع ہے۔ بدی کا دعویٰ ہے کہ "دین کی مٹی خود غرضی اور لالچ کے پانی سے گوندھی گئی ہے۔" گویا اس کے نزدیک اس دنیا میں نیکی اور شرافت کی کوئی گنجائش نہیں لیکن توفیق اپنے عمل سے اس دعوے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ اس کے نزدیک اس دنیا میں نیکی اور شرافت کی کوئی گنجائش نہیں لیکن توفیق اپنے عمل سے دعوے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے۔ اس کے نزدیک "دنیا میں سچی اور سیدھی ۔۔۔ فقط نیکی ہے جو انسان کو قبر کے دروازے سے نکال کر قیامت کے میدان سے ہوتی ہوئی بہشت کے دربار میں پہنچاتی ہے۔"

توفیق کی طرح اس کی بیوی طاہرہ سخی، رحمدل، فرض شناس اور شرافت و انسانیت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر سلطنت کے کم سن وارث سہیل کو اس کی سگی پھوپھی اور اس کے باپ کی قاتل شمسہ کے ناپاک ارادوں کا نشانہ بننے سے بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے، اور بڑے اہتمام کے ساتھ اس کی تربیت کرتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتی ہے کہ "تیر و تلوار سے رعیت کا سر بادشاہ کے سامنے جھک سکتا ہے، دل نہیں جھکتا۔ دل اس وقت جھکتا ہے جب بادشاہ نرمی اور انصاف سے پیار کرتا ہے۔"

صفدر اس ڈرامے کا ایک اور اہم کردار ہے۔ وہ اپنے سردار طغرل کے حکم کی تعمیل میں ایک مجبور و بے بس عورت کے خون سے ہاتھ رنگنے کو شرافت اور بہادری کی توہین قرار دیتے ہوئے حکم عدولی کے جرم میں اپنی جان تک دینے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے الفاظ میں "یہ دنیا فانی ہے، ہیضہ، طاعون، کھانسی، بخار میں سسک سسک کر مرنے سے وفاداری اور نیکی کی راہ میں مرنا خدا کی مہربانی ہے۔"

برائی کے مقابلے میں اچھائی کی کامیابی اور ظلم و ناانصافی پر شرافت و انسانیت کی فتح مندی کے یہ مرقعے تزکیۂ نفس، تہذیبِ اخلاق اور اصلاحِ معاشرہ کے اس عظیم مقصد کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جو شعر و ادب کو اس کی عام سطح سے بلند کر کے "چیزے دگر" بنا دیتا ہے۔

ظلم وتشدد اور بے ایمانی و ناانصافی کی طرح نسلی عصبیت اور مذہبی منافرت بھی بدترین رذائلِ اخلاق ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے دورِ حکومت میں ان کی عیارانہ حکمتِ عملی کے زیرِ اثر ان تعصبات کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ نتیجے کے طور پر یہ ملک جو مختلف نسلی، لسانی، مذہبی اور تہذیبی وحدتوں پر مشتمل ہونے کے باوجود سیاسی اور جغرافیائی اعتبار سے ایک مستقل اور مکمل وحدت تھا، کئی حصوں میں بٹ گیا۔ آغا صاحب نے تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی اس روش کو اپنے کئی ڈراموں میں ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ "یہودی کی لڑکی"، جو ۱۹۱۱ء میں لکھا گیا۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہے۔ اس ڈرامہ کے ذریعے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب کی بنیاد پر انسان اور انسان کے درمیان تفریق، انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شرافت اور انسان دوستی کسی خاص مذہب کی میراث نہیں اور انسان کو کسی حال میں بھی انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیے۔

اچھوتوں کے خلاف نفرت وحقارت کا جذبہ بھی انسان اور انسان کے درمیان عدمِ مساوات کے غیر حقیقی اور غیر الوہی تصور کی دین ہے۔ مذہبی و نسلی تفریق کے عالمگیر مسئلے کے برخلاف یہ خالص ہندوستانی مسئلہ ہے۔ اگرچہ گاندھی جی کی انتھک کوشش اور بعض آئینی تحفظات کے نتیجے میں اچھوتوں کا شمار سماج کے مراعات یافتہ طبقے میں ہونے لگا ہے تاہم ان کی اکثریت آج بھی عزت واحترام کے اس تاجِ شرف سے محروم ہے۔ جس پر اولادِ آدم ہونے کے ناطے تمام انسانوں کا یکساں حق ہے۔ آزادی سے قبل ان کی سماجی واقتصادی حالت اس سے بھی زیادہ افسوسناک اور قابلِ رحم تھی۔ انھیں نہ تو اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والوں کے مظالم کے خلاف لب کشائی کی اجازت تھی اور نہ وہ اپنے معمولی انسانی حقوق کے حصول و تحفظ کے لیے صدائے احتجاج بلند کرسکتے تھے۔ آرام وآسائش کی تمام نعمتوں سے محرومی ان کا مقدر اور ایک مستقل بےکسی و بےبسی ان کی میراث بن چکی تھی۔ چونکہ اس ناانصافی کا سرچشمہ مذہب کا ایک غلط اور غیر انسانی تصور ہے، اس لیے آغا حشر نے اس کے خلاف احتجاج کے لیے ایک خالص مذہبی ڈرامے میں گنجائش پیدا کی۔ "سیتا بن باس" میں شتروگھن رام کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ نیچی ذات کے ایک معمولی انسان کی بات پر یقین کرکے سیتا کے لیے بن باس کا حکم صادر کرنا مناسب نہیں۔ رام ان کی اس دلیل سے اتفاق نہیں کرتے اور انسانوں کے درمیان ذات پات پر مبنی اونچ نیچ کے اس تصور کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے یوں ہمکلام ہوتے ہیں:

"کیا برہمن، چھتری، ویش کے سمان شودر پرش اور استری سے جنم نہیں لیتے؟ منشیہ سماج میں پل کر بڑے نہیں ہوتے؟ منشیہ جیسا روپ، گُن، سوبھاؤ، ہردے، بدھی، گیان، وویک نہیں رکھتے؟ امیری، غریبی، مان، اپمان، امرت، وِش، شراپ اور آشیرواد کا بھید نہیں سمجھتے پھر شکتی اور شکشا کے ابھاؤ کے سوا ان میں اور دوسرے منشیوں میں کیا بھید ہے؟ ہے شتروگھن! جس کی جڑ کھوکھلی ہو وہ ورکش، جس کے استھمب بودے ہوں وہ چھت، جس کی نیو ہل رہی ہو وہ گھر، جس کے پچھلے بھاگ میں آگ لگی ہو وہ جہاز اور جس میں تھوڑے سے آدمی، اچھیہ جاتی میں جنم لینے کے کارن اپنی ماتر بھومی کے کروڑوں بچوں کو بل ہین، شکشا ہین اور ادھیکار ہین بنا کر سدا اپنے پیروں کے نیچے رکھنا چاہتے ہوں وہ دیش کبھی دیرگھ سمے تک سر اونچا کیے اپنی جگہ استھر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے شودروں کو بھی منشیہ سماج کا مہا پریوجنیہ انگ جانو، ان کے ساتھ نیائے کرو اور ان کی پکار کو بھی منشیہ کی پکار سمجھو۔"

اس قسم کی اخلاقی ومعاشرتی مسائل پر اصلاحی وتعمیری انداز کی تنقید کے پہلو بہ پہلو آغا صاحب قمار بازی اور شراب نوشی جیسی لعنتوں کے خلاف بھی ہمیشہ مصروفِ پیکار رہے۔ شراب سے ان کا ذاتی شغف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ آتشِ سیال تھا، ذُو آباد گھروں کو برباد کرنے اور راحت ومسرت کی حلاوتوں کو افلاس ومصیبت کی تلخیوں سے بدلنے کی کس قدر غیر معمولی طاقت رکھتی ہے چنانچہ ذاتی مشاہدات وتجربات کی روشنی میں انھوں نے اس شغل کے مہلک مضمرات کو اپنے کئی ڈراموں میں نہایت موثر طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس سلسلے میں "سلور کنگ"، "ترکی حور" اور "آنکھ کا نشہ" کے نام بطورِ خاص پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان تینوں ڈراموں میں شراب نوشی کے نتائج وعواقب کو اتنے مہیب اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ ڈرامے کے اسٹیج یا سینما کے پردے پر انھیں دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "آنکھ کا نشہ" دیکھنے کے بعد بہت سے لوگ شراب سے ہمیشہ کے لیے تائب ہوگئے۔ اور ان میں سے بعض نے آغا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر اس احسان کے لیے ان کا شکریہ بھی ادا کیا۔

اصلاحِ معاشرہ اور تہذیبِ اخلاق کے سلسلے میں آغا حشر کی ان کوششوں نے انھیں ایک معمولی ڈرامہ نگار یا ادیب کے منصب سے بلند تر کرکے مصلحین ومحسنینِ قوم کی صف میں شامل کر دیا ہے۔ فنکارانہ عظمت کی یہ وہ معراج ہے جو ہر کس وناکس کو حاصل نہیں ہوتی۔ یہ عظمت تادیر قائم رہنے والی ہے۔ چنانچہ اسی کی بدولت آغا صاحب کا نام آج بھی زندہ ہے اور آئندہ بھی انھیں عزت واحترام سے یاد کیا جاتا رہے گا۔

(آکاشوانی لکھنؤ سے نشر)

ڈاکٹر حنیف نقوی
ریڈر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی۔ وارانسی

وقت کی آوازیں

انعام داور

(نثری نظم)

وقت خاموش ہے خدا کی طرح
لیکن اس کا ضمیر ہمیشہ چیختا رہتا ہے .....
میں نے دیکھا ہے وقت کو مختلف کیفیات میں۔
کلائی سے بندھی گھڑی کے دل میں
دھڑکنوں سے سرگوشیاں کرتا ہوا
مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں زندہ ہوں ——
چوراہے پر کھڑے گھنٹہ گھر میں چھپ کر
بھاری بے ہنگم آواز میں
اپنے وجود کا اعلان کرتا رہتا ہے ——
ملوں اور کارخانوں کے ناقوسوں میں
عمرِ گذشتہ کی میت کا ماتم کرتے ہوئے
مزدوروں کو دوڑاتا رہتا ہے ——
موٹر سائیکلوں پر ہانپتے کانپتے ہوئے
سڑکوں پر بھونکتے ہوئے آوارہ کتوں کو ڈانٹتا رہتا ہے .....
موٹر کاروں اور بسوں کے انجن میں جھنجھلاتے ہوئے۔
شاہراہ پر بکھرے، پامال خس وخاشاک میں
غدر کرواتا رہتا ہے ....
مال واسباب سے لدے ہوئے ٹرکوں میں سفر کرتے ہوئے
شہر سے دور گاؤں کی کچی سڑکوں سے
کھیتوں کی آنکھوں میں دھول جھونک جاتا ہے
نیم شب میں بچوں کی صوتی زبان میں
"غوں"..... "غاں" کرتے ہوئے
سوئی ہوئی ماؤں کو بیدار کر دیتا ہے .....
پرندوں کی چہکار میں گنگناتا ہے
موسیقی کے سازوں سے آواز ملا کر گاتا ہے ——
بگولوں، طوفانوں اور آتش فشاں پہاڑوں میں
انسانی زندگی کی بے ثباتی کا مذاق اڑاتے ہوئے
رقص کرتا ہے .....
ہیلی کاپٹر، ہوائی جہاز اور برق رفتار طیاروں میں
پرواز کرتے ہوئے
خلاء کی پنہائیوں کو طوفانِ نوح کی یاد دلاتا ہے .....
اور وقتاً فوقتاً
زلزلوں کی شکل میں جمائیاں لیتے ہوئے
گمراہ انسانوں کو چونکا دیتا ہے
خدا یا ایشور جو قادرِ مطلق ہے
بلاشبہ عظیم ترین طاقت ہے
اسکی عظمت سے انکار کرنا
محض حماقت ہے

(ناگپور سے نشر)

بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا

محمد اسد اللہ

لکھنے لکھوانے کے لئے میرے پاس خیالات کی کمی نہیں. ذہن کے چھینکے میں خیالات مکھن کی طرح جمے رہتے ہیں. ذہن کے اس ذنبیل سے میں روزانہ بہت سا مکھن باہر نکالتا ہوں. خصوصاً اس وقت جب کوئی فرعون بے سامان حلق پھاڑ کر مجھ پر برسنا چاہے. سو وہ ذرا سے مکھن میں رام ہو جاتا ہے. آپ جانتے ہیں زیادہ مکھن کھا لیا جائے تو گلا بیٹھ جاتا ہے، آواز نہیں نکلتی اسی مکھن کی چکنائی کے طفیل زندگی کا "چھکڑا" ناہمواریوں میں چرخ چوں کا باجا بجائے بغیر گزرتا ہے. (مکھن آسودہ حال طبقے کی ضرورت اور غربا، و مساکین کے لئے فضول سی شے ہے دسترس سے باہر ہو تو ہر ذائقہ دار چیز کھٹی اور بے ذائقہ چیزیں فضولیات میں شمار ہونے لگتی ہیں. ضروریات کا کوٹہ پورا ہونے پر ہمیں آسودگی کا "نروان" حاصل ہوتا ہے. اس کے بعد فضولیات ضروریات میں داخل ہونے لگتی ہیں.) مکھن نہ صرف بلّی کی مرغوبات میں سے ہے بلکہ عام آدمی کی بھی ایک ایسی ضرورت ہے جو کھانے کے لئے کم اور دوسرں کو لگانے کے لئے زیادہ استعمال کی جاتی ہے بغیر کھائے پیئے زندہ رہا جا سکتا ہے لیکن ناخداؤں سے بیر رکھ کر جینا محال ہے.

بہر حال میرے ذہن کے چھینکے سے مکھن کا غدیر آتارنے کی کوئی سبیل نہیں بن پاتی تاآنکہ کوئی اچھا سا عنوان مقرر کر دے. ایسا ہو جائے تو مضامین غیب سے اترنے لگتے ہیں. مکھن لگانے میں یہی کچھ تو ہوتا ہے. عنوان دستیاب ہو جاوے تو محسوس ہوتا ہے گویا کسی کنواری لڑکی کے لئے جو مدتوں سے بن بیاہی، بلا عنوان کہانی بنی بیٹھی تھی مناسب رشتہ مل گیا اس موقع پر یہ محاورہ تو یاد آتا ہی ہے. بلی کے بھاگوں . . . .

میں. بلی نہیں ہوں تاہم مجھ میں اور بلی میں بہت سی باتیں مشترک ہو سکتی ہیں. عدم مماثلت کی صورت میں فرضی مماثلتیں بھی دریافت کر کے طشت از بام کی جا سکتی ہیں. اس سے ایک فائدہ مجھے یہ حاصل ہو گا کہ کتوں اور کتوں کی خصلتوں کے خانے میں فٹ ہونے والے افراد سے میں اپنے آپ کو صاف بچا لے جاؤں گا. کتے. بلی کا باہمی تضاد جو ضرب المثل ہے. بھلا ایک چیز. بلیّ جیسی ہو تو اسے کتے سے تشبیہ دینے کی جرأت کون کرے گا؟. عام ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ دوغلی نسل کی مقبولیت کے زمانے میں ایسے انسان بھی موجود ہیں جو کتے. بلی بلکہ مزید دو چار چوپایوں کے خصائل سے مزین ہونے کے باوجود ٹھونک کر خود کو انسان کہتے ہوئے ذرا نہیں جھجکتے.

ہم میں اور بلی میں کیا بات مشترک ہے اس کا تو ذکر جانے دیجئے کہ اس طرح ہماری مرغوبات کا تذکرہ چھڑ جائے گا. اور بات دودھ سے نہ سہی مکھن ہی سے شروع ہو تب بھی چھیچھڑوں تک جا پہونچے گی اور آخر میں تان ٹوٹے گی نظروں کی خرابی پر.

بلی خالہ جو کھیت چگنے کے بعد ہونے والے ہر ہوائی حملے میں عام طور پر جان بچا کر بچ نکلتی ہے. اور اس بار بھی صاف نکل جائے گی ہم اپنی اپنی عینک کے طفیل خواہ مخواہ دھر لئے جائیں گے. لہذا آیئے عدم مماثلت کی بات کریں.

بلیّ کے بھاگ اور ہماری قسمت کے درمیان جو فرق موجود ہے. وہی ہم دونوں کے بیچ سب سے بڑی عدم مماثلت ہے. بلیّ کے بھاگوں چھینکے ٹوٹتے ہیں اور ہمارے حق میں مصیبتیں. مانا کہ مصیبتوں کا سلسلۂ نسب تقدیر ہی سے جا ملتا ہے. تجربہ شاہد ہے کہ جو لوگ تقدیر پر تکیہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں ایسے سکندروں کے مقدر میں مصیبتیں ہی لکھی رہ جاتی ہیں اور ہاتھ پاؤں ہلانے والے چلتے پرزے، راحتیں اور سامانِ عیش اڑا لے جاتے ہیں. بہت تھوڑے ہیں جو مقدر کو ایزی چیئر سمجھ کر اس سے پیٹھ ٹکاتے ہیں بعض تو اس کے ذکر ہی پر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں. قسمت سے ملنے والی چیزوں پر سے اب لوگوں کا اعتبار اٹھنے لگا ہے اسی لئے تو ہندی کا ایک شاعر اس طرح دستِ دعا دراز کرتا ہے ——

اے خدا! مجھے چھپّر پھاڑ کر دے، مگر اتنا ضرور دے کر اس میں کم از کم چھپّر کی مرمت ہو سکے. بلیّ کے بھاگوں ٹوٹنے والے چھینکے محض اس لئے ٹوٹتے ہیں کہ نوشتۂ تقدیر کو عملی جامے سے آراستہ ہونا ہے. ہمارے آپ کے مقدر سے ٹوٹنے والے چھینکے یقیناً تحقیق طلب ہیں کہ آیا وہ واقعی غیبی اشارے پر ٹوٹتے ہیں. یا ہم ہی نے چور دروازے سے بانس نچا کر چھینکے کو زوردار جھٹکا دیا ہے. یا کسی تیسرے چھپے رستم کے تعاون سے چھینکا تڑ واکر" یا تقدیر یا تقدیر" کا شور مچایا ہے.

بنیادی فرق یہی ہے کہ مجھے اس قسم کے چھینکے ترواڈ کی ایک سو ایک ترکیبیں یاد ہیں. بلیّ بیچاری اس گر سے ناواقف ہے. اس نے بساط بھر کوشش کر ڈالی تو چھینکے پر چھلانگ لگا کر ہنڈیا لڑھکا دے گی اور نیچے گرا ہوا دودھ اتر کر چٹ کر جائے گی. یہ ناچیز تو بغیر چھلانگ لگائے ہوئے بھی یہ کرتب دکھا سکتا ہے.

کہا جاتا ہے کہ دستر خوان پر یہ بھید بھید نہیں رہتا کہ کون کس قدر مہذب ہے ان معنوں میں بلیّ خالہ شیر اور کتے سے زیادہ مہذب ہے. عموماً یہ باور کر لیا جاتا ہے کہ جو مہذب ہے وہ شریف بھی ہے کیونکہ تہذیب اور شرافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے. حالانکہ ان دونوں چیزوں کا ساتھ ہماری اعلیٰ سوسائٹیوں میں عموماً آوٹ آف ڈیٹ خیال کیا جاتا ہے. بہر حال کتے، بلیّ اور شیران تینوں سے زیادہ شریف حضرت انسان ہیں. شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ بھونکنے، دہاڑنے اور ممیانے سے کم اور بے ضرر آواز آپ صرف دستر خوان پر ہی محسوس کریں گے. یعنی ڈکار لئے بغیر نگل جانا اور نگل جانے کے بعد ڈکار تک نہ لینا. انسانوں ہی کا خاصّہ ہے.

بلیّ کی مجموعی کارکردگی پر نظر کیجئے تو پتہ چلے کہ انسانوں کے فیضِ صحبت نے اسے خود انسانوں ہی کے حق میں کس قدر تکلیف دہ بنا کر رکھ دیا ہے. ہماری اس بات سے کچن کی محافظ بیویاں کچھ زیادہ ہی اتفاق کریں گی.

اشیائے خوردنی کے معاملے میں کتا بڑا بے ضرر اور قابل اعتبار چوپایہ ہے. جبکہ بلیّ اپنی تمامتر شرافت اور تہذیبی کردار کے باوجود ایک نامعتبر اور غدار جانور ہے. کتوں کی شرافت تو روزِ اول ہی سے اس اندیشے کے سبب مشکوک چلی آ رہی ہے کہ بھونکتا ہوا کتا نہ جانے کب بھونکنے کا پروگرام ملتوی کر کے کاٹنے کی رسم اجرا منانے میں مگن ہو جائے اور ناگہاں آپ کے جسم پر خون کا ایک سرخ فیتہ لہرانے لگے.

ان لوگوں کا وجود بھی غنیمت ہے جو علی الاعلان بلا جھجک بھونک سکیں کیونکہ اب ان ناداں کی تعداد

بڑھتی جارہی ہے جو صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ۔ وقتِ قیام آجائے تو دھڑام سے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اس منظر پر ہم آپ مسحور و مرعوب ہو کر واپس ہونے لگیں تو ہمارے منہ پھیرتے ہی فوراً سجدے سے اٹھ کر ہماری گردن اتار لیتے ہیں ۔ اس طور کر ہمیں خبر بھی نہ ہونے پائے ان کا یہ عمل ایسا ہی ہے جیسے ہم نے کمرے میں دستر خوان بچھایا اس پر دودھ سے لبالب پیالہ رکھا اور ذرا ادھر ادھر ہوئے کہ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں قسم کی اک چھیل چھبیلی بلّی دبے پاؤں آئی اور سارا دودھ پی گئی ۔

بلّی کے اوصافِ حمیدہ میں سب سے اہم اس کی موقع پرستی ہے ۔ بلّی جانتی ہے کہ اس ایک صفت میں تسخیر کائنات کی کتنی بڑی قوت پوشیدہ ہے ۔ اسی خوبی کے طفیل وہ ان تمام لوگوں کو جو اس کی مرغوبات کی ذخیرہ اندوزی میں مشغول ہیں ۔ بندۂ بے دام بنا لیتی ہے ۔ روز مرہ کے اس واقعہ پر نظرِ ثانی کیجیے ۔ بلّی صبح تڑکے ہی آپ کو دودھ خریدنے روانہ کرتی ہے جس طرح فرہاد جوئے شیر لانے کے لئے بھیجا گیا تھا ۔ آپ فرہاد کا تاریخی کردار ادا کر کے سیر بھر دودھ حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو دودھ زبانِ حال سے گواہی دے گا کہ بھینس آج گوالے کی نظر بچا کر پانی زیادہ پی گئی ہے یا اسے پانی زیادہ پیتا ہوا دیکھ کر گوالے نے دیدہ و دانستہ نظر چرائی ہے یا پھر خدانخواستہ کسی آؤٹ آف ڈیٹ قسم کی روشن ضمیر بھینس نے بلا ضرورت زیادہ پانی پینے سے آنکھ دکھا کر سینگ ہلا کر انکار کر دیا تو گوالے نے دودھ ہی کو بھینس کا قائم مقام سمجھ کر پیٹ بھر کر پانی پلا دیا ۔ بلّی کو گوالوں کا یہ دستور معلوم ہے لہٰذا جب آپ دودھ لے کر گھر پہونچیں گے تو وہ دودھ کو ہرگز نہ چھیڑے گی ۔ کیونکہ اس پر یہ بھی منکشف ہو چکا ہے کہ دودھ کے پیالے کو گوالے کے دستِ کرشمہ ساز نے کنوئیں میں تبدیل کر دیا ہے ، اس کنوئیں کا تزکیۂ نفس ضروری ہے ۔ اب وہ آپ کی بیوی کے ذریعے اس کنوئیں کو چولہے پر چڑھوائے گی اور اس وقت تک انتظار کرے گی جب تک کنواں دوبارہ گرم گرم دودھ کے پیالے میں ڈھل نہ جائے ۔ اور آپ اسے ٹھنڈا ہونے کے لئے ذرا دیر یونہی چھوڑ دیں ۔ اب جو آپ ادھر ادھر ہوئے تو وہ اس نادر موقع کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دے گی ۔ آنکھ موند کر جو سر جھکا دے گی تو پھر سر اٹھانے کے بعد ایک ہلکی سی ڈکار پر ہی خاتمہ بالخیر ہو گا ڈکار ہو گی یا ڈکار جیسی ہی کوئی خفیف سی حرکت ۔ بعد ازاں ایک چھینک مار کر اپنی زبان میں خدا کا شکر ادا کرے گی ۔ جبکہ آدمی پرایا مال ہڑپ کرنے کے بعد ڈکار تک نہیں لیتا شکریہ ادا کرنا تو بہت بڑی بات ہے ۔ بلکہ ذرا سا چورن اور تھوڑا سا وقفہ عنایت کیجیے ، تو پھر آپ ہی پر بھو نکتا ہوا اٹھے گا ۔

یہاں ایک اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ بلّی کی موجودگی کے نتائج سے واقفیت کے باوجود ابلا ہوا دودھ مکھن یا گوشت اتنی لاپرواہی سے ادھر ادھر کیوں چھوڑ گئے ۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ آپ ان اشیاء کو احتیاطاً چھینکے پر چڑھا جاتیں یا الماری میں بند کر جاتیں مگر صاحب ! بات دراصل یہ ہے کہ اسی مقام پر بلّی کے بھاگ کھلتے ہیں اور آپ کی قسمت پھوٹتی ہے یعنی بس اک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے ۔ یا تو آپ دودھ کا پیالہ بھول جاتے ہیں یا الماری کا پٹ کھلا چھوڑ جاتے ہیں ۔ یہ سب نہ ہو تو جس طرح میلو ڈرامے میں ماورائی عناصر کا ظہور ہوتا ہے بلّی کے معاملے میں اسی قوت کا اظہار چھینکا ٹوٹنے کے عمل میں ہوتا ہے اور یکایک بلّی کی سوئی ہوئی قسمت جاگتی ہے ۔

یاد کیجیے ، قصہ ، شیریں فرہاد ، بیچارے فرہاد کو تیشہ تھما کر پہاڑ کی طرف چلتا کر دیا گیا کہ وہ دودھ کی نہر نکال لائے حالانکہ دودھ کی نہر موجود تھی ۔ نام تھا اس نہر کا " شیریں " ! یہ نہر ایک عرصے تک وقت کے چھینکے میں ٹنگی رہی ۔ حق تو یہ تھا کہ چھینکا محنت کش کوہکن فرہاد کے حق میں ٹوٹتا مگر اس کمبخت کو موقع پرستی چھو کر بھی نہ گزری تھی اس کا شائبہ بھی فرہاد میں ہوتا تو وہ بجائے پہاڑ کا رخ کرنے کے ڈیری فارم کھول لیتا ۔ سال دو سال میں دودھ کی نہر خراماں خراماں چلی آتی مگر وہ ٹھہرا فرہاد ۔

ادھر فرہاد موقع واردات سے ہٹا اور ادھر خسرو پرویز کی اسٹیج پر انٹری ہوئی جس طرح اس موقع پر بلّی دبے پاؤں آتی ہے ۔

دنیا کا ہر خسرو پرویز اور ہر بلّی اس نیک ساعت کو اچھی طرح پہچانتی ہے کہ اسی میں چھینکا ٹوٹتا ہے ۔

ایک مشورہ یہ ہے کہ شیریں فرہاد کے ڈرامے میں خسرو پرویز کا رول بلیّوں سے کروایا جائے کیونکہ نئے دور میں ماڈرن فرہاد نے کوہ کنی کے بے فیض کام سے اکتا کر اور عبرت حاصل کر کے اگر اب دودھ ڈیری کھول رکھی ہو تو وہاں بھی خسرو پرویز کی نمائندگی ہو سکے ۔ کیونکہ یہ لازوال ڈرامہ تو ہر دور میں کھیلا جاتا رہے گا ۔ فقط اسٹیج بدلتے رہیں گے ۔

(ناگپور سے نشر)

محمد اسد اللہ
الورلیسٹ ہارڈویئر روڈ
ضلع امراوتی مہاراشٹر
پن ۔ ۴۴۴۹۰۶

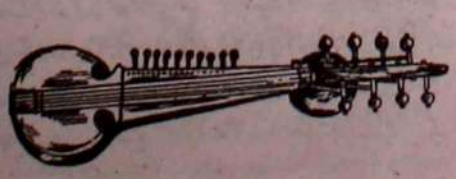

کیا کیا گل کھلاتا ہے

خدا کے جلوے کی طرح حسن کے جلوے بھی کائنات کے ذرّے ذرّے میں بکھرے پڑتے ہیں اور خدا جانے زیرِ زمین کتنے حسین منوں مٹی کے نیچے دبے ہوں اور کتنے جل کر خاک کی شکل پیوندِ زمیں بن گئے ہوں بقول غالبؔ یہ تو حسن کے چند پرتو ہیں جو پھولوں کی شکل میں بہت زور مار کر زمین سے اوپر آ گئے ہیں ۔

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں !
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

شاید یہی وجہ ہے کہ ہر بجھتی ہوئی آنکھ گھور گھور کر حسن پر شباب کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے ۔ ہم سوچتے ہیں کہ ان بزرگوں کو بڑھاپے میں کیا پڑی ہے جو اس طرح چلتے پھرتے حسن کو گھورتے رہتے ہیں ۔ ایک دن بڑی جرأت کر کے ایک سے میں نے پوچھ ہی لیا ——— " بڑے میاں ! یہ روز صبح و شام کیا نظارہ کرتے ہیں آپ ؟ " مجھے دیکھ کر گھبرائے نہیں بلکہ مسکراتے ہوئے بولے ۔

" بیٹا ۔ غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں

بڑے میاں کا جواب کیا تھا ' ایک نصیحت تھی ۔ زندہ دلی کی روشن مثال تھی ۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ بڑھاپے کے باعث جو جذبۂ عشق تھک چکا تھا شاید وہی جذبۂ عشق تھا شاید وہی جذبہ " مثنوی زہرِ عشق " اور باغ و بہار " کی شکل میں کاغذ پر ابھر آیا ہو گا ۔ ہائے ——— " بسا آرزو کہ خاک شدن " !

حسن و عشق کی تانکا جھانکی اور بھاگ دوڑ نے دنیا کے ہر ادب اور ہر دور میں گل کھلائے ہیں ۔ اور اگر سچ پوچھیے تو پردہ نشینوں سے لیکر شاہراہوں پر دوڑتی مسکراتی اور دعوتِ نظارہ دیتی جوانیوں نے جو قیامتیں دلِ عشاق پر ڈھائیں ——— شدتِ شوق سے جتنی دھڑکنیں دل میں بیدار ہوئیں ——— ہر

انتظار

سلمیٰ جبیں

"اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِین" بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کرو بیٹی صبر کرو۔"

بڑی دیر سے گھٹنوں پر رکھا چہرہ نائلہ نے اٹھایا۔ ابا جان سامنے کھڑے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ نائلہ کی ڈبڈبائی آنکھوں میں جیسے سیلاب آگیا۔ ہونٹ کپکپانے لگے سارا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بے بسی سے ابا جان کو آنسوؤں کے سمندر کے بیچ سے تک رہی تھی۔

اور پھر . . . . وہ ان سے بے اختیار لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ابو جی! یہ کیا ہوگیا ——— کیسے ہوگیا ——— ہم کیوں لٹ گئے، وہ کہاں چلے گئے ؟؟؟

اور اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

ابا جان کی حالت خود غیر ہو رہی تھی انھوں نے اسکی پیٹھ پر تھپکی دی اور کمرے سے نکل گئے۔

سامنے بستر پر چار ننھی منی جانیں ہر فکر سے بے نیاز میٹھی نیند سو رہی تھیں۔ دو گھنٹے کی مسلسل بے ہوشی کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو سامنے امی بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھیں۔ اور اس کے ہونٹوں سے پھر ایک چیخ نکل گئی تھی۔

"امی یہ کیا ہوگیا" امی نے کچھ نہیں کہا۔ کیا کہتیں؟ کیسے کہتیں کہ صبر کرو۔

نائلہ کی آنکھیں چھت کی طرف تھیں اور ذہن کہیں اور۔ پریشان و منتشر ذہن کے اوراق رفتہ رفتہ الٹے لگے۔ ازدواجی زندگی کی ابتداء کہاں سے ہوئی اور کہاں ختم ہوگئی۔ کشتی تو بھنور ہی میں پھنس کر رہ گئی۔

ذہن کی کتاب نے کئی ورق اور الٹے۔ پھر پرانی یادیں اور یادیں عروسی جوڑے میں اس کا خوبصورت شباب مچل رہا تھا۔ جھکی جھکی پلکوں میں کسی کے انتظار کی گرمی تھی۔ گلابی چہرہ حجاب نسوانیت سے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا۔

والدین نے ڈوبتی آواز سے اپنی لاڈلی بیٹی کو رخصت کیا اور وہ کلکتہ سے بہت دور مرادآباد آپہونچی۔

اور جب اس نے اپنے نئے گھر میں قدم رکھا تو پہلے اسے بڑی الجھن ہوئی۔ لوگ نئے گھر نیا شہر نیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا دل لگ گیا۔ کیونکہ اعجاز میاں کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام لوگوں نے اسے محبت دی۔ پھر اعجاز میاں کی عزت بھی تھی۔ کسی بڑی فرم کے منیجر تھے۔ کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی۔ قدرت نے یکے بعد دیگرے اسے چار ننھے منے پھولوں سے بھی نواز دیا تھا۔

لیکن . . . . اچانک وقت نے کروٹ لی اور اس کی زندگی کے سبھی تار جھنجھنا اٹھے اور جس خوشی کے سمندر میں وہ چار سالوں سے غوطہ زن تھی اس سمندر کا پانی اچانک سوکھ گیا تھا۔ وہ عجب انقلاب سے دوچار ہوئی تھی عجب تھی نفرت اور حقارت کی وہ جنگ۔ اس میں بھائی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور اسی خانہ جنگی نے اعجاز میاں کو نگل لیا تھا۔ اعجاز میاں مسلسل تین دنوں سے غائب تھے۔ باوجود لاکھ کوششوں کے ان کا پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں گم ہوگئے اور نائلہ کے ارمان دل کی اتھاہ گہرائیوں میں سسک سسک کر دم توڑنے لگے۔

وقت گزرتا گیا اور امید ناامیدی میں بدلنے لگی قدرت کا یہ انوکھا مذاق اس کے ذہن کو مفلوج کر چکا تھا اب اس کا دل یہاں ایک پل کو بھی نہیں لگ رہا تھا۔ ایک روز اس نے دبی زبان میں ساس اماں سے کہہ دیا۔ کہ امی مجھے کلکتہ بھیج دیجئے میں یہاں پاگل ہو جاؤں گی۔ شہر میں خوف و ہراس، سراسیمگی اب بھی باقی تھی۔ سفر محفوظ نہ تھا۔ پھر بھی ایک دن ساس اماں اور بڑی نند لاچار ہو کر مجھے کلکتہ بھیجنے پر رضامند ہوگئیں۔ ہاتھ میں کچھ روپے اور زیورات کا ایک ڈبہ دیا اور رخصت کیا۔ چھوٹے دیور نے چاروں بچوں کو سنبھال لیا۔ گاڑی رفتہ رفتہ اندھیروں کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ہر چہرہ ایک دوسرے کو اجنبیت سے تک رہا تھا۔ لیکن اس میں سب ہی مصیبت زدہ تھے۔ کون کس سے کیا پوچھتا رات گئے تک گاڑی چلتی رہی۔ تمام مسافر چوکنا لیکن خاموش بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی گاڑی میں جھٹکے لگتے تو نائلہ غفلت سے چونک اٹھتی۔ اس کی زندگی کی گاڑی کو بھی اسی طرح کے جھٹکے لگے تھے۔ اور اس جھٹکے نے اس کے دل و دماغ دونوں کو چور چور کر دیا تھا۔

اس کے سامنے اپنی زندگی تھی اپنے بچوں کا مستقبل تھا دو دنوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد وہ اپنے گھر تک پہونچی اور اس کے بعد سے وہ مسلسل گم سم ہے۔

"بیٹی اٹھو ناشتہ کر لو تمہاری امی کب سے تمہیں آواز دے رہی ہیں" ابو جی کی آواز کانوں میں کہیں دور سے آتی سنائی دی اور وہ چونک اٹھی۔ اس کے سپنوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بوجھل ذہن کی تھکاوٹ سارے جسم کو تھکا چکی تھی۔ اس کی نسیں دکھنے لگیں۔ دو روز تک گھر پر اپنے پرائے محلے ٹولے رشتہ داروں دوستوں کی بھیڑ لگی رہی۔ سبھوں کی زبان پر یہی تھا کہ یہ کیا ہوگا۔

لوگ اظہار ہمدردی کر کے رخصت ہوگئے اس کے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ لیکن والدین پریشان تھے کیا کیا جائے ایسے تو وہ مرجائے گی پھر ابا جان نے اسے جھنجھوڑا۔ سمجھایا کبھی پیار سے کبھی ڈانٹ کر" نائلہ اٹھو بیٹی تمہیں کچھ کرنا ہے۔ تمہیں جینا ہے ان بچوں کی خاطر" اور یہی بچے اب اس کے لئے جینے کا سہارا بن گئے۔ اور اس نے پھر اپنے حوصلوں کو ایک نیا آہنگ دیا۔

اس طور پر کر ——— نائلہ کے ہاتھوں میں اب بھی چوڑیاں ہیں۔ مانگ میں سہاگ سیندور ہے۔ چہرے پہ وہی معصوم مسکراہٹ ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ وہ آئے گا ایک نہ ایک دن وہ ضرور آئے گا ——— مگر کب ؟؟ ——— کبھی کبھی وہ سوچتی ہے ——— لیکن ناامید نہیں ——— وہ ضرور آئینگے ——— ابا گذر گئے لیکن آج بھی ان کے الفاظ پر نائلہ کو یقین ہے۔ "اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِین" بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ شاید خدا کو امتحان لینا اب بھی باقی ہے۔

(کلکتہ سے نشر)

سلمیٰ جبیں
۱۳۔ سرسید احمد روڈ
کلکتہ۔ ۷۰۰۰۱۴

آواز : قیمت
فی کاپی ——— ایک روپیہ
سالانہ ——— ۲۲ روپے
دو سال ——— ۴۲ روپے

انو بھابی

معین شاہد

انو بھابی اپنی بڑی حویلی کی چونا گردانی، صفائی اور سجاوٹ میں لگی ہوئی تھیں۔ حویلی کے لمبے، چوڑے محراب نما دالانوں، غلام گردشوں اور صحن سے ملحق اس بڑے کمرے کو خاص طور پر اپنے گرائت اور کیمیا سے جھاڑ پونچھ کروا رہی تھیں، جو کبھی ان کے سسر سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کی خصوصی نشست گاہ تھی۔ اور جہاں ہر صبح اور شام رحیم پورہ کے لوگ ہی صرف نہیں اکٹھا ہوتے بلکہ اس کے قرب و جوار کی بستیوں، بیجناتھ پور، داہو بیگھہ، سید پور، رحمت نگر کے دو سو بیگھہ جوتنے والے زمیندار، اور بڑے چھوٹے کاشتکار اور چودھری بھی حاضر ہوتے۔ اخبارات پڑھے جاتے، ان پر تبصرے ہوتے، گپ بازیاں ہوتیں، شطرنج کی بساط بچھتی، حقہ کا دور چلتا رہتا، بارہ گاواں کی پنچایت سلطان نیاز احمد صاحب کی اسی بیٹھک میں ہوتی جس میں چھوٹے بڑے قضیے، اور جھگڑے چکائے جاتے۔ یہ بیٹھک گویا لوک عدالت تھی، جہاں سبھوں کے مقدمات کے فیصلے ہوتے۔ اور جن فیصلوں کو فریقین بے چوں چرا مان لیتے میں اپنی عافیت سمجھتے۔ کیونکہ سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کا فیصلہ حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ اس سے انحراف گویا ایک بڑی آفت کو دعوت دینی تھی۔ اس کی نہ تو کہیں اپیل تھی اور نہ کہیں شنوائی

سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار اور کاشتکار نہیں تھے۔ ان کے پاس صرف سو بیگھہ کھیت تھے۔ اس علاقہ میں ان سے بڑے بڑے زمیندار اور کاشتکار اور بھی تھے۔ لیکن سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کی شرافت، وجاہت، لیاقت اور ان کا دبدبہ ایسا تھا کہ بڑے بڑے ان کے سامنے جھکتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی ان کی ڈیوڑھی کے سامنے سے ان کو سلام کئے بغیر اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے نکل جائے۔ منگلا ہاٹ میں، جو ہر ہفتہ رحیم پورہ سے صرف دو میل کی دوری پر، انہی کی زمین میں لگتا تھا، قرب و جوار سے کافی لوگ ٹوٹتے تھے۔ اسی روز سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم اپنی کھٹولی پر سوار ہو کر منگلا ہاٹ جایا کرتے تھے۔ جہاں ان کی کچہری بھی بنی ہوئی تھی جانوروں کا ہاٹ لگتا تھا۔ اس سے اچھی خاصی تحصیل ہوتی تھی۔ یہی تحصیل گویا ان کے ٹھاٹ باٹ کا سبب تھی۔ ان کی انصاف پسندی، اور عدل و مساوات، کے سبھی قائل تھے۔ جب تک سلطان نیاز احمد صاحب زندہ رہے، اس وقت تک رحیم پورہ اور بارہ گاواں پنچائت میں محبت، بھائی چارگی، ایکتا کی بنسری بجتی رہی۔ ہر کوئی چین کی نیند سوتا اور آرام کی زندگی بسر کرتا۔ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس علاقہ میں کوئی تھانہ ہے بھی یا نہیں۔

یہ آج سے ۲۵ سال قبل کی بات تھی جب انو بھابی اس بڑی حویلی میں دلہن بن کر نہیں آئی تھیں۔ انھوں نے اپنے سسر کی وہ فارغ البالی اور امن چین کا دور دیکھا نہیں تھا ان کے لئے وہ سب ایک قصۂ پارینہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب تو ان کی ساس شاہ بیگم بھی اس دنیا میں نہیں تھیں۔ جب ان کی شادی سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے کمال بابو سے ہوئی تھی تو اس وقت بڑی حویلی میں صرف ان کی ساس شاہ بیگم تھیں۔ ان کے سسر نے اپنے بیٹے کے سر سہرا بندھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اور اللہ کا ایسا کرنا ہوا کہ جب ان کی بے بی پیٹ ہی میں تھی اسی وقت ان کی ساس اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور وہ اپنی پوتی کو گود بھی نہ کھلا سکیں۔ اسے ان کی بدنصیبی ہی کہئے کہ انو بھابی دلہن تو بن گئی تھیں۔ لیکن انہیں نہ تو اپنے سسر اور ساس کا لاڈ و پیار ملا اور نہ ہی وہ زیادہ دنوں تک اپنے میاں کے ساتھ سکھ کا جیون بتا سکیں۔ بے بی ابھی دو ہی سال کی تھی کہ ان کا سہاگ اجڑ گیا۔ ان کی صندلی اور گوری گوری کلائیاں بنارسی لال لال چوڑیوں سے محروم ہو گئیں۔ ان کی مانگ کی افشاں دھل گئی۔ برسات کی وہ ایک بھیانک اور منحوس رات تھی، جب بجلیاں زور زور سے چمک رہی تھیں اور بادل ان کی بڑی حویلی پر، تمام قیامت سامانیوں کے ساتھ گرج رہا تھا کہ ان کے سرتاج کمال بابو پر قلب کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ وہ کروٹ بھی بدل نہیں سکے۔ انو بھابی سے نہ جانے قدرت کو کونسا انتقام لینا چاہتی تھی اور انہیں کونسے امتحان میں ڈالنا چاہتی تھی کہ دیکھتے دیکھتے ان کا بسا بسایا گھر اس طرح اجڑ گیا کہ در و دیوار سے حسرت برستی تھی اور ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کی آنکھوں کے وہ چراغ بجھ گئے تھے جو کبھی کسی جوان و تندرست باہوں، کپکپاتے ہوئے ہونٹوں، چوڑے چکلے سینے اور اونچی پیشانی کے لمس سے جل اٹھتے تھے۔

جب وہ اپنے میکے سے رخصت ہو کر اپنی سسرال رحیم پورہ آئی تھیں اور ان کا ڈولا بڑی حویلی میں اترا تھا تو گاؤں کی بڑی بوڑھیاں، خالائیں، پھوپھیاں، رشتہ کی بھاوجیں ان کو دیکھ کر بلائیں لیتے وقت، اپنی اپنی انگلیاں اپنے اپنے گالوں پر توڑے بغیر نہ رہ پائی تھیں۔ انوری خانم کا حسن، ان کی مخروطی انگلیاں، ان کی شربتی آنکھوں پر دراز پلکوں کا جھالر۔ ان کا گورا گورا مکھڑا مکھڑے کا عکس جمیل۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ آنگن میں چاند اتر آیا ہو۔ جس نے دیکھا مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ لاکھوں میں ایک تھیں ——— اب بھی سراپا کمال بابو کے مرنے کے بعد گویا موم بتی کی طرح سفید ہو کر رہ گیا تھا۔ جو اندر ہی اندر جل جل کر پگھلتی رہتی ہے۔ وہ سفید ساڑی میں ملبوس، بیوگی کا لبادہ پہنے کوہ قاف کی ایسی پری معلوم ہوتی تھیں جو بہت ہی بلندی سے، روئی کے گالوں کی طرح زمین پر اتر رہی ہو۔ جسے سہاگ کا لال جوڑا کبھی نصیب نہیں ہوا ہو۔ اور جو تلاش موہوم میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہو اور اسے کوئی گلے لگانے والا نہ ہو۔

انوری خانم اس حویلی میں صرف ایک سال تک انوری خانم رہیں اور اس کے بعد کمال بابو نے انہیں اکبار جو پیار سے انو کہا تو وہ اس حویلی میں انو دلہن بنکر رہ گئیں۔ اور شمشاد نے جو انہیں ایک بار انو بھابی کے نام سے پکارا تو وہ کمال بابو کے مرنے کے بعد بڑی حویلی میں انو بھابی ہو کر رہ گئیں۔ اب تو ان کا اصلی نام بھی کسی کو یاد نہ تھا۔ شمشاد کی دنیا میں اب اس کی انو بھابی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انو بھابی اس کے لئے بہت کچھ تھیں۔ وہ ایک بھابی بھی تھیں اور ایک ماں بھی۔ اسے اپنی مرحومہ ماں شاہ بیگم تو اچھی طرح یاد تھیں۔ اس نے اپنی ماں کی موت پر جو آنسو بہائے تھے، اس کے ایک ایک قطرہ کا حساب اس کی سوجی ہوئی آنکھوں کی پلکیں دے سکتی تھیں۔ لیکن اسے اپنے مرحوم والد سلطان نیاز احمد صاحب کا چہرہ ذرا بھی یاد نہ تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت دو سال کا تھا۔ دو سال "پالنے" کی عمر کو اس کے باپ کے ہاتھوں کی دی ہوئی لوریاں بھلا کیسے یاد رہ سکتی تھیں۔

جب اس کے بھائی کمال بابو کا انتقال ہوا تھا تو اس نے اپنی انو بھابی سے لپٹ کر روتے ہوئے کہا تھا "انو بھابی اب میرا اس دنیا میں کون ہے۔؟"

اس سوال کا جواب وہ کیا دیتیں کیونکہ اس دنیا میں

ان کا بھی تو اب کوئی نہ تھا۔

وہ کبھی بے بی کو دیکھتیں اور کبھی شمشاد کو۔ ایک طرف ان کو اپنی بیوگی کا غم کھائے جا رہا تھا تو دوسری طرف ان دو ننھے معصوموں کی یتیمی کا سوگ انہیں خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ انہوں نے بڑے صبر سے کام لیا۔ اور بولیں۔

"میں جو ہوں۔ میں تمہاری بھابی بھی ہوں۔ اور ماں بھی"

اور اس روز سے انہوں نے ایک ماں کی طرح شمشاد کا غم اپنے ویراں اور اجڑے آنچلوں میں سمیٹ لیا۔

انو بھابی شمشاد کی دیکھ بھال ایک ماں کی طرح کرنے لگیں۔ بڑی حویلی میں کام کرنے والی مامائیں، خادمائیں بہت ساری تھیں۔ جو گھر کا کام کاج سنبھالے رہتیں۔ سلو جوان کے ایک کمیا کی بہو تھی، وہ صبح سویرے اپنے گھر سے آجاتی۔ جھاڑو دیتی، جوٹھے برتنوں کو مانجھتی، اور چولہے میں آگ روشن کر دیتی۔ اس کے بعد وہ بے بی کو گود میں لے کر بڑی حویلی کے مغربی حصے میں جاتی، جہاں ایک بڑا سا میدان تھا۔ اور جہاں دھان کے بڑے بڑے تین گانج لگے ہوئے تھے۔ اور پیال سے وہاں پر کی زمینیں اس طرح ڈھکی تھیں جیسے نرم و ملائم قالین بچھی ہو۔ ان پر چلنے میں اور بے بی کو کھلانے میں سلو کو بڑا مزہ ملتا۔ انو بھابی دو کام اپنے ہاتھ سے ضرور کرتیں۔ ایک تو یہ کہ کھانا خود پکاتیں اور دوسرے یہ کہ شمشاد اور بے بی کے کپڑے خود سے دھوتیں۔ شمشاد اور بے بی کے کپڑوں کو دھونے میں دراصل ان کی ممتا کا ہاتھ ہوتا۔ وہ کپڑا دھو کر دھوپ میں سکھاتیں۔ ان پر آئرن دیتیں اور سلیقے سے ان کو بکس میں رکھتیں۔ شمشاد کا داخلہ انہوں نے نزدیک ہی کے ایک اسکول میں کرا دیا تھا جہاں سے وہ اب میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اب اس کی عمر گویا ۱۶ سال ہونے کو آئی تھی۔ بے بی بھی اب خیر سے آٹھ سال کی ہو گئی تھی۔ جسے وہ ایک مشن اسکول کے نرسری درجہ میں پڑھنے کے لیے بھیجتی تھیں۔ بے بی کا اسکول ۸ بجے صبح سے ہوتا تھا۔ اس لئے وہ سب سے پہلے بے بی کا ہاتھ منھ دھلاتیں، کپڑے تبدیل کرتیں، آنکھوں میں کاجل لگاتیں اور کتابوں کا بستہ اسے تھما دیتیں۔ پھر سلو اسے اسکول پہونچا دیتی۔ پھر اس کے بعد وہ شمشاد کو اپنے سامنے باورچی خانے ہی میں، ناشتہ کراتیں، اپنے ہاتھوں سے دھلے ہوئے کپڑے پہناتیں اور جیسے ہی دس بجتا، اسے ایک گڈنائٹ کے ساتھ اسکول روانہ کر دیتیں۔

شمشاد کہتا بھی کہ "انو بھابی۔ ! میں خود چلا جاؤں گا۔ رام پتی کو میرے ساتھ بھیجنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں شمو۔ اسکول ایک میل پر ہے۔ اور سنا ہے کہ ان دنوں رحمو چاچا کا سانڈ آس پاس گھومتا رہتا ہے۔ اگر اس نے مار دیا تو۔"

"وہ مجھے کیا مارے گا۔ آپ نہیں دیکھتی ہیں۔ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ میں جب اسے دیکھوں گا تو بھاگ کر اسکول پہنچ جاؤں گا۔"

اور وہ ایک سہانے خوابوں میں کھو جاتیں۔ "شمو ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ وہ اب بچہ تھوڑا ہی ہے۔ اب تو وہ گاؤں سے پڑھ کر، شہر، کالج میں جائے گا۔ وہ اسے ضرور میڈیکل پڑھائیں گی، پھر تو ڈاکٹر بن جائے گا۔ پھر اس کی شادی کریں گی، چاند سی دلہن آئے گی۔

یہ سوچتے سوچتے ان کا دل انجانے خوف سے دھڑکنے لگتا۔ جیسے اندر سے کوئی بدروح اور خوفناک پیکر ابھر رہا ہو اور کہہ رہا ہو۔ "یہ سب مت سوچو انو بھابی۔ تم بھی تو چاند سی دلہن بن کر اس حویلی میں آئی تھیں۔ تم نے بھی تو سہانے خواب دیکھے تھے کہ۔ "یہ بڑی حویلی ماضی کی پرانی روایات، اور تہذیبی قدروں کی حفاظت کرے گی۔ سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کا بیٹھکا پھر آباد ہو جائے گا، اسی طرح گاؤں کے چھوٹے بڑے جھگڑے طے کئے جائیں گے حقہ کا دور چلتا رہے گا۔ کھیت اور کھلیان آباد ہوں گے۔ اور وہ ایک سے ۱۲ ہو جائے گی۔ اس کے شوہر کا آدرمان اس قرب و جوار میں اسی طرح ہو گا جس طرح اس کے سسر کا ہوتا تھا ——— لیکن ان سہانے خوابوں کا تاج محل کس طرح تاراج ہوا۔ مت سوچو۔ خواب خواب ہیں، حقیقت نہیں۔ ان خوابوں نے اب تک کس کا ساتھ دیا ہے جو تمہارا دیں گے۔ انو بھابی مت سوچو ———"

پھر انو بھابی کچھ بھی نہیں سوچتیں۔ ان کے پاس سوچنے کے لئے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ ان کے ذہن کا شکول مفلس فقیر کے کشکول کی طرح یادوں سے خالی ہو جاتا۔ وہ سوچنا چاہتی تھیں لیکن سوچ نہیں سکتی تھیں۔ وہ کچھ دیر کے لئے سندر سپنوں کی چادر اوڑھے سونا چاہتی تھیں لیکن اس خوف سے ان سپنوں کی چادر تار تار ہو جاتی تھی کہ مبادا کہیں ماضی کا عذاب ان سے چمٹ نہ جائے۔

جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تھا تو چار یا پانچ مہینہ کے بعد ہی ان کے میکے والوں نے انہیں اس بات پر اکسانا شروع کر دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن جب بھی کوئی ان سے کہتا۔ "انو بھابی آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں تو وہ بپھر کر کہتی۔ "ایسی بات زبان سے نہ نکالو۔ میری ڈولی تو اب مرنے کے بعد ہی اس حویلی سے نکلے گی۔ اور پھر پھر۔ شمو کس کو انو بھابی کہہ سکے گا اور اسے کون ماں کا پیار دے گی میرے تو دو دو لعل ہیں۔ شمو اور بے بی۔ میں تو دونوں کی ماں ہوں۔ میں دوسری شادی کر کے ماں کے اس مقدس رشتہ کو ختم نہیں کر سکتی۔ اور پھر اس بڑی حویلی میں روزانہ اپنا دکھڑا سنانے، یہ غریب لوگ کس کے پاس جائیں گے میں تنہا نہیں ہوں۔ رحیم پورہ کی عورتیں، میری ساسیں، میری مائیں، میری بہنیں، میری نندیں، میری بھاوجیں، میری خالائیں ہیں۔ یہ میرے لئے سب کچھ ہیں۔ یہ میرا پورا پریوار ہے۔ میں اس پریوار کو چھوڑ نہیں سکتی۔

اور یہ بات صحیح بھی تھی۔ کمال بابو کے مرنے کے بعد سلطان نیاز احمد صاحب مرحوم کے بیٹھکا میں جو لوگ آیا کرتے تھے۔ اب ان کی عورتیں انو بھابی کے پاس آیا کرتیں ان سے صلاح و مشورہ کرتیں۔ غریب و بیکس لڑکیوں کے رشتے انو بھابی طے کرتیں۔ اور خود اپنے ہاتھوں سے ان لڑکیوں کو دلہن بنا کر ان کی سسرال رخصت کرتیں۔ وہ ہر سال اپنے پلو سے کافی روپے خرچ کرتیں۔ جب کاتک میں دھان اور پھاگن اور چیت میں گیہوں کی کٹائی اور کھیتوں کی فصلیں، بوجھا بن بن کر ان کی بڑی حویلی کے کھلیان میں آجاتیں تو اس کی ایک چوتھائی رقم اس مد پر خرچ کرتیں، غریب و بے سہارا اپنے غریب کمیا کی بچیوں کی شادیوں اور ان کے دکھ درد میں اپنا روپیہ خرچ کر کے انو بھابی کو بڑی مسرت اور سکون حاصل ہوتا۔ شاید انہی غریبوں کی دعاؤں کا اثر تھا کہ انو بھابی کی وہ دیرینہ خواہش پوری ہو رہی تھی جو انہوں نے شمو کو میڈیکل پڑھانے کے لئے کبھی ظاہر کی تھی اور جس کے لئے تمنا کی تھی۔

اور آج شمو میڈیکل کا فائینل امتحان دے کر شہر سے گاؤں آ رہا تھا۔ اور انو بھابی اپنی بڑی حویلی کی چونا گرد ائی، صفائی اور سجاوٹ میں لگی ہوئی تھیں۔

سید پور کی چودھرائن نے جب بڑی حویلی میں یہ اہتمام دیکھا تو انہوں انو بھابی سے پوچھا۔

"آج کیا کوئی مہمان آنے والا ہے۔ جو اتنی صفائی ہو رہی ہے"

"ہاں شمو آ رہا ہے نا۔ اس نے میڈیکل کا امتحان دیدیا ہے رکمنی دیدی" انو بھابی کا انگ انگ فخر و انبساط سے ناچ رہا تھا۔ اور ان کے آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکے پڑتے تھے۔

"وہ آج آئے گا۔ اب کے دو سال کے بعد آ رہا ہے میر العل ڈاکٹر بن جائے گا۔ میں نے اس کا رشتہ گنگا کے دیارا کے کنارے آباد نیر پور میں لگایا ہے نا۔ اب تو اس کی شادی ہو گی اور اس کی دلہن آئے گی"

پھر انہوں نے اپنے تصور کے نہاں خانے میں اتر کر آہستہ سے کہا۔ "کیا اب میں زندگی بھر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی رہوں گی۔ بے بی بھی تو اب جوان ہو گئی ہے۔ کچھ روز بعد وہ سسرال چلی جائے گی۔ تو میں اکیلی، اتنی بڑی حویلی میں کیسے رہ سکوں گی۔

"ہاں۔ ٹھیک کہتی ہو انو بھابی۔ اب شمو کی کنیا لے ہی آؤ"

"ہاں رکمنی دیدی۔ میں نے سب باتیں طے کر دی ہیں۔ صرف شمو کے آنے کی دیر ہے" شام ہو چلی ہے اب وہ آ ہی رہا ہو گا"

اور شام ہو گئی۔ شمو بس سے اتر کر سیدھے اپنی انو بھابی کے پاس حویلی کے اندر پہنچ گیا۔ جہاں انو بھابی اپنے مہمان کے سواگت کے لئے طرح طرح کے پروگرام بنا رہی تھیں۔ وہ شمو کو دیکھ کر خوشی کے مارے بے حال ہو گئیں۔ وہ شمو کو دیکھ کر خوشی کے مارے بے حال ہو گئیں۔ وہ کس طرح اپنے شمو کا استقبال کریں۔ اس کو دیکھیں کہ بات کریں۔ مسکرائیں کہ بلائیں لیں۔ کریں تو وہ

کیا کریں۔ ان کے آبنوسی چہرے پر کیفیت کا عجب عالم تھا انہوں نے پہلے ایک نظر میں اسے جی بھر کر دیکھا اور فرطِ مسرت سے چیخ پڑیں۔

"شمو تم آ گئے۔ ارے اب تو ماشاءاللہ ہم سے بھی دو بالشت اونچے دکھائی دیتے ہو۔ بس بس میں نے اپنے شمو کا جو نقشہ ذہن میں اتارا تھا۔ ٹھیک وہی ہے۔ بے بی کے ابا مرحوم کی طرح وہی ناک، وہی نقشہ، وہی آنکھیں، وہی چہرہ، وہی ڈیل ڈول۔"

انو بھابی کے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے غیر ارادی طور پر ان کے مرحوم شوہر کا سراپا گھوم گیا۔ لیکن ماں کا وہ رشتۂ لازوال جو انہوں نے اپنے شوہر کے مرنے کے بعد اپنے دیور شمو سے استوار کیا تھا، اور جسے اپنی تمام فطری خواہش کے ناگ کو مار کر اب تک بچا کر رکھا تھا، فوراً ہی غالب آ گیا۔

"بے بی کے پاپا تمہارے بارے میں یہی کہا کرتے تھے کہ شمشاد ٹھیک ابا مرحوم کے نقشے پر ہے۔"

"انو بھابی! آپ کا میں قرض کس طرح چکا سکتا ہوں۔ جس کا بوجھ میرے کندھے پر ہے۔ آپ نے ایک بھابی کا بھی رول ادا کیا ہے اور ایک ماں کا بھی، اس دوہری شخصیت کو میں کون سا خراجِ عقیدت پیش کروں۔"

"شمو! ایک قرض ہمارے اوپر اور رہ گیا ہے۔ جس سے میں سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا"

"وہ یہ کہ۔ میں تمہیں دولہا دیکھنا چاہتی ہوں، میں نے تمہارا رشتہ ایک جگہ پختہ کر دیا ہے۔ زبان دیدی ہے۔ اب تم اپنی دلہن اس بڑی حویلی میں لے آؤ۔"

پھر ٹھہر کر بولیں ۔۔۔ تم نے ڈاکٹری کا امتحان بھی دیدیا ہے۔ اب دو تین ماہ کے اندر تمہارا ریزلٹ بھی آؤٹ ہو جائے گا۔ چار مہینے کے بعد، اب کے عید کے چاند میں تمہاری شادی ہوگی۔"

شمو نے! انو بھابی کو جب یہ کہتے سنا تو وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ انو بھابی اتنی جلد اسے رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنا چاہتی ہیں۔ اسے شہر میں جا کر نئی سوسائٹی ملی تھی۔ موڈرن ماحول سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جو میڈیکل میں پڑھتی ہو۔ اور اس نے اپنے لئے ایسی لڑکی کا انتخاب بھی کر لیا تھا۔ سو آج اچانک اس کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑے۔ "انو بھابی۔ آپ نے کیوں اتنی جلدی یہ فیصلہ لے لیا۔ اگر شادی ہی کرنی ہے تو آپ پہلے اپنی شادی کر لیجیے۔ آخر آپ بھی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا سننا تھا کہ انو بھابی کو طیش آ گیا۔ اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے ایک زوردار تھپڑ شمو کے گال پر رسید کر ڈالی۔ (آگے ص ۲۱ پر)

افسانہ

درد منت کش دوا نہ ہوا

حسن منصور

رات بڑی دیر سے دونوں میاں بیوی اپنے بیمار بچے کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے دونوں کے جسم سردی کے باعث کپکپا رہے تھے۔ باہر بڑی شدت سے بارش ہو رہی تھی۔ اور سرد ہوا کے جھونکے بغیر کسی روک ٹوک کے ان پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔

ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ تیز ہوا کی آواز بارش کے شور کے سوا اور کسی جاندار کی آواز نہ آتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی ان کا سات سالہ بیمار بچہ درد کے باعث کراہ اٹھتا اور دونوں میاں بیوی مضطرب ہو کر اس پر جھک جاتے ماں اس کے سر کو دبانے لگتی۔ اور باپ پھٹے ہوئے لحاف کو بچے کے گرد اچھی طرح لپیٹنے لگ جاتا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس ہلاکت خیز ہوا کا کوئی جھونکا اس کے لال پر اثر نہ ہو سکے۔

اس سوکھی تیمارداری کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ ان کے پاس افلاس و غربت کے نامحدود خزانے بھرے پڑے تھے۔ بچے کی والہانہ محبت سے ان کا انگ انگ معمور تھا لیکن اس کے سوا ان کے پاس رکھا بھی کیا تھا۔ جو اس اکلوتے بچے کی صحت کے لئے لٹا دیتے اس حالت میں تو صرف دولت کی ضرورت تھی۔ جو ایک سیاہ نصیب انسان کی خوش بختی کی طرح ان کی دنیا سے مفقود تھی۔ آخر کس چیز کے سہارے اس مریض بچہ کا خاطر خواہ علاج ہو سکتا تھا۔ لے دے کے ان کے پاس صرف تین شکستہ حال چارپائیاں۔ تین پھٹے ہوئے لحاف۔ دو بوسیدہ کمبل اور ایک دری تھی کھانے پینے کے لئے صرف گنتی کے چند برتن تھے۔

ان کے پاس اس بچے کے علاج کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ جمن ایک مزدور تھا۔ یہ بھی بہت زیادہ خوش قسمتی تھی کہ اس بیکاری کے زمانے میں اسے ایک فیکٹری میں، قلیل تنخواہ پر ملازمت مل گئی تھی۔ ورنہ آج وہ کبھی کے بھوکوں مر گئے ہوتے۔

دونوں میاں بیوی ہزار جتن کر چکے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس کو گرم رکھا جائے۔ آگ جلائی گئی تھی۔ لیکن ایندھن ختم ہونے پر وہ بھی بجھ گئی۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ اور بچہ درد کے مارے کراہ رہا تھا۔ جس طرح بارش ہو رہی تھی۔ اسی طرح ماں کے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ بار بار اوپر کی طرف سر اٹھا کر کہتی۔ اے خدا میرے بچے پر رحم کر۔ اس کو شفا دے۔ اس کے عوض اگر تو میری جان بھی چاہے تو میں تجھے دینے پر تیار ہوں ۔۔۔۔"

"اماں" بچے نے کراہتے ہوئے کہا: کیا ہے میرے بیٹے، جمن پیار سے لال پر جھک گیا۔ ماں کے لئے اس کی آواز ایک ہتھوڑے کی چوٹ سے بھی زیادہ تھی جو اس کے دل پر مارا جائے۔ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے جمن کی طرف دیکھ کر کہا۔ لال کے ابا۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے آگے وہ کچھ نہ بول سکی۔ شدتِ غم نے اس کی آواز بند کر دی۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ جمن نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ صبر کر رحمین خدا کارساز ہے۔ وہ سب کے دکھوں کو دور کرتا ہے۔ وہ ضرور لال کو اچھا کر دے گا۔ ایسے رو رو کر ہلکان ہونے کا کیا فائدہ؟

اس طرح کر۔ اس کے لئے تھوڑی سی چائے بنا دے۔ کچھ نہ کچھ گرمی تو اس کے جسم کو پہونچے گی۔ جمن نے کہا۔ ہائے اللہ "میں کیا کروں": رحمین قریب چیخ کر بولی۔ چائے کی پتی بھی نہیں اور کمبخت آگ بھی بجھ رہی ہے۔ اچھا تو اللہ اسے آرام دے گا۔ جمن نے ٹوٹے ہوئے دل سے کہا۔ تو ذرا اس کے پاس بیٹھ۔ اور وہ بچے کی چارپائی سے اٹھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے کمبل اوڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ بچے کی بیماری اس کے لئے سوہانِ روح ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میری زندگی بھر کی کمائی کیا یوں ہی لٹ جائے گی۔ یہ کم بخت سرمایہ دار ذرا بھی رحم نہیں کرتے

آج فرم کے مالک کے سامنے ہزار ہاتھ جوڑے، ہزار منتیں کیں کہ خدا کے لئے مجھے کچھ رقم پیشگی دے دو مگر پتھر دل پر خاک بھی اثر نہیں ہوا۔ غربت بھی کتنی بڑی سزا ہے انسان کے لئے۔

ہماری اور رحیمن کی محبت کی ایک ہی نشانی ہمارا لال ہے۔ یہی ہماری خوشیوں اور راحتوں کا مرکز ہے۔ ہزار تنگی سہی، غربت سہی لیکن لال کے ہوتے ہوئے ہمیں کچھ بھی غم نہیں۔ اے خدا میرے لال کو آرام دے شفا دے۔ کاش کروہ کمبخت کچھ رقم پیشگی دے دیتا۔ اور میں اس کا علاج کرالیتا۔ خیراتی ہسپتال میں کوئی پوچھتا بھی نہیں ہے۔ آخر میں کیا کروں۔ کیا کسی جگہ چوری کروں نہیں۔ نہیں۔ ایسا میں نہیں کرسکتا۔ تو کیا بچہ یوں ہی بغیر علاج کے سسک سسک کر دم توڑ دے گا۔ غریبی بھی ایک لعنت ہے۔ کاش کہ ہم غریب نہ ہوتے۔ اس زمانے میں کوئی کسی کو قرض بھی نہیں دیتا۔ زیور کوئی ہمارے پاس نہیں۔ جسے رہن رکھ کر یا بیچ کر روپے حاصل کئے جاسکتے اور بچے کا علاج ہو جاتا۔ یہی گھر کی ٹوٹی پھوٹی چیزیں ہیں انہیں بھلا کون لے گا۔

اب ایک ہی راستہ ہے۔ کہیں چوری کروں چوری نہیں ایمان گنوانا! ایمان! چوری!! غریبی!!! اسی کشمکش میں دن کے ہارے ہوئے جمن کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد خواب میں اس نے دیکھا کہ وہ ڈاکٹر کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے ہمراہ اور بھی کئی غریب آدمی ہیں۔ وہ سب کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر ہمارا بچہ بیمار ہے! ہمارے ساتھ چلو ڈاکٹر!! لیکن ڈاکٹر ان سب کو پرے دھکیلتا ہوا اپنی کار میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ جمن مایوس ہوکر دوکان سے لوٹ آتا ہے اور تھوڑی دیر بعد چند سپاہی آکر اسے ہتھکڑی پہنا دیتے ہیں۔ یہ کس لئے؟ کیا جرم ہے میرا، جمن گھبرا کر پوچھتا ہے۔ تم نے اپنے مالک کے مکان میں چوری کی ہے۔ نہیں غلط ہے۔ میں نے آج تک کبھی چوری نہیں کی۔ جمن جواب دیتا ہے۔ اور اس جواب پر ایک سپاہی جھپٹ کر اس کے ہاتھوں میں پکڑا ہوا سفید کپڑا چھین لیتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ سپاہی پوچھتے ہیں۔ یہ۔ یہ میری اپنی ملکیت ہے۔ اس پر کسی کا حق نہیں چھوڑو یہ سفید کپڑا ہے۔ اس کی ہتھکڑی کھول دی جاتی ہے۔ وہ جب گھبراتا ہے تو چند لوگ اسے کہتے ہیں۔ رحیمن نے اپنی عزت کسی شخص کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ اتنے میں رحیمن روتی ہوئی آکر کہتی ہے۔ "میں نے بچے کے علاج کی خاطر اپنی آبرو بیچ دی ہے۔"

تو نے غریبوں کی آبرو کھو دی۔ جمن گرج کر کہتا ہے لو ابھی اس کا بدلہ لیتا ہوں اور وہ قریب پڑا ہوا ہتھوڑا اٹھا کر بچے کا سر کچل دیتا ہے۔ رحیمن زور زور سے چیخنے چلانے لگتی ہے۔ اور جمن قہقہہ لگاتا ہے۔ تم روؤ۔ میں ہنسوں گا۔ اتنے میں رحیمن نے جمن کو جھنجھوڑ کر اس کو خواب سے جگا دیا۔ لال کے ابا۔ اٹھو۔ دیکھو لال کو کیا ہو رہا ہے۔ جمن یہ آواز سن کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور جلدی سے لال کی چارپائی کے قریب پہونچ گیا۔ بچہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم اور روح میں جنگ ہو رہی تھی۔ جاؤ۔ جلدی سے ڈاکٹر بلا لاؤ۔ خدا کے لئے جاؤ رحیمن نے ہاتھ جوڑ کر جمن سے کہا۔ اور جمن بھی اسی طرح تیزی کے ساتھ ڈاکٹر کی کلنک کی طرف چل پڑا۔ جیسے اسکی جیبیں نوٹوں سے بھری پڑی ہوں۔ کلنک گھر سے دو میل کے فاصلہ پر تھی۔ باہر شدت کی سردی تھی۔ بارش ہونے کی وجہ سے ہوا کا ایک ایک جھونکا منجمد کرکے رکھ دیتا تھا جمن تیزی سے بھاگتا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے اس شدید سردی کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس کے جسم کا ذرہ ذرہ غم کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ دو میل لگاتار بھاگتا گیا۔ جب وہ ڈاکٹر کی کلنک کے پاس پہنچ کر رکا، تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ تمام راستے اور بازار سنسان پڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر کلنک کے اوپر ہی رہتا تھا۔ اس نے اکھڑی ہوئی آواز سے پکارا۔ ڈاکٹر صاحب! لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ گھنٹی بھی یہاں لگی ہوئی ہے۔ وہ برآمدے کے اندر چلا گیا۔ اور ٹٹولتے ہوئے کال بیل کو تلاش کرکے دبا دیا۔ اتنے میں اوپر سے ایک گرجتی ہوئی آواز آئی۔ کون ہے؟ جمن کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئیں۔ وہ بھاگ کر برآمدے سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر کھڑکی سے سر نکالے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ مر رہا ہے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ خدا کے لئے میرے ساتھ چلئے۔ جمن نے دردانگیز لہجے میں التجا کی۔ ڈاکٹر بڑبڑایا۔ جانا کہاں ہے۔ جی یہی کوئی دو میل! دن چڑھے آنا بھائی! ڈاکٹر نے جمن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس وقت میرا ڈرائیور بھی یہاں نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کھٹ سے کھڑکی کو بند کرلیا۔ اتنے میں گھڑی کی آواز آئی۔ پانچ بج چکے تھے۔ جمن کو ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے ہتھوڑے سے اس کے دل کو کچل دیا ہو۔ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور وہ خاموشی سے گھر کی طرف لوٹ پڑا۔

اب سردی کے باعث اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ بار بار سوچتا کہ اب کیا کروں۔ کس کے پاس جاؤں انہی خیالوں میں کھویا ہوا وہ گھر کے قریب آگیا۔ افق پر سفیدی نمودار ہو رہی تھی۔ کوئی آدمی کمبل میں لپٹا ہوا سڑک کی جانب جا رہا تھا۔ جمن آہستہ آہستہ گھر کے دروازے کے قریب آگیا۔ اندر سے رحیمن کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ جمن نے اسے آہستہ سے پکارا۔

رحیمن سینہ پیٹتی ہوئی اس کے قریب آکر گر گئی۔ میں لٹ گئی۔ ہائے میں برباد ہوگئی۔ جمن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم سے کسی نے لہو چوس لیا ہو۔ اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں خشک ہوگئیں۔ اس نے باہر جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ لیکن رحیمن نے بڑھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ لال کو تو دیکھ لو۔ اب کہاں جا رہے ہو۔

جمن نے گہری نظروں سے پاؤں پکڑے۔ روتی۔ دہاڑتی رحیمن کو دیکھا جیسے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

رحیمن ایک بار پھر چلائی۔ ہائے ہمارا لال ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم برباد ہوگئے۔ لال کے ابا ــــ اپنے لال کو دیکھ لو۔

لیکن جمن کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان بھی نہ تھا۔ ایک وحشت سی اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔

(پٹنہ سے نشر)

بقیہ :- انو بھابی

"کمبخت! تجھے شرم نہیں آتی کہ ماں کو شادی کرنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ کیا میں نے اپنے اندر کی اس شہہ زور عورت کو اسی لئے زہر دے کر سلا دیا تھا جو کئی بار دور شادی کرنے کے لئے میری خواہش نفسانی کی آگ کو اپنی آنچل سے ہوا دیتی رہی تھی۔"

وہ رونے لگیں ــــ "مجھے شادی ہی کرنی تھی تو میں کب کی شادی کرچکی ہوتی۔ اور میں اس حویلی کو چھوڑ کر دوسرا گھر بسالیتی۔ میں تجھے ماں کا پیار کیوں دیتی؟ میں تو اب تک تجھے ایک بیٹا ہی سمجھتی رہی کیونکہ بڑی بھابی ماں کے سمان ہوتی ہے۔ اور میں نے ایک ماں کی طرح تمہیں پالا، پوسا، پڑھایا۔ کیا اسی دن کے لئے کہ تو مجھے صرف بھابی کا درجہ دے کر ماں کے اس مقدس اور پوتر رشتہ کا اپمان کرے۔ تجھے شرم نہیں آتی۔" اور انو بھابی روتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی گئیں۔ پھر فوراً ہی وہاں سے نکلیں۔ اور بڑی بے چینی کے عالم میں سلو کو آواز دی۔ اور بولیں۔ شمو کہاں گیا۔ جاکر دیکھ۔ اس کا گال سوج گیا ہوگا۔ میں نے ناحق تھپڑ مار دی۔ آخر بچہ ہے نا۔ جا اسے بلا لا ــــ"

شمو اندر حویلی سے نکل کر سر جھکائے اپنے مرحوم باپ سلطان نیاز احمد صاحب کے بیٹھکے میں آکر اس تخت پر بیٹھ گیا تھا۔ جس پر ایک سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی اور مسند لگا ہوا تھا۔ اور جسے خود انو بھابی نے شمو کے لئے بچھایا تھا۔ اسے اس وقت اپنی مرحومہ ماں شاہ بیگم یاد آگئیں۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ پڑے یہ احساس ندامت کے آنسو تھے یا اقبال جرم کے۔ اسے وہاں پر کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ (پٹنہ سے نشر)

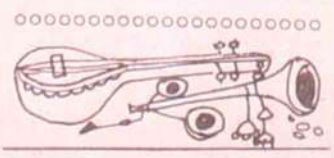

افسانہ

تاریک رات

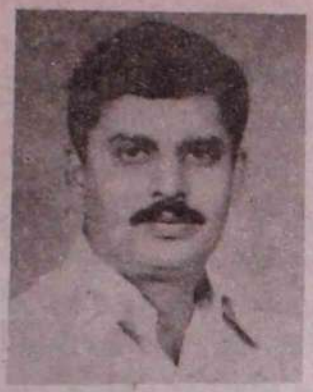

محمد نظام شمیم

کافی دیر سے کہانی لکھنے کی کوشش کر رہا **میں** تھا۔ بہت سارے موضوعات ذہن میں تھے۔ کس موضوع کا انتخاب کروں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ یکایک مجھے رامو کا خیال آیا۔ جو خضر پور کے پل پر بھیک مانگتا تھا عمر ۳۵۔۴۰ سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ساٹھ سال کا بوڑھا ہو۔ میں جب بھی ادھر سے گزرتا، اسے ایک چونی ضرور دیتا۔ ویسے میں دان پُن کرنے والا مہاتما نہیں ہوں بھیک دینا پسند نہیں کرتا بھکاریوں کی بیچارگی اور مجبوری دیکھ کر دل میں جب ہمدردی کے سوتے پھوٹنے لگتے ہیں۔ میں انھیں بند کر دیتا ہوں کیونکہ انسان کی پستی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ کم ہمت انسان کے لئے میرے دل میں کبھی کوئی جگہ نہیں رہی بیچارگی کا یہ روپ مجھے پسند نہیں۔ جس شخص میں یہ احساس نہیں کہ جینا اس کا پیدائشی حق ہے۔ وہ ایک لاش ہے اور مجھے لاشوں سے دلچسپی نہیں دراصل مجھے زندگی سے پیار ہے، زندگی حسین سے حسین تر ہو یہی میری آرزو ہے یہی میرا مقصد ہے اور میرے اس مقصد کی تکمیل میں ایک زندہ انسان ہی ہاتھ بٹا سکتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے بھیک منگوں سے پیار نہیں۔

"آہا جناب کہانی کار کسی شاہکار کی تخلیق میں مشغول ہیں شائد" کہتا ہوا جاوید میرے کمرے میں داخل ہوا میں نے قلم اور پیڈ پرے کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں یار بس یونہی کچھ اوٹ پٹانگ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔" خیر فی الحال اس کہانی و بانی کا چکر چھوڑو آؤ میرے ساتھ کم از کم اس خوشی میں ہی آج کی شب رنگین کر لیں کہ کل پندرہ اگست ہے۔ رات کے بارہ بجے جب ۱۵ اگست کی تاریخ شروع ہوگی ہم آزادی کا جام پئیں گے۔" میں اس کی بہکی بہکی باتوں پر مسکراتا رہا اور پھر لباس تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہو لیا۔

جاوید کی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد مجھے پھر اپنی کہانی کا خیال آیا۔ اور مجھے رامو یاد آنے لگا۔ رامو سے میری پہلی ملاقات خضر پور پل پر ہوئی تھی، اس نے جب بھیک کے لئے ہاتھ پھیلایا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا تھا۔ "چاروں ہاتھ پیر سلامت ہیں پھر بھی بھیک مانگتے ہو۔ شرم نہیں آتی" اور اس نے قدرے بپھر کر جواب دیا تھا۔ بابو چند سال پہلے کوئی یوں میرا ہاتھ جھٹکتا تو مزہ چکھا دیتا، بڑے آئے اپدیش دینے والے کہیں کوئی کام دلا سکتے ہو۔ کسی نوکری سے لگا سکتے ہو۔ یا صرف خالی خولی بھاشن ہی دے سکتے ہو" اور یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ مجھے رامو کا یہ انداز اچھا لگا یعنی اس کے اندر اب بھی زندگی باقی تھی۔ احتجاج کرنے کی طاقت سلب نہیں ہوئی تھی۔ ظلم کے خلاف بپھرنے اور احتجاج کرنے والے مجھے پسند ہیں۔ لہٰذا میں نے رامو میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ پتہ چلا وہ کسی انجان باپ کا بیٹا ہے۔ جسے اس کی بھکارن ماں نے فٹ پاتھ پر جنم دیا تھا۔ وہ فٹ پاتھ کا ہی پروردہ تھا۔ بڑا ہوا تو پاکٹ مارنا اور داداگیری اس کا پیشہ رہا۔ لیکن برا ہو بیماریوں کے متواتر حملوں کا کہ اس کی صحت گرتی گئی اور وہ جوانی میں بوڑھاد کھائی دینے لگا۔ ٹی۔ بی کا مریض ہونے کے بعد اس میں وہ چابکدستی نہیں رہی جو پاکٹ مارنے کے لئے ضروری ہے فٹ پاتھ پر رہنے والوں پر اس نے جو رعب گانٹھ رکھا تھا، وہ بھی باقی نہیں رہا۔ کہتے ہیں ٹی۔ بی کا مرض اب لاعلاج نہیں لیکن تنگدستی، غربت و افلاس کے لاؤ لشکر کے ساتھ جب ٹی۔ بی کا حملہ ہوتا ہے تو وہ لاعلاج ہے۔ رامو کے حالات جاننے کے بعد میرے منہ سے کچھ نہیں نکلا۔ میں خاموشی سے ایک چونی اس کی ہتھیلی پر رکھ کر چلا گیا۔ اس کے بعد جب بھی وہ ملا میں اس سے آنکھیں نہ ملا سکا۔ کیونکہ میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا تھا۔ چپ چاپ ایک چونی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ کر چلا جاتا۔ آج اگر رامو مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس کی زندگی کو کہانی کا روپ دوں گذشتہ چند مہینوں سے رامو نظر نہیں آیا تھا۔ خضر پور پل سے جب گاڑی گزرنے لگی تو میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ شاید رامو نظر آجائے اور میں اپنی کہانی پوری کر سکوں۔ لیکن وہ نظر نہیں آیا۔ فٹ پاتھ پر کسے تلاش کر رہے ہو" جاوید کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔ "ارے یار تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ بارہا کہا کہانی و بانی کا چکر چھوڑو۔ آدمی بنو دو پیسے کماؤ اور عزت سے رہو۔ آدرش کی لمبی چوڑی باتیں سوچنا، گھنٹوں غور کرنا اور پھر انھیں صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا یہی تو تمہارا مشغلہ ہے اس سے کیا مل جاتا ہے کون سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟"

میں نے جاوید کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہماری گاڑی پارک اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی کہ میری نظر رامو پر پڑی۔ پہلی نظر میں اسے پہچاننا مشکل تھا۔ بالکل لاغر آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا۔ وہ چورنگی اور پارک اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک شاندار بلڈنگ کے نیچے کراہتے ہوئے "بابا تیرا بھلا ہوگا" کی صدا آہستہ آہستہ لگا رہا تھا۔

میں نے جاوید کو گاڑی روکنے کے لئے کہا۔ "رامو تمہاری یہ حالت کیسے ہو گئی؟" میرے سوالوں کے جواب میں اس نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "بابو تم انجان کیوں بنتے ہو تم سب جانتے ہو کہ میں اس حال میں کیسے پہونچا"۔ لیکن اس نے مختصر جواب دیا کہ بھیک منگوں کی برادری نے بھی اسے گلے نہیں لگایا اور وہ اس بلڈنگ کے نیچے تنہا بھیک مانگتا ہے۔ مجھ سے باتیں کرتے وقت وہ ہانپنے لگا۔ اس کا دم جیسے اکھڑ رہا تھا لیکن مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا، تاکہ میں اپنی کہانی مکمل کر سکوں۔

بلڈنگ کی پہلی منزل سے موسیقی کی آواز آرہی تھی ہال روم ڈانس کا انتظام ان لوگوں نے کیا تھا جنہیں آزادی راس آئی تھی۔ مرد اور عورتوں کی ملی جلی ہنسی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اتنے میں جاوید نے گاڑی کا ہارن بجایا مجبوراً مجھے لوٹنا پڑا۔ "ارے یار آخر کب تک بور کرو گے" جاوید نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔"

میں نے کار میں بیٹھتے وقت بلڈنگ کی پہلی منزل پر عیش میں مست لوگوں کے قہقہوں کو سنا اور دوسرے لمحہ رامو کو دیکھا جو کراہ رہا تھا۔ میں یکایک اداس ہو گیا۔ ریسٹوران میں جا کر بھی دل نہ لگا شیک جرک اور چاچا چاکی دھنیں سب پھیکی معلوم ہو رہی تھیں کیبرے ڈانسر کا شہوت انگیز رقص بھی رامو کا خیال ذہن سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اور میں جاوید سے معذرت کر کے ۱۲ بجے ریسٹوراں سے نکل گیا۔ میں تیز چلتا ہوا رامو کے پاس جا رہا تھا۔ جو میری کہانی کا موضوع تھا۔ اور جس سے بہت سی باتیں دریافت کرنے کے بعد میں اپنی کہانی مکمل کر سکوں گا۔ قریب پہونچا تو دیکھا کہ رامو کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا کو چھوڑ چکا تھا۔

رات کے ۱۲ بجے کے بعد ۱۵ اگست شروع ہو چکا تھا۔ جس دن ہندوستان آزاد ہوا تھا شاید اسی لئے رامو نے اپنی روح کو آزادی دے دی تھی تاکہ ۱۵ اگست کی خوشی میں اسکی روح پوری طرح شریک ہو سکے اور اس کا ٹی۔ بی زدہ جسم اس کے لئے رکاوٹ نہ بن سکے اوپر کی منزل کی پارٹی ختم ہو چکی تھی زیادہ تر لوگ جا چکے تھے۔ دو صاحبان جو زیادہ پی گئے تھے وہ پارٹی سے نکلنے کے بعد رامو کی لاش سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچے ایک نے رامو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا "لگتا ہے سالا بہت پی گیا ہے" اور وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ رات اور تاریک ہو گئی ہے

(کلکتہ سے نشر)

افسانہ

صلیب

نوید ہاشمی

ایک مہینہ قبل وہ گاؤں اپنی چچی سے ملنے جارہا تھا زندگی میں پہلا موقع تھا جب کہ گاؤں کی ہوائیں اس کے جسم کو چھو رہی تھیں۔ ورنہ اس کی زندگی کے اکیس سال تو شہر کے ہنگاموں میں گزرے تھے۔ کتنی بار چچی کے یہاں سے اس کا بلاوا آیا تھا۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ پڑ گئی تھی کہ وہ نہ جا سکا تھا اور نہ ہی چچی اس کے یہاں آئی تھیں۔ لیکن اب کے وہ ہر رکاوٹ کو پھلانگ کر جارہا تھا۔ گاؤں کے سپاٹ راستے سے گزر کر جب وہ دوراہے پر باغ کے قریب پہنچا تو وہ عجیب تذبذب میں پڑ گیا۔ دوراہے دو سمت گئے تھے اور دونوں کے متصل ایک ایک گاؤں تھا۔ اب یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے مشکل تھا کہ کون گاؤں اس کی منزل ہے۔ کچی سڑک پر اس نے نظر دوڑائی۔ سڑک بالکل ویران تھی، وہ باغ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً اس کے کانوں میں بڑی رسیلی آواز گونجی اور پھر اس کی نگاہوں میں جیسے بجلی سی چمک گئی۔ تازگی، لطافت اور پاکیزگی کی وہ ایک ایسی کلی تھی۔ جس پر فرشتے یقیناً نثار ہوتے ہونگے۔ اس کا آنچل سر سے ڈھلکا ہوا تھا۔ زلف شانوں پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ اس کو دیکھتا رہا اور وہ گائے جارہی تھی۔ گرچہ گیت ارشد کی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ لیکن لڑکی گا رہی تھی۔ حالانکہ لڑکی اس کے خیال سے خود سراپا غزل تھی۔ ایسی غزل جو زندگی پر چھائی ہوئی بہار کا پیغام تھی۔ گیت جب ختم ہوا تو اسے یاد آیا کہ اسے اپنی چچی کے یہاں جانا ہے۔ گرچہ اس کا دل اس کو اس بات پر اکسا رہا تھا کہ وہ خاموشی سے اسی طرح کھڑا رہ کر کسی دوسرے کا انتظار کرتا۔ لیکن اس نے اپنے قدم بڑھائے اور لڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا۔

ہرپور گاؤں کون سا ہے۔؟

لڑکی نے اپنی پلکیں جھپکائیں، دوپٹہ ٹھیک کیا اور انگلی سے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بھاگ گئی۔ اور وہ کھڑا دور تک اس کو چوکڑیاں بھرتے دیکھتا رہا اور جب وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھی گاؤں کی طرف چل پڑا۔

چچی! جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو اٹھ کر جھٹ جھٹ اس کی بلائیں لینے لگیں اور جب وہ اپنی چچی کے ساتھ مکان میں داخل ہوا تو وہ جیسے چکرا سا گیا۔ وہ باغ والی لڑکی آنگن میں نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے بدن کے ایک ایک انگ سے جوانی کے شرارے پھوٹ رہے تھے، اس کی سادگی میں کتنا غضب کا حسن تھا۔

یہ تمہاری چچازاد بہن تمنا ہے ارشد" چچی نے تعارف کرایا"

جی" ارشد نے کہا اور اس کا دماغ بہت تیزی سے اڑا۔ گاؤں اور شہر کے حسن میں کتنا بڑا تضاد تھا۔ پاؤڈر، لپ اسٹک اور عریاں لباس سے آراستہ چہرے اس نکھار سے بے نیاز تھے جو نکھار تمنا کے رخسار پر جلوہ فگن تھا۔ لیکن اس تضاد کے اسباب اس کی سمجھ میں نہیں آسکے۔ چائے پینے کے بعد جب اس نے ایک بار پھر تمنا کو غور سے دیکھا تو وہ لاجونتی کی طرح لجا گئی۔ اپنے دوپٹے کے ایک کنارے کو اپنی انگلیوں میں لپیٹنے لگی اور اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخ ڈوریاں اُبھر آئیں اور پھر وہ اس کے سامنے سے اٹھ کر کمرے میں بھاگ گئی۔

وقت گزرتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ تمنا کی جھجک اور لجاہٹ کم ہوتی گئی۔ پر ایک دن باتوں باتوں میں وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی، وہ مسکرایا اور دونوں بے تکلف ہو گئے۔ اور پھر وہ دونوں ایک دن گاؤں کے کنارے تالاب پر گئے۔ گھاس کے فرش پر قریب قریب بیٹھ کر ان دونوں نے پاؤں پانی میں لٹکا دیئے۔

"دو پاگل" اور وہ اٹھی، کھل کھلائی اور کھیت میں بھاگتے ہوئے لہرائی" تم مجھے نہیں پا سکتے" وہ اس کو پانے کے لئے عجیب وارفتگی سے اس کے پیچھے بھاگا۔ دور تک رہا تلاش کرتا رہا لیکن وہ سچ مچ اس کو نہ پا سکا۔ نہ جانے گھنے ارہر کے کھیت میں وہ کہاں گم ہو گئی اور پھر اسی رات جب تمنا اس کے کمرے میں کھانا پہنچا کر لوٹنے لگی تو اس نے اسکی کلائی پکڑ لی، وہ کسمسائی، تڑپی اور پھر اس کی بانہوں میں جھول کر ہانپنے لگی

"میں نے تمہیں پا لیا نا" ارشد مسکرایا۔

"ہاں اب میں خود تمہارے پاس آئی" وہ تڑپ کر ارشد کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔

"کسی طرح بھی پا لیا نا" ارشد پھر مسکرایا۔

"مجھے پانا اتنا آسان نہیں ہے" وہ یکایک جیسے غمزدہ سی ہو گئی ابا نے نواب صاحب سے سات ہزار قرض لیا تھا اور وہ نواب ..... سات ہزار کے عوض میں ..... وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا سات ہزار کے عوض میں؟" ارشد بے چین ہو گیا۔

"مجھے چاہتا ہے" تمنا کی گردن جھک گئی۔

"پاپی، کمینہ" ارشد غصہ میں بھر گیا۔

"کھانا کھا لو، غصے سے بھوک اڑ جائے گی" تمنا نے کہا یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ہمارے دیش کی ہزاروں لڑکیاں قرض چکانے کے کام آچکی ہیں"

"میں یہ ظلم نہیں ہونے دونگا تمنا" ارشد نے کہا۔

"بھلا تم کیا کرو گے۔؟"

"میں اس نواب کے روپے چکا کر تمہیں حاصل کرلوں گا"

"اتنے روپے تمہارے پاس ہیں؟"

"ہیں تو نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ ہو ضرور سکتے ہیں"

"وہ بھلا کس طرح۔؟"

"جدوجہد کر کے۔ ارشد نے کہا" تم صرف یہ وعدہ کرو کہ جب تک میں روپے فراہم نہ کرلوں، تم میرا انتظار کرو گی"

تمنا جواب میں کچھ نہ بولی لیکن وہ اس کی بازوؤں میں جھول کر بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ اور اس طرح عہد و پیمان کے بعد ارشد کے رنگین دن پلک جھپکاتے گزر گئے۔ پھر وہ شہر چلا آیا۔ نئے عزائم کے ساتھ اس نے جدوجہد شروع کی۔ وقت گزرتا رہا روپے جمع ہوتے گئے۔ پھر ایک دن اس کے باپ پر فالج کا حملہ ہو گیا اور ارشد کے جمع کئے ہوئے روپے سب ان کے علاج میں صرف ہو گئے۔ تمنا کا خط آتا رہا کہ نواب کا اصرار شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ وہ تمنا کو جواب دیتا رہا کہ وہ کچھ دنوں تک اور ٹال مٹول کرے۔ ادھر اس کے باپ کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت تھی۔ اس کی ماں کے سب زیورات علاج کے نذر ہو گئے تو اس کی ماں نے ایک گھرانے میں اس کی شادی کی بات دس ہزار روپے کے عوض طے کرلی۔

پہلے تو وہ ماں کے فیصلہ پر جھنجھلایا، انکار کرتا رہا۔ لیکن آج اس نے اپنی ماں کے فیصلہ کے آگے سر جھکا لیا۔ تمنا کا خط پانے کے بعد انکار کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ اس کے خط کی عبارت کتنی مختصر تھی، لیکن اس میں زندگی کی کتنی ٹھوس حقیقت تھی۔ لکھا تھا۔

ارشد

میرے والدین کی مجبوریوں نے مجھے سات ہزار کے عوض بوڑھے نواب کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ کیا پتہ کہ اپنے حالات سے تم بھی میری طرح بے بس ہو، میں تمہیں کبھی نہیں بھلا سکتی تمنا

ارشد نہ جانے کب تک اس مختصر سی تحریر کو بار بار پڑھتا رہا اور اس کا چہرہ دل کے بہتے ہوئے خون سے بھیگتا رہا۔!!

(پٹنہ سے نشر)

یکم اپریل ۱۹۸۷ء

آپ کی رائے

یکم فروری ۸۷ء کے آواز نے آواز دی اور میں غفلت سے ایسے جاگا جیسے برسوں سے اس آواز سے بے خبر سو رہا تھا جی تو بہت لکھنے کو چاہتا ہے، پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ سورج کو کیا چراغ دکھاؤں؟ ہر اعتبار سے آپ دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ طباعت، ضخامت دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ایک روپیہ میں اس قدر موقر مواد بھی مہیا کیا جاسکتا ہے۔

"حسنِ زندگی"، جگر مراد آبادی، یونانی طب.... "سچ بولنا" بہت ہی اچھے مضامین ہیں۔ غزلوں کا انتخاب اچھا ہے۔ بعض اشعار دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے۔ اب کس کس کا ذکر کیا جائے؟

دو ایک باتیں مشورتاً پیش خدمت ہیں، امید کہ توجہ مبذول فرمائیں گے:۔

۱۔ آواز سپرد ڈاک کرتے وقت صرف ایک فولڈ کیا جائے۔ دو فولڈ سے حسن ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ دایاں اور بایاں حاشیہ تھوڑا اور چوڑا رکھا جائے تاکہ تجلید کے بعد کٹنگ کے وقت بھی حاشیہ بحُسن قائم رہے۔ عنوان کے لکھنے میں جو زیادہ جگہ صرف کی جاتی ہے کم کی جائے اور دائیں بائیں چوڑے حاشیہ کا تدارک کیا جائے۔

۳۔ نیا مضمون نئے صفحے سے شروع کیا جائے مثال کے طور پر صفحہ ۸ کے عنوان "دیہات کے موجودہ ...." اور عبدالاحد ساز صاحب کی غزل صـ۱۹ کی، صـ۸ پر دی جاسکتی تھی اور "ستو اور اس کی دلہن" کو صـ۱۹ پر ختم کیا جاسکتا تھا۔

اسی طرح صـ۱۴ پر "قصہ تنخواہ بڑھنے کا" صـ۱۵ سے شروع ہوسکتا تھا اور نور عالمی صاحب کی غزل صـ۱۴ کے تیسرے کالم میں دی جاسکتی تھی۔ مختصر یہ کہ نئے مضمون صرف ایک کالم جفت صفحہ پر نہ دیا جائے تاکہ "آواز" میں اور بھی حسن پیدا ہو۔

جاندار، شاندار اور آبدار رسالہ آواز نکالنے پر دلی مبارکباد۔

نادر (ایس ایف رحمٰن)
نزد وِدربھا اِنڈسٹریز
کلمب ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

"آواز" برابر پڑھتی ہوں مگر "آپ کی رائے" کالم میں شرکت کے لیے بہت دنوں سے سوچتی رہی۔ آخر کار آج قلم اٹھا چکی۔ فروری کا شمارہ پڑھ چکی۔ اس شمارہ میں سب سے زیادہ جو چیز متاثر کیا وہ ہے۔ سرورق کی تصویر، اس لیے کہ مور کے پنکھ کو بچپن سے کتابوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔ آج سرِ بزم دیکھ کر مسرت ہوئی۔

میں اسکول کی ایک طالبہ ہوں سیدھے سادھے افسانے تو سمجھ لیتی ہوں مگر آج کے جدید افسانے سمجھ میں نہیں آتے عطیہ پروین کا افسانہ مزہ دے گیا۔

حسن اور زندگی بھی عقل وفہم کے دریچے کھولتا ہے۔

رفعت پروین رحمانی
ہندپیڑھی، رانچی

رسالہ آواز ۱۶ر تا ۲۸ر فروری دستیاب ہوا پرچہ پر نظر پڑتے ہی واہ واہ کی آواز زبان سے باہر ہوگئی اتنا خوبصورت سرورق کہ کافی دیر تک میری نظر مرکوز رہی سچ سچ آپ نے اتنا سندر اور خوبصورت بنادیا ہے آواز کو کہ میرے پاس تعریف کے الفاظ نہیں کن الفاظ میں تعریف کروں۔

بہرحال ورق گردانی کرتے کرتے میری نظر غزلیات کے صفحہ پر مرکوز ہوگئی اور بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا دل کو سرور اور ذہن کو سکون نصیب ہوا افسانے اور مضامین کا بھی مطالعہ کیا معلومات میں اضافہ ہوا۔

تمام سرکاری اردو جرائد میں مجھے آواز بہت پسند آتا ہے کتابت طباعت بھی لاجواب، خدا آپ کو اجر عظیم عطا فرمائے آئندہ دوسرے خط کے ذریعہ ملاقات ہوگی۔

محمد اسماعیل انصاری
اسٹیل ٹرنک شاپ دوکان ۱۱
نزد کالی مندر چرچ روڈ، رانچی

۱۶ر تا ۲۸ر فروری کا آواز ۱۴ر فروری کو بازار سے خریدا تمام سرکاری رسالوں میں آپ کا آواز پابندی کے ساتھ وقت سے پہلے موصول ہوجاتا ہے جو دوسرے رسائل کو نصیب نہیں بہرحال یہ شمارہ سابقہ دوسرے شماروں سے بدرجہا خوب صورت اور لاجواب ہے سرورق اتنا حسین و جمیل کہ جواب نہیں ایک پیاسے شیر کو پانی پیتے ہوئے دیکھ کر قدرت کی منظر نگاری یاد آگئی ہر انداز سے اسکی مصوری لاجواب ہے اور آپ باکمال ہیں خدا آپ کو اجر عظیم سے نوازے۔

اس مرتبہ جموں سے نشر شدہ غزلوں میں سریندر سرور ملکزادہ منظور احمد، عزیز بانو داراب وفا کی غزلیں بہت پسند آئیں شعرا حضرات کو مرحبا۔ ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ انسان کی ہستی ایک پانی کے بلبلے کے مانند ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں لیکن پھر بھی لوگ اس دارفانی کی ثروت کے پیچھے صبح وشام پریشان و سرگرداں ہیں، آخرت کا خیال دلوں سے نکل گیا ہے یہ ایک سبق آموز اور عبرت آموز مضمون ہے مجھے اس مضمون سے اتفاق ہے، مجتبیٰ حسین صاحب میں نے آپ کی بے مکانی کو دیکھ لیا اب آپ اپنی بے زمانی بھی تو دکھاتے جائیں، زمین والو ہماری بے زمانی دیکھتے جاؤ اب اس پر تو ہم قارئین کرام کو کچھ سناتے جائیں پہلے تو آپ کو اپنی بے زمانی دکھلانی تھی مگر آپ نے تو پہلے بے مکانی دکھا دیا اب قارئین حضرات ہی فیصلہ کریں بہرحال اب مدیر صاحب آپ سے بھی بذریعہ آواز کچھ باتیں ہوجائیں تاکہ قلبی سکون نصیب ہو قاضی فضل رب اور ڈاکٹر ارشاد حیدر نے جو رائے بھیجا تھا میں ان کے رائے سے اتفاق کرتا ہوں میں خود مایوس ہوگیا کہ یہ رسالہ آواز آخر کیوں بند ہونے جارہا ہے اخبارات میں جب اس طرح کی خبر ہے تو مجھے بھی بہت دکھ ہے خدا نہ کرے یہ آواز بند ہو اگر ایسا ہوا تو ہم پروانوں اور شیدائی آواز کا کیا ہوگا خدارا ہمیں یتیم ہونے سے بچائیں تاکہ ہماری آواز بند نہ ہونے پائے خدا کی معاونت آپ کے ساتھ ہو۔

عبدالحق انصاری رانچوی
ہندپیڑھی نزد مدینہ مسجد
جی ٹی روڈ، رانچی

۱۶ر سے ۲۸ر فروری ۸۷ء کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر جم کاربٹ نیشنل پارک میں ایک شیر کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ یہ آواز ہی کی انفرادیت ہے کہ ہر پندرہ دن کے بعد قاری کو نئے سرورق دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ شمارہ بھی ہر لحاظ سے بھرپور ہے اور کافی اہم ہے۔ ڈاکٹر حسینی نے "ہستی اپنی حباب کی سی ہے" پیش کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ انسان کی ہستی ناپائیدار ہے پھر بھی انسان اپنی ہستی پر اس طرح اتراتا ہے جیسے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں آیا ہے۔ یہی خیال سارے فساد کی بنیاد ہے۔ رام لال صاحب کا "شیشے کا گھر" ایک عمدہ تجزیہ ہے۔ رام لال صاحب کو میں عرصے سے جانتا ہوں۔ خاکساری ہی ان کی معیاری افسانہ نگاری کے لیے مہمیز ثابت ہوئی ہے خواتین میں اعتماد کی ضرورت ہے۔ یہ بھی فاطمہ حسن کا ایک عمدہ مضمون ہے۔ مگر اعتماد کس طرح بحال کیا جائے اس کے متعلق کچھ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ لیزر شعاعیں ایک اہم معلوماتی مضمون ہے۔ کالج کے طلبا اور عام لوگ اس سے اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا اندازِ بیان دلکش ہے۔ وہ بہت ہی لطیف انداز میں قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ البتہ شفیقہ فرحت صاحبہ نے کچھ زیادہ متاثر نہیں کیا۔ فخرالدین عارفی کا افسانہ صرف توڑ جوڑ سے تیار کیا گیا ہے۔ نہ تو اس میں کوئی جدت ہے نہ اچھی تکنیک ہی۔

آواز پابندی سے شائع ہو۔ یہی میری آرزو ہے۔ امید ہے آپ بہ خیر ہوں گے۔

انوار انصاری
اولڈ ہزاری باغ روڈ
نزد چونا بھٹہ، رانچی ۹

۱۶ر فروری ۱۹۸۷ء کا آواز کا شمارہ موصول ہوا۔ اس شمارے میں شامل تنقیدی مضامین، کہانیاں اور شاعری کا حصہ پسند آیا۔ خصوصاً دو مضامین نے بے حد متاثر کیا۔ پہلا مضمون "اردو ہندی کہانی سیمینار (رپورٹ)" اور دوسرا "فراق کی شاعری میں ہندوستانی رسم ورواج"۔ ڈاکٹر عابدہ بیگم صاحبہ نے یہ مضمون لکھ کر فراق گورکھپوری کی شاعری کے متعدد گوشوں میں سے ایک گوشے پر روشنی ڈالی ہے تاہم اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں موصوفہ نے مضمون کے شروع میں ان شعرا کے نام گنائے

ہیں جن کے یہاں ہندوستانی رسم و رواج کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ چند اور اہم شعراء ہیں جنھوں نے ہندوستانی فضا، اوہام اور رسم و رواج کی حقیقی تصویر کشی کی ہے، مگر ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔ مثلاً میر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ نے اپنی مثنوی میں مختلف موقعوں کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کافی مدت تک ہندوستانی رسم و رواج سے مناسبت رکھتے ہیں۔ مرثیہ گو شعراء اور خصوصاً میر انیس کے یہاں مرثیوں میں مختلف موقعوں پر کی جانے والی رسم و رواج کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ بھی کافی حد تک ہندوستانی رسم و رواج سے مناسبت رکھتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستانی رسم و رواج کی تصویر کشی فارسی سے لے کر اب تک برابر کی جارہی ہے۔ یہ کوئی فراق صاحب کی دین نہیں ہے۔ انھوں نے اگر اردو شعراء کو ان عناصر کی طرف متوجہ نہ بھی کیا ہوتا تو یہ بھی سب ان کے یہاں ملتے کیونکہ کوئی بھی شعر و ادب اپنے ماحول اور سماج سے آنکھیں چرا کر باقی نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر اشفاق حسینی
شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد

۱۶ فروری کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اس شمارے کے تمام تخلیقات معیاری ہیں۔ خصوصاً فاطمہ حسن کا "خواتین میں خود اعتمادی کی ضرورت" اور ڈاکٹر ابو نعیم کا "ادویات کی عادت اور اس کے خطرات" معلوماتی ہیں۔ آج ہمارے سماج میں منشیات کا استعمال خاص کر نوجوان طبقے میں اس کے اثرات خطرناک حد تک بڑھ رہے ہیں۔ اگر اس طرف خصوصی توجہ نہ دی گئی تو شاید اس کے مضر اثرات سے ہمارا پورا معاشرہ برباد ہو جائیگا

اس بار جموں سے پیش کی گئی غزلوں میں سیدہ شان معراج کی غزل کا یہ شعر کافی پسند آیا ؎

وہ بے وفا مجھے تنہا فریب کیا دیتا
قصور وار مرا اپنا اعتبار بھی تھا

خدا کرے "آواز" اسی طرح پابندی سے نکلتا رہے۔ نیک خواہشات کے ساتھ۔

فرحان غنی شاہ گنج، پٹنہ

آواز ۱۶ تا ۲۸ فروری کا شمارہ نشاط نظر ہوا۔ ایک ہی نشست میں ساری تخلیقات پڑھ گیا۔ یوں تو اس شمارے میں شامل تمام تخلیقات معیاری اور دلچسپ ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کا انشائیہ "مکاں والو ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ" اور فخر الدین عارفی کا افسانہ "ایک اور طوفان" مجھے خاص طور سے پسند آیا۔ مجتبیٰ حسین کی تحریریں جو شگفتگی اور چاشنی ہے وہ ہندو پاک کے کسی دوسرے طنز و مزاح نگار ادیب کی نثر میں ہمیں نہیں ملتی ہے اسی طرح فخر الدین عارفی کے افسانوں میں ہمیں افسانے کی جو خوب صورت زبان ملتی ہے وہ اس دور کے بہت کم افسانہ نگاروں کے یہاں ملتی ہے۔ فخر الدین عارفی کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں ایسی زبان کا استعمال کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کے دلوں کی گہرائیوں میں بہت دور تک اتر جاتی ہے وہ الفاظ کے بہت بڑے جادوگر ہیں افسانہ "ایک اور طوفان" ان کا ایک بہت ہی پیارا افسانہ ہے، یہ افسانہ اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر پڑھنے والے کے ذہن و دماغ پر بہت گہرا نقش چھوڑتا ہے۔

گزشتہ ۲۹ جنوری ۸۷ء کو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نئی دہلی سے فخر الدین عارفی کا ایک فیچر "پٹنہ ماضی کے آئینے میں" بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ بڑا اچھا ہو، اگر اردو سروس سے حاصل کر کے یہ فیچر آپ "آواز" کے صفحات پر شائع کر دیں، تاکہ ہزاروں لوگ اس فیچر سے استفادہ کر سکیں اور یہ قیمتی تحریر محفوظ ہو جائے۔

محمد نسیم احمد
انجمن ترقی اردو بہار
بالائی منزل، گورنمنٹ اردو لائبریری
چوہٹہ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

آج آواز کا شمارہ مارچ کے ماہ کا پہلا پرچہ بازار سے خرید کر لایا تو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ اگر میں کچھ الفاظ آپ کی شان میں نہ لکھے تو یہ خود میرے لیے زحمت ہوگا کیونکہ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ میں تصور میں کھویا رہا کہ اس ملک میں مایا ناز لکھنے والے مدبر ادبی شخصیت رکھنے والے سائنس داں، ڈاکٹر و دیگر شخصیات ہیں اور ان کی موجودگی میں اگر ہمارا ملک ترقی نہ کرے تو یہ ہمارے لیے باعثِ زحمت ہے۔

آواز کی ہر چیز اپنے آپ میں مکمل ہے ہر صفحہ میں اتنی باتیں لکھی ہوتی ہیں کہ علم کا خزانہ ایک ایک صفحات میں موجود ہے۔

صباح الدین عمر کا مضمون "بہادر شاہ ظفر، تحریروں کے آئینے میں" خوب تر ہے یہ مضمون اپنے آپ میں افسانہ ہے تاریخ اور ادب ہے ہر چیز میں مکمل ایسا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ ایسی تخلیقات شائع کرنے کا شرف صرف آواز کو ہی پہونچتا ہے دوسرے مضامین بھی اپنے آپ میں خوب سے خوب تر ہیں غزلیات بھی بامطلب و معنی ذوق اور افسانوی ہیں جن پر مطلب براری کی جاسکتی ہے۔ میری طرف سے آواز کے پورے خاندان کو سلام قبول ہو۔

محمد احمد
محلہ چھپیاں، سہارنپور

آواز یکم مارچ شادمانیوں اور تابانیوں کے ساتھ بصد یاب ہوا سرورق میں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری کا مزار اقدس کی تصویر ہے اور بہار شریف پر ایک مضمون بھی ہے جس سے بہار شریف کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوا۔ اس شمارے کا سب سے پہلا مضمون سیرت حضرت علی رضی اللہ عنہ پر ہے جو ناصر زیدی صاحب کا بہترین معلوماتی اور کارآمد مضمون ہے جس سے قارئین کو بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایڈلین روحی کا مضمون "آخر کیوں مرنہ جانے کی آرزو ہے" بہت اچھا ہے۔ "روزمرہ زندگی میں کیمیا کی اہمیت" "مضری بچوں کی اصلاح" اور نجمہ بانو حسن کا طنزیہ مضمون "عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتے دار" خوب صورت مضمون ہے پسند آیا۔ افسانہ میں "خزاں کے بعد" اچھا افسانہ ہے اس شمارے کے تمام مضمون افسانے اور غزلیں خوب ہیں اور معیاری ہے منظر بھوپالی کا یہ شعر پسند آیا ؎

ٹوٹ جاؤں گا بکھر جاؤں گا ہاروں گا نہیں
میری ہمت کو زمانے کی ہوا جانتی ہے

سید زین العابدین
گوال ٹولی، رانچی

یکم مارچ کا "آواز" نظر سے گذرا، بیشتر مضامین قابلِ تعریف و تحسین ہیں۔ لیکن پروفیسر محمود الٰہی کا مضمون "تحقیق و تنقید میں بنیادی فرق" خصوصی توجہ کا مستحق اور مشعل راہ ہے۔ موصوف نے اس مختصر سے مضمون میں تحقیق و تنقید کے نمایاں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کرشن چندر کی شخصیت پر مبنی مضمون "کرشن چندر" بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس میں ریوتی سرن شرما نے بہت ہی اچھے پیرائے میں کرشن چندر کی زندگی کے کچھ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ نیز دوسرے تمام مضامین، افسانے اور غزلیں خوب سے خوب تر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ "سرورق" بھی پرکشش ہے

(ڈاکٹر) محمد ایمن انصاری
دسہری باغ، گورکھناتھ
گورکھپور

آواز پرچہ کا میں بہت پرانا قاری ہوں مگر کبھی میں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا ہوں، شاید اس لئے گمنام ہوں ہر حال کہنا یہ ہے کہ برابر آواز میں دوسرے دوسرے ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر شدہ افسانے غزلیں مضامین وغیرہ دیکھتا ہوں مگر رانچی کا کوئی پروگرام نہیں نظر آتا ہے آخر وجہ کیا ہے نا چیز کو معلومات فراہم کریں نوازش ہوگی۔

مورخہ ۸ جنوری کو ۸ بجے شب کو رانچی ریڈیو اسٹیشن سے فضول خرچی پر ایک گفتگو سنی جو مجھے بیحد پسند آیا کوثر آرا صاحبہ اور جناب عبدالحق انصاری صاحب نے اس موضوع پر جو بات چیت سنایا وہ عوام الناس کے لئے عبرت اور درس ہے۔ شاید آواز میں یہ مقالہ دیکھنے کو ملے آواز پرچہ کے ذریعہ بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ قابل مبارکباد ہیں خدا اس ادارہ کو قائم رکھے آمین

محمد خلیل اورنگ آبادی گروسر
ہند پیڑھی لیک فیکٹری روڈ
رانچی۔ بہار

دور درشن

دہلی
چینل ۴ تصویر 62.25 MHz
بینڈ ۱ آواز 67.75 MHz

مسوری
چینل ۱۰ تصویر 210.25 MHz
بینڈ ۳ آواز 215.75 MHz

روزانہ ٹیلی کاسٹ ہونیوالے پروگرام

صبح کی خصوصی نشریات

صبح ۷-۳۰ وندے ماترم: سوپربھات
۷-۳۵ سماچار (ہندی خبریں)
۷-۴۵ دس قدم
(جسمانی چستی کےلیے رہنما پروگرام
۸-۰۰ لوک گیت
۸-۰۵ نیوز (انگریزی خبریں)
شام
۶-۰۰ افتتاحی اعلانات (سوائے اتوار)
۶-۵۵ پروگراموں کا خلاصہ اور گمشدہ افراد سے متعلق اعلانات (سوائے ہفتہ)
۷-۰۰ کرشی درشن (پیر، منگل، بدھ اور جمعہ)

نیشنل پروگرام

رات
۸-۴۰ سماچار (ہندی خبریں)
۹-۳۰ دی نیوز (انگریزی خبریں)
۱۱-۴۵ نیوز ہیڈلائنز (ہفتہ کو ۱۲-۲۰ پر)

اسکول ٹیلی کاسٹ

پیر
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ سائنس (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۱۰-۱۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

منگل
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ انگریزی کا سبق (ساتویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ کیمسٹری (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ حساب (ساتویں جماعت)

بدھ
صبح ۹-۰۰ اور دوپہر ۲-۳۵ حساب (آٹھویں جماعت)
۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ بائیلوجی (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور شام ۴-۴۵ سائنس (ساتویں جماعت)

جمعرات
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ جغرافیہ (دسویں جماعت)
۱۰-۵۵ اور سہ پہر ۴-۰۰ پرائمری اسکول کے لیے
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ سائنس (چھٹی جماعت)

جمعہ
صبح ۹-۴۰ اور سہ پہر ۳-۱۵ فزکس (دسویں جماعت)
۱۱-۱۰ اور سہ پہر ۴-۴۵ انگریزی کا سبق (چھٹی جماعت)

یو جی سی پروگرام

دوپہر ۱۲-۴۵ اور شام ۴-۴۰
اعلیٰ تعلیمی پروگرام (روزانہ سوائے اتوار اور تعطیل)

دہلی I

اتوار
صبح
۹-۳۰ سرب سانجھی گوربانی / پربھاتی
۹-۴۵ یوگ اور سواستھ
۱۰-۰۰ اپو اور پپو (ہندی سیریل)
۱۰-۳۰ رامائن (ہندی سیریل)
۱۱-۱۵ دیٹ از کرکٹ (انگریزی سیریل)
۱۱-۳۰ اولڈ فاکس (انگریزی سیریل)
۱۲-۳۰ زندگی زندگی (ہندی سیریل)
۱-۳۰ علاقائی زبان کی انعام یافتہ فیچر فلم (I اتوار)
علاقائی زبان کی فیچر فلم II III اور V
۴-۰۰ ورلڈ آف اسپورٹ
شام
۵-۴۵ اور ۷-۴۵ ہندی فیچر فلم
۷-۳۰ سنرکشن اپھوگتا کا / اندھی گلیاں
۹-۰۰ کونٹیکٹ: کوئیز (انگریزی)
۹-۵۰ فوکس: حالات حاضرہ پر انگریزی پروگرام
۱۰-۲۰ فوک اور اینڈ ٹریڈیشنل آرٹ (اتوار I)
سُنیے (اتوار II)
کوی سمیلن (اتوار III)

پیر
شام
۶-۰۰ نہیلاؤں کے لیے
۶-۱۵ بچوں کے لیے انگریزی فلم (سلسلے وار)
۶-۳۵ جان ہے جہان ہے (صحت سے متعلق)
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ ہندی ناٹک
۹-۰۰ ہندی سیریل
۹-۵۰ سچ کی پرچھائیں
I اور III
چترمالا II اور IV
شامِ غزل V

۱۰-۲۰ گرم چند (ہندی سیریل)
۱۰-۴۵ رقص کا نیشنل پروگرام / I، II، III، V
بیلے (IV).
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

منگل
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ کھیل کھلاڑی
۶-۳۵ ہمارے کامگار، ہمارے ادیوگ
(II اور IV)
ہمارے ادھیکار اور کرتویہ
(I، III، V)
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ یوتھ فورم I III اور V
یووامنچ II اور IV
۸-۱۰ بزم (اردو ادبی میگزین)
۹-۰۰ بنیاد (ہندی سیریل)
۹-۵۰ جن وانی I، III
بییانڈ ٹو مارو II اور IV
۱۰-۲۰ انگریزی میں ڈاکومنٹری فلم
۱۰-۵۰ ٹیلی فلم
ٹوورڈس پروگریس /
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

بدھ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (ہندی)
۶-۱۵ آنگن واڑی
۶-۳۵ وکاس کی اور
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ آپ اور ہم (ناظرین کے خطوں کے جواب)
۸-۰۰ چترہار (ہندی فلموں سے رقص و گیت)
۹-۰۰ صبح (ہندی سیریل)
۹-۵۰ رونگ آئی I, III
حالاتِ حاضرہ پر پروگرام
پرادکشنا
اے جرنی ڈاؤن دی گنگا (اتوار II)
اے سورس ٹولائف IV
۱۰-۲۰ پورنیما: ہندی سیریل
۱۰-۴۵ پریمیر انسٹی ٹیوشنز آف انڈیا
(I III اور V)

گریٹ ماسٹرز (II اور IV)
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعرات
شام
۶-۰۰ دیہی بچوں / دیہی نوجوانوں کے لیے
۶-۱۵ گھریلو نسخے
۶-۳۵ قانونی صلاح
۷-۰۰ رقص
۷-۱۵ وشو درشن
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ پتریکا (ہندی ادبی میگزین)
۸-۰۰ باتوں باتوں میں
۸-۲۵ اکنامکس میڈ ایزی: انگریزی سیریل
۹-۰۰ سوئم سدھا: ہندی سیریل
۹-۵۰ پرشن منچ I
کیوسٹ سائنس کوئیز II
اسپورٹس کیوز III
واٹ از دی گڈ ورڈ IV
ہیلتھ کوئیز V
۱۰-۲۰ ٹوورڈز برائٹ فیوچر / پورٹریٹ / ٹورسٹ اسپاٹ (انگریزی پروگرام)
۱۰-۴۵ موسیقی کا نیشنل پروگرام
۱۱-۱۵ پارلیمنٹ نیوز

جمعہ
شام
۶-۰۰ بچوں کے لیے (انگریزی)
۶-۱۵ آپ کا پریوار
۶-۳۵ سگم سنگیت / اُپ شاستریہ سنگیت
۷-۳۰ سنسد سماچار
۷-۴۰ گیان دیپ
۸-۰۰ چترہار
۹-۰۰ ایک کہانی (ہندی سیریل)
۹-۵۰ ہندی سیریل
۱۰-۲۰ لانگ اسپورٹس ایونٹس III
اسٹیٹس آف دی یونین II اور IV
سپر تمپر انسٹی ٹیوشن آف انڈیا I

ہفتہ
دوپہر
۱-۴۵ گھر باہر
۲-۱۵ یوتھ ٹائم / یوتھ فورم
۲-۴۵ اعلان کے مطابق

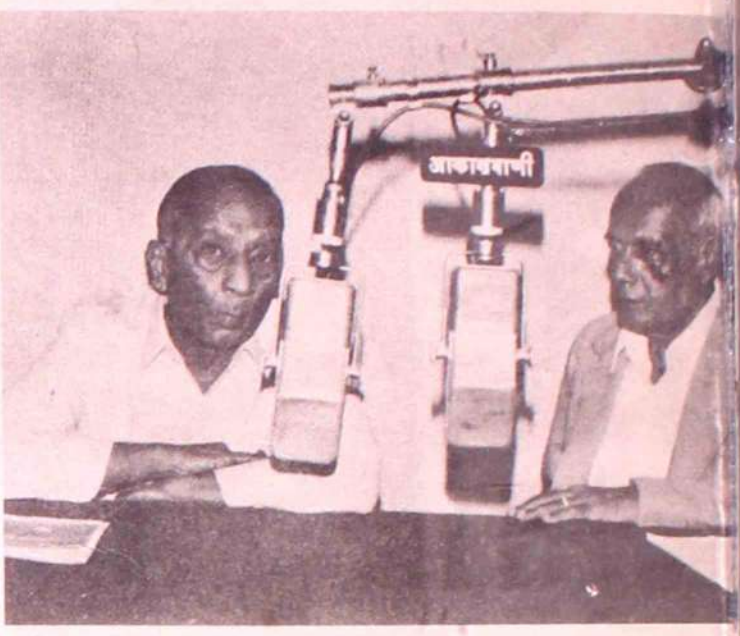

(اوپر) گجرات کے وزیر تعلیم ہنس مکھ بھائی پٹیل (بائیں) نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے۔
(اوپر دائیں) مشہور فوٹو گرافر اے ایل سید سے فوٹو گرافی کے موضوع پر سریندر پٹیل کی بات چیت گزشتہ دنوں نشر ہوئی۔ یہ دونوں پروگرام آکاشوانی احمد آباد بڑودہ سے نشر ہوئے۔

آر سنگمیشورن، پربندھک ندیشک بھلائی اسٹیل پلانٹ ــــــ نے 'پبلک سیکٹر انٹرپرائز اینڈ انڈین اکنامی' کے موضوع پر ایک تقریر آکاشوانی رائے پور سے پیش کی۔
آکاشوانی رانچی کے بچوں کے پروگرام میں بھیا فضل الباری کے ساتھ بیش چودھری اور کنچن گپتا۔

بھاگیرتھی دیوی اور شاردا دیوی آکاشوانی نجیب آباد سے گڑھوالی لوک گیت پیش کرتے ہوئے۔ پریم داس نے مشک بین پر سنگت کی۔

Regd. No. D-(C)39
R.N. No. 14253/57

PRICE : RUPEE 1.00

AWAZ
1st. APRIL 1987

prepayment at PSO, New Delhi

'اکاشوانی کوٹا' کے افتتاح کی تقریب میں ۔ (اوپر) وزیر اطلاعات و نشریات شری اجیت پانجا اکاشوانی کی سگنیچر ٹیون کا بٹن دبا کر نشریات کا آغاز کرتے ہوئے اور (بائیں) رنجنا چودھری راجستھانی لوک گیت پیش کرتے ہوئے ۔

'اکاشوانی لکھنؤ' کے 'یوا رنگ' پروگرام میں نرتیہ نائیکہ 'چنڈالیکا' پیش کرتے ہوئے ۔

'اکاشوانی بھج' کی جانب سے منعقد شاستریہ سنگیت کی ایک محفل میں اروند گجیندر گڈکر بانسری وادن پیش کرتے ہوئے ۔

Published by the Director General, All India Radio, at the Office of the Chief Editor, Akashvani Group of Journals, PTI Building, II floor, Sansad Marg, New Delhi-110001.
Printed by the Manager, Govt. of India Photo Litho Press, Faridabad.